حیاتِ سلیمان

شاہ معین الدین احمد ندویؒ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

حیاتِ سلیمان

یعنی

ڈاکٹر علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کے

سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندویؒ

www.KitaboSunnat.com

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڈھ (ہند)

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر: ۱۰۶

نام کتاب	:	حیاتِ سلیمان
نام مصنف	:	شاہ معین الدین احمد ندویؒ
صفحات	:	۵۹۵
سن اشاعت	:	۲۰۱۱ء، جدید معیاری ایڈیشن
مطبع	:	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)
ناشر	:	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)
قیمت	:	۳۰۰ روپے
باہتمام	:	عبدالمنان ہلالی

ISBN : 978-93-80104-38-6

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

حیاتِ سلیمان

دیباچہ طبع جدید

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کی اہم مطبوعات میں "حیات سلیمان" شامل ہے۔ اکیڈمی نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس وقت معارف پریس کی طباعت و اشاعت معیاری اور مثالی ہوتی تھی، انقلاب زمانہ سے اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی، مالی دشواریوں کی وجہ سے طباعت کا معیار مستقل گرتا چلا گیا اور اس کے باعث یہاں سے چھپنے والی کتابوں کا پڑھنا مشکل اور ان سے استفادہ دشوار ہوتا چلا گیا۔

دارالمصنّفین نے جب تمام تر دشواریوں کے باوجود اپنی مطبوعات کے جدید اور خوبصورت ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو فطری طور پر علامہ شبلی کی کتابوں اور دوسری اہم مطبوعات کو اولیت دی گئی، المامون، الفاروق، سوانح مولانا روم، سفرنامہ روم و مصر و شام اور خطبات کے نئے ایڈیشن اہتمام سے شائع کیے گئے، اب تک پچاس سے زیادہ کتابوں کے معیاری ایڈیشن شائع کیے جا چکے ہیں، "حیات سلیمان" کا یہ ایڈیشن بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یقین ہے کہ قدردانان دارالمصنّفین اس نئے قالب میں یہاں کی مطبوعات کی پذیرائی کریں گے۔

اشتیاق احمد ظلّی

۱۳؍جولائی ۲۰۱۱ء　　　　ڈائریکٹر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کبھی ان کی سوانح عمری لکھنے کا ذکر آتا تھا تو یہ واقعہ نقل فرماتے تھے کہ منشی افتخار عالم مارہروی جنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح عمری لکھی تھی، مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری بھی لکھنا چاہتے تھے، کئی مرتبہ مولانا شبلیؒ سے اس کی خواہش کی، مگر مولانا ان کے قلم سے اپنی سوانح عمری پسند نہ کرتے تھے، اس لیے برابر انکار کرتے رہے، آخر میں افتخار عالم صاحب نے سید صاحبؒ کے ذریعہ سفارش کرائی، مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''منشی افتخار عالم صاحب میری سوانح عمری کیا لکھیں گے، جب تم کبھی دنیا کے کاموں سے فرصت پانا تو تم ہی لکھنا۔''

سید صاحبؒ کی وفات کے بعد ہی سے سوانح عمری کے لیے لوگوں کا تقاضا شروع ہوگیا تھا، معارف کا سلیمان نمبر نکال کر ایک حد تک اس طلب کو پورا کیا گیا مگر اس سے شائقین کی تشفی نہیں ہوئی، ان کا تقاضا برابر جاری رہا لیکن ایسی عظیم المرتبت شخصیت کی سوانح عمری لکھنے کی جس کے کارنامے اتنے گونا گوں ہوں اور جن کا سمیٹنا آسان نہ تھا، ہمت نہیں پڑتی تھی، اس لیے کئی سال اسی تذبذب میں گزر گئے، مگر شائقین خصوصاً مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا اصرار برابر جاری رہا، مولانا عبدالباری صاحب

نے ایک مرتبہ لکھا کہ ”کاش میری زندگی میں سید صاحبؒ کی سوانح عمری شائع ہو جاتی۔“

ان بزرگوں کے اصرار کے علاوہ سب سے بڑا تقاضا خود حضرت الاستاذ کے حقوق کا تھا، یہ بھی خیال ہوا کہ عمر گریزاں ختم ہوتی جارہی ہے، اگر یہ خدمت مجھ سے انجام نہ پاسکی تو آئندہ اور بھی دشواری ہوگی اور شاید یہ ضروری کام رہ جائے گا، اس لیے خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیا لیکن درمیان درمیان میں مختلف کاموں کی وجہ سے طویل ناغے بھی ہوتے رہے، اس لیے کتاب کی تکمیل میں اندازہ سے زیادہ تاخیر ہوگئی، خدا کا شکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ کام انجام پا گیا، اس کے بعد کتابت وطباعت میں مختلف قسم کی دشواریاں پیش آتی رہیں اور اس میں تقریباً تین سال لگ گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مرحلہ سے بھی گزار دیا۔

سید صاحب نے حیاتِ شبلی کے دیباچہ میں لکھا ہے:

”پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں، جس نے بتیس برس ۱۸۸۲ء-۱۹۱۴ء تک ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسی سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا۔“

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

”یہ (حیاتِ شبلی) عہد جدید کے سب سے بڑے عالم کی زندگی کے سوانح ہیں، جن میں قدیم کے ساتھ جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو ہیں جو عہد قدیم کی نامانوس نگاہوں میں کبھی کبھی کھٹک پیدا کرتے ہیں کیوں کہ اس عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی، اس لیے وہ قدیم وجدید کے ایسے سنگم ہیں جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر ملتے ہیں، مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ اس لیے ان کی زندگی کے کارنامے گزشتہ علماء دین کے کارناموں سے نسبتاً مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آرا و خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علما کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مؤرخ بھی تھے، متکلم بھی تھے،

مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے اور نئے زمانہ کے اقتضاءات اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے اور یہ سب گوناگوں رنگ ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں۔"

بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ کم و بیش یہی اوصاف و کمالات سید صاحب میں بھی تھے، بلکہ ان کے دور میں ہر راہ میں زمانہ کا قدم بہت آگے بڑھ گیا تھا اور علمی اور عملی دونوں میدانوں میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی، مذہبی میدان میں نئے نئے مسائل و مباحث اور قدیم و جدید دونوں طبقوں میں بہت سے مصنفین اور اہل قلم پیدا ہو گئے تھے، تلاش و تحقیق کا معیار زیادہ بلند ہو گیا، عملی میدان میں قومی و ملی اور سیاسی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا، خلافت، ترک موالات اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی انقلاب انگیز تحریکیں اسی دور میں پیدا ہوئیں اور ہندوستان آزاد ہوا، ان سارے کاموں اور تحریکوں میں سید صاحبؒ کا نمایاں حصہ رہا، پھر ان کو مولانا شبلیؒ سے زیادہ مدت تک کام کا موقع ملا، مولانا شبلیؒ کے کاموں کی مدت بتیس سال ہے اور سید صاحبؒ کی تقریباً نصف صدی، اس طویل مدت میں انہوں نے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیم، قومی و ملی اور سیاسی کام انجام دیے جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی، اس لیے اس کتاب میں سید صاحبؒ کے سوانح کے ضمن میں اس دور کے ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی ہر قسم کی تاریخ آ گئی ہے، اس کی تالیف میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔

۱- سید صاحبؒ کی زندگی میں اکثر ان کے حالات کی فرمائشیں آتی تھیں، اس لیے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبؒ نے ان کے مختصر حالات قلم بند کر دیے تھے، جس کی نقل فرمائش کرنے والوں کو بھیج دی جاتی تھی، سید صاحبؒ کی وفات کے بعد صباح الدین صاحبؒ نے اس کو بڑھا کر مختصر سوانح کی شکل میں کر دیا، جو سلیمان نمبر میں شائع ہو چکی ہے، اس میں سید صاحب کی سوانح کا مختصر مگر جامع خاکہ آ گیا ہے۔

۲- خاندانی حالات سید صاحبؒ کے پھوپھی زاد بھائی، بچپن کے ساتھی اور ہمدرس

مولوی نجم الہدیٰ کی زبانی اور تحریر سے ماخوذ ہیں۔

۳-ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ سے لے کر قیام دارالمصنفین تک کے حالات خود سید صاحبؒ نے حیات شبلیؒ میں لکھ دیے ہیں، اس کے علاوہ کچھ حالات ان کے مضمون ''میری محسن کتابیں'' اور بعض دوسری تحریروں میں بھی ہیں۔

۴-سب سے بڑا اور مستند ماخذ معارف کے شذرات اور مضامین ہیں جس میں وہ اکثر اپنی مشغولیتوں اور سفر وغیرہ کا حال لکھتے تھے اور ہر قسم کے اہم مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے، اس لیے اس کی حیثیت خود نوشت سوانح کی ہے۔

۵-اخلاق و سیرت کے حالات کچھ ذاتی علم سے لکھے ہیں اور بیش تر سید صاحبؒ کے بھتیجے مولانا ابوظفر صاحب مرحوم اور ان کے پرانے رفیق مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سلیمان نمبر کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔

۶-راقم الحروف کو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۶ء یعنی سید صاحب کے بھوپال جانے تک ان کی ملازمت کا شرف حاصل رہا، بھوپال کے قیام کے زمانہ میں برابر خط و کتابت رہتی تھی اور وقتاً فوقتاً اعظم گڑھ بھی تشریف لاتے رہتے، اس لیے اس زمانہ کے حالات چشم دید ہیں۔

۷-پاکستان جانے کے بعد مستقل خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، اس لیے اس زمانہ کے حالات کچھ ان خطوط اور بیش تر حالات ان کے مسترشد مولوی غلام محمد صاحب کی کتاب ''تذکرۂ سلیمان'' سے ماخوذ ہیں، جن کے وہ عینی شاہد ہیں۔

مزید اطمینان کے لیے کتاب کا پورا مسودہ سید صاحبؒ کے عمر بھر کے رفیق اور ان کے حالات کے سب سے بڑے واقف کار مولانا عبدالماجد صاحبؒ کے ملاحظہ میں پیش کیا، انہوں نے ملاحظہ فرما کر مشورے بھی دیے، جس کے لیے راقم ان کا شکر گزار ہے۔

ایک زمانہ میں جب تنقید کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہوا تھا اور نگاہ میں اتنی خوردہ گیری اور قلم میں بے باکی نہ پیدا ہوئی تھی، سوانح عمری لکھنا بہت آسان تھا، اکابر کے حالات اسوۂ

حسنہ کی حیثیت سے لکھے جاتے تھے اور عقیدت کے دل سے قبول کیے جاتے تھے لیکن اب یہ پرانے آداب ختم ہو گئے ہیں، خوبیوں کے بجائے عیب ڈھونڈنا ہنر بن گیا ہے، اس لیے سوانح عمری لکھنا بڑا دشوار ہو گیا ہے، چنانچہ اس دور کی بڑی سے بڑی شخصیت اور اس کی سوانح عمری بھی تنقید کی جراحت سے محفوظ نہیں، اس لیے یہ توقع رکھنا کہ یہ سوانح عمری ہر ذوق اور معیار پر پوری اترے گی، ایک غلط توقع ہوگی لیکن اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ قلم جادہ حق وصواب سے ہٹنے نہ پائے اور حتی الامکان صاحب سوانح کی صحیح تصویر پیش کر دی جائے، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ اہل نظر کریں گے، مگر یہ ملحوظ رہے کہ ایک جلیل القدر شخصیت اور ایک شفیق استاد کی یہ سوانح عمری ایک ادنیٰ شاگرد کے قلم سے ہے، اس لیے اگر کہیں جذباتی عقیدت کا پرتو نظر آئے تو اس کو معذور سمجھا جائے۔

کتاب کی ترتیب کے دو طریقے تھے، ایک یہ کہ مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی وملی اور سیاسی کاموں کو الگ الگ ابواب میں لکھا جاتا، اس میں دشواری یہ تھی کہ ان میں بیش تر کام ایک دوسرے سے اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ ان کو جدا کرنا مشکل ہے، اس صورت میں الگ الگ لکھنے میں واقعات کی تکرار کا اندیشہ تھا، دوسری صورت یہ تھی کہ سنین کی ترتیب کے ساتھ لکھا جائے، اس میں سارے حالات بھی آجاتے تھے اور کوئی دشواری بھی پیدا نہیں ہوتی تھی، اس لیے یہی شکل اختیار کی گئی۔

اب یہ حقیر کوشش ناظرین کی خدمت میں پیش ہے، اس سے حضرت الاستاذ کی سوانح نگاری کا پورا حق تو ادا نہیں ہوا لیکن اپنے مقدور بھر اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس آئینہ میں صاحب سوانح کا مرقع نظر آجائے، وماتوفیقی الا باللّٰہ۔

فقیر معین الدین احمد ندوی

۲۶ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۹۷۳ء

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

وطن، خاندان اور تعلیم

۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۷ء

وطن: صوبہ بہار میں عظیم آباد کا علاقہ ہمیشہ سے بڑا مردم خیز رہا ہے، اس کے نواح میں قدیم خاندانوں اور عالی نسب سادات و شیوخ کی بہت سی بستیاں ہیں، جن میں بڑے بڑے صاحب کمال پیدا ہوئے، انہیں میں پٹنہ سے سولہ میل اور بہار شریف سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم گاؤں دیسنہ ہے، اس میں سادات کرام کا ایک قدیم خاندان آباد ہے، ان کے مورث اعلیٰ مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ہم راہ ہندوستان آئے تھے، ان کی اولاد میں ایک بزرگ میر حسن عہد اکبری سے کچھ پہلے بہار تشریف لائے اور دیسنہ میں قیام کیا اور عہد اکبری کے مذہبی وسیاسی فتنہ دین الٰہی میں شہادت پائی، ان کے کئی صاحبزادے تھے، ان میں ایک صاحبزادے میر عثمان دیسنہ ہی میں مقیم رہے اور ان کے دوسرے بھائی

دوسری بستیوں میں آباد ہوگئے، سید عثمان کے اکلوتے لڑکے میر سلیمان تھے، ان کے دو صاحبزادے تھے، سید صدر الدین اور میر جان محمد سادات دیسنہ ان ہی کی اولاد سے ہیں، سید صدر الدین کو بادشاہ وقت نے ایک جاگیر دی تھی، جو ائمہ دیسنہ کے نام سے مشہور ہے، یہ جاگیر بہار میں زمین داری کے خاتمہ یعنی ۱۹۵۵ء تک سادات دیسنہ کی ملک میں تھی۔

نسب و خاندان: حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان سے تھے اور ان کو دادھیال اور ننہال دونوں جانب سے سیادت کا شرف حاصل تھا، باپ کی طرف سے رضوی اور ماں کی طرف سے زیدی تھے، آپ کا نسب نامہ سینتیس واسطوں سے حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے، پورا نسب نامہ یہ ہے:

سید سلیمان بن سید ابوالحسن بن میر محمدی بن میر عظمت علی بن میر وجیہ الدین بن میر سید عثمان ابن سید حسن شہید بن سید شمس الدین بن میر سید خلیل بن سید عرب ثانی بن سید مالک بن سید میر بن سید محمد ابن سید شمس محمد بن سید معین محمد بن سید میر محمد بن سید عرب اول بن سید برہان بن سید محمد میران بن سید احمد بن سید محمد بن سید یوسف بن سید اسحٰق بن امام جعفر صادق بن امام باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین بن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت نبی اکرم ﷺ، ننہالی شجرہ حضرت امام زید شہیدؒ سے ملتا ہے۔

سید صاحب کے ننہال اور دادیہال دونوں کا آبائی پیشہ طبابت تھا، کئی پشتوں تک نام ور اطبا ہوتے رہے، اطراف بہار میں یہ پہلا خاندان ہے جس میں طبابت کا سلسلہ مسلسل کئی پشتوں تک رہا، سید صاحب کے نانا حکیم سید حیدر حسن اور دادا سید محمد شیر عرف حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے نام ور طبیب تھے، میر محمدی پہلے بہار شریف اس کے بعد شیخ پورہ ضلع مونگیر میں مطب کرتے تھے اور یہاں کے رئیس نواب علی خاں کے یہاں بڑے اعزاز و وقار سے رہتے تھے، تقریباً چالیس سال تک خلق اللہ کی خدمت کرنے کے بعد ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی، وہ صاحب دل صوفی بھی تھے اور بہار شریف کی درگاہ منیر شریف کے سجادہ نشین

حضرت شاہ نور محمد سے بیعت تھے، اسی نسبت سے سہروردی مشائخ کے حال میں ایک رسالہ نور محمدی کے نام سے لکھا تھا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ طب میں دو کتابیں قرابادین محمدی جس کا تاریخی نام مخزن الحکمۃ العلیا ہے اور دستور العلاج یا اصول علاج لکھیں، یہ کتابیں اپنے صاحب زادے یعنی سید صاحب کے والد حکیم سید ابوالحسن صاحب کی تعلیم کے لیے لکھی تھیں، شاعری سے بھی ذوق تھا اور کبھی کبھی بزرگان دین کی منقبت میں قصائد اور اپنے خاندانی بزرگوں کی تاریخ وفات کہتے تھے، انہوں نے اپنا نسب نامہ بھی نظم کیا تھا۔

حکیم میر محمدی کے تین صاحب زادے تھے، ان میں سب سے بڑے حکیم سید ابوالحسن صاحب، سید صاحب کے والد ماجد تھے، وہ بھی اپنے اجداد کی طرح حاذق طبیب تھے اور اسلام پور ضلع پٹنہ میں مطب کرتے تھے، بڑے دین دار اور متقی تھے اور حضرت شاہ ولایت علی نقشبندی سے بیعت تھے، اس لیے اہل اسلام پوران کا بڑا احترام کرتے تھے مگر بیعت کے کچھ ہی دنوں کے بعد پیر کا انتقال ہوگیا، ان کے بعد حضرت شاہ علی حبیب صاحب پھلواروی کی جانب رجوع کیا اور ان سے باقی تربیت کی تکمیل کی۔

حکیم سید ابوالحسن کے دو صاحب زادے تھے، بڑے صاحب زادے حضرت سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابو حبیب اور دوسرے سید صاحب، مشہور مصنف اور اہل قلم مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم سید ابو حبیب کے صاحب زادے تھے، انہوں نے پٹنہ اور پھلواری شریف میں تحصیل علم کی اور شاہ ابواحمد صاحب بھوپالی کے مرید تھے، ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا۔

پیدائش: سید صاحب صفر ۱۳۰۲ھ مطابق نومبر ۱۸۸۴ء میں جمعہ کے دن پیدا ہوئے، ان کے دادا میر محمدی اس وقت حیات تھے، انہوں نے پوتے کی تاریخ ولادت کہی:

چو جستیم تاریخ او از خرد | یکا یک سروشے ز تاریخ وسال
بگفتا کہ بیدار شد مصرعہ | "شدہ مہر تاباں ز برج کمال"
۱۳۰۲ھ

یہ تاریخ ایسی مبارک ساعت میں کہی گئی تھی کہ اس کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور سید صاحب حقیقتاً برج کمال کے مہر تاباں بنے۔

ابتدائی تعلیم: اس زمانہ کے دستور کے مطابق گھر کے مکتب میں گاؤں کے ایک معلم سید مقصود علی اکھدوئی سے پائی، سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابو حبیب سید صاحب سے عمر میں ۱۸، ۱۹ سال بڑے تھے، سید صاحب کے آغاز تعلیم کے وقت تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور دیسنہ میں مطب شروع کیا تھا، والد اسلام پور میں رہتے تھے، اس لیے مکتبی تعلیم کے بعد سید صاحب نے بڑے بھائی سے پڑھنا شروع کیا اور فارسی کی درسیات اور عربی میں میزان، منشعب، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری اور شرح ملا جامی تک کی تعلیم بھائی سے حاصل کی۔

سید ابو حبیب نے حافظ عبد اللہ[۱] صاحب غازی پوری اور ان کے شاگرد مولانا شاہ نعمت علی پھلواروی[۲] سے تعلیم پائی، اس لیے ان پر توحید و سنت اور اتباع سنت کا بڑا غلبہ تھا، اس زمانہ میں پورے ملک کی طرح دیسنہ کی عورتوں میں بھی بدعتیں رائج تھیں، سید ابو حبیب صاحب ان کی اصلاح کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ وعظ کہتے تھے، سید صاحب اس زمانہ میں کم عمر تھے، اس لیے ان کے بھائی عورتوں کے مجمع میں ان سے تقویۃ الایمان مؤلفہ مولانا اسماعیل شہیدؒ پڑھواتے تھے اور خود پردہ کی آڑ میں بیٹھ کر اس کا مطلب سمجھاتے تھے، اس طرح ابتدا ہی سے سید صاحب کے دل پر کتاب و سنت اور صحیح اسلامی عقائد کا نقش بیٹھ گیا، جس کو آئندہ حالات کی کوئی رو مٹا نہ سکی، وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] حافظ عبد اللہ غازی پوری، مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے ارشد تلامذہ میں اور اہل حدیث کے بڑے نام ور اور اپنے دور کے نام ور اساتذہ میں تھے، چشمۂ رحمت غازی پور میں عرصہ تک مدرس رہے، ان کے دامن سے بہت سے علما تعلیم پا کر نکلے، نومبر ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔ [۲] شاہ نعمت علی صاحب خاندان پھلواری سے تھے، مگر مولانا عبد اللہ غازی پوری اور مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے اثر سے اہل حدیث ہو گئے تھے۔ ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی۔

''یہ (تقویۃ الایمان) پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسوں آندھیاں آئیں کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے، مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکی علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں کے سامنے سے گزرے مگر اسماعیل شہید کی تلقین اپنی جگہ پر قائم رہی۔'' (میری محسن کتابیں)

اسی زمانہ کا ایک واقعہ جو سید صاحب کے ماموں زاد بھائی اور ہم سن و ہم سبق مولوی نجم الہدیٰ صاحب[1] کی زبانی منقول ہے، قابل ذکر ہے، ان کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں دیسنہ میں محرم کی بہت سی بدعتیں رائج تھیں، سادات دیسنہ تعزیہ داری کرتے تھے، ہم دونوں (یعنی وہ اور سید صاحب) میں مولوی ابوحبیب کی تعلیم و تلقین اور تقویۃ الایمان کے اثر سے اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ دونوں نے مل کر محرم کی بدعات کے خلاف ایک تحریر لکھی اور اس کو ایک لڑکے کے ہاتھ خاندان کے ایک بزرگ کے پاس بھجوا دیا، اس سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، یہ تحریر سید نجم الہدیٰ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس لیے سارا نزلہ ان ہی پر گرا اور اس کی یہ سزا ملی کہ پچیس مرتبہ کان پکڑ کر اٹھائے بٹھائے گئے اور سید صاحب صاف بچ گئے۔

اسی زمانہ میں سید صاحب نے کچھ دنوں تک اپنے ایک عزیز مولانا بشارت کریم سے جو استھانواں میں رہتے تھے، چند اسباق پڑھے۔

سید صاحب فطرۃً سنجیدہ، متین، خاموش اور کم آمیز تھے، اس لیے بچپن میں بھی ساتھیوں سے زیادہ بے تکلف نہ تھے اور ان کے کھیلوں میں بہت کم شریک ہوتے تھے، البتہ

---

[1] مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی سید صاحب کے حقیقی ماموں زاد بھائی، ان کے ہم سن اور ہم سبق ہیں، ابتدائی تعلیم سے لے کر ندوہ کی تعلیم سے فراغت تک ان کے ساتھ رہے، سید صاحب کے ابتدائی حالات کا جاننے والا ان سے زیادہ کوئی نہیں، اس کتاب میں ان کے بیانات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، اب تک بفضلہ بقید حیات ہیں لیکن بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور خانہ نشین ہیں۔

کبڈی شوق سے کھیلتے تھے اور بیت بازی سے دل چسپی تھی اور اس میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے، اس لیے اسی زمانہ سے ان کو اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار یاد تھے اور اسی سے ان کے ذوق شعری کی بنیاد پڑی۔

۱۸۹۸ء میں مولوی سید ابو حبیب صاحب حج کو چلے گئے، اس لیے دیسنہ میں ان کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ اپنے والد بزرگ وار کے پاس اسلام پور چلے گئے، مگر یہاں ان کا قیام صرف چند مہینہ رہا، اس زمانہ میں پھلواری شریف سلوک وطریقت، ارشاد و ہدایت کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی مرکز تھا، اس کے علاوہ سید صاحب کے والد حکیم سید ابوالحسن صاحب خانقاہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین شاہ علی حبیب[۱] نصر کے مرید اور خلیفہ تھے اور خانقاہ پھلواری سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، اس تعلق کی بنا پر انہوں نے سید صاحب کو حصول تعلیم کے لیے پھلواری بھیج دیا، یہاں انہوں نے مولانا شاہ محی الدین صاحب[۲] پھلواری سے جو اس زمانہ میں نئے نئے فارغ ہوئے تھے اور حدیث کا دورہ کر رہے تھے، ہدایہ اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاکوی سے شرح تہذیب پڑھی، پھلواری کے زمانہ قیام میں سید صاحب کا زیادہ تعلق مولانا شاہ محی الدین صاحب سے رہا اور ان کا زیادہ وقت ان ہی کی صحبت میں گزرتا تھا، پھلواری میں قوالی کے اثر سے شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا، سید صاحب کو اس کا چسکہ بیت بازی کے ذریعہ پڑ چکا تھا، قوالی کی محفلوں نے اس ذوق کو اور بڑھایا، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعروشاعری کا خاصہ چرچا تھا، اسی فضا میں میں نے سانس لی اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا پڑھا اور جب کتاب ختم کی تو خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔'' (معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۶۰)

۱؎ شاہ علی حبیب نصر خانقاہ پھلواری کے ممتاز سجادہ نشینوں میں اور جامع بین الشریعت والطریقت بزرگ تھے، ان کے زمانہ میں خانقاہ پھلواری طالبین سلوک وطریقت کا مرجع تھی، ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ ۲؎ مولانا شاہ محی الدین صاحب سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف اور امیر شریعت اول بہار۔

اسی زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلما کی اصلاحی تحریک کے اثر سے حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ایک خلیفہ مولانا شاہ منور علی نے دربھنگہ میں ندوۃ العلما کے نمونہ پر ایک مدرسہ امدادیہ قائم کیا تھا، سید صاحب کے بعض اعزہ دربھنگہ میں رہتے تھے، وہ اس مدرسہ کے بڑے مداح تھے، اس لیے پھلواری میں ایک سال قیام کے بعد ۱۸۹۹ء میں سید صاحب مدرسہ امدادیہ میں بھیج دیے گئے، یہاں انہوں نے مولوی مرتضیٰ حسین صاحب دیوبندی سے ہدایہ اور مولوی فدا حسین صاحب آروی سے شرح تہذیب جس کا درس پھلواری سے جاری تھا، پڑھیں۔

اس مدرسہ میں طلبہ کی تقریر اور تحریر کے لیے ایک انجمن تھی، جس میں وہ تقریر کرتے اور مضامین پڑھتے تھے، یہ عربی مدارس کے بالکل نئی چیز تھی، سید صاحب بھی اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، چنانچہ انہوں نے تعلیم نسواں اور وقت کی قدر و قیمت کے عنوان سے دو مضامین پڑھے، جو بہت پسند کیے گئے، تعلیم نسواں کا مضمون اخبار الپنچ پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔

پٹنہ میں ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس: اس زمانہ میں مجلس ندوۃ العلما کی تحریک شباب[1]

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ اور انگریزی حکومت کے قیام کے بعد پرانی بساط اٹھ رہی تھی اور نئی بساط جم رہی تھی اور اس کے مظاہر زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھے، علما اور تعلیم بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے، پرانے مدارس ختم اور ان کی جگہ جدید تعلیم کے اسکول اور کالج قائم ہو رہے تھے اور مسلمان لڑکے پرانے مدارس کو چھوڑ کر اسکولوں اور کالجوں کی طرف کھنچ رہے تھے، عیسائی مشنریوں کا جال پورے ہندوستان میں بچھا ہوا تھا، ان میں اور مسلمانوں میں مناظرہ کا بازار گرم تھا، عیسائیت آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح امنڈتے چلے آرہے تھے، نئی تہذیب کی آب و تاب نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا اور وہ بڑی تیزی سے پرانی تہذیب کی جگہ لے رہی تھیں، اس وقت تک مسلمانوں کی قیادت علما کے ہاتھوں میں تھی، ان کا یہ حال تھا کہ عام علما زیادہ تر درس و تدریس میں مصروف اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے ہوئے تھے، خواص تقلید و عدم تقلید قرأت فاتحہ، خلف الامام آمین بالجہر اور رفع یدین کے جھگڑوں میں ایسے مبتلا تھے کہ مناظرہ سے گزر کر جنگ و جدال (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳ پر)

پر تھی، مختلف شہروں میں اس کے سالانہ جلسے ہوتے تھے، ۱۸۹۹ء میں پٹنہ میں اجلاس ہوا، جو ندوۃ العلما کی تاریخ میں نہایت عظیم الشان اجلاس تھا، اس میں سید صاحب کے والدان کے اعزہ اور وہ خود بھی دربھنگہ سے آکر شریک ہوئے تھے اور یہ سب اتنے متاثر ہوئے کہ اس جلسہ کی شرکت سید صاحب کے ندوہ میں داخلہ کا ذریعہ بن گئی، اس کی روداد اور اس جلسہ کی عظمت وشان خود سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ ہو:

(بقیہ حاشیہ صفحہ۱۲) تک نوبت پہنچ گئی تھی، خدا کے گھر کشتی کا اکھاڑا اور لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق علما کا محبوب مشغلہ تھا، مدرسہ کا پرانا نصاب اور فرسودہ طریقہ تعلیم بالکل ناکارہ ہو چکا تھا اور ایسے علما پیدا کرنے سے قاصر تھا جو نئے حالات میں صحیح رہنمائی کر سکے اور یہ خطرہ بالکل سامنے آگیا تھا کہ اگر ان نئے حالات کا مقابلہ نہ کیا گیا تو جدید علوم اور مغربی تہذیب کا سیلاب مسلمانوں کو بہا لے جائے گا۔

گو عام علما ان خطرات اور نئے اور حالات اور ان کی ضروریات سے بے خبر تھے لیکن صاحب نظر طبقہ کو اس کا پورا احساس تھا، اس طبقہ کے ہراول مولانا شبلیؒ تھے، ان کو اس کا شدت سے احساس تھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور کی دستار بندی کے موقع پر جب کہ ہندوستان کے چوٹی کے علما کا اجتماع تھا، ان حالات پر غور کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے ندوۃ العلما کے نام سے ایک مجلس قائم ہوئی اور مولانا محمد علی مونگیری اس کے ناظم مقرر ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام ہی میں اس مجلس کا پہلا جلسہ ہوا جس میں ہر مسلک ومشرب کے علما نے شرکت کی، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھ، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عبداللہ صاحب انصاری، مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا غلام الحسنین کنتوری۔

اس جلسہ میں باقاعدہ مجلس ندوۃ العلما کا آئین مرتب کیا گیا، ندوۃ العلما کا تخیل اور اس کی تحریک مولانا شبلیؒ کے دل کی آواز تھی، اس لیے وہ اس میں بہت پیش پیش ہو گئے مجلس ندوۃ العلما کے قیام کے بعد مختلف شہروں میں اس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے، جس میں اس زمانہ کے اکثر مشاہیر علما شریک ہوتے تھے، (بقیہ حاشیہ صفحہ۱۴ پر)

"۱۹۰۰ء پورا ہو رہا تھا کہ اس مجلس (ندوۃ العلما) کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا، یہ جلسہ کیا تھا جوش وخروش کا ایک سمندر تھا، یہ پہلا موقع تھا جب عمامے اور ہیٹ یک جا ہوئے، علما اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھ کر قوم وملت کی چارہ نوازی کی فکریں کیں، میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا، میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا، میں نے اس جلسہ میں یہ پر اثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے، جو خود بھی رو رہے تھے اور بڑے بڑے جبہ ودستار والے علماو مشائخ کو بھی رلا رہے تھے، اس جلسہ میں سب سے پہلے نے اس سلسلہ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ عبد القادر لاہوری کو دیکھا، اس وقت وہ آبزرور کے ایڈیٹر تھے، وہ اپنی اس تقریر کی تمہید میں ٹرانسوال میں بوکروں کی لڑائی کی مختلف خبریں جو اس وقت آ رہی تھیں، دل چسپ انداز میں اس کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے تھے کہ اخبار نویسوں کی بات پر اعتبار کیوں کر کیا جائے، اس تمہید کے بعد انہوں نے کہا کہ میں بھی اخبار نویس ہوں، اگر تم سے یہ کہوں کہ تمہارے بزرگوں کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریوں میں بند پڑی ہے مگر تم کو اس کی خبر نہیں تو تم کو بھی اس بات کا کیوں کر یقین آئے گا، یہ کہہ کر انہوں نے ندوۃ العلما کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی، ان کی تقریر ایسی دل چسپ تھی جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا اور دل میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) مولانا شبلیؒ پابندی سے شرکت کرتے تھے اور علما وتعلیم کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کے متعلق اپنے خیالات اور تجویزیں پیش کرتے۔

۱۸۹۶ء میں بانس بریلی کے اجلاس میں مجلس ندوۃ العلما کے تخیل کے مطابق ایک درس گاہ کے قیام کی تجویز منظور ہوئی اور ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلما کے نام سے یہ درس گاہ قائم ہوگئی، مولانا محمد علی مونگیری مرحوم جو مجلس ندوۃ العلما کے ناظم تھے، اس کے ناظم اور مولانا سید عبد الحئی مرحوم مددگار ناظم مقرر ہوئے۔[1]

(حضرت الاستاذؒ نے حیات شبلی میں ندوۃ العلما کے قیام کی مفصل تاریخ لکھی ہے، ہم نے بقدر ضرورت اوپر اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔)

ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس کی مشق بعد کو ہوئی، جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے پروبال پیدا کیے اور میں اڑ کر لکھنؤ پہنچا اور ندوۃ العلما کی درس گاہ میں داخل ہو گیا، یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علما کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا، یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا اور کانوں نے سب کچھ سنا۔'' (معارف، جولائی ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶، ۷)

دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ: اس وقت سارا ہندوستان ندوۃ العلما کی تحریک سے گونج رہا تھا، اصلاح پسندوں کا پورا طبقہ اس کی جانب رجوع تھا اور طلبہ دور دور سے کھنچ کھنچ کر ندوۃ العلما میں آرہے تھے، سید صاحب کے بعض اعزہ پہلے سے اس تحریک میں شریک تھے، پھر ندوہ کے اجلاس میں خود سید صاحب کی شرکت اور ندوہ کے اثرات کے مشاہدہ نے ان کے دل میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ کا جذبہ پیدا کر دیا، چنانچہ ۱۹۰۱ء کے آغاز میں وہ اور ان کے پرانے ہم سن و ہم سبق مولوی نجم الہدیٰ صاحب ندوۃ العلما کے درجہ ابتدائی سال دوم میں داخل ہوئے، اس میں صرف ونحو، فقہ وفرائض اور منطق وحساب کی تعلیم ہوتی تھی، اس زمانہ میں مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی صدر مدرس اور مفتی عبداللطیف صاحب اور مولانا حفیظ اللہ صاحب بڑے اساتذہ میں تھے[1]۔

---

[1] یہ تینوں اپنے دور کے مشہور عالم اور نام ور اساتذہ میں تھے۔

مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی قصبہ چریا کوٹ ضلع اعظم گڑھ کے ایک قدیم اور تاریخی عباسی خاندان سے تھے، مولانا فاروق اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول دونوں بڑے نام ور عالم اور جملہ علوم میں یگانہ تھے، مولانا عنایت رسول سرسید کے بعض علمی کاموں میں ان کے دست راست تھے، مولانا فاروق صاحب نے اپنے بڑے بھائی مولانا رحمت اللہ صاحب بانی مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور، مفتی محمد یوسف صاحب اور ملا نعمت اللہ فرنگی محلی سے تحصیل علم کی تھی، ان کو جملہ علوم معقول ومنقول پر عبور تھا، خصوصاً ادب اور معقولات کے امام تھے، فن موسیقی میں بھی ان کو دسترس حاصل تھا، وہ مختلف مدرسوں میں مدرس رہے، ۱۳۱۷ء میں جب ندوۃ العلما قائم ہوا تو مولانا فاروق صاحب اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے، جب ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلیؒ دارالعلوم کے معتمد (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ پر)

جماعت دوم میں بہت سے طالب علم تھے، جن میں مولوی ظہور احمد وحشی شاہ جہاں پوری سب میں ممتاز تھے، اس درجہ میں حساب بھی تھا، جس سے سید صاحب کو دل چسپی نہ تھی، اسی بنا پر وہ فرائض سے بھی گھبراتے تھے، اس لیے ان کا شمار معمولی طلبہ میں رہا، ان کی بڑی کام یابی یہی تھی کہ درجہ دوم پاس کرلیا اور درجہ سوم میں آئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) مقرر ہوئے تو مولانا فاروق صاحب نے ترک ملازمت کر کے بلیا میں وکالت شروع کی، ۱۹۰۹ء میں مولانا شبلیؒ نے پھر ان کو دارالعلوم میں بلالیا مگر اس مرتبہ تھوڑے ہی دن رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۰۹ میں غازی پور میں انتقال ہوگیا، مولانا فاروق صاحب کو عربی کے علاوہ فارسی نظم ونثر میں بھی کمال حاصل تھا۔

مفتی عبداللطیف صاحب وطن قصبہ سنبھل ضلع مراد آباد ہے، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے ارشد تلامذہ میں تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد ندوہ میں مفتی اور پھر ۱۳۱۶ھ میں اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے، ۱۹۰۳ء میں ندوہ چھوڑ کر مولانا محمد علیؒ کے پاس مونگیر چلے گئے اور خانقاہ رحمانی میں تالیف وتصنیف کی خدمت انجام دیتے رہے، ۱۹۱۷ء میں جب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی حیدر آباد میں صدرالصدور امور مذہبی اور جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو انہوں نے مفتی صاحب کو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کا پروفیسر مقرر کیا، پھر اس کے صدر ہوگئے، پنشن ملنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف مرحوم کی جگہ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر مقرر ہوئے، چند دنوں کے بعد ضعف پیری کی وجہ سے اس سے بھی الگ ہوگئے، مفتی صاحب مصنف بھی تھے، تاریخ القرآن اور سیرت امام ابوحنیفہ ان کی یادگار ہیں، ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا۔

مولانا حفیظ اللہ صاحب اعظم گڑھ میں ایک موضع بندی گھاٹ مولانا کا وطن ہے، غدر ۱۸۵۷ء سے چھ مہینہ پہلے پیدا ہوئے، فارسی کی تعلیم چشمہ رحمت غازی پور میں پائی اور عربی کی تحصیل مولانا سلامت اللہ صاحب جیراج پوری، مولانا غلام جیلانی شاگرد مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی سے اور تکمیل مولانا عبدالحیٔ مرحوم سے کی، معقولات اور ریاضیات میں خاص طور سے کمال حاصل تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں کاکوری کے مدرسہ میں مدرس رہے، پھر مدرسہ عالیہ رام پور چلے گئے اور اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے، یہاں مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی سے ان کے مناظرے رہے، رام پور کے بعد ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما کے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷ پر)

علمی و تعلیمی انہماک: سید صاحب کو جلسہ کے مشاغل اور مرغوبات سے بہت کم دل چسپی تھی، کھیل کود میں کم حصہ لیتے تھے، کم آمیز تھے اور ان کا سارا وقت درس و مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، ان کے رفیق قدیم مولانا عبدالباری صاحب لکھتے ہیں:

''علمی ذوق وشوق کی عام فضا ندوہ میں استاد محترم (مولانا شبلیؒ) کے دور میں پیدا ہوئی لیکن سید صاحبؒ جہاں تک دیکھا اور سنا اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود میں نمایاں شرکت تو قطعاً یاد نہیں آتی، نہ میل جول اور سیر و تفریح کی زیادہ عادت تھی، یہی رنگ طبیعت آخر تک رہا کہ خاص تعلق کے لوگوں تک بھی ''ولے برندش'' ہی پہنچ پاتے، گویا یکسوئی ان کا طبعی امر تھا، جو علم و عمل کی ہر راہ میں کسب کمال کی شرط ہے۔''

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''سید صاحبؒ کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھتے اور کتب بینی کرتے اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ پایا، ہر طرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے ہیں، طلسم ہوش ربا تک کو اسی توجہ سے پڑھا تھا، چندہ کے ایک وفد میں ساتھ تھا، یاد نہیں کہ کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالباً پانی بھی برس رہا تھا، اس عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سناتے جاتے تھے جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں، پورا راستہ تفریحی بن گیا، شاگردی کی سعادت ہونے کے بعد حاضری زیادہ ہونے لگی، جب حاضر ہوتا کچھ نہ کچھ پڑھتے ہی لکھتے، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار یا رسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آ گئی تو اسی وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) صدر مدرس مقرر ہوئے، ۱۹۰۸ء کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، گورنمنٹ نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا، ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ سے پنشن لے کر حج کو گئے، واپسی میں ندوہ کے ارکان کے اصرار سے پھر اس کی صدر مدرسی قبول کی، راقم الحروف نے اسی زمانہ میں مولانا سے تصریح اور بخاری شریف پڑھی تھی، ۱۹۳۰ء میں سبک دوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے، بڑے دین دار اور متقی تھے، ۱۳۶۲ھ میں وفات پائی، ہیئت کی درسی کتاب تصریح پر حاشیہ ان کی یادگار ہے۔

اٹھا کر دیکھنے لگے، ذرا بھی کوئی بات دل چسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ خالی وقت گزاری کے طور پر نہیں بلکہ توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں، طبیعت بہت اخاذ پائی تھی، ہر ادنیٰ اعلیٰ کتاب، رسالہ اور کہہ دمہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کرتے اور حسب موقع کام لیتے۔" (معارف، سلیمان نمبر، ص ۸۲و۸۳)

عرفی طالب علمی سے لے کر شہرت وعظمت کے اوج کمال تک اشخاص وکتابوں دونوں سے کھلے دل ودماغ کے ساتھ اخذ واستفادہ کیا، یہی کمال کہنا چاہیے کہ ان کو زندگی بھر لفظاً ومعناً سچا طالب علم بنائے رہا، ان کے گوناگوں کمالات میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے کام لینے کو دخل رہا، فطری ذہانت وذکاوت طباعی وجودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے، ندوہ میں سید صاحبؒ سے پہلے خود ان کے ساتھ اور ان کے بعد ایک سے ایک بڑھ کر ذہین وطباع طلبہ داخل ہوتے رہے لیکن سید سلیمان ندویؒ بننے میں سب سے پیچھے رہے، ان کے کسب وطلب کا کمال یہی تھا، ان کے طالب علمانہ، عالمانہ زندگی وسیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے۔" (معارف، سلیمان نمبر، ص ۸۳)

حسن اتفاق سے اس ذوق وشوق کے ساتھ سید صاحب کو استاد بھی مولانا فاروق جیسا امام فن ملا، گو ان کے اور اساتذہ بھی تھے لیکن سید صاحب نے ابتدا میں سب سے زیادہ فائدہ مولانا فاروق صاحب ہی سے اٹھایا اور ان ہی کے دامن فیض میں ان کی آنکھیں کھلیں، جیسا کہ وہ خود اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے استفادہ: یہاں (ندوہ) میں ہندوستان کی مشہور ہستی صدر مدرس یعنی مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کی تھی، یہ اپنے زمانہ میں ادب ومعقولات کے امام تھے، ان کی خاص چیز ان کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور پر پڑھاتے تھے اور اس کی مشق کراتے تھے، صرف ونحو، ادب وعروض، منطق وفلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا، دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں

کے پابند نہ تھے، یعنی کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پالیتا تھا، ان کے طرزِ تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلیؒ جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا، بہرحال ان کے طرزِ تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کردی کہ آنکھوں کے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہ آتے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے، یہ پہلی شخصیت تھی جس نے میرے دل ودماغ پر اثر ڈالا۔ (معارف، جولائی ۱۹۵۰ء)

ادب سے سید صاحب کو خاص دل چسپی تھی، ان کے ذوق وشوق اور مولانا فاروق صاحب جیسے یگانہ فن استاد کے درس سے سید صاحب کی استعداد بڑھنے لگی، وہ درس کے علاوہ خارج اوقات میں بھی مولانا فاروق سے استفادہ کرتے تھے، وہ ادب کے جو نکتے بیان فرماتے، سید صاحب ان کو کاپی میں نوٹ کرکے ذہن نشین کرتے، ان کی صحبت میں ادبی مسائل پر جو گفتگو ہوتی اس کو دماغ میں محفوظ رکھتے تھے، مولانا شبلیؒ مرحوم نے سفرنامہ مصروشام کے آخر میں عربی کے نئے الفاظ کی جو فہرست دی ہے، ان کو زبانی یاد کرلیا تھا، دارالاخبار میں عربی کے جو اخبارات اور رسالے آتے تھے، ان کا پابندی سے مطالعہ کرتے تھے، ان کا ذوق دیکھ کر مولانا فاروق بھی ان کی جانب خاص توجہ کرتے تھے اور ان کی افتادِ طبیعت کی بنا پر قیس لقب دیا تھا، اس لیے چند ہی دنوں میں سید صاحب کا شمار ممتاز طلبا میں ہونے لگا۔

مضمون نگاری کا آغاز: تعلیم ودرس کے ساتھ علم وادب کے ہر شعبہ کے ساتھ ان کو یکساں دل چسپی تھی، طلبہ کی انجمن دارالمکالمہ میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اکثر اردو میں اور کبھی کبھی عربی میں تقریر کرتے تھے، مضمون نگاری کی مشق بھی جاری تھی، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ایک مضمون ''علم اور اسلام'' کے عنوان سے اپنے وطن دیسنہ کی انجمن الاصلاح میں پڑھا، جو بہت پسند کیا گیا اور علی گڑھ منتھلی میں چھپا، اس کے بعد جب ۱۹۰۴ء میں الندوہ نکلا تو مضمون نگاری کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا اور مولانا عبدالحیٔ صاحب مرحوم ناظم

ندوۃ العلما کی فرمائش پر الندوہ کے لیے دو مضمون ایک علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھا، ان میں پہلا مضمون الندوہ میں شائع ہوا۔ (معارف، جولائی، ۱۹۵۰ء)

لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ میں آزاد اخبار کے نام سے خبروں کا ایک ضمیمہ الگ ہوتا تھا، سید صاحب کبھی کبھی اس کے لیے عربی اخبارات سے ترجمہ کر کے دیتے تھے۔

شعر و ادب سے دل چسپی: شعر و سخن کا ذوق شروع سے تھا، لکھنؤ کی شعر پرور فضا میں اس میں اور ترقی ہوئی، خود ندوہ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، طلبہ مشاعرے کرتے تھے، اس دور کے شاعر طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا، مولوی ظہور احمد وحشی شاہجہاں پوری، مولوی عبدالغفور شرر، مولانا عبدالسلام شمیم خاص طور سے قابل ذکر ہیں، سید صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور غزلیں بھی پڑھتے تھے، کبھی کبھی یہ شوق کھینچ کر شہر کے مشاعروں میں بھی لے جاتا تھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا، سید صاحب بھی اس سے متاثر تھے، ان کا دیوان مرأۃ الغیب اکثر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا اور یہ تاثر آئندہ چل کر بھی قائم رہا، اس زمانہ کا ایک شعر یادگار ہے:

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی   حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

کبھی کبھی نظم بھی کہتے تھے، چنانچہ اسی زمانہ میں انجمن الاصلاح دیسنہ کے جلسہ میں ایک اصلاحی ترکیب بند پڑھا تھا، غرض چند ہی سال میں درس و تعلیم، تحریر و تقریر اور شعر و ادب ہر چیز میں سید صاحب نمایاں ہوگئے اور طلبہ کی مختلف انجمنوں کے ناظم مقرر ہوئے۔

عربی میں قصیدہ: اس زمانہ کے اکابر اکثر دارالعلوم کے معائنہ اور یہاں کی تعلیم کا مشاہدہ کرنے کے لیے آیا کرتے تھے، ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک تشریف لائے اور طلبہ کا امتحان لیا، ان سے عربی کے اخبارات پڑھوا کر سنے، اس امتحان میں سید صاحب اول آئے، انہوں نے نواب صاحب کی شان میں ایک عربی قصیدہ کہہ کر سنایا، جس کو سن کر نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے جو ان دنوں

ندوہ میں مقیم تھے، اس واقعہ کا ذکر اخبارات میں کیا اور لکھا کہ ان شاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان سرزمین ہند میں علم ودین کی خدمت کے لیے موجود رہے گا۔

ندوہ میں مولانا شبلی کی آمد: مولانا شبلی مرحوم کو ابتدا سے ندوہ سے جو دل چسپی تھی، اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ندوہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی یہ دل چسپی برابر بڑھتی گئی اور وہ عرصہ سے اس کی مستقل خدمت کے لیے لکھنؤ آنا چاہتے تھے، چنانچہ اسی نیت سے انہوں نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا، ۱۹۰۲ء کے ایک خط میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں کہ:

''صرف ندوہ کے لیے میں نے کالج کو چھوڑا تھا، گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نہ مل سکا۔'' (مکاتیب شبلی)

لیکن کالج سے علاحدگی کے بعد ایسے حالات پیش آتے گئے کہ ان کا ارادہ پورا نہ ہو سکا، کئی سال تک مختلف مقامات پر مختلف کاموں میں مشغول رہے، بیماری کا سلسلہ بھی مسلسل قائم رہا۔

۱۹۰۱ء میں سررشتۂ علوم وفنون حیدر آباد کے ناظم مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۴ء کے آخر تک اس عہدہ پر رہے، مگر جہاں بھی اور جس حال میں بھی رہے، ندوہ کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی، اس کی اصلاح وترقی کی تدبیر سے غافل نہ رہے، اس کے سالانہ جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور ندوہ کی اصلاح وترقی کی تجویزیں پیش کرتے تھے، ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں جو امرتسر میں ہوا تھا اور بعض حیثیتوں سے نہایت اہم تھا، حیدر آباد سے امرتسر آئے، اسی اجلاس میں انہوں نے اپنا وہ مشہور ترکیب بند پڑھا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

اے کہ پرسی چہ کسانیم وچہ ساماں داریم ۔۔۔ انچہ با ہیچ نیز زد بجہاں آں داریم

اسی جلسہ میں اصلاح نصاب کا معرکۃ الآرا مسئلہ پیش ہوا اور بڑے بحث ومباحثہ کے بعد اصلاح نصاب کے متعلق مولانا شبلی کی تجویز منظور ہوئی، مگر ندوہ میں اس وقت زیادہ تر

پرانے نصاب کے حامی تھے، اس لیے عرصہ تک اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا، امرتسر کے اجلاس کی واپسی میں مولانا شبلی ندوہ تشریف لائے اور ہونے والے جانشین شبلی نے پہلی مرتبہ استاد کو دیکھا، چنانچہ حیات شبلی میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ ۱۹۰۲ء پہلا موقع ہے میرے ہوش و حواس کے کانوں نے مولانا شبلی کا آوازہ سنا، امرتسر سے جب واپس ہوئے تو لکھنؤ ٹھہرے اور میں نے سب سے پہلی مرتبہ ان کی زیارت کی۔''

(حیات شبلی، ص ۳۹۰)

ابھی دارالعلوم ندوۃ العلما کی ترقی کا آغاز تھا کہ ارکان میں باہم اختلاف شروع ہو گیا، کچھ لوگوں کو مولانا شبلیؒ سے بھی بدگمانی تھی، مولانا سید محمد علی مونگیری علاحدہ ندوہ کی خدمت سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے اور یوں بھی کئی سال سے سفر حج میں رہتے تھے، اس لیے مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہ جہاں پوری قائم مقام ناظم مقرر ہوئے اور ندوہ کا دفتر شاہ جہاں پور منتقل ہو گیا، ان حالات نے ندوہ میں بڑا انتشار پیدا کر دیا اور ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہونے لگی جس کو ندوہ کی لگن ہو اور وہ یہاں رہ کر اس کی نگرانی کر سکے، مولانا شبلیؒ کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں نظر آتی تھی، چنانچہ مارچ ۱۹۰۳ء کے جلسہ انتظامیہ میں ارکان نے طے کیا کہ مولانا شبلیؒ سے درخواست کی جائے کہ وہ ندوہ کی نگرانی کے لیے لکھنؤ آ کر قیام کریں، مگر اس وقت کچھ ایسی مجبوریاں تھیں کہ دلی تمنا کے باوجود مولانا اس وقت اس درخواست کو قبول نہ کر سکے۔

جنوری ۱۹۰۴ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ مدراس میں ہوا، اس میں مولانا شبلیؒ نے بھی شرکت کی، ان کی شرکت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا محمد علی ناظم ندوۃ العلما اور مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم سے زبانی گفتگو کے بعد باہم جو غلط فہمیاں تھیں وہ دور ہو گئیں اور اصلاح نصاب کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی، جس کے ایک رکن مولانا شبلیؒ تھے اور دارالعلوم کے رسالہ الندوہ میں بھی بہ حیثیت ایڈیٹر کے ان کا نام شامل کیا گیا، اس کے

بعد مولانا شبلیؒ نے یہ طے کیا کہ دار العلوم میں نیا نصاب جاری کیا جائے اور خود جا کر دار العلوم کی خرابیوں کو دیکھیں اور اس کی اصلاح کی تدبیروں پر غور کریں، چنانچہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں وہ حیدر آباد سے لکھنؤ آئے اور دو تین ہفتہ دار العلوم ندوۃ العلما میں قیام کیا۔

استاد و شاگرد میں پہلی ملاقات: اس قیام میں ہونے والے استاد و شاگرد کی پہلی ملاقات ہوئی اور استاد نے جوہر قابل کو پرکھا، حیات شبلیؒ میں فرماتے ہیں یہ پہلا موقع تھا کہ خاکسار اور مولوی ضیاالحسن صاحب علوی جو دار العلوم میں زیر تعلیم تھے، مولانا کے حلقہ میں بیٹھے اور مولانا نے اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازا، مولوی محمد امین صاحب خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی بھی ان دنوں اپنے والد بزرگ وار کے ساتھ ندوہ میں ٹھہرے تھے، وہ بھی حاضر رہتے تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے مولانا سے مجھے روشناس کرایا، نومبر کے آخر میں وہ حیدر آباد واپس گئے تو میرے ایک عزیز نے میری صلاحیت کی نسبت ان سے دریافت کیا، اس کے جواب میں ۲۷رنومبر ۱۹۰۴ء کو وہ فقرہ لکھا جو میرے لیے ہمیشہ طغرائے فخر ہے:

> ''ملازمت نے مجھ کو حیدر آباد آنے پر مجبور کیا، مولوی سید سلیمان چندروز میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہر قابل ہیں۔'' (حیات شبلی، ص ۴۰۰)

اس قیام کے بعد مولانا شبلیؒ نے حیدر آباد سے قطع تعلق کر کے ندوہ میں مستقل قیام کا عزم کر لیا اور فروری ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد کی ملازمت سے استعفا دے کر وطن آ گئے۔

مولانا شبلیؒ کی شان میں سید صاحب کا فارسی قصیدہ: مولانا کی تشریف آوری اور ندوہ میں مستقل قیام کی خبر سے دار العلوم کے طلبہ میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہوں نے مختلف طریقوں سے اپنی مسرت کا اظہار کیا، سید صاحب نے مولانا کے خیر مقدم میں حسب ذیل قصیدہ کہا:

بدہ ساقی مئے کو بفکند جلباب ظلمانی　　خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

مئے کز جرعہ اش رونق فزاید لفظ و معنی را | دہد تیغ زباں را جوہر تیغ صفاہانی
مپرس افسانۂ دارا و اسکندر کہ می بافند | مپرس از دفتر پاریں حکمت ہائے یونانی
خرد گم کردہ راہست اندریں راہے کہ می پویم | فلاطونی دریں کشور نباشد جز بنادانی
فسوں سازی چشم نرگسیں دل را نمی بازد | کہ مسحورم بہ سحر کلک و جادوئے سخن دانی
نہ دارم گوش بر ایں نغمہ سنجیہائے داؤدی | کہ گوشم ہست بر آواز مرغ باغ یزدانی
فدائی آں حدیث روح پرور باد ہر جانے | کہ جان نو دمد در مردہ دل چوں آب حیوانی
خدیو کشور معنی کہ فرمانش برد دلہا | چہ دلہا سکہ بر جاں زد چہ بر قاصی چہ بردانی
بیا اے قصۂ خوان جاہ آفریدون و کیخسرو | بہ بیں اینجا کہ درویشے کند در فقر سلطانی
نہ ایوانے نہ دربانے نہ دیہیمے نہ اورنگے | نمی دارد بدستش ہیچ اسباب جہاں بانی
وثاقش سجدہ گاہ قصر و ایوان شہنشاہی | بساطش بوسہ گاہ دانش آموزاں یونانی
کہن دستار او بالاتر از اکلیل سلطانی | حصیر کلبہ اش بہتر ز اورنگ سلیمانی
عصائے موسوی کلکش ید بیضاست قرطاسش | سطور صفحہ اش چوں جعد بر رخسار نورانی
صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشن حکمت | مدادش از پے چشم ورق کحل صفاہانی
سخن گوید لبش یا گوہر شہوار می بارد | چنیں گوہر نہ زنہار آفریدست ابر نیسانی
گراں تو چند اوراقش بود از گنج قارونی | نمی ارزد بیک حرفش ہمہ سامان سامانی
سنان خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش | زبانگ طبل صیتش پر فضائے کون امکانی
دلش آرام گاہ موج دریائے معانی را | ہویدا فکر حل معضلات از خط پیشانی
ضمیرش چوں کند غواصی جیحون مشکلہا | برآرد دست فکرش صد در ناسفت و نورانی
کفش باشد تہی از درہم و دینار دامانش | پر از در عمانی و پر از لعل بدخشانی
خجل از حسن نثرش لعبتان حجلۂ گردوں | عرق از در نظمش بر جبیں ابر نیسانی
دلش نتواں کشیدن منت ارباب نعمت را | کہ نشتر می خورد از ہمتش اقبال سلطانی

بیانش ابر باران است می بخشد چوں می بارد — ببوم شور سر سبزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم باعجاز قلم جان دگر بخشد — بحکم قم باذن العلم آں تن را کہ شد فانی
بخواہم از خداوندے کہ ناش حی و قیوم است — بماند زندۂ جاوید ایں شبلی نعمانی
نوشتم چوں مدیح حضرۃ الاستاذ برخواندم — ندا آمد مرا از پردۂ ناموس ربانی

دلیل فضل ممدوحت ز مدح تو ہویدا شد
بہ پیش مور سر نہی کہ ہمنام سلیمانی

(حیات شبلی، ص ۴۱۰-۴۱۱)

اس وقت سید صاحب وسطانی درجوں میں تھے، اس قصیدہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس جوہر قابل میں ابتدا ہی سے کتنی غیر معمولی صلاحیت تھی۔

ندوہ کی تعلیمی اصلاح وترقی: مولانا کی تشریف آوری کے بعد ندوہ کی کایا پلٹ گئی، انہوں نے ہر پہلو سے ندوہ کی اصلاح وترقی کی جانب پوری توجہ کی، نیا نصاب مرتب کرکے جاری کیا گیا، انگریزی کی تعلیم لازمی قرار دی گئی، آریوں کے حملوں کو روکنے کے لیے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور بعض طلبہ نے اس کی تعلیم حاصل کی، مگر یہ درجہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا، ہندوستان کے مشہور ومنتخب اساتذہ دارالعلوم میں جمع کیے، مولانا شیر علی صاحب، مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، شیخ محمد طیب عرب جیسے علما کو جو اپنے اپنے فن کے اساتذہ تھے، مولانا ہی نے یک جا کیا، علوم جدیدہ کی تعلیم کی بھی کوشش کی اور مرزا ہادی رسوا، بی، اے نے جو اس زمانہ میں کرسچین کالج میں لکچرار تھے، کچھ دنوں تک جدید ہیئت کے اسباق دیے، مگر یہ انتظام بھی نہ چل سکا، تفسیر عام نصاب میں شامل تھی، مولانا نے اپنے طرز قرآن پڑھانے کے لیے الگ درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا، جدید عربی میں طلبہ کی تقریر وتحریر کی جانب خاص توجہ کی، ندوہ کا کتب خانہ بہت معمولی تھا، اس کو وسیع کیا، رسالہ الندوہ کئی سال سے جاری تھا مگر اس کی حیثیت بہت معمولی تھی، مولانا نے اس کو ایک بلند معیار کا رسالہ

بنا دیا، ان کے علاوہ مختلف حیثیتوں سے ندوہ کو اتنی ترقی دی کہ وہ آئیڈیل عربی تعلیم کی اعلیٰ درس گاہ بن گیا، جس کی تقلید رفتہ رفتہ تمام عربی مدارس نے کی اور ندوہ کی شہرت ہندوستان سے نکل کر اسلامی ملکوں تک پہنچ گئی، جس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

مولانا شبلیؒ سے خصوصی استفادہ: مولانا کے مستقل قیام سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے ذوق اور ندوہ کے نصب العین کے مطابق ہونہار کی طلبہ کی تعلیم و تربیت کی جانب خاص توجہ کی اور ان کے گرد ایسے طلبہ کی ایک جماعت جمع ہوگئی، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی ضیا الحسن علوی مرحوم رجسٹرار، امتحانات عربی و فارسی صوبہ متحدہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، بعد میں مولانا عبد السلام ندوی مرحوم بھی جو ۱۹۰۶ء میں ندوہ میں داخل ہوئے تھے، اس جماعت کے ایک رکن بن گئے تھے، جو ابتدا ہی سے بڑا ہونہار تھے۔

مولانا ضیا الحسن علوی اگرچہ درجہ میں سید صاحب سے ایک سال آگے تھے مگر مولانا شبلیؒ سے استفادہ میں دونوں ساتھ رہتے تھے، مولانا ان دونوں کو بلاغت قرآن کا درس خاص طور سے دیتے تھے اور قرآن پاک کے اصول بلاغت املا بھی کراتے تھے، مولانا ضیا الحسن صاحب نے اسی سے استفادہ کر کے ایک سلسلہ مضمون لکھا تھا جو الندوہ میں شائع ہوا تھا اور ۱۹۰۷ء میں دستار بندی کے جلسہ میں بلاغت قرآن پر ایک تقریر بھی کی تھی۔

ان تینوں میں سید صاحب اس سرچشمۂ فیض سے زیادہ سیراب ہوئے اور درس قرآن کے اوقات کے علاوہ بھی استفادہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ان کی صلاحیت اور ذوق و شوق کو دیکھ کر مولانا شبلیؒ نے ان کی تربیت کی جانب توجہ کی، الندوہ کے بہت سے کام ان کے سپرد کر دیے اور دوسرے علمی کام بھی زیادہ تر ان ہی سے لیتے تھے۔

عربی مضمون نگاری کی مشق: مولانا شبلیؒ کے ندوہ آنے سے پہلے ہی سید صاحب کا شمار دار العلوم کے ہونہار اور ممتاز طلبہ میں ہونے لگا تھا، علامہ شبلی کی تربیت اور فیض صحبت نے ان کے جوہروں کو اور چمکا دیا، عربی ادب کا ذوق ان میں امام ادب مولانا فاروق صاحب

چریا کوٹی کی تعلیم سے پیدا ہو چکا تھا، مگر خود مولانا متاخرین کے طرز کے دل دادہ تھے، اس لیے ابتدا میں سید صاحب کا بھی یہی مذاق رہا، مگر جب مولانا شبلیؒ کی کوشش سے دلائل الاعجاز اور نقد الشعر درس میں داخل ہوئیں تو سید صاحب کی بھی آنکھیں کھلیں اور ان میں قدما کا صحیح اور خالص ادبی مذاق پیدا ہوا، انہوں نے اپنی تحریر میں اس کی تقلید کی کوشش کی، جس نے آگے چل کر ان کو ایک بڑا ادیب بنا دیا، مولانا شبلیؒ کے پاس شام کے بہت سے عربی اخبارات و رسائل آتے تھے، سید صاحب التزام سے ان کو پڑھتے تھے، اس سے جدید عربی کی استعداد پیدا ہوئی اور اب انہوں نے عربی میں مضمون نگاری شروع کر دی اور ان کے مضامین لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان[1] میں نکلنے لگے، ایک دو مضامین علامہ رشید رضا مصری کے رسالہ المنار میں بھی نکلے۔

مختلف فنون کا مطالعہ: حدیث کے درس کے ساتھ اس کا عام مطالعہ بھی انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں شروع کر دیا تھا، چنانچہ جس زمانہ میں وہ بخاری اور موطأ پڑھتے تھے، اس زمانہ میں ان کی شروح حواشی اور فتح الباری کا مطالعہ کرتے، فتح الباری کے مطالعہ سے فن حدیث کا خاص ذوق پیدا ہو گیا، چنانچہ حدیث کی درسی کتابوں کے علاوہ انہوں نے اسی زمانہ میں عجالۂ نافعہ، بستان المحدثین اور تذکرۃ الحفاظ کا مطالعہ کیا جس سے حدیث و رجال پر ان کی نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی اور انہوں نے علم حدیث پر ایک مضمون لکھا جو ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں شائع ہوا، حدیث کی کتابوں میں وہ موطأ امام مالک کو بہت پسند کرتے تھے اور وہ اکثر ان کے مطالعہ میں رہتی تھی، اس دل چسپی کا نتیجہ آئندہ چل کر حیات مالکؒ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

ان میں صحیح علمی ذوق مولانا شبلیؒ کی صحبت میں پیدا ہوا اور انہوں نے مولانا شبلیؒ کی

---

[1] یہ رسالہ مولوی عبدالعلی آسی کی نگرانی میں مولوی عبداللہ مصری کی ایڈیٹری میں لکھنؤ سے نکلتا تھا اور عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اس میں مضمون شائع ہوتے تھے۔

کلامی تصانیف پڑھیں اوران تصانیف میں عبدالکریم شہرستانی اورابن حزم وغیرہ کی جن کتابوں کا زیادہ حوالہ ہے، ان کو بھی پڑھ ڈالا، یہ گویا علم کلام سے ان کے ذوق کی بنیاد تھی جو آگے چل کران کا خاص فن بن گیا۔

تذکرۃ الحفاظ کے مطالعہ نے طبقات وتراجم اورتاریخ کا ذوق پیدا کیا، چنانچہ اسی زمانہ میں انہوں نے وفیات الاعیان ابن خلکان، ابن ندیم اور کشف الظنون کا مطالعہ کیااور ابن خلکان کو اتنی بار پڑھا کہ ان کے نوٹ اور حواشی سے کتاب کے شروع اور آخر کے سارے صفحات بھر گئے، یہ نسخہ دارالمصنفین میں برسوں رہا، سید صاحب نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کراچی منگالیا تھا۔

عربی میں ایک تاریخی تقریر: غرض طالب علمی ہی کے زمانہ سے مختلف علوم میں سید صاحب کی استعداد پختہ اوران پران کی نظر نہایت وسیع اورعربی زبان پراتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ فصیح عربی میں برجستہ تقریر کرنے لگے تھے، چنانچہ ۱۹۰۷ء میں جب سید صاحب آخری درجہ میں تھے رفاہ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا، اس جلسہ میں قدیم وجدید علوم کے بہت سے ماہرین جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان لینا چاہتے تھے، شریک ہوئے تھے، اس جلسہ میں سید صاحب نے برجستہ عربی زبان میں ایسی فصیح تقریر کی کہ پورا جلسہ محوِ حیرت ہوگیا، اس کی روداد خود اپنے قلم سے حیات شبلی میں لکھی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

”مولانا نے اس جلسہ میں پیش کرنے کے لیے اپنے چند منتہی طلبہ کوبعض عنوانات دے کر پراثر تقریر کی ہدایت فرمائی، محبی مولوی ضیاالحسن مرحوم نے قرآن مجید کے ایجاز وبلاغت پر اور راقم نے علوم جدیدہ وقدیمہ کے موضوع پر تقریر کی، اسی تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اورشائقین کو آئینہ حیرت بنا دیا، راقم کی تقریر کے درمیان کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا جب قاعدہ

جلسہ باہر چلے گئے تھے مولوی سید عبدالحئ مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کر سکتے ہو، میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا، مولانا کو باہر خبر ملی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم اس پر تقریر کر سکتے ہو، میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لیے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے۔

موضوع کے تقرر کے لیے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے موضوع یہ مقرر کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو، میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کیے، ہر طرف سے احسنت وآفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاد مرحوم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا، جو اس خاک سار کے واسطے ہمیشہ کے لیے طرہ افتخار بن گیا۔"

مولانا نے خود اس واقعہ کی اطلاع مولانا شروانی کو ان لفظوں میں دی:

"جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت اس پر عربی زبان میں لکچر دوں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محوِ حیرت تھا اور آخر میں لوگوں نے نعرہائے تحسین کے ساتھ کہا کہ بس اب حد ہو گئی۔"

یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس سے اس کا غلغلہ سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ (حیات شبلی ص ۴۵۷-۴۵۸)

باب دوم

۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۴ء

تعلیم سے فراغت: ۱۹۰۷ء میں سید صاحب نے تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ان کی زندگی کا وہ موڑ آ گیا جس سے مختلف راستے کھلتے تھے، سید صاحب کے بزرگوں کی خواہش تھی کہ وہ اب اپنے آبائی پیشہ طب کی تعلیم حاصل کریں، چنانچہ انہوں نے بار بار مولانا شبلی کو لکھا کہ وہ سید صاحب کو اس کے لیے آمادہ کریں لیکن قدرت کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا، اس لیے علامہ شبلی نے ان کی علمی صلاحیتوں کو طب میں برباد کرنا پسند نہ کیا، انہوں نے ان لوگوں کو لکھا کہ آپ لوگ ان کی زندگی خراب نہ کیجیے، ان کو میرے حوالے کیجیے، ان کو خدا نے دوسرے کام کے لیے بنایا ہے، الندوہ کے بعض کام مولانا نے اپنے آنے کے بعد ہی سید صاحب کے سپرد کر دیے تھے، تعلیم کی فراغت کے بعد ان کو باضابطہ الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔

رسالہ الندوہ: الندوہ دارالعلوم ندوۃ العلما کا مشہور علمی رسالہ اور اس کا نقیب تھا، یہ رسالہ ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا تھا اور اس کے ایڈیٹروں میں مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا نام تھا، مگر یہ دونوں لکھنؤ میں نہیں رہتے تھے، اس لیے چند دنوں تک الندوہ بے جان رہا، مولانا شبلیؒ کی تشریف آوری کے بعد ایک معیاری رسالہ بن گیا، اس زمانہ میں اردو

رسالوں کا رواج ہو چلا تھا، المعارف علی گڑھ، علی گڑھ میگزین، خدنگ نظر و دل گداز لکھنؤ، دکن ریویو حیدرآباد اپنے اپنے دور کے اچھے رسالے تھے لیکن ایک بلند پایہ علمی رسالہ کی اب بھی اس لیے اور بھی ضرورت تھی کہ علما میں سنجیدہ علمی و تحقیقی مضامین کا کوئی ذوق نہ تھا، ان کے لکھنے پڑھنے کی ساری صلاحیتیں منطق و فلسفہ وغیرہ کی پرانی کتابوں کے شروح و حواشی پامال فقہی مسائل کی مناظرانہ رسالہ بازی میں ضائع ہورتی تھی، الندوہ پہلا رسالہ ہے جس نے ان کے سامنے نئے علمی مباحث و مسائل کا دروازہ کھولا اور زمانہ کے حالات کے مطابق اسلامی علوم کی خدمت اور اس میں تلاش و تحقیق کے نئے طریقے بتلائے اور زبان و بیان کا ایک دل کش ادیبانہ اسلوب پیش کیا اور اسلامی علوم کی مختلف شاخوں پر علمی و تحقیقی مضامین کا ایک معیاری نمونہ قائم کر دیا۔

عربی مدارس کے ذی استعداد طلبہ اور نوجوان علما اس سے زیادہ متاثر ہوئے اور ان حلقوں میں بھی الندوہ بار پانے لگا جو نئی چیزوں سے بھڑکتے تھے، جن لوگوں میں مضمون نگاری کا ذوق تھا، انھوں نے عام طور سے اس کی تقلید شروع کر دی اور یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پرانے عربی مدارس اور علما کے خیالات میں الندوہ نے بڑا انقلاب اور ان میں صحیح علمی مذاق پیدا کر دیا، مگر الندوہ سے قدرتاً سب سے زیادہ فائدہ ندوہ کے طلبہ اور فارغ التحصیل نوجوانوں کو پہنچا، چنانچہ اس زمانہ کے وہ تمام ہونہار طلبہ جن میں لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا اور جنھوں نے آگے چل کر بحیثیت مصنف اور مضمون نگاری شہرت حاصل کی، انھوں نے الندوہ ہی کے ذریعہ اس کا سلیقہ سیکھا اور ملک میں روشناس ہوئے، مولانا ابوالکلام نے بھی الندوہ ہی کے ذریعہ مضمون نگاری سیکھی، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۶ء تک اگرچہ رسالہ پر ان کا نام نہ چھپتا تھا لیکن عملاً وہی سب ایڈیٹر رہے، ۱۹۰۶ء میں جب وہ اس زمانہ کے مشہور اخبار وکیل میں امرتسر چلے گئے۔

الندوہ کی سب ایڈیٹری: اس وقت سید صاحب الندوہ کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے،

الندوہ کا ایک مقصد دارالعلوم کے طلبہ کی علمی تربیت تھا، اس لیے وقتاً فوقتاً اس کے سب ایڈیٹر بدلتے رہے، چنانچہ ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۲ء تک مختلف اوقات میں سید صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اس کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے، الندوہ کی سب ایڈیٹری کے دوران میں سید صاحب کے مضامین مستقل الندوہ میں نکلتے رہے، اس کا کوئی نمبر مشکل ہی سے ان کے مضمون سے خالی ہوتا، ان کی فہرست یہ ہے:

۱۹۰۷ء علم ہیئت اور مسلمان، عربی زبان کی وسعت، برنابا کی انجیل، بحرالعلوم

۱۹۰۸ مسئلۂ ارتقا اور قرآن مجید، ابن خلکان، ایمان بالغیب، جرجی زیدان کی تمدن اسلامی پر تنقید۔

۱۹۰۹ء مکررات القرآن، اسلامی رصد خانے، سود اور صحف انبیا، تحریم شراب علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق۔

۱۹۱۰ ندوہ کے لیے ایک کتب خانہ کی ضرورت، کتب خانہ اسکندریہ۔

۱۹۱۱ء اشتراکیت اور اسلام، مذہب اسلام اور عقل، اسماء القرآن، الاحتساب فی الاسلام

۱۹۱۲ فرقہ حنفیہ عقائد میں کس کا مقلد ہے۔ (۲) عذاب۔

ان میں بعض مضامین بہت طویل ہیں، جو کئی نمبروں میں شائع ہوئے، ان تمام مضامین استاد کے علمی وادبی رنگ کی جھلک نمایاں ہے، جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، ان مضامین سے ہندوستان کے پورے علمی حلقہ میں سید صاحب کی شہرت پھیل گئی۔

ندوہ کی معلمی: مولانا شبلی مرحوم سید صاحب جیسے ہونہار جوہر قابل کو جدا کرنا پسند نہ کرتے تھے، اس لیے اور بھی ان کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے کہ ان کے جوہروں کو چمکنے اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا وقت تعلیم سے فراغت کے بعد آیا تھا، اس لیے الندوہ کی سب ایڈیٹری کے ساتھ ستمبر ۱۹۰۸ء میں ان کو دارالعلوم میں عربی انشا کا معلم مقرر کیا، اس

کے ایک سال بعد ۱۹۰۹ء میں نائب ادیب مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک اس خدمت پر رہے اور انہوں نے علامہ شبلی کے فیض صحبت سے سب سے زیادہ فائدہ اسی زمانہ میں اٹھایا اور الندوہ کی سب ایڈیٹری اور دار العلوم کی معلّمی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے علمی کام انجام دیتے رہے، علامہ شبلی اپنے متفرق کام ان ہی سے لیتے تھے۔

دروس الادب اور لغات جدید کی تالیف: اسی زمانہ میں انہوں نے دروس الادب کے نام سے عربی کی دو ریڈریں لکھیں، جو بہت مقبول ہوئیں اور آج تک عربی کے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل ہیں، اس وقت تک اردو میں عربی کے جدید الفاظ کا کوئی لغت نہ تھا، جس کی وجہ سے عربی کے طلبہ کو مصر وشام کے اخبارات ورسائل کے سمجھنے میں دقت ہوتی تھی، سید صاحب نے دار العلوم ندوہ کی تحریک پر لغات جدیدہ کے نام سے عربی کے نئے الفاظ کا ایک لغت مرتب کیا، اس میں انہوں نے وہ تمام الفاظ جمع کر دیے ہیں جو اس وقت تک مصر وشام وغیرہ کے عربی اخبارات ورسائل میں رائج ہو چکے تھے، یہ اردو میں جدید عربی الفاظ کی پہلی ڈکشنری ہے، جس سے آج تک عربی کے طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

شعبہ تصحیح اغلاط تاریخی کا قیام اور اس کی نظامت: انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کو ایسا مسخ اور اس کو ایسے رنگ میں پیش کیا تھا جسے پڑھ کر خود مسلمان طلبہ شرم وندامت محسوس کرتے تھے اور ہندو مسلمان میں منافرت پیدا ہوتی تھی، اسی قسم کی تاریخیں نصاب میں بھی داخل تھیں، جس سے مسلمانوں کی جدید نسل متاثر ہو رہی تھی، علامہ شبلی نے ان کتابوں کی تاریخی اغلاط کی تصحیح کے لیے تصحیح اغلاط تاریخی کے نام سے ندوہ میں ایک شعبہ قائم کیا اور سید صاحب کو اس کا سکریٹری مقرر کیا، انہوں نے مختلف یونیورسٹیوں اور اسکولوں کے مسلمان استادوں سے اس بارہ میں مشورہ لیا اور عام اطلاع کے لیے اخبارات میں مضمون لکھا، مختلف لوگوں نے قابل اعتراض کتابوں کے نام لکھ کر بھیجے، علامہ شبلی نے ان کتابوں کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تاریخ کی

جو قابل اعتراض کتابیں رائج تھیں ان کی تصحیح اوران کونصاب سے خارج کرانے کی بھی کوشش کی جس میں بڑی حد تک کام یابی ہوئی، مگر ابھی یہ کام شروع ہی ہوا تھا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے اس کام کواپنے ہاتھ میں لے لیااور اخبار''البشیر''(اٹاوہ) میں اس کا خاکہ شائع ہوا،مگر اس میں ندوہ کا کوئی حوالہ نہ تھا، علامہ شبلی سید صاحب کوایک خط میں لکھتے ہیں:

''تمہارے مضمون تصحیح اغلاط پر ارباب علی گڑھ کس قدر جلد چونکے، فوراً ایک کمیٹی قائم کی اور مختلف کورسوں کی جانچ کے لیے مختلف کمیٹیاں قائم ہوگئیں لیکن ندوہ کا ذکر نہیں آیا، بلکہ بیان کیا گیا کہ یہ کام ہم پہلے سے کر رہے ہیں، خیر کام ہونا چاہیے کہیں سے ہو، تاہم تمہارا دائرہ الگ ہے، وہ صرف گورنمنٹ کو مطلع کریں گے اورتم کو تصحیح سے تعلق ہے۔''(مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، نمبر۳۴)

سید صاحب نے ایک خط میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کولکھا کہ:

''البشیر میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ پڑھی کہ جناب نے اس امر (تصحیح اغلاط تاریخی) کی طرف توجہ فرمائی ہے، دوسری بار بعض اغلاط تاریخی کی اشاعت کے بعد پھر البشیر میں پڑھا کہ جناب نے معلمین و فاضل مدرستہ العلوم کی ایک کمیٹی بغرض تصحیح اغلاط مرتب فرمائی ہے، چوں کہ ایک قومی کام دو الگ الگ مقاموں میں انجام پانا خلاف مصلحت ہے، اس لیے چند امور عرض ہیں، ۱- اس کام کومتحدہ قوت سے کیوں کر عمل میں لایا جائے ۲- اپنے اس کام کو عملی صورت میں لانے کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں ۳- انگریزی کورس کی جو تاریخ ازسرتاپا لغو ہو اس کو خارج از کورس کرانے کی کیا تدبیر ہے؟

امید ہے کہ قومی کاموں میں یک جہتی کو پیش نظر رکھ کر جواب سے جلد مستفیض فرمائیں گے۔''(حیات شبلی، ص ۵۲۷)

مگر اس خط کا مناسب جواب نہیں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام ندوہ میں بھی نہ ہو سکا اور ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی نہیں کیا۔

شعبہ تبلیغ اسلام کی نظامت: ہندوستان میں ایسے نومسلموں کی بڑی تعداد ہے جو محض نام کے مسلمان ہیں، اسلامی عقائد و اعمال سے ان کو کوئی واقفیت نہیں ہے اور ان میں اب تک ہندووانہ رسمیں رائج ہیں، بلکہ بعضوں کے نام تک ہندووانہ ہیں، اس لیے آریہ سماج ان کو مختلف اوقات میں ہندو بنانے کی کوشش کرتے رہے، خصوصاً میوات کے نئے مسلموں کو جو راجستھان سے لے کر آگرہ اور دہلی تک آباد ہیں، ان میں ان کو کسی نہ کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں مولانا الیاسؒ کو پیدا کر دیا، جنہوں نے میواتیوں کو نہ صرف ارتداد سے بچایا بلکہ ان کو دین دار مسلمان بنا دیا، علامہ شبلی مرحوم کے زمانہ میں بھی آریہ سماج اس قسم کے نومسلموں پر چھاپا مارتے رہتے تھے اور کچھ نومسلم ہندو بھی ہو گئے تھے، اس سے علامہ مرحوم بہت متاثر ہوئے اور اس کے انسداد کے لیے پوری کوشش کی اور ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۲ء تک کوشش کرتے رہے، ۱۹۱۲ء میں اس کام کے لیے مجلس اشاعت وحفاظت اسلام کے نام سے تبلیغ اسلام کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا اور بڑے وسیع پیمانہ پر اس کے انتظامات کیے، سید صاحب کو اس کا جوائنٹ سکریٹری بنایا مگر ابھی اس کام کو شروع ہی کیا تھا کہ ۱۹۱۳ء میں ندوہ میں انقلاب ہو گیا، سید صاحب بددل ہو کر کلکتہ چلے گئے اور چند دنوں کے بعد علامہ شبلی بھی ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہو گئے، مولانا شبلی کی ان تبلیغی کوششوں کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے، مکاتیب شبلی میں بھی، مکاتیب بنام سید سلیمان نمبر ۳۷، ۳۸، ۳۹ اور ۴۰ میں اس کا ذکر ہے۔

سیرت نبویؐ کے اسٹاف میں: سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کا خیال علامہ شبلی کو بہت عرصہ سے تھا اور اس کام کو انہوں نے ۱۹۰۳ء میں شروع کیا تھا مگر ایسے حالات پیش آتے گئے کہ یہ کام آگے نہ بڑھ سکا، مگر سیرت کی تالیف مولانا کے دل سے لگی ہوئی تھی، بالآخر ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اس کا کام کا مصمم عزم کر لیا، نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے اس کام کے لیے دو سو ماہوار کی امداد مقرر کر دی، مصارف کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مئی

۱۹۱۲ء میں انہوں نے سیرت نبوی ﷺ کا ایک دفتر قائم کیا اور اس کے لیے انگریزی کے مترجم رکھے اور سید صاحب کو عربی کے مددگار کی حیثیت سے مقرر کیا اور وہ کچھ دنوں کے لیے ندوہ کی معلّمی سے سیرت کے اسٹاف میں منتقل ہو گئے، ان کے متعلق عربی کی کتابوں سے سیرت کے مواد کی فراہمی تھی۔

سیرت کے کام کے لیے جس یک سوئی کی ضرورت تھی وہ لکھنؤ میں میسر نہ تھا، یہاں کا موسم بھی سخت تھا، اس لیے اس کام کے لیے بمبئی کا گوشہ عافیت انتخاب کیا، چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کو لکھتے ہیں:

> ''میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کر کے سیرت ختم کروں، یہاں روز ایک قصہ رہتا ہے اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسٹاف ساتھ لے جاؤں گا، سید سلیمان ساتھ رہیں گے، خوش نویس اور مترجم بھی۔'' (مکتوبات بنام منشی محمد امین، مکتوب نمبر ۹)

چنانچہ سیرت نبوی کی تکمیل کی غرض سے جون کی کسی تاریخ کو بمبئی چلے گئے اور چند دنوں کے بعد سید صاحب کو بھی بلا لیا اور جولائی ۱۹۱۲ء میں سیرت نبوی کی تالیف کا کام شروع ہو گیا، مولانا شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''کام ہو رہا ہے، سیرت کی اصل مآخذ صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ان کے تمام رواۃ استقصا کر کے ان کا اسماء الرجال تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں کہ رواۃ کے انتقاد میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور یہیں ہیں، خود الگ سیرت میں مشغول ہوں، انگریزی کتابوں کا بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔'' (مکاتیب شبلی بنام شروانی، نمبر ۱۰۲)

مدراس محمڈن کانفرنس کے اجلاس بنگلور میں شرکت: سید صاحب کے بمبئی پہنچنے کے چند ہی دنوں کے بعد آخر جولائی ۱۹۱۲ء میں مدراس محمڈن کانفرنس کا اجلاس بنگلور میں ہوا، اس کی حیثیت مدراس میں وہی تھی جو شمالی ہند میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تھی، سید صاحب نے اب تک جنوبی ہند کا سفر نہیں کیا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر محمڈن

کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے ۲۵؍ جولائی کو بمبئی سے روانہ ہوئے، راستہ میں مولانا شوکت علی صاحب مرحوم کا بھی ساتھ ہو گیا اور ان سے کانفرنس علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی اور اشاعت اسلام وغیرہ مسائل پر تبادلہ خیال ہوا، مسلم یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہیں ہوئی تھی اور اس زمانہ میں اس کے قیام اور حقوق کا مسئلہ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان موضوع بحث بنا ہوا تھا۔

کانفرنس میں سید صاحب نے دو تقریریں کیں، ایک تعلیم نسواں پر، دوسری کسی مذہبی موضوع پر، اس سفر میں سید صاحب مدراس، بنگلور، سرنگاپٹم، وانمباڑی وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے ۸؍ اگست کو بمبئی واپس ہوئے، اس سفر کی روداد انہوں نے مولانا سید عبدالحکیم صاحب کو لکھی تھی، جو مختلف حیثیتوں سے بڑی دل چسپ اور پراز معلومات ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ سے ان کی نگاہ کتنی حقیقت نگر تھی، اس روداد کو خود ان کی زبان قلم سے سنیے:

ایک تاریخی مکتوب: عم محترم! تسلیم

میں نے پہلے خط میں آپ کو اطلاع دی تھی کہ مدراس محمڈن کانفرنس کی شرکت کے لیے مدراس جا رہا ہوں، ۲۵؍ جولائی کو یہاں سے روانہ ہوا اور ۸؍ اگست کو واپس آیا۔

یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ مفید و پراز معلومات رہا، ۲۵؍ کو روانہ ہوا، ۲۶؍ کو کنڈکل پہنچا، جہاں سے بنگلور (مقام کانفرنس) کو گاڑی جاتی تھی، اتفاق سے جس درجہ میں میں تھا، اسی میں مسٹر شوکت علی بھی تھے، کانفرنس یونیورسٹی کالج اور اشاعت اسلام پر متفرق گفتگوئیں ہوئیں، کانفرنس کے متعلق ہمارے اکثر اعتراضات کو انہوں نے تسلیم کیا، یونیورسٹی کے متعلق یقین دلایا کہ گورنمنٹ کو مجبوراً یونیورسٹی کو حق الحاق دینا پڑے گا، طرابلس و ایران و مراکو کے حالات بد سے جیسا ہر مسلمان متاثر ہے، وہ بھی تھے۔

صبح کو گاڑی بنگلور پہنچی، اسٹیشن پر والنٹیر موجود تھے۔

بنگلور: ریاست میسور کا بہترین شہر ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے تمام جنوبی ہندوستان میں

مشہور ہے، آج کل وہاں اچھا خاصہ جاڑا تھا اور موسم گرما میں بھی وہاں سردی اور گرمی کا اعتدال رہتا ہے، غرض یہ کہ وہاں گرمی کبھی نہیں ہوتی، اس شہر کا ایک حصہ لشکرگاہ انگریزی ہے اور یہی کانفرنس کا مقام تھا، یہ ریزیڈنسی ہے، دوسرا حصہ شہر ہے، جو ریاست کے ماتحت ہے۔

عمارتیں دور دور، پست کھپریل کی، مگر صاف ستھری ہیں، انتظام عمدہ ہے، پولیس اچھی ہے، نباتات کا ایک عالم یہاں ہے، زمین کا رنگ عموماً سرخ ہے اور نہایت زرخیز اور عمدہ ہے، سرو جس کے ایک فرد کا وجود بھی ہمارے باغوں کے باعث سربلندی ہے، یہاں اس کا جنگل ہے، میوہ ہر قسم کا یہاں ہوتا ہے، انار میں نے یہاں بہت بڑے بڑے دیکھے، مدراس میں انگور کے درخت دیکھے، سپاری کا درخت دیکھا، کھجور کے درخت نہایت کثرت سے ہیں۔

کانفرنس: کانفرنس تین دن تک رہی، جسٹس عبد الرحیم پریسیڈنٹ تھے، ہندوستان سے تین آدمی شریک تھے، میں، خواجہ کمال الدین اور مسٹر شوکت علی، کانفرنس کا مقصد جنوبی ہندوستان میں اشاعت تعلیم ہے، کانفرنس اپنا کام انجام دے رہی ہے، اس سے زیادہ جتنا آل انڈیا کانفرنس انجام دیتی ہے۔

کانفرنس کے روح رواں بلکہ جنوبی ہندوستان کے تمام تحریکات کے روح رواں صرف دو شخص ہیں، نواب غلام احمد اور مسٹر قریشی بی، اے، نواب غلام ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لب ریز ہے، قومی کاموں کو ان سے اس سے زیادہ دل چسپی ہے، جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے ہے، قومی مصائب پر ان کا دل اسی قدر جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر، ہر سال اپنے ہزاروں روپے قوم کے لیے نذر کرتے ہیں، آج کل بیمار تھے، شریک کانفرنس نہ ہو سکے، مسٹر قریشی مدراس کا عبد الحکیم ہے، بی، اے، بی، ٹی ہے، گورنمنٹ نوکر مگر تھا مگر سب چھوڑ چھاڑ کر مدراس کے قومی ہی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں، انگریزی زبان کا بلا کا قابو رکھتا ہے، مدراس کے اکثر انگریزی اخبارات میں اس کے

مضامین چھپتے رہے۔

کانفرنس کا اجلاس تین دن رہا، مختلف تعلیمی ضرورتوں پر لکچر ہوئے، تعلیم تجاویز منظور ہوئیں، میں نے دو تقریریں کیں، ایک تعلیم نسواں پر جس نے حاضرین پر اثر کیا اور پسند کی گئی، اس تقریر میں ایک یورپین خاتون کے مخفی اعتراضات کا جواب بھی تھا جس نے مجھ سے پہلے اسی موضوع پر انگریزی میں تقریر کی تھی، دوسری تقریر شب کو مذہبی تھی، جس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔

ختم اجلاس پر میں نے احباب کے ساتھ جن میں خصوصیت کے ساتھ میں دو کا نام لوں گا، مسٹر قریشی اور مسٹر اسد اللہ بی، اے، حیدرآباد میں رجسٹرار ہیں، وطن مدراس ہے اور قومی درد رکھتے ہیں، بنگلور کا مشہور عجائب خانہ دیکھا، جس میں میں نے دو اسلامی چیزیں دیکھیں، ایک پتھر پر ایک کتبہ جو سلطان ٹیپو کی کسی عمارت پر تھا، دوسرا ایک سنگی نقشہ جو حیدر علی کے تیار کردہ قلعہ و عمارات واقع سرنگا پٹن پایہ تخت سلاطین میسور کا تھا، محبت سے میں نے ان کو دیکھا، دل میں ایک درد اٹھا، بے اختیار ہوگیا اور جی چاہا کہ اس افق کو دیکھتا جہاں ہندوستان کا آخری ستارہ طلوع ہوا اور ڈوبا۔

راستہ میں دوستوں سے ذکر کیا، اسد اللہ خاں معیت کے لیے تیار ہوگئے، وہ بھی مدت سے اس کے آرزومند تھے، قرار یہ پایا کہ میں پہلے صبح کو مسٹر قریشی کے ساتھ کولار جاؤں جہاں نواب غلام احمد خاں مقیم تھے اور ان کی عیادت کروں، شام کو بنگلور واپس آؤں، یہاں اسد اللہ خاں اسٹیشن پر تیار ملیں گے، ان کے ساتھ سرنگا پٹن کا ارادہ کروں۔

حسب قرارداد کولار روانہ ہوا، یہاں سے ڈھائی گھنٹہ کا راستہ تھا، نواب غلام احمد اور ان کے برادر بزرگ دونوں کو حد درجہ خلیق اور خاکسار پایا، مل کر نہایت خوش ہوا کہ ہندوستان کی اسلامی خاکستر میں اب تک دبی دبائی چنگاریاں باقی ہیں۔

یہاں سب سے قابل سیر چیز سونے کی کانیں ہیں، جو ریاست میسور کی مملوکہ

ہیں، ۲؍ بجے اس کو دیکھنے چلا گیا، اس کے لیے پہلے ریاست کے عہدہ دار سے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے، اس اجازت نامہ کی وساطت سے انگریزی کمپنی سے جو کان کی ٹھیکہ دار ہے، دوسرا اجازت نامہ ملتا ہے، ریاست اور کمپنی دونوں کے سپاہی ساتھ ہوتے ہیں، پھر کان کی سیر نصیب ہوتی ہے، بہر حال ان مراحل کو طے کر کے کانوں کے کارخانہ تک پہنچا، کانیں میلوں تک ہیں، نیچے نیچے کھودی جاتی ہیں اور اوپر معمولی سطح زمین نظر آتی ہے، میں نیچے نہیں اترا، نیچے اترنا عام آدمیوں کے لیے خطرناک ہے، صرف اوپر کی سیر کی، ایک کارخانہ قدرت نظر آیا، ہر قدم پر انسان کی قوت کمال عقلی اور خدا کی صفت فیاضی کے مناظر نظر آئے، وہ جگہ دیکھی جہاں مشین کی مدد کے ذریعہ مزدور نیچے اترتے ہیں، ڈیڑھ دو ہزار فٹ نیچے کان ہے لیکن صرف ایک منٹ میں زینہ سے نیچے آتے اور اوپر جاتے ہیں، زینوں کے نیچے اوپر جانے کے لیے الگ ایک مشین کا مستقل کارخانہ اور عملہ ہے، اندر روشنی اور ہوا پہنچانے کا الگ کارخانہ اور عملہ ہے، وہ جگہ دیکھی جہاں کانوں سے توڑ توڑ کر اوپر سونے کے پتھر لاتے ہیں، وہ جگہ دیکھی جہاں وہ پتھر توڑے جاتے ہیں، وہ مشین دیکھی جو ان پتھروں کو چورا کرتی ہے، وہاں گیا جہاں سونے کے ذرات خاک الگ ہوتے ہیں، پھر یہ خاک دوسری جگہ پانی کے ساتھ مل کر جاتی ہے، وہاں پر صاف کی جاتی ہے، یہی خاک پھر دوسری بار صاف کی جاتی ہے، تیسری بار خاک ہوائی اڑن کھٹولوں پر روانہ کی جاتی ہے، جس کو میں نے حیرت سے دیکھا، یعنی ایک پست مقام سے بلند مقام پر تار پر یہ آہنی صندوق بلا مدد آتے جاتے ہیں، اوپر سے نیچے نشیب میں آنا معلوم لیکن من دو من کی خاک سے لدے ہوئے آہنی صندوقوں کا آہنی تاروں پر بلندی کی طرف دوڑ کر جانا میرے لیے طلسم ہوش ربا کا ایک منظر معلوم ہوتا تھا، بہر حال یہاں کے عجائبات دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ ہندوستان کو ترقی کے کس معیار تک پہنچنا ہے۔

میسور: کان سے واپس آ کر شام کی گاڑی سے بنگلور واپس آیا، اسد اللہ خاں اسٹیشن پر موجود

تھے، میسور کی راہ لی، صبح سات بجے ہم میسور پہنچے، شہر دیکھا، راجہ کا خاص محل دیکھا، اتفاق سے محل کے سامنے ریاست کی کچھ فوج مصروف ورزش تھی، اس کا نظارہ کیا، شہر شہری حیثیت سے پست ہے، پست و بدصورت مکانات، گندہ سڑک، بدہیئت دوکانیں، پایہ تخت میسور سرمایہ ناز چیزیں ہیں، بعض عمارات اس سے مستثنیٰ ہیں مگر وہ خال خال ہیں، راجہ کا محل عالی شان اور خوب صورت ہے، مگر میری آنکھیں فلک نما کو ڈھونڈتی تھیں۔

بہر حال اس شہر کا گشت لگاتے ہوئے ہم سرنگا پٹن کو چل کھڑے ہوئے جو یہاں سے بارہ میل ہے، درمیان کے مقامات میں جا بجا اسلامی عمارات کے نشانات ملتے ہیں، کہیں کہیں شہدا کی قبریں نظر آتی ہیں جو اسلام کی آخری عظمت کے خاتمہ کا قصہ سنا رہی ہیں، راستہ میں ایک پل نظر آیا جو کاویری ندی کی ایک شاخ پر تعمیر کیا گیا ہے، تمام انگریزی پلوں کے برخلاف اس کے ستون مخروطی مثلث کے بجائے مربع تھے، جو بالکل عجیب وغریب چیز ہے، وہ ستون بھی محض ایک سالم پتھر سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔

تھوڑی دیر میں وہ میدان اور وہ دیواریں نظر آئیں جو سلطانی فوج کی ورزش گاہیں تھیں اور جہاں نشانہ کی مشق ہوتی تھی، آگے چل کر اس بدنصیب پایہ تخت کا سواد نظر آیا جو اب بالکل ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے، ہر جگہ شہدائے اسلام اور انگریزی سپاہیوں کی قبریں ہندوستان کے آخری فیصلۂ قسمت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

سب سے پہلے ہم نے سلطان کے مزار کا قصد کیا، ایک وسیع باغ کے اندر خود سلطان کا بنا کردہ قبرستان ہے، جہاں اکثر خاندان سلطانی کے ارکان مدفون ہیں، صدر دروازہ کی سقف پر اب تک نوبت ونقارہ بج رہا ہے، جس کی مہیب آواز ہمارے کانوں میں الفاظ ماتم وتعزیت بن کر آ رہی تھیں، وسط میں سلطانی مقبرہ تھا جس میں ایک عظیم الشان گنبد تھا، گنبد کے دروازہ پر چند کتبے تھے، جن کو میں نے لکھ لیا ہے، ایک دروازہ کے اوپر ایک دروازہ کے داہنی طرف کی دیوار پر اور ایک بائیں طرف کی دیوار پر، جس کی صورت یہ ہے:

در شاہے کہ شہر الاسلام | باب شیرے کہ کسّر الاصنام
اوست سلطان دین وہم دنیا | بندہ بارگاہ او علام

بجانب راست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | اللہ محمد ابو بکر عمر عثمان علی
زہے گنبد کز شکوہ بنا | فلک زیر دستش بود در علو
تو خواہی فلک خواہ خورشید خواں | فلک داغ گردید از رشک او
بود شمسہ اش نور چشم فلک | قمر یافتہ ضو تعلیم ازو
تراوش کناں بحر رحمت ز خاک | گروہے ز کرو بیاں گرد او
سحر گہ پے کسب فیض وشرف | گذشتیم ازیں خواب گاہ نکو
چوں ایں مضجع تازہ آمد بچشم | نمودم چو روحانیاں جستجو
کہ ایں شاہ آسودہ ام چیست | چہ تاریخ رحلت نمود است او
یکے زماں میاں گفت تاریخ ونام | کہ حیدر علی خاں بہادر بگو

بجانب چپ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | رب الرحم از سلطان الکریم
ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ | خون خود ریخت فی سبیل اللہ
بود ذیقعدہ بست وہشتم آں | شدہ در روز شنبہ حشر عیاں
میر سالش بہ نیم ماہ بگفت | نور اسلام دیں ز دنیا رفت
تاریخ گشتہ گشتن سلطاں حیدری | ٹیپو بوجہ دین محمد شہید شد
جواں مردمیداں نہاں شدز دنیا | یکے گفت تاریخ شمشیر گم شد
روح قدسی بعرش گفت آہ | نسل حیدر شہید اکبر شد
ان اخذ مصر کما قد ذکروا | و سرنج فتن اخذت و بہا

مصیبة ما مثلها ارختها ذهب عز الروم والهند کلها
من کلام الشیخ الجعفری غلام حسین

قد صنفه الحقیر میر حسین علی و حرره سید عبد القادر بالخط الجلی

عربی کا قطعہ عروض ونحو کے اعتبار سے غلط ہے لیکن دردو جاں گدازی صحت الفاظ پر منحصر نہیں:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند لے نہیں ہے

عربی قطعہ اس اتفاقی مصائب کا اظہار کررہا ہے جو عالم اسلام کو سترہویں صدی عیسوی کے اواخر یا تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان ومصر میں برداشت کرنا پڑے، ادھر قاہرہ نپولین کے زیر قدم تھا ادھر سرنگاپٹن پر یونین جیک لہرانے لگا۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا، مقبرہ میں ایک دروازہ سے داخل ہونا پڑتا ہے، جس میں سیاہ غالباً آبنوس کے کواڑ ہیں، اندر قبریں برابر اس طرح تھیں:

سرخ	سیاہ	سیاہ
سلطان ٹیپو شہید	حیدر علی	حیدر علی کی بیگم

سلطان ٹیپو کی قبر پر سرخ چادر اور دونوں قبروں پر سیاہ چادریں چڑھی تھیں، سرخ چادر اس خونی پیرہن کی طرف اشارہ ہے جس کو پہنے سلطان سو رہا ہے، او شیر میسور! اٹھ کہ اب اسلام تیری مدد کا محتاج ہے، ایک آواز تھی جو زبان دل سے بے اختیار نکلی اور جس کو صرف گوش دل نے سنا، مگر ہائے مہمان نواز عاشق اسلام سلطان کے لب گور نے کوئی جواب نہ دیا، فرط محبت سے جی چاہا گستاخانہ قبر سے لپٹ کر ایک چیخ ماروں لیکن خدام ادب نے آواز دی کہ ادب! ادب! آخر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ کے چند پھول چڑھا کر با چشم نم باہر نکل آیا۔

مزار کے سامنے سلطانی مسجد تھی جس میں مجاور اور مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، عمارت متوسط حیثیت کی ہے، یہیں سے نیچے اتر کر دونوں بازوؤں میں دو مسقف عمارتیں

ہیں جن کو مہمان سرائے سمجھتا ہوں۔

مزار پر اب تک مجاور، قرآن خواں اورنوبت ونقارہ بجانے والے ریاست کی طرف سے مقرر ہیں۔

یہاں سے نکل کر ایک طرف اس دشمن اسلام خاندان کے ایک ممبر کا گنبد قبر ہے، جس کا ایک رکن بنگال میں میر جعفر کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا رکن میر صادق کے نام سے یہاں معروف ہے اور جو سلطان شہید کا نمک حرام وزیر اور اسلام کا کافر بندہ تھا، دروازہ بند تھا، میرے رفیق نے بیان کیا کہ اس کی قبر پر جوتوں کا ڈھیر ہے اور جس زائر کا وہاں سے گزر ہوتا ہے، وہ اب تک جوتوں کی نذر اس کی قبر پر پیش کرتا ہے، دل نہ چاہا کہ دامن چشم اس مجرم اسلام کے دیدار سے آلودہ کروں۔

دریا دولت باغ پہنچا، یہ ایک باغ ہے جس کے وسط میں ایک عالی شان عمارت ہے، جس میں سلطان رہا کرتا تھا، عمارت غالباً لکڑی کی ہے، یا مجھے ایسا معلوم ہوا، تمام دیواریں اور سقف مختلف خوش نما رنگوں سے رنگی تھیں، جس پر نہایت باریک بوٹے بنے تھے، سب سے پہلے یہاں سیاح کی جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ اس عمارت کے سامنے کی دیوار ہے، تمام دیوار پر سلطان ٹیپو اور حیدر علی کے معرکوں کی تصویریں ہیں، ابتدائے معرکہ سے لے کر آخیر معرکہ تک کی تصویریں ہیں، کہیں وہ رقص وسرود میں بیٹھا نظر آتا ہے، کہیں وہ سویا ہے، کہیں اس کی گردن شہنشاہ حقیقی کے سامنے جھکی نظر آتی ہے، کہیں وہ بیٹھا قرآن مجید تلاوت کر رہا ہے، غرض عجیب منظر ہے، گھنٹوں تک حیرت نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور میں تعجب اور حسرت سے ایک ایک سپاہی، ایک ایک سوار بلکہ ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا، آخر رفیق کی آواز نے چونکا دیا اور ہم یہاں سے نکلے۔

قلعہ دیکھا جو صرف پتھروں سے بنایا گیا تھا اور جس کے چاروں طرف کاویری ندی طواف کرتی ہے، قلعہ توڑ دیا گیا ہے، کچھ کچھ آثار باقی ہیں، قلعہ کے دروازہ سے نکل کر سامنے

شاہی جامع مسجد سنگی نظر آئی، نیچے مکتب یا مدرسہ کے کام کی عمارت ہے، اوپر مسجد ہے، وسیع اور عالی شان ہے، منارہ بلند ہے، تقریباً سوڈیڑھ سو زینے ہیں، ابتدائی زینے سنگی اور آخری ہیزمی ہیں، مسجد میں ایک کتبہ ہے جس میں پانچ شعر ہیں، میں نے صرف دونقل کیے ہیں:

اول	گر حضرت سلیماں اندر زمان ماضی	تعمیر مسجدے کرد نامش نہاد اقصیٰ
آخر	مانند زر چو جویا گشتم برائے تاریخ	طاعت سرائے ثابت ہاتف نمو لقا

۱۲۳۵ھ

یہاں کی سیر ختم ہو چکی تھی، اسٹیشن پہنچا، یہاں سے بنگلور روانہ ہوا، بنگلور سے میں وانمباڑی کی طرف روانہ ہوا۔

ریاست میسور کا اب علاقہ ختم ہوا، میسور کے متعلق میری رائے حیدر آباد سے زیادہ بہتر ہے، تعلیم یہاں نہایت عام ہے، اسکولوں سے ہر جگہ لڑکے لڑکیاں آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں، اسکولوں کی تعداد نہایت کافی ہے، کالج بھی ہیں، ٹاٹا انسٹیٹیوٹ ہے جہاں مختلف صنعت وحرفت کی تعلیم ہوتی ہے، عورتوں میں بھی تعلیم شائع ہے، پردہ نہیں ہے آزادی ہے، اس لیے لوگوں کی رائے ہے کہ اخلاقی حالت اچھی نہیں، ایک عجیب بات یہاں کی نسبت سنی کہ یہاں ہندوستانی محبوب اور یورپین ویورشین عاشق اور یورپین اور یورشین معشوق اور ہندوستانی عاشق نہایت کثرت سے ہیں۔

مسلمانوں میں یہاں بھی یہی مرض ہے جو ہر جگہ ہے، یعنی جہالت، اب تعلیم پھیل رہی ہے، ایک محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن آف میسور قائم ہے، جس کی طرف سے کچھ نائٹ اسکول قائم ہیں، کچھ واعظ ہیں جو مسلمان قیدیوں میں وعظ کہتے ہیں، چندۂ طرابلس میں یہاں کے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا اور تقریباً دو ہزار کا چندہ ہوا، یونیورسٹی میں بیس ہزار کا فنڈ وصول ہوا، ایک فری ریڈنگ روم قائم ہے اور بھی قومی تحریکیں مثلاً مسلم ہال، تعلیمی وظائف اور انتظام اوقاف اسلامیہ جاری ہیں مگر ان تحریکات کا نفس ناطقہ کون ہے؟ نواب غلام احمد۔

وانمباڑی دامن کوہ میں ایک متوسط اسلامی آبادی ہے، باشندے زیادہ تر مسلمان ہیں، وہ خوش حال تاجر ہیں، قومی تخیل یہاں قابل تعریف ہے، مسلمانان مدراس کا قومی ہائی اسکول یہیں قائم ہے، یہاں تقریباً دس بارہ مسلمانوں کے ابتدائی مدارس، دو زنانہ مدرسے، دو کلب اور عربی مدرسے اس ہائی اسکول کے سوا اور موجود ہیں، ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ماسٹر مسٹر قریشی ہیں۔

اس شہر میں میرے دو تقریریں ہوئیں، ایک ہائی اسکول میں طلبہ اور ماسٹروں کے سامنے موضوع بحث تعلیم تھا، دوسرا اسی شام کو بعد مغرب جامع مسجد میں حب رسول ﷺ پر وعظ کہا۔

وانمباڑی سے تیرہ چودہ میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی مقام گڑآمبور ہے، یہیں وہ میدان ہے جہاں چاند خاں اور انور الدین خاں میں حکومت کرناٹک کے لیے فیصلہ کن لڑائی ہوئی، دونوں مدعی تھے، چاند خاں کے طرف دار فرانسیسی تھے اور انور الدین خاں کے انگریز، انور الدین خاں گو مارا گیا لیکن فتح انگریزوں کو ہوئی، یہیں وہ پہاڑ واقع ہے جس پر ایک نہایت مضبوط قلعہ تعمیر تھا، اسی پہاڑ کے سلسلہ میں حیدر علی اور ٹیپو نے اپنی وہ جنگی سڑک تیار کی تھی جس پر میسور سے چل کر چھپتا چھپاتا ساحل مالا بار تک پہنچ جاتا تھا اور انگریزوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی، اس قدیم سڑک کا نشان اب تک باقی ہے، یہیں والی کرناٹک کا ایک مستحکم قلعہ میدان میں تھا، جس کی کچھ دیواریں اور دروازہ اب تک باقی ہے، جو کاروان گذشتہ کا گویا ایک صرف نقش قدم ہے، میں احباب کے ساتھ گڑآمبور گیا، ایک ایک چیز دیکھی، پہاڑ پر چڑھا، میدان میں پھرا، انور الدین خاں کے مقام شہادت پر ایک چبوترہ بنا ہے، قبر یہاں نہیں ہے مگر مجاور ہیں، مجاوری کا کچھ وقف ہے، پہاڑ پر ایک دو کمین گاہیں اب تک موجود ہیں، یہاں میدان میں ایک معمولی سے مسجد اور گنبد قبر ہے، جو زمانہ جنگ کے پہلے کی تعمیر ہے، مسجد پر کتبہ لگا ہوا ہے:

میر صفدر عز شانہ منبع جود و کرم ساخت مسجد بہر طاعت فی المثل بیت الحرم

گفت رضوانم بگو تاریخ ایں عالی بنا ختم شد از فضل رب مسجد کبیت محترم

محمد قانع کتبہ ابوتراب باہتمام میر محمد حسین عرف سید کری

یہاں کی زیارت سے واپس آ کر ایک دن کے بعد وہاں پہنچا جو میرے سفر کا منتہا تھا، یعنی شہر مدراس، مدراس میں ڈیڑھ دن صرف رہا، نواب غلام احمد کا وہاں کمرشیل آفس ہے، نواب صاحب کے نائب محی الدین پاشا اسٹیشن پر موجود تھے، تپاک سے ملے اور جب تک میں رہا اخلاق و محبت سے ملتے رہے، ڈیڑھ دن کے لیے آفس کی موٹر میرے لیے وقف کردی، اتنی مدت میں جو کچھ دیکھ سکا، دیکھا، یہاں کی مشہور چیزیں مچھلیوں کا عجائب خانہ، ہائی کورٹ کی عمارت، لا کالج، کرسچین کالج، فورٹ سینٹ جارج، ساحل مرینا وغیرہ ہیں، یہ تمام چیزیں دیکھیں، مچھلیوں کا عجائب خانہ یہاں کی مشہور اور مخصوص چیز ہے، سمندر کے کنارے ایک مختصر عمارت ہے، جس کے چاروں طرف شیشہ کی الماریاں ہیں، جن میں پانی بھرا ہے، پانی اور مچھلیوں کی اصل قوت قائم رکھنے کے لیے برقی تار اس میں دوڑائے ہیں، ان مختلف الاشکال مختلف الالوان مچھلیوں کو دیکھ کر خدا کی قدرت نظر آئی، کوئی شکل، کوئی رنگ ایسا نہ ہوگا جس کی مچھلی نہ ہو، عجائب المخلوقات کے مصنف کہتے ہیں کہ جس طرح اٹھارہ ہزار مخلوق عالم میں خدا نے پیدا کی ہیں اسی طرح اٹھارہ ہزار مخلوق عالم بحر میں بھی ہیں، اس عجائب خانہ کو دیکھ کر میں اس مسئلہ پر ایمان لے آیا۔

یہاں کا مردہ عجائب خانہ دیکھا، مگر عجائب خانہ کلکتہ کے سیاح کے لیے کوئی دل چسپی کی چیز نہیں، البتہ اسلحہ خانہ میں کچھ دل چسپی ہے، مگر میں نے یہاں صرف ایک چیز دیکھی اور وہ گویا میری سیر کا حاصل تھی، یعنی دو قلمی تصویریں سلطان حیدر علی اور ٹیپو کی فوجی نقل و حرکت کی، بیچ میں سلطان کا ہاتھی جس پر سلطان سوار ہے، امرا گھوڑوں پر آگے پیچھے ہیں، توپوں کا سلسلہ ایک طرف ہے، سوار دو خط مستقیم میں منقسم ہو کر داہنے بائیں آگے پیچھے

پیدل ہیں، اونٹوں پر خیمے لدے ہیں، سب کے آگے ہاتھی پر سرخ پرچم لہرا رہا ہے اور اسی قواعد کے ساتھ فوج کوچ کررہی ہے، عجیب سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا، میرا جسم اس وقت گو بیسویں صدی میں تھا لیکن میری روح ڈیڑھ صدی پیچھے کے مناظر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، ایک کتب خانہ بھی ہے، وسیع ہے، انگریزی کتابوں کا انبار، مشرقی شاخ کی نسبت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں یہ شاخ نہیں، تعجب ہے، آخر حکومت کرناٹک کا کتب خانہ کہاں گیا، ہائی کورٹ کی عمارت اسلامی طرز کی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی اسلامی عمارت تھی جس کو قطع و برید کے بعد ہائی کورٹ بنایا گیا۔

یہ سب چیزیں دیکھیں، مگر میری آنکھ اس چند بالشت زمین کی زیارت کی مشتاق تھی جہاں اسلامی علوم وفنون کے بحر زخار کی آخری موجیں سمٹ کر سما گئی ہیں یعنی بحر العلوم کی تربت پاک، نواب والا جاہ والی کرناٹک کی بنوائی ہوئی یہاں پتھر کی ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے، اسی کے ایک پہلو میں بعض شاہان ارکاٹ کا مقبرہ ہے، بحر العلوم کی قبر بھی ان ہی سلاطین کے پہلو بہ پہلو ہے، علم کے تاج دار کا رتبہ دولت ومملکت کے تاج دار سے کم نہیں، مرقد مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھا، افسوس قبر پر کوئی کتبہ نہیں، جاہل قرآن خواں مقرر ہیں جو ایصال ثواب کے لیے ہر روز وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھا کرتے ہیں، ان سے اس شہر خاموش کے بعض باشندوں کے نام وحالات پوچھے تو وہ انتہائے جہالت کی وجہ سے اتنا بھی نہیں بتا سکے کہ ان گم نام وروں کے نام کیا ہیں۔

یہاں ایک ہمارا ہم وطن بھی سو رہا ہے، جس کی قبر پر پتھر کا ایک کتبہ ہے، جس پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ ہے، نام وجیہ الدین ابن مجیب اللہ، باشندہ عظیم آباد کندہ ہے، تاریخ وفات سن ۱۲۲۹ھ لکھی ہے۔

جامع مسجد وسیع اور عالی شان، مادۂ تاریخ شعرا نے اچھا نکالا ہے:

امیر الہند والا جاہ فرمود   بنا ایں مسجد فرخندہ منظر

ز دل از بہر تاریخ بنائش ندا آمد کہ ذکر اللہ اکبر

ساخت طاعت گہ اسلام شہ دیں پرور آنکہ فرمان براں ہست زمہ تا ماہی

بہر تاریخ بنائش بخلد ہاتف گفت نام فرخندہ و بے مسجد والا شاہی

اسی روز رات کو دس بجے کی گاڑی سے مدراس سے بمبئی روانہ ہوا، راستہ میں دوشہروں کے دیکھنے کو دل مچلا، گلبرگہ اور پونہ، مگر آئندہ کے وعدہ پر سمجھایا تو بارے مان گیا۔

جسٹس عبدالرحیم سے مدراس میں ملنے کا وعدہ تھا، مگر افسوس قلت فرصت کی وجہ سے نہ مل سکا، جسٹس موصوف متواضع اور خاک سار ہیں اور متاثر دل رکھتے ہیں، مجھ سے نہایت خلوص سے بار بار ملے۔ والسلام سید سلیمان ۱۵/اگست ۱۹۱۲ء (از معارف اکتوبر ۱۹۵۵ء)

سیرت نگاری کی تربیت: علامہ شبلیؒ کے ذمہ اتنے گوناگوں قومی کام تھے اور ہر طرف سے ان کی اتنی طلب تھی کہ بمبئی کے گوشہ عافیت میں بھی زیادہ دنوں تک بیٹھنا نصیب نہ ہوا، چنانچہ ستمبر ۱۹۱۲ء میں پھر لکھنؤ آنا پڑا، مگر سیرت کی تالیف کا سلسلہ وقفہ وقفہ سے جاری رہا، اس کی تفصیل مقصود نہیں، محض یہ دکھانا ہے کہ آئندہ چل کر جس ذات کو سیرت نبویؐ کی تکمیل کی سعادت ملنے والی تھی، اس کو ابتدا ہی سے قدرت کی جانب سے اس کام کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، چنانچہ سید صاحب شروع سے آخیر تک سیرت کی تالیف میں مددگار رہے، جس کا تذکرہ مکاتیب شبلی میں جا بجا موجود ہے، مثلاً ایک خط میں مولانا شبلی ان کو لکھتے ہیں:

''تم اب کیا کر رہے ہو، اگر کوئی اور کام نہ ہو تو اب دوسرے حصہ کے اجزا کو لے لو۔''

(مکاتیب بنام سلیمان، نمبر ۴۱)

۱۸/اپریل ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں ہدایت دیتے ہیں:

''تم عرب بائدہ یا عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے پیچھے نہ پڑو،[1] جو یمن شام وغیرہ

---

[1] سید صاحب نے اس کے اوپر یہ حاشیہ تحریر کیا ہے، سیرت کے لیے بطور مقدمہ کے عرب جاہلیت کی تاریخ کی ضرورت تھی، اسی کے متعلق یہ ہدایت ہے، اسی مقدمہ کو بڑھا کر مکتوب الیہ نے ارض القرآن میں شامل کر دیا ہے۔

میں قائم تھیں، ان کے متعلق چند صفحات میں اجمالی بحث کافی ہوگی، تمام کوشش نجد وحجاز و یثرب کے متعلق معلومات کے جمع کرنے میں صرف کرنی چاہیے، تم ان ہی مقامات کے متعلق معلومات بہم پہنچاؤ، آبادی، کعبہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واقعات میں جس قدر تفصیلات مل سکیں محقق وتلاش کرو۔'' (مکتوب بنام سلیمان، نمبر ۴۳)

۱۴؍ جولائی ۱۹۱۳ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تم نے کعبہ کی تعمیر اور ذبح[1] کے متعلق کچھ نہیں لکھا، قرآن مجید میں **فبشرہ بغلام حلیم** جہاں ہے اس سے ہر شخص نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو مراد لیا ہے، کیوں کہ بشارت کا لفظ ان ہی کے متعلق دوسرے مواقع میں آیا ہے اور اسی آیت کے بعد یہ آیت ہے **فلما بلغ معه السعی** الخ، اس لیے اس سے بھی حضرت اسحٰق علیہ السلام مراد ہو سکتے ہیں، اس کا کیا جواب ہے۔'' (مکتوب بنام سید سلیمان، نمبر ۴۸)

۲؍ اگست ۱۹۱۳ء کے خط میں ارقام فرماتے ہیں:

''سیرت کے متعلق جو عام امور ذہن میں آئے یعنی کن کن امور پر زیادہ توجہ کی جائے، وغیرہ وغیرہ، ان کو وقتاً فوقتاً جب جو بات ذہن میں آئے لکھ بھیجا کرو۔'' (مکتوب نمبر ۴۹)

۷؍ اگست کے خط میں ارشاد فرماتے ہیں:

''علالت کی وجہ سے دو گھنٹہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، تمہارے چلے جانے کا افسوس ہے، تم[2] ہوتے تو لائف کے علاوہ کتاب کے اور حصے ساتھ ساتھ ہوتے جاتے، ان حصوں کو تم اچھی طرح لکھ سکتے ہو۔'' (مکتوب نمبر ۵۱)

۲۸؍ نومبر ۱۹۱۳ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''دو چار مہینہ کے لیے سیرت میں تمہاری ضرورت ہے، یوں تو ارادہ ہے کہ سیرت کا

---

[1] یعنی حضرت اسماعیل وحضرت اسحٰق علیہما السلام میں ذبیح کون تھے۔ [2] اس زمانہ میں سید صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال میں چلے گئے تھے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

سلسلہ مستقل قائم کر دیا جائے اور کم سے کم میری زندگی تک تو باقی رہے لیکن بہر حال تم کو زیادہ روکنا نہیں چاہتا[1]۔ (مکتوب نمبر ۶۱)

۲ ردسمبر ۱۹۱۳ء کے خط میں حیدر آباد سے لکھتے ہیں:

''۶ ردسمبر کو یہاں سے روانہ ہوں گا، بھوپال میں دو چار دن ٹھہروں گا، پھر لکھنؤ یا الہ آباد کانفرنس کی شرکت سے فارغ ہو کر کہیں مستقل قیام کروں گا، اس وقت تم کو تکلیف دوں گا، تمہاری ضرورت اس لیے ہے کہ مبیضہ پر نظر ثانی کرو، کوئی بات غلط درج ہوگئی ہو یا فروگذاشت ہوگئی ہو ان کو نوٹ کرتے جاؤ، بعض امور میں مشورہ کی بھی حاجت ہے، چند مہینہ کے بعد تم بالکل آزاد ہو، جو تمہاری اسکیم ہو اس کے موافق کام کرو، میں ہر کام میں مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔ (مکتوب نمبر ۶۲)

۷ ردسمبر ۱۹۱۳ء کے خط میں پھر تحریر فرماتے ہیں:

''حاشا یہ مقصود نہیں کہ تم کو اسی دائرہ میں پابند رکھوں، میری ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ اعزہ واحباب درس گاہ سے نکل کر ملک میں پھیلیں اور الگ الگ نظام شمسی قائم کریں لیکن جب تک موقع نہ نکل آئے اور ایک محدود مدت تک (جو چار پانچ مہینہ سے متجاوز نہ ہوگی) سیرت کے کام میں رہنا چاہیے کہ پہلی جلد تیار ہو جائے، ضعف حافظہ و دماغ کی وجہ سے اپنی نظر ثانی میں اطمینان نہیں، مسائل ذیل پر نہایت تحقیق و تدقیق سے نظر ڈالو، کعب اشرف یہودی اور ابو رافع کا قتل باذن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بخاری میں منقول ہے اس کو کیوں کر اخلاق کے موافق تسلیم کیا جائے۔

راوی اول جابر بن عبداللہ ہیں، کیا وہ اس واقعہ میں شریک تھے یا شرکا سے سنا تھا، آیت تخییر سے کیا مراد ہے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عدل بین الازواج باقی نہیں رہا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیثیں ترجی من تشاء کے متعلق کہاں تک صحیح ہیں۔''

اس قسم کے اور بہت سے خطوط ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کو کس

---

[1] یعنی سید صاحب کے مشاغل سے۔

طرح رفتہ رفتہ سیرت نبوی کی تالیف کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

ندوہ کی اسٹرائک اور مولانا شبلی کا استعفا: ندوہ کے کارکنوں کی ایک جماعت عرصہ کے مولانا شبلی کے خلاف تھی اور دونوں میں برابر کشمکش چلی آ رہی تھی، مخالفین قدم قدم پر مخالفت کرتے تھے، اس لیے آخر میں تنگ آ کر مولانا نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ کی معتمدی سے استعفا دے دیا، اس کو مجلس انتظامیہ نے بھی منظور کر لیا، دار العلوم کے طلبہ مولانا شبلی کی حمایت میں تھے، اس لیے منتظمین نے ان پر بھی قید و بند عائد کیں اور بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ طلبہ نے اسٹرائک کر دی، یہ اتنی اہم اسٹرائک تھی کہ اس زمانہ کا پورا اسلامی پریس اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھا تھا اور سارے مسلمان لیڈر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، اس اسٹرائک کا سلسلہ کئی مہینہ جاری رہا اور بڑی ہنگامہ آرائی کے بعد حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور اس زمانہ کے دوسرے لیڈروں اور علماء و اکابر کی کوششوں سے مئی ۱۹۱۴ء میں اس کا خاتمہ ہوا اور فریقین میں صلح ہو گئی، مگر مولانا شبلی مخالف جماعت کے ساتھ کام نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے دوبارہ معتمدی قبول نہیں کی اور صرف ایک رکن کی حیثیت سے ندوہ کی خدمت کرتے رہے، ان واقعات کی تفصیل بڑی طویل ہے جس سے اس کتاب کو تعلق نہیں ہے، اس لیے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے، سید صاحب کے قلم سے حیات شبلی میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔

الہلال کلکتہ کے عملۂ ادارت میں: مولانا ابو الکلام اور سید صاحب دونوں کی علمی تربیت مولانا شبلی کے دامن میں ہوئی تھی، ندوہ کے شباب کے دور میں دونوں عرصہ تک ساتھ میں رہ چکے تھے، اس زمانہ میں جتنے ہونہار نوجوان مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے، ان سب کو الندوہ کی ایڈیٹری یا سب ایڈیٹری ملتی تھی، چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد بھی اس کے سب ایڈیٹر رہ چکے تھے، اس تعلق سے وہ اور سید صاحب دونوں خواجہ تاش اور پرانے رفیق تھے، اس لیے ۱۹۱۴ء میں جب مولانا ابو الکلام نے اپنا مشہور اخبار ''الہلال'' نکالا تو سید صاحب کو اس کے عملہ

ادارت میں شرکت کے لیے بلایا، انہوں نے اس وقت ندوہ کو چھوڑنا پسند نہ کیا، مگر مولانا شبلی کے مستعفی ہونے کے بعد وہ بھی ندوہ سے برداشتہ خاطر ہو گئے، مولانا ابوالکلام کا اصرار برابر قائم تھا اور الہلال سید صاحب کے ذوق کا اخبار تھا، اس لیے مئی ۱۹۱۴ء میں وہ ندوہ سے مستعفی ہو کر الہلال کے عملہ ادارت میں شامل ہو گئے، ۲۳ مئی ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں سید عبدالحکیم صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہیں:

''میں کلکتہ میں ہوں، دیسنہ کا حال معلوم نہیں، آپ کہاں ہیں اور کیسے ہیں، الہلال کا تعلق مولانا آزاد کے اصرار سے قبول کیا تھا، بالفعل استی دیں گے، آئندہ ترقی۔''

یہی زمانہ ندوہ کے طلبہ کی اسٹرائک کا تھا، الہلال پہلے سے مولانا شبلی کا حامی تھا، سید صاحب کے پہنچ جانے سے اس کی حمایت اور پرزور ہو گئی اور اس نے مولانا شبلی اور طلبہ کی حمایت میں بڑا سرگرم حصہ لیا اور بڑے پرزور مضامین لکھے، مولانا شبلی بھی سید صاحب کو برابر ندوہ کے حالات کی اطلاع دیتے رہتے تھے، جس کا تذکرہ ان خطوط میں موجود ہے، جو انھوں نے سید صاحب کے نام ان کے قیام کلکتہ کے زمانہ میں لکھے تھے۔

مسجد کان پور کی شہادت: اتفاق سے یہی زمانہ جنگ بلقان کا بھی تھا، گو جنگ ختم ہو گئی تھی مگر اس کے اثرات باقی تھے اور حکومت برطانیہ کی پالیسی سے ہندوستان کے مسلمانوں کے دل غم وغصہ سے لبریز تھے کہ اگست ۱۳ء میں مسجد کان پور کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا، اس سے مسلمانوں میں پھر آگ لگ گئی۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ کان پور کے محلّہ مچھلی بازار میں لب سڑک ایک مسجد اور اس کے قریب ہی ایک مندر تھا، کان پور کی میونسپلٹی اس کے پاس سے ایک نئی سڑک نکالنا چاہتی تھی اور مندر کے بچانے میں مسجد کا وضو خانہ اس سڑک کی راہ میں پڑتا تھا، میونسپلٹی نے اس کو زبردستی گروا دیا، اس واقعہ سے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، اگست ۱۹۱۳ء میں کان پور کے مسلمانوں نے مولانا آزاد سبحانی کی سرکردگی میں اس کے خلاف احتجاجی جلسہ

کیا، اس جلسہ نے اور زیادہ جوش پیدا کر دیا اور مسلمانوں کا ایک گروہ جن میں بچے بھی تھے، مسجد پہنچا اور وضو خانہ کی گری ہوئی اینٹیں اٹھا اٹھا کر منہدم دیوار پر رکھنے لگا، یہ دیکھ کر مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے مسجد پر متعین فوج سے گولی چلوا دی، اس میں بہت سے مسلمان جن میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے، زخمی اور شہید ہوئے، اس واقعہ سے مسلمانوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا اور مسلمان مقررین، اہل قلم اور شعراء نے اپنی تقریروں، تحریروں اور نظموں سے پورے ہندوستان میں آگ لگا دی، اخبار الہلال نے جو اس حادثہ میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا، بڑے پرجوش مضامین نکلے، سید صاحب نے مشہد اکبر کے عنوان سے ایسا آتش باز مضمون لکھا کہ گورنمنٹ کو اس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا، چنانچہ اس نے اس پرچہ کو جس میں یہ مضمون لکھا تھا، ضبط کر لیا، اس مضمون کا ابتدائی حصہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، جس سے اس کی آتش فشانی کا اندازہ ہوگا:

سید صاحب کا ایک پرجوش مضمون

اے محمد! گر قیامت سر بروں اری ز خاک　　سر بر آور دیں قیامت درمیان خلق بیں

خون خلق بے گناہ بر حریم مسجد است　　ز آستاں بگذشت و ما را خون دل ز آستیں

پیروان دین حق را خون بہ خاک آغشتہ شد　　از پے خاکے کہ ہر مسلم بروں ساید جبیں

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (آل عمران-۱۷)

زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہیے مگر کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، خاک ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا، ہندوستان کی زمین بھی پیاسی تھی، خون چاہتی ہے، کس

کا؟ مسلمانوں کا، آخرکار سرزمین کان پور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش وخروش میں ہے، اپنی قربان گاہ کے لیے نذر مانگتی ہے، کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے، صوبہ متحدہ کا بادشاہ (سر جیمس مسٹن) بالآخر آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لیے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے، وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے:

ع سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہمالیہ! تو ہندوستان کا سب بڑا پہاڑ ہے، تو تند وتیز ہوا کو روک دیتا ہے، تو پر غیظ و غضب بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے، کیا تو ہمارے شدائد ومصائب کا طوفان نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے حزن وغم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا لیکن کیا لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا، برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا لیکن کیا اس سے بھی کم جتنا ایک راستہ کی زینت وآرائش کا۔

۳/ اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے، بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف وناتواں وغیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے، انہیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل وانصاف کو زخمی کر رہی ہیں، انہیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی حکومت قائم ہے، وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں، ناتوانو! تم تو اس سے عداوت کر رہے ہو، جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔

غیر آئینی خوں ریزی

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کان پور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشم نم و بادل پرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا، کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ، چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم و اسماعیل کی زبان پر جاری تھی:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

پروردگار! اپنے گھر کے لیے ہماری ان چند اینٹوں کو قبول کر) تو سن رہا ہے، جان رہا ہے۔

یہ پر اثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کان پور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہے اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے، پردہ جب چاک ہوتا ہے تو میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں، جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں، جو افسوس دم توڑ چکیں۔ (الہلال، ۱۳؍اگست ۱۹۱۳ء)

یہ مضمون الہلال کے رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ جن لوگوں کو مضمون نگار کا علم نہیں وہ اس کو مولانا ابوالکلام کا مضمون سمجھتے ہیں، سید صاحب نے الہلال کے تعلق کے زمانہ میں بہت سے مضامین لکھے مگر ان میں سے صرف چند ان کے نام سے شائع ہوئے، ان میں ایک مضمون ''عربی زبان اور علمی اصطلاحات'' کے عنوان سے ہے جو اگست و ستمبر ۱۹۱۳ء کے الہلال میں شائع ہوا، دوسرا علوم قرآن پر ہے جو فروری اور مارچ ۱۹۱۴ء کے الہلال میں چھپا ہے، احرار اسلام بھی ان ہی کا ہے، جو الہلال کے کئی نمبروں میں نکلا ہے، مگر ان کے نام سے نہیں ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد مضامین ایسے ہیں جو سید صاحب کے قلم کے ہیں مگر ان کے نام سے نہیں شائع ہوئے تھے، اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب منسوب ہو گئے، جس کا ذکر خود سید صاحب کے ایک بیان میں ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''الہلال میں چوں کہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے، اس لیے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کو شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام کی طرف منسوب کردیا، حالاں کہ یہ صحیح نہیں، ''الحریۃ فی الاسلام'' ''تذکرۂ نزول قرآن'' ''حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق'' ''قصص بنی اسرائیل'' اور ''مشہد اکبر'' وغیرہ میرے مضامین ہیں[1]۔''

دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری: اگرچہ سید صاحب مولانا ابوالکلام کے اصرار سے الہلال میں چلے گئے تھے مگر ان کے جیسے ہونہار کے لیے یہ مستقل جگہ نہیں ہوسکتی تھی، مولانا شبلی بھی اس کو پسند نہ کرتے تھے اور وہ ان کے لیے کسی معقول اور مناسب جگہ کی تلاش میں تھے، اتفاق سے جلد ہی اس کی صورت نکل آئی، دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی، مولانا شبلی نے پروفیسر شیخ عبدالقادر کے ذریعہ کوشش کرکے سید صاحب کو یہ جگہ دلوا دی، چنانچہ وہ ۱۹۱۴ء کے شروع میں کلکتہ سے پونہ چلے گئے، مولوی سید عبدالحکیم صاحب دسنوی کو ۳؍جنوری ۱۹۱۴ء کے خط میں اس کی اطلاع دیتے ہیں:

''مکرمی! میں کہاں سے کہاں پہنچا، لکھنؤ آنے کی اطلاع دے چکا ہوں، ایک ہفتہ لکھنؤ رہ کر حضرت مولانا شبلی کی زیارت کرکے آگرہ پہنچا، آگرہ کی نمائش گاہ اندنس اور لیگ[2] کو دیکھتا ہوا کل پونہ پہنچا، مولانا کی کوشش سے میں یہاں دکن کالج میں اسسٹنٹ پرشین لکچرر ہوگیا ہوں، میرا ارادہ قبول منصب کا نہ تھا، مولانا کا سخت اصرار ہوا، آخر میں مجھے مجبور ہونا پڑا۔

پروفیسر شیخ عبدالقادر[3]، ایم۔اے یہاں پرشین لکچرر ہیں، وہ مولانا کے احباب مخلصین میں ہیں اور میرے مخدوم، ان کی وجہ سے تمام مراحل طے ہوگئے، ان ہی کے قریب مکان لے لیا ہے، تنخواہ بالفعل سو ہے، ترقی دوسو تک اور دس روپے سالانہ، دیکھیے کب تک نبھتی ہے، لیگ امسال

---

[1] رسالہ ''مستقبل'' کراچی اکتوبر ۱۹۴۹ء [2] اس زمانہ میں آگرہ میں لیگ اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے ہوئے تھے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ [3] شیخ صاحب بڑے ذی علم اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، دارالمصنفین کے رکن بھی تھے، ۱۹۵۲ء میں انتقال کیا۔

جیسی بھی رہی لیکن پریسیڈنشیل اسپیچ لاجواب ہے اور کانگریس کے ہم پلہ، حزب المتاخرین کو پوری شکست ہوئی، اخبارات میں دیر سے پہنچے گی، اس لیے بھیجتا ہوں۔''

سید عبدالحکیم ہی کے نام کے دوسرے خط کے بعض حصے بہت دل چسپ ہیں، جس سے اس زمانہ کی بعض چیزوں پر روشنی پڑتی ہے، یہ خط ۱۱؍جنوری ۱۹۱۴ء کا مرقومہ ہے، اس میں لکھتے ہیں:

''ہاں اس وقت سو ہیں لیکن دس روپے سالانہ ترقی ہے، دس برس میں دوسو، ایک عربی خواں کے لیے اور کیا چاہیے لیکن میری طبع غیر مستقل، دو تین برس سے کب آگے بڑھے گی، خوب کہی، آپ کا حال اس مولوی سے کم نہیں جس نے کہا تھا کہ حضرت علیؓ کس قدر بہادر تھے کہ عرب سے چلے تو چند روز میں درۂ خیبر پر آکر دم لیا، اس بے وقوف نے عرب کا خیبر اور ہندوستان کا درۂ خیبر ایک سمجھا، آپ کہتے ہیں پونہ شاید صوبہ مدراس کا صدر ہے۔

پونہ بمبئی کے پاس پریسیڈنسی کا دوسرا شہر ہے، بمبئی پہلا شہر ہے، موسم گرما میں بمبئی گورنمنٹ کا دفتر یہیں ہوتا ہے، وہ زمانہ یہاں کے سیزن کا ہے، موسم بہار ہوتا ہے، یہ شہر برہمنوں اور مرہٹوں کا صدر مقام اور مسٹر تلک کا دارالحکومت ہے، مسلمانوں کے سوا یہاں کی اور قومیں برہمن، مرہٹہ، پارسی، یہودی، سب ترقی یافتہ اور ذی ثروت ہیں لیکن دنیا کی وہ قوم جو ہر جگہ خستہ حال ہے یہاں خستہ تر ہے، تمام پونہ میں ایک بھی مسلمان گریجویٹ، وکیل یا بیرسٹر نہیں، یہاں کے سب سے بڑے لیڈر مولوی رفیع الدین بیرسٹر ہیں، جو یہاں کے اندھوں میں...... راجہ ہیں، کوئی یہاں مذہبی آدمی نہیں، مولوی تک نہیں، بعض مسلمانوں اور برہمنوں کے علاوہ کسی قوم میں پردہ نہیں، حسن یہاں آزادو بے نقاب ہے، عورتوں میں تعلیم و تہذیب بدرجہ اولی......ساوری یہاں ایک چھوٹی سی ریاست ہے، شب کو وہاں کے نواب کے آنر میں ایک سیٹھ کے یہاں دعوت تھی، اوروں نے تقریریں کیں، میں نے بھی کی اور یہ تجویز ہوا کہ یہاں ایک ہاسٹل مسلمان طلبہ کے لیے تیار ہو۔

دکن کالج گورنمنٹ کالج ہے، بمبئی کے الفنسٹن کالج کے بعد یہ دوسرے درجہ کا کالج

ہے، پرنسپل اور چار پانچ پروفیسر یورپین ہیں، بقیہ برہمن، مرہٹہ اور ہم دو مسلمان ہیں، کام کا وقت دو گھنٹہ ہے، سنیچر اور اتوار بالکل فرصت، کالج دور ہے، ایک گھنٹہ گاڑی پر آنے جانے میں لگتا ہے، غرض تین گھنٹے کالج کی نذر باقی تمام شب و روز فرصت، سیرت عائشہؓ لکھ رہا ہوں اس کے لیے مواد بہت نہیں ہے لیکن ایک ضروری کام ہے، اس لیے مختصر ہوگی، شاید سو صفحے، ایک دوسری کتاب ختم کے قریب ہے، تاریخ عرب[1] قدیم، اس میں بہت سے نادر مباحث ہیں، عن قریب پریس میں جائے گی، جو کتاب مولانا میرے لائے تھے[2]، سیرت عائشہؓ کے لیے مفید ہوگی، وہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس میں ایک شخص نے حضرت عائشہؓ کی ان تمام حدیثوں کو جمع کر دیا ہے جس میں انہوں نے دوسرے صحابیوں کی غلطیاں دکھائی ہیں۔

سعید رضا کے لیے اس صوبہ میں پروفیسر عبد القادر کی معرفت کوشش کرتا ہوں، **والامر بیداللہ۔**

بیچارے پروفیسر عبد القادر نہایت ستودہ صفات ہیں، ایم، اے ہیں، علم دوست ہیں، فرنچ جانتے ہیں، عربی مجھ سے پڑھتے ہیں، آپ سنتے ہیں میں نے یہاں ایک یہودی سے عبرانی پڑھنی شروع کی ہے اور انگریزی کو تقویت دے رہا ہوں۔

مولانا شبلی ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''پروفیسر صاحب (شیخ عبد القادر) نے تم پر اور مجھ پر دونوں پر احسان کیا ہے، ان کو عربی صرف صرف و نحو پڑھا دو، صرف ضروری مسائل جن سے عبارت پڑھنا آ جائے۔'' (مکتوب نمبر ۶۴)

سیرت عائشہؓ اور ارض القرآن کی تالیف کا آغاز: اوپر کے خط میں دو کتابوں کا ذکر ہے، سیرت عائشہؓ اور ارض القرآن، سیرت عائشہؓ کی تیاری سید صاحب بہت عرصہ سے کر

[1] اس سے مراد ارض القرآن ہے۔ [2] اس سے مراد امام سیوطی کا رسالہ ''عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدہ عائشہؓ علی الصحابہ'' ہے، یہ نادر قلمی رسالہ تھا، مولانا شبلی نے اس کی نقل سیرت عائشہؓ کے لیے فراہم کی تھی، وہ سیرت عائشہؓ کے پہلے دو ایڈیشنوں میں شائع نہ ہو سکا بلکہ تیسرے ایڈیشن میں شائع ہوا ہے۔

رہے تھے، اس کے لیے مواد کی فراہمی شروع کر دی تھی، بیگم صاحبہ بھوپال کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کی تکمیل کی بڑی تاکید کی، قیام پونہ کے زمانہ میں مولانا شبلی نے کئی مرتبہ اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی، ۳۰ رجون ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آج بھوپال سے خط آیا ہے، حضرت عائشہؓ کی سوانح کا بڑا تقاضا ہے یعنی جلد تیار کر دو، تم ایک مدت سے اس میں مصروف ہو، استدراک علی الصحابہ کا انتظار تھا، وہ میں نے تم کو دے دی ہے، ہاں اس کو مولوی شیر علی کے پاس فوراً بھیج دو، اب کیا انتظار ہے، مفصل جواب لکھو، کس قدر ضخامت ہوگی، مجتہدات لکھ دیے ہیں یا نہیں، بیگم صاحبہ معقول معاوضہ دیں گی، وہ یہ بھی چاہتی ہیں کہ ازواجؓ کی سوانح عمریاں بھی قلم بند ہو جائیں لیکن چوں کہ جلد چاہتی ہیں اور تم کو فرصت نہ ہوگی اس سے کچھ اور انتظام کرنا پڑے گا، حضرت عائشہؓ کے متعلق میری خاص معلومات ہیں، میں تمہارا مسودہ دیکھتا تو رائے ظاہر کرسکتا۔'' (مکتوب نمبر ۷۰)

ایک دوسرے مکتوب میں ہدایت فرماتے ہیں:

''مسند عائشہؓ میرے پاس ہے، میں دے دوں گا، طبقات میں لغویات زیادہ ہیں، اس سے کیا فائدہ، بخاری، مسلم، ابوداؤد کافی ہیں، یہ کتابیں یہاں کسی انجمن سے مل جائیں گی، شیخ عبدالقادر صاحب بھی لا سکتے ہیں، ان کے مجتہدات کے نوٹ میں دیکھوں تو بتاؤں کس قدر اضافہ ہو سکتا ہے، فن درایت کی وہ خاص موجد ہیں، ان کو خوب پھیلا کر لکھ سکتے ہیں، فقہیات اور اعتقادیات میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے، تم پورا خاکہ دو چار صفحوں میں لکھ کر بھیجو تو میں رائے دوں۔

ہاں اسلم جیراج پوری[1] نے بھی تو شاید حضرت عائشہؓ کی سوانح لکھی ہے، اس کو دیکھ لو، اس سے بہت الگ رہے، یا بہت آگے نکل جائے۔'' (مکتوب نمبر ۷۴)

ارض القرآن درحقیقت سیرت نبویؐ جلد اول کا مقدمہ ہے، جس میں عرب قدیم کے حالات تحریر کیے گئے تھے مگر یہ طویل زیادہ ہو گیا، اس لیے اس کا صرف خلاصہ سیرت

---

[1] مولانا اسلم جیراج پوری المتوفی دسمبر ۱۹۵۶ء۔

میں لیا گیا، جس کا ذکر مکاتیب میں موجود ہے، مکتوب نمبر ۸۳ میں اس مقدمہ کے متعلق ہدایات ہیں، اس کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''سیرت کے لیے بطور مقدمہ عرب جاہلیت کی تاریخ کی ضرورت تھی، اسی کے متعلق یہ ہدایت ہے، اسی مقدمہ کو بڑھا کر مکتوب علیہ نے ارض القرآن کر دیا ہے، پونہ کے زمانہ قیام میں سید صاحب نے اس کا پہلا حصہ مکمل کر دیا تھا، جس کا ذکر اوپر کے خط میں کیا ہے، مگر اس کی اشاعت کی نوبت دارالمصنفین کے قیام کے بعد آئی۔''

ابھی سید صاحب کو پونہ میں صرف ڈیڑھ سال گزرا تھا کہ مولانا شبلی کا وقت آخر ہو گیا، ان کو استاد کی وصیت کے مطابق ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آجانا پڑا۔

دارالمصنفین کا ابتدائی تخیل: دارالمصنفین کا ابتدائی تخیل مولانا شبلی کے دماغ میں سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں آیا تھا اور انہوں نے ندوہ کے اجلاس دہلی کے موقع پر دارالعلوم کی جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں ندوۃ العلما کے کتب خانہ کی ضرورت کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ:

''قومی و مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی طرح ایک کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضرورت ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم پہنچایا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں، جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو، بلکہ وقف عام ہوتا کہ ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ تجویز کی ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف

مطالعہ کتب اور تصنیف وتالیف ہو جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب کہ ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کرایا جائے۔'' (حیات شبلی ص ۶۸۸ تا ۶۸۹)

اس جلسہ میں مولانا شبلی نے سید صاحب کی تقریر کے لیے ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت کا عنوان مقرر کیا تھا اور یہ ہدایت فرمائی کہ اس سلسلہ میں وہ دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز پیش کریں، سید صاحب کی تقریر الندوہ میں چھپی تھی، اس کے آخر میں انہوں نے ان الفاظ میں یہ تجویز پیش فرمائی تھی:

''ندوہ العلما جس قسم کے علما اپنے مدرسہ میں تیار کرانا چاہتا ہے وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجہ عالمیت یا درجہ تکمیل کے بعد تالیف وتصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغہ تالیف وتصنیف قائم کیا جائے، جس سے علوم تاریخ اسلام کا احیاء ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ندوۃ العلما کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو، جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں، اردو زبان کی بہترین لائف الفاروق ہے لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ صفحوں کی کتاب ہندوستان، مصر، قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو کھنگال کر لکھی گئی ہے، یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مصنف کو یہ فرصت ووسعت نہیں مل سکتی کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ ونادر شائع ہوتی ہیں، اگر قوم ندوۃ العلما کے اقتدا میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کردے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو تو یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ نہایت آسانی سے اردو زبان میں جمع ہوجائے اور خصوصاً اس اسکیم کے قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہوگی کہ ممتاز طلبائے دارالعلوم کا ایک حصہ صیغہ تالیف وتصنیف کے لیے وقف کردیا جائے، جس کی اس وقت قوم کو نہایت سخت ضرورت ہے۔

دارالعلوم کی جدید عمارت میں ایک کتب خانہ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے جس میں کتب خانہ کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم ومصنفین کے لیے بنایا جائے جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف وتصنیف میں مشغول ہو، مادری زبان کو جس گہوارہ یعنی دہلی ہے، ان

تصنیفات کے ذریعہ ترقی دی جائے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم و مصنّفین جس کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے، اس کے مصارف اپنی جیب سے پورے کریں اور اس عمارت کا نام ''دارالمصنّفین'' ہو، بظاہر یہ تجویزیں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کی امداد سے جہاں آج بظاہر بہت سے مشکل بلکہ بظاہر محال کام انجام پارہے ہیں اس کتب خانہ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں، جس کے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔'' (حیات شبلی، ص ۶۹۰-۶۸۹)

اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ آپ کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوا دیں گے، مولانا نے اس کے جواب میں اگست ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں یہ نوٹ لکھا:

''جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کی بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے لیکن نواب صاحب چوں کہ علم دوست ہیں اس لیے انہوں نے علم پروری کا ایک بہانہ پیدا کرلیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت ''دارالمصنّفین'' کے نام سے تعمیر ہو، جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے متعلق باقاعدہ تصانیف ہوں، باہر کے مصنّفین اگر چاہیں تو اس میں آ کر رہیں، ان کے لیے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم و فنون کی کتابیں مہیا رہیں، چوں کہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف کا تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس لیے دارالمصنّفین کی تجویز ہر لحاظ سے موزوں ہے، نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لیے دس ہزار روپے درکار ہوں گے۔''

(حیات شبلی، ص ۶۹۱-۶۹۰)

اس کے بعد ندوہ میں اختلافات شروع ہو گئے اور ان جھگڑوں میں یہ خیال آ گے نہ بڑھ سکا، جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ کی معتمدی سے استعفا دینے کے بعد جب ادھر سے یکسوئی ہوئی تو پھر دارالمصنّفین کے قیام کی جانب متوجہ ہوئے، چنانچہ نومبر ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں منشی محمد امین صاحب زبیری کو لکھتے ہیں:

''ہاں یہ دونوں (سید صاحب اور مولانا عبدالسلام ندوی) اچھے بن گئے، کم بخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا، ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہر حال یہ طے ہو لے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں، انشاءاللہ سیرت ہی کا دفتر اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں پر حکمرانی کرتا ہے۔'' (مکاتیب بنام منشی محمد امین زبیری، نمبر ۱۸)

غرض دارالمصنّفین کا خیال اب اس قدر پختہ ہو گیا کہ ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ اس خیال کو ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ کرایا، ابتدا میں مولانا ابوالکلام کی رائے سے یہ طے پایا کہ چند طلبہ مولانا کے ساتھ رہیں جن کو خاص خاص فنون میں تیار کیا جائے، چنانچہ سید صاحب کو جون ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''آزاد (مولانا ابوالکلام) سے مشورہ ہوا، رائے یہ ٹھہری کی اصل غرض اشخاص کا تیار کرنا ہے، اس لیے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں اور ان کو کسی فن میں تیار کر دوں اور ان میں صحیح مذاق پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف کا تکفل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا، اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو، نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہیے، اس میں کچھ ماہوار تم بھی دو۔''

(مکاتیب سلیمان، نمبر ۶۸)

دارالمصنّفین کے قیام کا ارادہ مصمم ہو گیا تھا، مگر ابھی یہ طے نہیں ہو سکا کہ کہاں قائم

کیا جائے، مولانا کی دلی خواہش تھی کہ ندوہ میں ہو، اس بارہ میں انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے مشورہ کیا، انہوں نے سکوت اختیار کیا، ان کی خاموشی پر ۱۴ رفروری ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''ہاں دارالمصنفین پر آپ نے کیوں سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے، میں عمارت کو انشاءاللہ پورا کر کے رہوں گا اور شاید وہی میرا مدفن[۱] بھی ہو۔'' (شروانی، نمبر ۱۱۳)

پھر مارچ ۱۹۱۴ء کے خط میں دوبارہ لکھا:

''دارالمصنفین کی تجویز میں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہو تو موجودہ ابتدائی عمارت کے لیے جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپے ہیں، خود اپنے پاس سے ادا کر دوں گا، چھوٹے چھوٹے کمرے اور احباب سے بنوالوں گا، بہر حال صرف آپ سے مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے، اگر علی گڑھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ کا مقلد کہیں گے، اس لیے میں اتمام حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں، اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا، پرلطف تجویزیں دارالمصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں۔'' (شروانی، نمبر ۱۱۴)

اس خط کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں غالباً خود اپنے وطن حبیب گنج کا نام پیش کیا، جس کو مولانا نے منظور نہیں کیا اور ان کو لکھا:

''آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں۔'' (۱۱۵)

مگر مولانا کی دلی خواہش یہی تھی کہ دارالمصنفین ندوہ ہی میں قائم ہو، چنانچہ مولانا مسعود علی صاحب نے جب یہی خیال ظاہر کیا تو ان کو لکھا کہ:

''بھائی، وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ محض بناؤں ورنہ میری اصلی خواہش یہی ہے کہ لیکن کیا کیا جائے، حالاں کہ اس میں ان ہی کا فائدہ ہے۔'' (مکاتیب بنام

---

[۱] یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور مولانا دارالمصنفین کے احاطہ میں محوِ خواب ہیں۔

مسعود علی ندوی، نمبر ۱۳)

مولانا مسعود علی صاحب ایک عملی آدمی تھے اور ندوہ میں مولانا کے تمام عملی کام وہی انجام دیتے تھے، مولانا ان کی عملی صلاحیت کے بہت معترف تھے، اس لیے جب انہوں نے دارالمصنفین قائم کرنے کا عزم کیا تو اس کے انتظامات کے لیے ان ہی کا انتخاب کیا اور اس مسئلہ پر برابر ان سے خط و کتابت کرتے رہتے، چنانچہ جولائی ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

''ایک کام تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں، کہو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو پھوس کا ایک مختصر بنگلہ اور چند چھپر کے کمرے بنوا لیے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا، غالباً وہاں میری صحت بھی درست رہے۔''

(مسعود علی، نمبر ۱۵)

باب سوم

دارالمصنّفین کا قیام اور اس کے کاموں کا آغاز

۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء

ابھی دارالمصنّفین کے قیام کی مختلف تجویزیں مولانا شبلیؒ کے زیرِ غور تھیں کہ خود قدرت نے اس کا فیصلہ کر دیا، اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا، ان کی موت نے ان کو اعظم گڑھ کے قیام پر مجبور کر دیا اور انہوں نے اپنے کاموں کا مرکز اعظم گڑھ کو بنانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ۴؍ستمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں مولوی مسعود علی صاحب کو لکھتے ہیں:

"میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔

میں نے یہاں مستقل قیام کا انتظام کر لیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیم کے کام شروع ہو گئے ہیں، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اتنے دن کیوں پاجیوں میں بسر کیے، باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دل خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں کے سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا، دارالمصنّفین بھی شروع ہو جائے گا۔"

دارالمصنّفین کے لیے ضروری انتظامات: اس فیصلہ کے بعد دارالمصنّفین کے قیام کے لیے اپنا باغ اور بنگلہ وقف کرنے کا ارادہ کیا اور اس میں ان کے اور جو اعزہ شریک تھے ان کو بھی اس پر آمادہ کرلیا، چنانچہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۴ء کے خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں:

"تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے[1]، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنّفین اور تکمیل وغیرہ) کی جولان گاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھرگئی ہیں، وقف نامہ باغ زیرتحریر ہے، بنگلہ کے بغل میں مختصر دارالضیوف بن گیا ہے۔" (سلیمان-۸۱)

مگر ابھی تک دارالمصنّفین کی آمدنی کا کوئی انتظام نہ تھا، مولانا نے درجہ تکمیل کے لیے مولانا حمید الدین صاحب مرحوم سے تیس ماہوار مقرر کرادیے، اسی قدر مولانا نے خود اپنے ذمہ لیا، باغ اور بنگلہ کی توسیع اور ترمیم میں جو مصارف ہونے والے تھے ان کو بھی اپنے ذمہ لیا، دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے طلبہ کے قیام کے لیے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ سے قریب اور ایک دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا، کرایہ پر لیا، باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا اس کے خریدنے کا سامان کیا۔ (حیات شبلی، ص ۶۹۵)

ان انتظامات کے ساتھ دارالمصنّفین کا تعلیمی خاکہ مرتب کیا، ان سب مراحل کے طے ہونے کے بعد دارالمصنّفین کے لیے طلبہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، مولانا جن طلبہ

---

[1] مولانا شبلی کے تلامذہ میں مولانا مسعود علی صاحب انتظامی صلاحیت میں ممتاز تھے، جس کا اعتراف مولانا شبلی کو بھی تھا اور وہ اپنے انتظامی کام ان ہی سے لیا کرتے تھے، چنانچہ جب دارالمصنّفین کا خاکہ انہوں نے بنایا تو اس کے انتظامی امور کے لیے ان ہی کا انتخاب کیا تھا اور اس سلسلہ میں ان سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے، جو مکاتیب شبلی میں موجود ہے، اسی سلسلہ میں وہ مولانا کی وفات کے پیشتر اعظم گڑھ آئے تھے اور مستقل قیام کے لیے اپنا سامان لینے گھر چلے گئے تھے اور ان کی وفات سے دو تین دن پیشتر واپس آگئے تھے اور وفات کے وقت موجود تھے۔

سے واقف تھے، ان کا انتخاب خود کیا، چنانچہ مولوی ابو الحسنات[1] مرحوم رفیق دار المصنفین کا انتخاب ان ہی نے کیا تھا، مولانا خلیل عرب[2]، مولانا عبد الرحمٰن نگرامی[3] اور مولوی محسن بہاری پر بھی ان کی نگاہ انتخاب پڑی تھی، ندوہ کے متعدد طلبہ نے داخلہ کی خواہش کی تھی، ان کو بقرعید کے بعد انٹرویو کے لیے بلایا، ابھی یہ انتظامات جاری تھے اور مولانا اپنے بعض احباب خاص کو دار المصنفین دیکھنے کے لیے مدعو کرنے والے تھے کہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔

مولانا شبلیؒ کا مرض الموت: مولانا کی صحت برسوں سے خراب چلی آ رہی تھی، وفات سے سال ڈیڑھ سال پیش تر بہت گر گئی تھی اور ذرا سی بے احتیاطی میں بیمار پڑ جاتے تھے، چنانچہ جون ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں مولوی عبد الباری صاحب کو لکھتے ہیں:

۱؎ مولانا ابوالحسنات عبد الشکور کا وطن بہار تھا، بڑے ذہین اور ہونہار تھے، ندوہ میں تعلیم پائی تھی، ۱۹۱۸ء میں دار المصنفین سے وابستہ ہوئے اور نومبر ۱۹۲۴ء میں انتقال ہو گیا، معارف میں چند علمی مضامین اور "ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں" ان کی یادگار ہیں جو ان کی علمی قابلیت کی شاہد ہیں۔ ۲؎ مولانا خلیل عرب مشہور یمنی محدث شیخ حسین عرب کے پوتے تھے، شیخ حسین نواب صدیق حسن خاں کی قدر دانی سے بھوپال میں مقیم ہو گئے تھے، ان کے درس سے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، ان کے لڑکے شیخ محمد عرب ندوہ میں ادب کے استاد تھے، ان کے صاحبزادے شیخ خلیل عرب کی تعلیم ندوہ ہی میں ہوئی، عربی ان کی مادری یا کم سے کم پدری زبان تھی، اس میں ان کو بڑی مہارت تھی اور وہ مختلف اوقات میں ڈھاکہ، کلکتہ، دار العلوم ندوۃ العلما اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے مدرس رہے، ندوہ میں راقم نے ان ہی سے متنبی پڑھی تھی اور انشا سیکھی تھی، پھر بھوپال چلے گئے تھے، وہاں کی مجلس علما کے رکن ہو گئے تھے، آخر میں کراچی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ ۳؎ مولانا عبد الرحمٰن صاحب نگرامی کا وطن نگرام ضلع لکھنؤ تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ سے بڑے لائق اور ہونہار تھے، درس و تدریس، تقریر و تحریر ہر چیز میں کمال حاصل تھا، مختلف اوقات میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مدرسہ اسلامیہ کلکتہ اور دار العلوم ندوۃ العلما میں مدرس رہے، راقم نے ان سے حماسہ پڑھی تھی، علمی کمالات کے ساتھ بڑے دین دار اور متقی تھے، زندگی بڑی سادہ اور مجاہدانہ تھی، ۱۹۲۶ء میں عین عالم شباب میں انتقال کیا۔

"اب بمبئی کے قابل نہیں رہا، یعنی دن بھر دروازے بند رکھتا ہوں، ہوا ذرا سی خنک ہوگئی تو اس کی برداشت نہیں ہوسکتی، ایک مرتبہ اسی بے احتیاطی میں بخار آچکا ہے، بھائی تیل تمام ہو چکا، اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، غذا چوبیں گھنٹوں میں سب ملا کر پاؤ بھر، بات کرنا گراں ہوتا ہے، حالاں کہ بخار وغیرہ کچھ بھی نہیں۔" (مکتوب بنام مولانا عبدالباری ندوی، نمبر ۱۵)

لیکن اس حالت میں بھی جب ذرا طبیعت سنبھلتی تھی، سیرت میں لگ جاتے تھے، دارالمصنّفین کا خاکہ انہوں نے اسی زمانہ میں تیار کیا تھا اور مختلف قسم کے منصوبے ان کے دماغ میں تھے، مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم کی وفات کے حادثہ نے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی صحت پر اور زیادہ اثر ڈالا، وہ بڑی تیزی سے گرنے لگی اور وہ زندگی سے مایوس ہوگئے، اس وقت بھی ان کو سب سے زیادہ سیرت کی تکمیل کی فکر تھی اور ایسے جانشین کی تلاش تھی جو ان کے ادھورے کاموں کو مکمل کرسکے، چنانچہ وفات سے ایک مہینہ پیش تر ۱۶/ اکتوبر کو مولانا حمید الدین مرحوم کو لکھا:

"دو دن اچھا رہا تو دو دن بیمار رہتا ہوں لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں، لوگ جانتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظامِ جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سردی لگی، حالاں کہ دوپہر کا وقت ہے، افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرسکے، اگر دارالمصنّفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا، آج سید سلیمان آئیں گے اور کل پرسوں چند طلبۂ تکمیل کے لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے۔"

نومبر ۱۹۱۴ء کے پہلے ہفتہ میں ہرچند علاج و معالجہ ہوا مگر سب بے سود، جب زندگی سے بالکل مایوسی ہوگئی تو سیرت کا مسودہ کپڑے میں بندھوا کر الماری میں مقفل کرادیا اور اعزہ کو وصیت کی کہ یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں اور وفات سے تین دن پیش تر مولانا حمید الدین صاحب کو حیدرآباد، مولانا آزاد کو کلکتہ اور سید صاحب کو دیسنہ بلانے کے لیے تار دیے، مولانا ابوالکلام

کے تار کا مضمون یہ تھا:

''اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی ﷺ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بے کار ہو جائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔''

(ابوالکلام نمبر ۴)

سید صاحب کی آمد، تکمیل سیرتؒ کی وصیت اور وفات: مگر سید صاحب کو یہ تار نہیں ملا، ان کا بیان ہے کہ مجھے بھی کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع خود دل نے زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کچھ کہے بغیر چل کھڑا ہوا لیکن آہ جب ۱۵ رنومبر کی شام کو پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا، اب کیا، اب کیا، لوگوں نے جواہر مہرہ پانی میں گھول کر ایک چمچہ پلایا، جس سے جسم میں پوری طاقت آ گئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ''سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تمام کرو'' میں نے بھرائی آواز میں کہا، ضرور، ضرور، ۱۶ رکو مولانا حمید الدین بھی تشریف لے آئے، جن کے مولانا ابتدا سے منتظر تھے، ۱۷ رکی صبح کو مجھے اور انہیں یاد فرمایا اور زبان سے تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا ''سب کام چھوڑ کے۔'' (حیات شبلی، ص ۷۲۳-۷۲۲)

مولانا کا وقت آخر ہو چکا تھا، علاج و معالجہ سب بیکار ثابت ہوا اور ۲۸ رذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء چہار شنبہ کی صبح کو علم و ادب کا یہ نیر تاباں غروب ہو گیا اور عصر کے قریب اپنے خاندانی باغ اور بنگلہ کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

استاد کا مرثیہ: مولانا کی وفات کا ماتم مہینوں اخبارات میں بپا رہا، غم زدہ شاگرد نے بھی ایک دل دوز مرثیہ کہا، جس کا ہر لفظ غم والم میں ڈوبا ہوا ہے۔

نوحۂ استاد

از سید سلیمان ندویؒ

اے متاعِ عزتِ پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

شامِ اقبالِ گزشتہ! مقطعِ عہدِ سلف!
شمعِ بزمِ صحبت آخر! نشانِ رفتگان

غنچۂ فصلِ پسیں موجِ نسیمِ صبحِ دم!
نغمۂ آخر سحر مرغِ گلستانِ خزاں

علم وفن کا عشق تھا جس کی طبیعت کا خمیر
صفحۂ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھیں نوحۂ اسلاف تھی
جس کی ہر فریاد تھی صوت درائے کارواں

جس کی ہر رائے زریں آزارِ ملت کا علاج
جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسپاں

جس کی اِک اِک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جس کی رگ رگ میں تھیں سوزِ درد کی چنگاریاں

جس کے ہر مصرع میں سوزِ آتشِ زخمِ دروں
جس کے ہر فقرے میں تھی مرہمِ دردِ نہاں

جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رودِ فرات
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشکِ دریائے عماں

پیکر آرائے سخن جس کا دماغِ نکتہ ور
مرکبِ پروازِ معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لیے وہ آہ! ہم سے چھٹ گیا
وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیبِ دل فگار
جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار

جانتا ہوں ہر بشر کو راہ روِ عاجل سفر
جانتا ہوں زندگی کو اِک لباسِ مستعار

جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
پھر دلِ اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار

یاد آئے جب وہ اس کا فقرۂ نا مختتم
"آہ سیرت! آہ سیرت چھوڑ کر سب کاروبار"

اس طرف لب توصیہ فرماتے تکمیلِ عمل
اس طرف جاں مبتلائے نزع و رنجِ احتضار

پھر رُکے کس طرح پرشوری قلب مضطرب / کس طرح رُک جائے خوں نابیِ چشمِ اشکبار
اے سروشِ موت! اک لمحہ توقف کر کہ میں / پوچھ لوں ''اے احمدِ مختار کے سیرت نگار
تیرے اوراقِ پریشاں کس طرح ترتیب دوں / کچھ طریق نقد سکھلا، کچھ بتا اندازِ کار
جب سوادِ خط ترا آئے گا آنکھوں کو نظر / کس طرح پائے گا قلب مضطرب صبر وقرار
اہل میت اک توقف پوچھ لوں آقا سے میں / میرے آقا میں فدا! اور جاں مری تجھ پر نثار
تو نے فرمایا کہ ''تاریخ عرب'' تحریر ہو / ہوچکی تکمیل، اب ہو کون دیباچہ نگار

ارض القرآن

بہر تسکینِ دل بے صبر کچھ فرمایئے
میرے آقا پھر ذرا سحرِ بیاں دکھلایئے

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں / کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جاں
مرکزِ امید جو تھا آہ وہ جاتا رہا / جذبۂ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں
اے پرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے / پست مضموں کون پہنچائے گا اب تا آسماں
کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن / کون سمجھائے گا رمزِ حسن اسلوبِ بیاں
کون دیکھے گا مرا اب زور بازوے قلم / کون دیکھے گا مری جولانیِ طبعِ رواں
کون نامہ میں کرے گا اب عزیزی! سے خطاب / کس کا ''تم'' کہنا بڑھائے گا مری توقیر وشاں
کس کے نامہ کو بناؤں اب میں عنوانِ خطاب / ''سیدی'' ''مولائی'' ''استاذی'' ''غزالی الزماں''
اس کی مجلس تھی تماشا گاہِ اربابِ نظر / آہ اے دستِ اجل تو نے مٹایا وہ سماں
میں نے جب پوچھا بتائے اس نے ہر فن کے رموز / اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں آہ کس کا آستاں
جب اسے دیکھا نئی روحِ عمل پیدا ہوئی / اس کی باتیں جب سنیں پائی نئی تاب وتواں

اس دلِ پرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا
میرے بازو میں اگر کچھ زور تھا تو اس سے تھا

تیرے فرزندانِ ندوہ تیری کوشش کے ثمر
کم سنی ہے سہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر

کچھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں
رو کے مچلے ہیں کہ کیوں آقا نے چھوڑا ہے یہ گھر

کیا ابھی جانیں یہ خوں نابہ فشانی چشم کی
کس طرح سمجھائیں ان کو صدمۂ داغِ جگر

نوجواں جو ہیں وہ کہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ وہ
ہو ملالِ طبع ہم سے باعث عزمِ سفر

کس ہوس سے تو نے ان کی تربیت فرمائی تھی
آہ کس امید سے تو نے لگائے تھے شجر

باغباں کیا رک نہیں سکتے ہوا گلی فصل تک
لوگ کہتے ہیں کہ اب کی لائیں گے یہ برگ و بر

طاقتِ پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور
اب نکل آنے لگے تھے بازوؤں پر بال و پر

جب کبھی باہر ہوا جانا تو ان سے مل گئے
وعدۂ دیدار کیوں اٹھا ہے اب کی حشر پر

ان کی خاطر سے ہوئے اکثر ارادے ملتوی
ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لیے عزمِ سفر

اور اگر کارِ ضروری ہے کہ ٹل سکتا نہیں
عرض اتنی ہے کہ ہو ان کی یتیمی پر نظر

اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہے دور

تو نے جب چھیڑا ہے کوئی سخت یا آسان کام
نا پسند آیا ہے اس کو چھوڑ دینا نا تمام

مقصدِ اعظم ترا یعنی بنائے درس گاہ
جس میں طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام

شائقِ فن کے لیے سامانِ تکمیلِ علوم
اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام

تھے ابھی پیشِ نظر کچھ اور قومی مسئلے
نشر دیں، تعطیلِ جمعہ، انتظامِ وقفِ عام

ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور
تیرے ہاتھوں سے ابھی پانا تھا جن کو انصرام

کام ادھورے ہیں، بہت پھر کیوں ہوا عزمِ سفر
اس قدر تو ہو توقف ان کا بن جائے نظام

لوگ ٹھہرائیں جنازہ پوچھ لوں بھولا نہ ہو
یا ہوا اس وقت اور عالم میں کہیں ایسا نہ ہو

کوچ ہوتا ہے جہاں سے قوم کے غمخوار کا
کون ہو اب چارہ ساز اس ناتواں بیمار کا

شغل دائم جس کا تھا غم خواری دین مبیں
اب وداعِ دائمی ہوتا ہے اس غمخوار کا
وقف ماتم جو رہا جب تک کہ اس میں جاں رہی
کون اب ماتم کرے اس جانِ ماتم کار کا
سوگوار اپنے بزرگوں کا رہا جو عمر بھر
کون ہو اب سوگوار اس سوگوارِ زار کا
خون روئے جس نے قومی بے کسی پر تیس سال
نوحہ گر ہو کون اب اس دیدۂ خونبار کا
تھا صف میدان ملت کا وہی شمشیر زن
عرصۂ ہیجا میں ہو کون اب حریف اغیار کا
دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارۂ سیماب تھا
یا سراپا زخم خوردہ درد کی تلوار کا
چارہ گر آزارِ قومی کا جو تھا رخصت ہوا
مدعی کو ہے صلا! اب چارۂ آزار کا
نے نواز داستانِ غم نہ تھی اس اس کی زباں
اِک ترانہ تھا دہن میں لحن موسیقار کا

عالم اسلام میں تھا اک وہی روشن دماغ
آہ اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

(حیات شبلی، ص ۸۴۰-۸۴۴)

معمار دارالمصنّفین: سید صاحب کے علمی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنّفین کی تعمیر و ترقی ہے، اگرچہ اس کی بنیاد علامہ شبلی نے ڈالی تھی، مگر ابھی وہ اس کے ابتدائی انتظامات سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کا وقت آخر ہو گیا، پھر ان کے پیش نظر دارالمصنّفین کا اتنا بلند و وسیع تخیل نہ تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پہنچایا اور جو عظیم الشان کام ان کے ذریعہ انجام پائے، اس کی ترقی کا ایک بہت بڑا سبب تو اس کے کارکنوں کا اخلاص و حسن نیت ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ ٹھیک ایسے وقت میں قائم ہوا جب علمی اور دینی حیثیتوں سے ایسے ادارہ کی ضرورت اور ملک کو اس کی طلب تھی۔

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں علم و فن کی جو خدمات انجام دیں، اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے، انہوں نے سیکڑوں نئے علوم پیدا کیے اور پرانے علوم کو اتنی ترقی دی کہ ان کو بالکل نیا بنا دیا، علوم قدیمہ کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے، جس میں ان کے کارنامے اور ان

کی تصانیف موجود نہ ہوں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ قدیم اور جدید علوم کی درمیانی کڑی تھے، اگر انہوں پرانے علوم کی حفاظت نہ کی ہوتی اور اس کو ترقی دے کر آگے نہ بڑھایا ہوتا تو آج جدید علوم کا وجود نہ ہوتا لیکن مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ان کے علمی ذوق پر بھی زوال آ گیا، علمی جدت واختراع تو بڑی چیز ہے، ان میں اپنے اسلاف کے پیدا کردہ علوم سے فائدہ اٹھانے کی بھی صلاحیت نہ رہ گئی تھی، کم وبیش پوری دنیائے اسلام کا یہی حال تھا، دوسری طرف مشرق پر مغربی قوموں کے غلبہ واقتدار، ان کے علوم اوران کی تعلیم وتہذیب نے نئی نئی علمی ضرورتیں پیدا کردی تھیں، ان کے اثر سے ہر چیز میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا، جس سے زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہ تھا، دین ومذہب، تاریخ وتہذیب، علم وفن ہر چیز کی پرانی قدریں بدل گئی تھیں، عقائد وخیالات کو عقل وعلم کی ترازو میں تولا جانے لگا تھا، ان میں بحث ونظر کے نئے نئے پہلو پیدا ہو گئے تھے، جدید علوم نے علم وفن کا دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا، جس سے اردو زبان کا دامن تقریباً خالی تھا، جدید تعلیم وتہذیب کا اثر ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر جو اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقف تھا، بہت برا پڑ رہا تھا، وہ ان سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا، ان حالات نے نئی ضرورتیں پیدا کر دی تھیں، جن سے ہمارے علما کا طبقہ بے خبر اب تک پرانے ڈھرے پر گامزن تھا، ان میں اپنے اسلاف کے علمی ذخیروں سے فائدہ اٹھانے کی بھی صلاحیت نہ رہ گئی تھی، ان کا دائرہ پرانے درسیات تک محدود تھا، جن میں تصنیف وتالیف کی صلاحیت تھی وہ پرانی درسی کتابوں کی شرح درشرح اور حاشیہ در حاشیہ اور مذہب کے فروعی مسائل اور فقہی اختلافات کی تحقیق وتدقیق میں ضائع ہو رہی تھی، نئی ضروریات کی ان کو خبر تک نہ تھی۔

مگر ایک ذہین اور عاقبت اندیش طبقہ کو حالات کے اس تغیر اور نئی ضرورتوں کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے مذہبی مسائل اور علمی پہلوؤں پر جدید طرز کی کتابیں لکھیں، اس جماعت کے سرخیل سرسید، حالی، شبلی، چراغ علی اور مولوی نذیر احمد وغیرہ تھے، انہوں نے اپنے مضامین اور تصانیف سے اردو میں تالیف وتصنیف کا ایک نیا نمونہ قائم کر دیا اوران کے

اثر سے تعلیم یافتہ طبقہ میں سنجیدہ علمی مذاق پیدا ہو گیا اور کچھ نئے لکھنے والے بھی پیدا ہو گئے، اس جماعت میں مولانا شبلی کے علاوہ ایک بڑی خامی یہ تھی کہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھی کہ اپنی تہذیب و معاشرت بلکہ مذہب تک کو اسی سانچے میں ڈھال دینا چاہتی تھی، ان کے مقابلہ میں مولانا شبلی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو ایسے دل نشین اور محققانہ رنگ میں پیش کیا جائے کہ اس کے مخالفین بھی اس کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں، چنانچہ ان کی تمام تصانیف کا مرکز و محور یہی نقطہ تھا، دوسری ضرورت یہ تھی کہ گو اس زمانہ میں اردو میں سنجیدہ علمی تصانیف اور جدید علوم کی مفید کتابوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا بلکہ ترجموں کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی اور اردو زبان ان سے ناآشنا نہ رہ گئی تھی، مگر ایک زبان کو علمی حیثیت سے سرمایہ دار بنانے کے لیے جس قدر علمی ذخیرہ کی ضرورت ہے، اردو کا دامن اس سے خالی تھا، اس کا پرانا ذخیرہ زیادہ تر شعر و شاعری، ادب و افسانے اور پرانے قسم کی ٹھیٹھ مذہبی کتابوں تک محدود تھا اور چند پرانے مصنّفین کو چھوڑ کر جو دنیا سے اٹھ چکے تھے، نئے مصنّفین کا علمی مذاق ابھی پوری طرح پختہ نہ ہوا تھا اور اچھی کتابیں خال ہی خال نکلتی تھیں اور حالی و شبلی کے طبقہ کے بعد پھر سناٹا نظر آنے کا خطرہ تھا۔

اس کام میں ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ جن لوگوں میں تصنیف و تالیف کا سلیقہ اور اس کا ذوق تھا، ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ تصنیفی زندگی اختیار کریں تو ان کے معاش کا ذریعہ کیا ہوگا، پھر ان کی تصانیف کی طباعت و اشاعت کا بار کون اٹھائے گا، اس لیے ایک ایسے ادارہ کی بڑی ضرورت تھی جو ان سب ضرورتوں کو پورا کر سکے اور جہاں مصنّفین فکر معاش اور کتابوں کی طباعت و اشاعت کی زحمتوں سے آزاد ہو کر سکون و یکسوئی سے تصنیف و تالیف کا کام انجام دے سکیں، ان ہی ضروریات کے پیش نظر دارالمصنّفین کا قیام عمل میں آیا، اس کی پوری روداد خود معمار دارالمصنّفین کی زبان سے سننا زیادہ بہتر ہے، وہ دارالمصنّفین کی پہلی سالانہ روداد میں تحریر فرماتے ہیں:

دارالمصنّفین کی ضرورت معمار دارالمصنّفین کے قلم سے

ہمارا فقر علمی: ملک کے علمی فقر و بے نوائی کا ماتم آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہے، مذاق علمی کے فقدان کا یہ عالم ہے کہ سالہا سال گذر جاتے ہیں اور ملک میں کوئی اچھی تصنیف پیدا نہیں ہوتی اور اگر حسن قسمت سے کوئی ایک آدھ کتاب نکل بھی آتی ہے تو ناقدر شناسی سے رواج نہیں پاتی، اردو زبان ہندوستان کی عالم گیر زبان ہے، ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستوں میں وہ شاہی زبان بھی تسلیم کی جاتی ہے، تاہم ہندوستان کے دیگر مختص الصوبہ زبانوں کے مقابلہ میں بھی اس کی جھولی کم مایہ ہے، اس کے کشکول گدائی میں اگر کچھ ہے تو شاعری اور افسانوں کے خرف ریزے ہیں، جن سے ایک عظیم الشان قوم کے لیے قوت کا سامان میسر نہیں آسکتا، علوم وفنون ایک طرف کیا اسلام کی کوئی جامع تاریخ بھی موجود ہے۔

قوموں کی ترقی، خیالات کی بلندی اور اصلاح پر منحصر ہے لیکن خیالات کا تغیر و انقلاب کس کے ہاتھ میں ہے، صرف تصنیفات اور ملک کے علمی کارناموں کے ہاتھ میں، اس بنا پر مسلمانوں کی ترقی کو ان کے لٹریچر کی ترقی پر منحصر سمجھنا چاہیے، ملک میں جا بجا اصلاحی مجلسیں قائم ہیں، جو سال بہ سال اصلاحی تقریروں کا ایک انبار اسٹیج پر لگا دیتی ہیں لیکن یہ پادر ہوا ہستیاں جن کا وجود صرف ہوا کی چند موجوں سے ہے، کبھی کوئی پائیدار مستقل اور مسلسل اثر قائم رکھ سکتی ہیں اگر ان کی نصف کوشش بھی مفید تصنیفات کی اشاعت میں صرف ہوتی تو ہم قوم میں ایک پائیدار اور مستحکم تاثیر کا وجود پاتے، ہر گھر میں ایک دائمی اور غیر فانی خطیب موجود ہوتا جو ہر لحظہ قوم کو صحیح راستہ کی ہدایت کرسکتا۔

مسلمانوں کی سعی وکوشش کو پچاس برس ہوئے لیکن یہ سن کر افسوس ہوگا کہ مسلمانوں کے پنجاہ سالہ جدوجہد کے بعد اتنا سرمایہ بھی ابھی میسر نہ آسکا ہے جو تنہا ایک الماری کی

زینت کا بھی باعث ہو سکے لیکن اس وقت اور زیادہ افسوس ہوگا جب ہم الماری کے ایک خانہ کو کھول کر دیکھیں گے کہ یہ پیداوار کی کس جنس سے بھرا ہے تو تاریخ، مذہب اور افسانہ کے سوا ہر علم کا خانہ خالی ملے گا، متعدد قومیں ہیں جو زمانہ کی ایسی مسافت میں اپنے خزانوں کو اتنا مالا مال کر چکی ہیں کہ اب ہر سکہ کے قرض خواہ ان ہی کی طرف رخ کر رہے ہیں۔

تعلیمی تحریک کی چہل سالہ چیخ پکار نے تعلیم کا احساس پیدا کر دیا لیکن سہی اور عمومی تعلیم ملکی زبان میں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، دنیائے گذشتہ اور موجودہ میں سیکڑوں قومیں عروج و کمال تک پہنچ چکی ہیں لیکن تاریخ اس مثال سے عاجز ہے کہ کبھی غیر ملکی زبان کی تعلیم قوموں کے کمال وارتقا کا باعث ہوئی ہے۔

لیکن جب ملکی زبان میں تعلیم کا مسئلہ پیش آئے گا تو کیا ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی ٹکسال ایسی نظر آئے گی جہاں سے تعلیم نصاب کی کتابیں ڈھل ڈھل کر باہر آئیں گی، یہ مقصد اس وقت تک ممکن الحصول نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک کی زبان میں کثرت سے علمی تصنیفات موجود نہ ہوں، ہائی ایجوکیشن اور اس کے لیے کورس کی تکمیل تو بڑی چیز ہے، ابتدائی مکاتب جو مسلمانوں کے اہتمام میں اب تک ہیں کیا ان کی ضرورت کے مطابق بھی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے۔

علوم اسلامیہ کا بقا: مسلمانوں کا لقب استخواں فروش ہے، آبا و اجداد پر فخر استخواں فروشی ہے لیکن مسلمان اگر بجا طور پر استخواں فروش ہوتے تو ان کا پایہ اعزاز آج سے کہیں بلند تر ہوتا، ان کے بزرگوں نے ان کے لیے فخر و مباہات کے خزانے چھوڑے ہیں، کیا کبھی انہوں نے ان خزانوں کی حفاظت کا سامان کیا ہے، مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ ان کا اسلامی لٹریچر ہے لیکن کبھی انہوں نے اس کی باقاعدہ کوشش کی کہ سلف کے کارناموں کو زندہ رکھا جائے، اگر حقیقت میں آج مسلمانوں کی علمی کوششیں منظر عام پر کر دی جائیں تو یورپ ان کو قرون وسطیٰ کا تاریک زمانہ کہتے ہوئے شرمائے گا۔

قوموں کے وجود کی غایت دنیا میں معارف وصلاح پیدا کرنا ہے، اگر یہ دریافت کیا جائے کہ اس معیار کی رو سے دنیا میں مسلمانوں کا کوئی پایہ ہے تو بزرگوں کے نتائج علمی کھو کر کیا ہم کوئی جواب دے سکتے ہیں؟ آج ہماری طرح ہندوستان میں بہت سی محکوم قومیں ہیں جن کا سرمایہ ہم سے کم تر، جن کے جنس متاع کی گرانی ہم سے پست تر، جن کے ذخیرہ میں بزرگوں کی کمائی اقل تاہم وہ نمائش اور کوشش کی فروانی میں ہم سے بیش تر ہم سے بلند تر اور ہم سے بڑھ کر ہیں، ہندوؤں کا سنسکرت لٹریچر عربی کے مقابلہ میں صفر ہے، بااین ہمہ ہندوستان میں متعدد مجلسیں ان کی حفاظت، ترتیب اور نشر واشاعت میں مشغول ہیں، پونہ اور میسور میں سنسکرت کے طبع واشاعت کے وہ سامان ہیں جو عربی کے لیے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک کہیں بھی نہیں۔

علمائے سلف کی بعض نادر تصنیفات جو کم یاب ہیں یا جن کی ضرورت نہایت شدید ہے یا موجود تصانیف جن کی اشاعت خاص دل چسپی اور اہمیت کا موجب ہوگی، ضرورت ہے کہ ان کے طبع واشاعت کا سامان کیا جائے، یورپ کو اپنے علوم وفنون کی ترقی واشاعت میں جو انہماک اور مصروفیت ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم کبھی یہ خیال بھی نہیں کر سکتے کہ بزرگان اسلام کے مردہ اور مدفون تصنیفات کو کبھی ہاتھ بھی لگایا جائے گا، بااین ہمہ واقعہ کیا ہے؟ یورپ میں سیکڑوں علمائے مستشرقین ہیں جن کی زندگی صرف علوم اسلامیہ کے بقا و حفاظت میں صرف ہورہی ہے، بیسیوں سوسائٹیاں ہیں جو صرف اسلامی تصنیفات کے طبع و اشاعت کے لیے مخصوص ہیں اور آج ان ہی کے بذل واحسان کا اعجاز ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ علم وتمدن کے جواہر ریزوں کا انبار لگا رہی ہے لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ فرض خود ہمارا نہیں ہے؟

علوم جدیدہ کے تراجم: بااین ہمہ ضرورت جو اپنے قدیم اسلامی علوم کے بقا کی ہے، اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ زمانہ کا ہر قدم آگے ہے، یورپ کا ابر آج جدید علوم و

فنون کی جو متصل اور پیہم بارش برسا رہا ہے مسلمانوں کے کشت زار اس سے بھی مستغنی نہیں ہیں، الحکمۃ ضالۃ المومنین این وجدھا فھوا حق بھا، چالیس برس سے تعلیم جدید کے لیے ساعی ہیں لیکن اس کے علوم کا کس قدر حصہ ہم اپنی زبان میں منتقل کر سکے ہیں، ابتدائی سائنس کے چند رسالے ہماری ضرورت کو نہیں پورا کر سکتے، نہایت شدید حاجت ہے کہ جدید علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے وسائل اختیار کیے جائیں، مختلف ضروری موضوع پر لوگوں سے کتابیں لکھوائی جائیں۔

قدیم وجدید علوم وفنون کے نشر واشاعت کے ساتھ ساتھ ہم کو عام مذہبی وتاریخی تصنیفات سے بھی بے نیازی نہیں ہو سکتی، معارف القرآن، عقائد اسلام، تاریخ اسلامی، سلاطین وعلمائے اسلام کی سوانح عمریاں، اسلامی مسائل کی تشریح توضیح، اسلام پر مذہبی یا تاریخی نظر سے جو اعتراضات عائد ہوں، ان کی تردید، یہ تمام موضوع روزانہ کے مطالعہ کے لیے ضروری ہیں، اسلام اور تاریخ کے متعلق بہت سے ضروری مسائل ہیں جن پر بہتر سے بہتر تصنیف کی ضرورت ہے۔

فقدانِ رجال: زمانہ جدید نے اپنے انقلاب کے ساتھ ہمیں چند نفوس عطا کیے تھے، جنہوں نے حسب الامکان ان میں سے بعض ضرورتوں کو ایک حد تک پورا کیا، سرسید، نذیر احمد، آزاد، حالی اور شبلی ہمارے جدید نشاۃ علمیہ کے کارپرداز تھے لیکن آہ جب اس سلک گہر کا ایک ایک موتی ہم سے گم ہو چکا ہے تو اب ہمارے لیے مایۂ تسکین کیا ہے؟ ہم نے سیکڑوں خزانے لٹا کر ان چند گوہروں پر قناعت کی تھی، ان کی زندگی ہماری علمی ضرورتوں کی ضامن تھی لیکن موت کی باد صرصر کا ہاتھ جب ان چراغوں کو گل کر چکا ہے تو مستقبل کا منظر کس قدر تیرہ اور تاریک نظر آتا ہے اور پہلے سے کس قدر زیادہ علمی کوششوں کے لیے ضرورت بڑھ گئی ہے، ان ضرورتوں کی عدم تکمیل کی زیادہ تر ذمہ دار صرف دو چیزیں ہیں، ایک مصنفین کی پریشان حالی اور دوسری تصنیفی سلیقہ کی تعلیم کے لیے تربیت گاہ کی ناموجودگی۔

حقیقی مصنّفین ہر زمانہ میں پریشان حال رہے ہیں، تاہم موجودہ زمانہ نے ان کو پریشان تر بنا رکھا ہے، ان شاذ و نادر ہستیوں کے لیے جو اپنی زندگی کا مقصد صرف علم کی خدمت قرار دینا چاہتے ہیں، ہندوستان کی کئی ہزار میل کی وسعت میں ان کے لیے پناہ کا ایک گوشہ نہیں، غیر ملکی حکومت مصنّفین کی دست گیری کے لیے تیار نہیں، کوئی قومی کتب خانہ ہماری ضرورت کے مطابق ملک میں موجود نہیں، ان کی علمی مہمان نوازی کے لیے کوئی فنڈ نہیں، جو ان کے دل و دماغ کو افکار سے فارغ کر سکے، کوئی ذریعہ ملک میں موجود نہیں، مصائب گوناگوں اور بلاہائے پیہم کے تحمل کے بعد جب اپنی تصنیف کے چند اجزاوہ فراہم کرتا ہے تو صدا دیتا ہے:

ع من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

لیکن افسوس کی انتہا نہیں ہوتی جب کرۂ ارضی اور فضائے آسمانی سے ایک آواز بھی ان جگر پاروں کی خریداری کے لیے نہیں اٹھتی۔

قدمائے مصنّفین کا کام کتاب کا آخری صفحہ لکھ کر ختم ہو جاتا تھا، شائقین خود اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ نقل کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک پہنچا دیتے تھے لیکن مصنّفین حال کا کام ختم تصنیف کے بعد شروع ہوتا ہے، کتاب کو کسی مطبع کے حوالہ کرنا، کاپیوں کی تصحیح، پروفوں کی ترمیم، روپیہ کی کافی مقدار کی فراہمی، پھر ریویو اور اشتہار کے لیے اخباروں کی خوشامد اور چاپلوسی اور با ایں ہمہ مصائب و متاعب، کتابت کے نسخوں کو بغل میں دبا دبا کر خریدار کی تلاش میں گلی کوچہ کی آوارہ گردی، کیا یہ قابل صد رحم حالت اس طبقۂ انسانی کے لیے مناسب حال ہے، جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم اور صرف علم کے لیے ہونا چاہیے تھا۔

پبلک کی ناقدر شناسی کا جہاں گلہ ہے خود مصنّفین کی نسبت بھی کچھ کہنے کی حاجت ہے، جسم کے مختلف اعضا جس طرح اس کی زندگی کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں قوم

کی مختلف کارکن جماعتیں بھی اسی طرح اس کی زندگی کے ضروری آلات حیویہ ہیں، قوم کے ارباب قلم طبقہ کا درجہ جسم قومی کے لیے مقوی اور صحت بخش غذا کی فراہمی اور صحیح خون کی پیدائش ہے، اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ یہ طبقہ مختلف اغذیۂ علمی کے انتخاب کا سلیقہ، کیمیاوی ترکیب و تحلیل کا طریقہ، موقع اور ضرورت کا علم اور غذاؤں کی قوت اور ضعف کا فیصلہ اسی حیثیت سے کر سکے، جس طرح ایک جسمانی ڈاکٹر مادی جسم کے لیے ہر روز کرتا ہے، گاؤں کا ہر جاہل عطائی اس لائق نہیں کہ وہ جسم کی صحیح پرداخت کے لیے اپنی مختصر دکان کی بوسیدہ جڑی بوٹیوں سے کوئی نسخہ ترتیب دے سکے۔

ہندوستان کے بعض صوبے جس فراوانی کے ساتھ ایک طرف جسمانی امراض کے لیے عطائیانہ اشتہاری نسخے ترتیب دے رہے ہیں، دوسری طرف علمی تندرستی کے لیے چھپے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر لگا رہے ہیں، اس پر نظر کرتے ہوئے کون اس جماعت کے لیے ایک صحیح تربیت گاہ کی ضرورت سے انکار کرے گا۔

موضوع کا انتخاب، مواد کی فراہمی، کتابوں کا مطالعہ، کہنہ مصنّفین سے استفادہ، مذاق ادبی کی درستی، تصنیف و تالیف کا سلیقہ، تعبیر و ادا کا طریقہ، مباحث مہمہ پر تبصرہ و تنقید، ان میں سے ہر چیز محنت و کاوش، تعلیم اور ایک اجتماعی شکل کی تربیت گاہ کی محتاج ہے۔

دارالمصنّفین: شمس العلما علامہ شبلی نعمانی برد اللہ مضجعه وجعل الجنة مثواه، جن کی زندگی کا ہر لمحہ علم و ملت کی خدمت میں صرف ہوا، سب سے پہلے تین چار برس ہوئے کہ انہوں نے اس ضرورت کا احساس کیا اور فیصلہ کیا کہ دارالمصنّفین کے نام سے ایک جمعیۃ یا سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جائے، جس کے احاطہ میں وسیع کتب خانہ ہو، جس میں مصنّفین کی راحت و آسائش کا سامان مہیا کیا جائے، صاحب مذاق طلبہ کو وظائف دے کر تصنیف و تالیف کی مشق کرائی جائے، اہم مباحث پر کتابیں لکھوائی جائیں، بلند پایہ تصنیفات کی اشاعت کا سامان کیا جائے، وغیرہ۔

لیکن ندوہ اور سیرت نبویؐ کی مصروفیت اس تجویز کی تعمیل میں ہمیشہ حائل رہی، ۱۹۱۳ء میں مولانائے مرحوم نے جب ندوہ کی مہمات سے سبک دوشی حاصل کی تو یہ تحریک کسی قدر شدت کے ساتھ موج زن ہوئی اور توکلاً علی اللہ انہوں نے اس کام کو شروع کر دینا چاہا، احباب اور تلامذہ کو اعانت اور مشورے کے خطوط لکھے، ندوہ اور لکھنؤ سے دست برداری کی صورت میں اپنے وطن (اعظم گڑھ صوبہ متحدہ) میں بالاستقلال قیام کا فیصلہ کیا، اپنا بنگلہ اور وسیع باغ اس سوسائٹی کی عمارت کے لیے وقف کیا، اپنی اور اپنے اعزہ کے ذاتی کتب خانہ اور سیرت کی کتابیں دارالمصنّفین کے نام سے منتقل کیں اور طے کیا کہ جب تک کوئی اور ذریعہ نہ ہو حیدرآباد کا ماہوار منصب تین سو روپیہ دارالمصنّفین پر صرف کریں گے، طلبہ کو خطوط روانہ کیے گئے کہ تاریخ مقررہ پر وہاں پہنچ جائیں کہ اسی اثنا میں روز مقرر آ پہنچا اور ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کی صبح کو مولانا نے دارفانی کو وداع کیا اور تمام کام ناتمام رہ گئے۔

دارالمصنّفین کے لیے اب تک کیا ہوا: موت سے انسان کو چارہ نہیں لیکن کیا اس سے انسان کا کام بھی مرجاتا ہے؟ مولانا کے متعدد تلامذہ اس وقت موجود تھے، گریہ وبکا کے آنسو اب تک برس کر نہیں تھمے تھے، زبانوں نے اب تک بند سکوت نہیں توڑا تھا، دلوں کا پنڈولم اب تک اپنے مرکز پر قرارگیر نہ ہوا تھا کہ ۲۱/نومبر کو واقعہ کے تیسرے دن برادر اعظم مولانا حمیدالدین صاحب کی دعوت پر ہم نے مولانائے مرحوم کے اعمال متروکہ کی تکمیل کے لیے اخوان الصفا کے نام سے ایک مجلس تاسیس کی، اس مجلس کے حسب ذیل ممبر تھے:

۱-	مولانا حمیدالدین صاحب	رئیس مجلس
۲-	سید سلیمان ندوی	ناظم
۳-	مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	رکن
۴-	مولوی مسعود علی صاحب ندوی	رکن
۵-	مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی	رکن

ہم نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلا کام ہمارا سیرت کی تکمیل ہے، اب تک بھوپال کی طرف سے اجرائے اعانت کا کوئی خیال نہ تھا لیکن چوں کہ قلوب نے خلوص کے ساتھ دعوی کیا تھا، مجیب الدعوات نے شرف قبول بخشا، ہر ہائنس سرکار عالیہ ریاست بھوپال نے جناب منشی محمد امین صاحب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال کو اعظم گڑھ بھیجا اور آخر ۲۹ رنومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا حمید الدین صاحب اور خاک سار سرکار عالیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بشارت کے ساتھ واپس آئے کہ سیرت کی ماہ وار رقم بقیہ زمانۂ مقررہ تک جاری رہے گی، مولانا کے باغ و بنگلہ کا وقف ناتمام رہ گیا تھا، ۲۴ رنومبر ۱۹۱۴ء کو اعیان شہر کی ایک مجلس مدعو کی گئی اور وقف کے بقیہ مراحل طے کیے گئے، شیخ رشید الدین صاحب[1] انصاری پھریہا اعظم گڑھ نے وقف کی تکمیل میں خدمات جلیلہ انجام دیے، جن کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں۔

دار المصنّفین کے قواعد وضوابط اور اغراض ومقاصد نہایت تفصیل کے ساتھ ابتدائی طور پر تحریر کیے گئے اور منتخب اشخاص کے معائنہ کے بعد انگریزی اور اردو میں چھاپے گئے۔

چوں کہ یہ کام خالصۃً للہ شروع کیا گیا تھا اس لیے میر سامان نے اس کی کام یابی کے عجیب وغریب وسائل عطا کیے، مولانا حمید الدین صاحب کی تحریک اور جناب عماد الملک بہادر اور مسٹر حیدری بی، اے، معتمد عدالت امور عامہ سرکار نظام کی سفارش سے سرکار نظام خلد اللہ ملکہ نے اپنی مشہور خسروانہ فیاضی اور علم دوستی کے ساتھ مولانائے مرحوم کے منصب (۳۰۰ ماہوار) کو دار المصنّفین میں منتقل کرنا منظور فرمایا، چوں کہ سرکار نظام نے اجرائے وظیفہ کے لیے انجمن کی رجسٹری ضروری قرار دی تھی اور خود ملک کے اعتماد کے لیے اس کے رجسٹرڈ ہونے کی ضرورت تھی، اس لیے گورنمنٹ کے قواعد کے مطابق ۴ رجولائی ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں باقاعدہ اس کی رجسٹری کرالی گئی، اس وقت دار المصنّفین کی حسب ذیل چیزیں ہیں، دو وسیع بنگلے، ایک میں دفتر اور کتب خانہ ہے اور دوسرا دار الضیوف ہے، دو باغ جن کی

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی کے چھوٹے بھائی تھے۔

آمدنی تقریباً پانچ سوسالانہ ہوگی، ایک مختصر کتب خانہ جس میں (موہوب و مملوک و مستعار) انگریزی اور عربی کی تقریباً پندرہ سو کتابیں ہوں گی، پانچ سو مستقل و غیر مستقل ماہوار عطایائے حیدرآباد (بنام دارالمصنفین) و بھوپال (بنام سیرت) ایک اسٹاف، جس میں چار آدمی آنریری اور پیڈ کام کرتے ہیں، فرنیچر کا بھی ایک حد تک سامان موجود ہے، تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا گیا ہے، بعض کتابیں مطبع میں دے دی گئی ہیں، دارالاشاعت کھل گیا ہے، دارالتصنیف کا بھی دو مہینہ میں امید ہے کہ افتتاح ہو جائے، ایک خالص علمی رسالہ کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے، عن قریب اس کے لیے سامان ہوگا۔

اب تک دارالمصنفین کا کام آہستگی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے، امید ہے کہ ناظم حال سید سلیمان سرکاری خدمت (اسسٹنٹ پروفیسر، دکن کالج پونہ) سے مستعفی ہو کر جب دارالمصنفین کے مرکز میں آجائے گا، اس وقت سے باضابطہ حسب مقاصد مشتہرہ تمام کام انجام پانے شروع ہو جائیں گے:

والله المستعان وعلیه التکلان

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا انتخاب اور اس کے کاموں کا آغاز: یہ روداد اجمالی ہے، دارالمصنفین کی تاسیس کے بعض اہم واقعات اس میں نہیں ہیں، اس کی بنیاد مستحکم ہونے کے بعد سید صاحب نے دکن کالج پونہ سے استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس کے لیے کچھ وقت درکار تھا، اس درمیان میں انہوں نے دارالمصنفین کے بارے میں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم سے خط و کتابت کی، سب نے بڑی گرم جوشی سے اس کو خوش آمدید کہا اور حسب ذیل بزرگوں نے خاص طور سے دلچسپی کا اظہار کیا۔

۱-نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، حیدرآباد دکن، ۲-صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں لکھنؤ، ۳-مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علی گڑھ، ۴-ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، لاہور، ۵-مولانا ابو الکلام آزاد، کلکتہ، ۶-پروفیسر نواب علی صاحب بڑودہ کالج،

۷-پروفیسر شیخ عبدالقادر صاحب، دکن کالج پونہ، ۸-مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۹-سید اکبر حسین صاحب، پنشنر جج الہ آباد، ۱۰-ڈاکٹر سید محمود صاحب، بیرسٹر چھپرہ، ۱۱-مولانا عبدالماجد صاحب دریا آباد، ۱۲-منشی محمد امین صاحب زبیری، مہتمم دفتر تاریخ بھوپال، ۱۳-خواجہ رشید الدین صاحب لکھنؤ، ۱۴-مولوی عبداللہ صاحب، محافظ حجاج بمبئی، ۱۵-مولوی حکیم غلام غوث صاحب طبیب خاص نواب صاحب خیر پور سندھ۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کا بڑا ممتاز ادارہ تھا، پوری تائید وحمایت کی، آگے چل کر مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر اخبار البشیر کی ایک آواز مخالفت میں اٹھی جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

دکن کالج پونا سے استعفا کے مراحل طے ہونے تک سید صاحب صلاح ومشورہ کے لیے برابر دارالمصنّفین آتے رہے، گرمیوں کی تعطیل میں سید صاحب پونہ سے اور مولانا حمید الدین صاحب حیدرآباد سے اعظم گڑھ آئے اور ۲۵ رمئی ۱۹۱۵ء کو دارالمصنّفین کا پہلا جلسہ ہوا، جس میں ان دونوں کے علاوہ مولانا مسعود علی ندوی جو دارالمصنّفین میں مستقل مقیم تھے، شریک ہوئے اور تینوں نے مل کر حسب ذیل اشخاص کو دارالمصنّفین کا رکن اساسی منتخب کیا۔

۱-مولانا حمید الدین صاحب، صدر، ۲-مولانا سید سلیمان صاحب، ناظم، ۳-مولانا مسعود علی صاحب، منیجر، ۴- حامد نعمانی صاحب، ۵-مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علی گڑھ، ۶-نواب سید علی حسن خاں لکھنؤ، ۷-پروفیسر شیخ عبدالقادر صاحب، پونہ، ۸-ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب، لاہور، ۹-نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، حیدرآباد، ۱۰-مولانا عبداللہ عمادی، ۱۱-مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، ارکان۔

اس مجلس نے دارالمصنّفین کے قواعد وضوابط مرتب کیے اور مئی ۱۹۱۵ء میں دارالمصنّفین کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے جن تلامذہ کو تالیف و تصنیف کے لیے تیار کیا تھا، ان میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نہایت ممتاز تھے، وہ الہلال کلکتہ کے عملہ ادارت میں تھے مگر الہلال بند ہو چکا تھا اور مولانا ابھی تک کلکتہ ہی میں مقیم تھے، اس لیے دارالمصنّفین کے قیام کے بعد ان کو بلا لیا گیا اور وہ مئی ۱۹۱۵ء میں دارالمصنّفین آ گئے، سید صاحب بھی چند مہینوں میں استعفے کے مراحل طے کر کے نومبر ۱۹۱۵ء میں اعظم گڑھ پہنچ گئے، اس طرح بزم شبلی کے پورے نورتن جمع ہو گئے۔

اس وقت دارالمصنّفین کا نقشہ یہ تھا کہ اس کے پاس پندرہ بیگھ پختہ کے دو باغ تھے، جس میں دو وسیع بنگلے تھے، ایک میں دارالمصنّفین کا دفتر اور کتب خانہ تھا، دوسرے میں دارالمصنّفین کے کارکن رہتے تھے، یہی مہمان خانہ کا کام بھی دیتا تھا، کتب خانہ میں پندرہ سو کتابیں تھیں، جو زیادہ تر سیرت کے متعلق تھیں، دارالمصنّفین کی مستقل آمدنی ساڑھے پانچ سو ماہوار تھی، اسٹاف میں پانچ آدمی تھے، سید صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا مسعود علی صاحب، حاجی معین الدین[۱] صاحب ندوی، ایک مسودہ نویس، ان کی تنخواہ بالترتیب سو، پچاس، تیس اور بیس ماہوار تھی، دارالمصنّفین کے مجوزہ نقشہ میں دارالتصنیف، دارالاشاعت، دارالکتب، پریس کا قیام اور ایک علمی رسالہ کا اجرا تھا، مگر ابتدا دارالتصنیف اور دارالاشاعت سے ہوئی، شعبہ تصنیف میں شروع میں صرف دو آدمی تھے، سید صاحب اور مولانا عبدالسلام

---

۱ حاجی معین الدین صاحب کا وطن استھاواں بہار تھا، ندوہ میں تعلیم حاصل کی، یہاں کے لائق طلبہ میں تھے، ندوہ سے فراغت کے بعد ۱۹۱۴ء میں دارالمصنّفین کے رفیق مقرر ہوئے، یہاں کے دوران قیام میں خلفائے راشدین اور مہاجرین جلد اول لکھی، پھر امپیریل لائبریری کلکتہ میں فہرست کی ترتیب پر مقرر ہوئے، یہاں سے خدابخش خاں لائبریری پٹنہ میں چلے گئے اور عربی کتابوں کی فہرست کی کئی جلدیں انگریزی میں مرتب کیں جو چھپ چکی ہیں، کچھ دنوں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں رہے اور ہندوستان کے تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی میں لکھا، آخیر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے اور یہیں ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

صاحب ندوی، دارالاشاعت کا آغاز مولانا شبلی کی تصانیف کی اشاعت سے ہوا، پھر جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی، رفتہ رفتہ دوسرے شعبے قائم ہوتے گئے۔

کام کا آغاز اور ارض القرآن جلد اول اور مکاتیب شبلی کی اشاعت: دارالمصنفین کے کام کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۵ء کے آخر سے ہوا اور سیر الصحابہ کے مقدس سلسلہ سے اس کی ابتدا کی گئی اور سب سے اول سید صاحب کی تالیف ارض القرآن اور مکاتیب شبلی شائع ہوئیں۔

سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی کو ۱۲ / فروری کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"سیر الصحابہ شروع ہوگئی، مکاتیب اور ارض القرآن زیر طبع ہیں۔"

مکاتیب کے جمع وترتیب کا کام سید صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلما کے قیام کے زمانہ ۱۹۰۹ء سے شروع کر دیا تھا، اس کی پہلی جلد تقریباً مکمل ہوکر مولانا شبلی کی نظر سے گزر چکی تھی، ان کی وفات کے بعد اس پر نظر ثانی کر کے مکمل کیا اور دوسری جلد کے لیے مزید مکاتیب جمع کیے، مکاتیب کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"استاد مرحوم کے خطوط جمع کرنے کا شوق مجھے آغاز ملاقات ہی سے پیدا ہوا، سب سے پہلے ۱۹۰۲ء میں مجھے مراسلت کا شرف حاصل ہوا، ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک ان کا لکھا ہوا ایک ایک پرزہ اپنے نام کا میں نے ایک گراں بہا خزانہ کی طرح محفوظ رکھا جس میں لفافے، کارڈ، عام رقعے، ہر قسم کے مکتوبات کی تعداد ۲۵۰ تھی، ۱۹۰۹ء میں خیال آیا کہ یہ جواہر ریزے ممکن ہے اور بہت سے قدر شناس جوہریوں نے محفوظ رکھے ہوں، چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۹ء کے الندوہ میں میں نے اپنا خیال احباب کی خدمت میں پیش کیا، انہوں نے نہایت سرگرمی سے اس کی تائید کی اور اطراف ملک سے کئی ہزار خطوط کا مجموعہ جمع ہوگیا، جلد اول کے اکثر خطوط مولانا کی زندگی ہی میں صاف ہوکر ان کی نظر سے گزر چکے تھے، پھر کچھ ایسے عوائق پیش آئے کہ یہ مجموعہ سالہا سال تک گوشۂ اہمال میں پڑا رہا، ۱۹۱۴ء میں ان کی وفات کے بعد برسوں کی سرد تحریک میں گرمی پیدا ہوئی، دوبارہ مسودہ نکال کر صاف کرایا، خیال تھا کہ مولانا کے احباب وتلامذہ کے خطوط ملا کر ایک پوری جلد ہو جائے گی لیکن اس تحریک

کے دوبارہ اعلان پر اس کثرت سے ہر طرف سے خطوط کی بارش ہوئی کہ تمام ذخیرہ ایک جلد میں نہ سما سکا اور بالآخر جو بچ رہا اس کو ایک اور خزانے کے لیے بیمنت کر رکھنا پڑا، اس پر بھی ہم اس سلسلہ کو دوسری جلد پر تمام کرتے ہیں اور خطوط کا یہ حال ہے کہ ان سطروں کے لکھتے وقت ان کی آمد کا تار نہیں ٹوٹا، اس دوسری جلد کو بھی صرف تلامذہ کے خطوط پر ۲۰۰ صفحہ میں تمام کرنے کا ارادہ تھا لیکن ۲۰۰ صفحوں کے چھپ جانے کے بعد مولانا کے بعض ایسے اخص الخاص دوستوں کے خطوط ملے کہ اگر وہ مکاتیب شبلی میں جگہ نہ پاتے تو ہمارا یہ کارنامہ ناقص رہ جاتا۔" (دیباچہ مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۲، ۳)

ارض القرآن جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، درحقیقت سیرۃ النبی کا مقدمہ تھا، جو مولانا شبلی کی فرمائش پر لکھا تھا مگر یہ مقدمہ طویل زیادہ ہو گیا تھا، اس لیے سیرت میں صرف اس کا ضروری حصہ لیا گیا اور باقی کو بڑھا کر مصنف نے ایک مستقل کتاب بنا دی، یہ قرآن مجید کی تاریخی جغرافیائی تفسیر ہے، قرآن مجید میں جن مقامات اور اقوام و قبائل کا ذکر آیا ہے، ارض القرآن میں اس کی تاریخی، جغرافی اور اثری تحقیق کی گئی ہے، جس سے کلام مجید کے بیانات اور تاریخی و جغرافی تحقیقات میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں مستشرقین نے جو غلطیاں کی ہیں، ان کو بھی واضح کیا گیا ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ اور اپنے موضوع پر بالکل منفرد ہے، اس سے پہلے عربی میں بھی اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی، گو اب ارض القرآن کے متعلق بہت سے نئے معلومات حاصل ہو گئے ہیں مگر اس کی اولیت کا سہرا سید صاحب ہی کے سر ہے، اس لیے اس کتاب کو اہل علم میں بڑا حسن قبول حاصل ہوا۔

یہ دونوں کتابیں چند مہینوں کی تقدیم و تاخیر سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئیں، سید عبدالحکیم دیسنوی کو ۱۶؍ مئی ۱۹۱۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"مکاتیب جلد اول چھپ کر تمام ہوئی، الندوہ کی درمیانی جلدوں میں مکاتیب شبلی پر ایک مختصر مضمون ہے، جس قدر جلد ہو سکے اس کی نقل بھیج دیجیے، تمہید لکھنی ہے، ارض القرآن نصف

چھپی ہے اور سینے سیرت عائشہؓ نصف مرتب ہوگئی۔"

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکاتیب شبلی ارض القرآن سے پہلے چھپ گئی تھی، چنانچہ اس کی اشاعت کا اعلان بھی جولائی ۱۹۱۶ء کے معارف کے مطبوعات جدیدہ کے تحت میں موجود ہے مگر دارالمصنّفین کے سلسلۂ مطبوعات کا پہلا نمبر ارض القرآن پر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارض القرآن پہلے شائع ہوئی، اس وقت تک معارف پریس قائم نہیں ہوا تھا اور یہ دونوں کتابیں مطبع شاہی لکھنؤ میں چھپی تھیں۔

پریس کا قیام اور معارف کا اجرا: جون ۱۹۱۶ء میں معارف پریس قائم ہوا اور اس کی ابتدا مکاتیب حصۂ دوم کی طباعت سے ہوئی، ۹رجون ۱۹۱۶ء کے خط میں سید عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

"اس خوشی میں خط لکھتا ہوں کہ آج ۹رجون ۱۹۱۶ء پہلا دن ہے کہ معارف پریس نے کام شروع کیا، آج کاپیوں کے پہلے مسطر چھپے ہیں، پھر مکاتیب جلد دوم، مکاتیب جلد اول چھپ گئی ہے، آپ کے نام کے خطوط اسی میں ہیں، سیرت عائشہؓ کی نسبت لکھ چکا ہوں کہ آج کل زیادہ وقت اسی کی ترتیب وتحریر میں صرف ہوتا ہے، امید ہے کہ آئندہ ماہ میں تمام ہوجائے، معارف بھی اسی ماہ میں وجود میں آجائے گا۔"

علامہ شبلی نے دارالمصنّفین کا جو خاکہ بنایا تھا اس میں ایک علمی رسالہ کا اجرا بھی تھا اور اس کا نام بھی وہ تجویز کر گئے تھے، مگر ابھی تک دارالمصنّفین کا اپنا پریس قائم نہیں ہوا تھا، اس لیے معارف جاری نہیں ہوسکا تھا، معارف پریس کے قیام کے ساتھ ہی معارف جاری کردیا گیا اور اس کا پہلا پرچہ جولائی ۱۹۱۶ء میں نکلا، یہ پرچہ دارالمصنّفین کا علمی ترجمان تھا اور اس کے مقاصد وہی تھے جو دارالمصنّفین کے تھے، اس کی تفصیل خود ایڈیٹر اور ناظم دارالمصنّفین نے معارف کے پہلے نمبر میں یہ تحریر فرمائی ہے:

"رسالہ کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں شروع کرتے ہیں کہ

ہمارے علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب اسی ماہ مقدس میں نازل ہوئی تھی، شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔

الندوہ سے رخصت ہو کر پانچ چھ مہینہ کے بعد آج ہم پھر پبلک میں آتے ہیں اور معارف کے نام سے ایک دوسرا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

ع آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

اس مطبوعات پرستی کے دور میں کسی رسالہ کا عالم وجود میں آنا برسات کی پیدائش عام سے زیادہ دقیق نہیں، تاہم جب یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے سفر کا ہر قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹتا ہے تو اپنی سعی بے سود اور جدوجہد لاحاصل پر بھی خوشی حاصل ہوتی ہے، چند سال پیشتر ہمارے ملک میں متعدد علمی رسائل تھے لیکن اب ہر طرف سناٹا ہے، اس عالم میں اگر کسی گوشہ سے بھی کوئی لمعۂ برق کوند جاتا ہے تو تسلی کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں کہ اس ظلمت کدہ میں ایک امید کا چراغ روشن ہے۔

ملک میں روز بروز علمی چیزوں کی طرف سے سرد مہری پھیلتی جاتی ہے، فرزندان تعلیم جدید جو ہماری آئندہ توقعات کے سنگ بنیاد تھے، وہ اتنے بودے نکلے کہ از سر نو ایک نئی عمارت کا بوجھ اٹھانے کے بجائے اپنی پرانی جھونپڑی کو بھی انہدام سے نہیں بچا سکتے، علمائے کرام سے امید تھی کہ وہ اس فرض کو سب سے بہتر ادا کرسکیں گے کہ ان کی تعلیم و طلب علم کا نصب العین دفاتر سرکاری کا اعزاز اور حطام دنیا کا اکتساب نہیں ہے لیکن ان کو ابھی تک درمختار کی جزئیات اور تاتارخانیہ کے فتاویٰ سے فرصت کہاں؟

اسی بنا پر حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی مرحوم دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ معارف نام ایک ماہوار علمی اور دینی رسالہ کا تخیل بھی رکھتے تھے:

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

حاشیہ نشینان بساط شبلی نے اس محسن کی یاد میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی بساط بھران کی

تمام تحریکوں کو زندہ رکھیں گے، دو سال کی گذشتہ مدت دارالمصنّفین کے قیام و تاسیس میں صرف ہوگئی، اب جب ادھر سے اطمینان میسر آیا تو دوسرے فرائض یاد آئے، ان میں ایک معارف کا بھی اجرا تھا، ہم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک ایک خاص علمی رسالہ کی اعانت کے لیے کہاں تک تیار ہے تاہم ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے۔

ملک میں اس وقت علم و مذہب کے متعلق جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں وہ بالکل غیر معتدلانہ ہیں، کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ تمسخر سے نہیں شرماتے، دوسری طرف حامیان مذہب و علوم مذہبی کا جمہور اعظم ہے، جو عقل و علم، مصالح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے، ملک میں دونوں قسم کے مضامین اور تصنیفات ہر روز شائع ہوتے ہیں، ہماری جماعت صلح عام کی منادی ہے، وہ دونوں فریق کو دعوت دیتی ہے، وہ جدید علوم، تازہ خیالات، نئی تحقیقات کی بجان و دل خریدار ہے لیکن اس کے معاوضہ میں بزرگوں کا اندوختہ نہیں کھونا چاہتی ہے، ان نادانوں پر ہنسی آتی ہے جو تمام سرمایہ عمر دے کر بازار فرنگ کی ہر چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں، وہ ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہتی ہے کہ کیا ہمارے بزرگوں کے تاریک تہہ خانوں میں، ویران خرابوں میں اور مدفون خزانوں میں یہ موجود تو نہیں ہے، اگر ہے تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر میں ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی تلاش میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کر لے گا۔

دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے، لوگ اپنی وضع تبدیل کر رہے ہیں، مذاق، تمدن، طرز معاشرت، طریق تجارت، اسلوب گفتگو، ہر چیز میں نمایاں انقلاب ہے، اب اگر دلی کی پرانی وضع میں ایک تنگ و تار گلی کے اندر ایک چھوٹی سی دوکان میں بیٹھ کر ولی دکنی اور مرزا مظہر جان جاناں کی زبان میں ہم اکسیر بھی بیچیں تو کون خریدنے آئے گا، ہمارے گذشتہ علوم و فنون کا بعینہ یہی حال ہے، ہم کو اسی سامان و متاع کو لے کر اب نئے

ساز و سامان سے موجودہ طرز کی ایک بڑی شاپ میں بیٹھ کر شیشہ دار الماریوں میں اپنی دوکان سجانی چاہیے۔

اس رسالہ کا موضوع اور مقصد سمجھنے کے لیے تھوڑی دیر کے واسطے یہ فرض کر لینا چاہیے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے لیکن موجودہ نسل کے بجائے ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آ گیا ہے، اس حالت میں اب غور کرو کہ اس گروہ کے کیا علمی مہمات ہوں گے۔

اس سوال کا جواب قیاسی اور فرضی نہیں بلکہ اصول و تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے، علمائے سلف اور ان کے کارنامے دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے زمانہ تک تمام علوم اسلامی بالکل سادگی اور یک رخی حالت میں تھے، دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعۃً ایک انقلاب پیدا ہو گیا، سب سے پہلے ایک گروہ پیدا ہوا جس نے مختلف زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل کر دیے، ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوانوں پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں شروع کر دیں، عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی، عربیت نے معانی و بلاغت کا قالب بدلا، اصول فقہ میں منطقی استدلالات پیدا ہو گئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہو گئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہو گئے، ان باتوں کے ساتھ ان علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی، جہاں غلطیاں دیکھیں، اصلاح کی، جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کر دیا، جو حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا، تحلیل کر دیا، جو اصل عقائد سے آ کر ٹکراتا تھا اس کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔

آج بعینہٖ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے، ممالک مغربیہ نے اکثر علوم و فنون کے قالب بدل دیے ہیں، فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن

گئی، مذہبی علوم میں اب ہزاروں نئے مباحث کی ضرورت پیش آگئی ہے، اسلوب ادا اور طرز تعبیر کا اختلاف اب نئے سرے سے ان کی مستقل ترتیب وتہذیب کا طالب ہے۔

اسی گذشتہ مثال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر آج اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے جو علوم قدیمہ کے ساتھ انہوں نے کیا، علم کلام کو فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ میں وہ مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے اور فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قابل قبول ہیں اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیوں کر پیوند دیا جاسکتا ہے، یا ان کے نمونہ پر علوم قدیمہ کی روش کیوں کر بدلی جاسکتی ہے، یہ سچ ہے کہ آج قوم میں غزالی، رازی، بیرونی، ابن ہیثم، ابن خلدون اور مقریزی موجود نہیں ہیں تاہم اس کے لیے کام پڑا نہیں رہ سکتا اور جو کچھ کام جہاں تک بھی بن آئے وہ قابل قدر ہے، دارالمصنّفین علامہ مرحوم کے ان ہی تخیلات کا نتیجہ تھا اور ہم اپنی کائنات کے مطابق ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام کو شروع کرنا چاہتے ہیں۔

گذشتہ بالا خیالات کے مطابق معارف سے جن خدمات کی توقعات رکھنی چاہیے اور اس کے مقاصد میں جو نوعیت پیش نظر ہوگی وہ حسب ذیل ہے:

فلسفہ حال کے اصول اور ان کا معتدبہ حصہ پبلک میں لایا جائے، عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے، علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سرِنو ترتیب دیا جائے، علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا، علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بعہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے، اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو، عربی زبان کی نادر الفن اور کم یاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی

اوراخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کیے جائیں۔

اگر صرف ان ہی مقاصد پر قناعت کر لی جائے تو بھی ہمارے نزدیک بڑا کام ہے لیکن چوں کہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے اس لیے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقادوتقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوانات سے ان کی تلخی اور خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

معارف ایسے وقت میں نکلا جب ملک کو ایک بلند پایہ رسالہ کی بڑی طلب تھی، اس لیے اہل علم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ممتاز اخبارات ورسائل نے اس پر نہایت عمدہ ریویو کیے اور اس کے مضامین کو اپنے کالموں میں نقل کیا، چنانچہ سید صاحب جنوری ۱۹۱۷ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''معارف کی نسبت ملک کے کثیر وقیع اور مشہور اخبارات ورسائل نے جن مادحانہ اور قدردانانہ الفاظ کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لیے نہایت حوصلہ افزا ہے، اکثر معاصرین اس کے مضامین کو اپنے اخبارورسائل میں نقل کرنے کا شرف بخشتے ہیں، ملک کا تمام روشن خیال اور علم دوست طبقہ بحیثیت مجموعی اس کووقعت دیتا ہے اورعزیز رکھتا ہے، تاہم اپنے عیوب سے ہم بے خبر نہیں، اس لئے اپنے بعض دوستوں کے نیک مشوروں کو ہم نے خوشی سے سنا اور قبول کیا، کہتے ہیں کہ علمی مضامین کی خشکی اور تلخی کو گوارہ بنایا جائے لیکن اصل یہ ہے کہ طبیبوں سے فرمائش ہے کہ قندو شکر کے اضافہ سے دوا کی تلخی دور کی جائے وہاں نفاست پسند مریضوں سے بھی التجا ہے کہ ان کو اپنی زبانوں کی قوت ذائقہ کی درستی کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔''

معارف ان مقاصد میں کہاں تک کام یاب ہوا، اس کا فیصلہ ہم سے بہتر دوسرے اہل علم کر سکتے ہیں، جس زمانہ میں معارف نکلا ہے، علمی وتحقیقی مضامین لکھنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، معارف نے بیسیوں لکھنے والے پیدا کر دیے، اس کے اثر سے نئے اور پرانے دونوں طبقے متاثر ہوئے، پرانے طبقے کو اس نے مذہب اسلام اور اسلامی علوم وفنون

کی خدمت کے نئے وسائل اور علمی مسائل کی تحقیق وتنقید وانشاوتحریر کے نئے طریقوں سے آشنا کیا، جدید طبقہ کو جن کی دنیا محض جدید تعلیم تک محدود تھی، اپنی تاریخ اور اپنے علوم کی طرف متوجہ کیا اور ان دونوں میں سنجیدہ اہل علم کی ایک جماعت پیدا کردی اور اس کی نقل و تقلید پر وہ قدامت پسند بھی مجبور ہوئے جو ہر نئی چیز سے بھڑکتے تھے، معارف نے سیکڑوں علمی موضوعوں اور مسائل پر اور اسلامیات کی مختلف شاخوں پر مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کردیا جس سے اسلامی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جاسکتی ہے۔

معارف جس زمانہ میں نکلا ہے اپنے رنگ کا تنہا علمی رسالہ تھا اس لیے علمی طبقہ نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے چوٹی کے رسالوں میں اس کا شمار ہوتا تھا، اس کے بعد معارف کی تقلید میں جو رسالے نکلے ان میں ایک بھی علمی حیثیت سے اس کے ٹکر کو نہ پہنچ سکا، البتہ اب لکھنے والوں کی بڑی تعداد پیدا ہوگئی ہے اس لیے اور بھی علمی رسالے نکلنے لگے ہیں لیکن معارف کا امتیاز اب تک قائم ہے۔

مولوی بشیرالدین مرحوم کی مخالفت: دارالمصنفین جن مقاصد کے لیے قائم ہوا تھا، اس کا عملی نمونہ مولانا شبلی کی تصانیف، مضامین اور الندوہ میں نظر آچکا تھا، اس لیے ہندوستان کے تمام اکابر نے دارالمصنفین کو خوش آمدید کہا، صرف مولوی بشیرالدین صاحب مرحوم کی ایک آواز مخالفت میں اٹھی، انہوں نے ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۶ء کے البشیر میں مخالفت میں مضمون لکھا، افسوس ہے کہ یہ پرچہ دستیاب نہ ہوسکا، سید صاحب نے اکتوبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں اس کا جو جواب دیا ہے اس سے مخالفت کے اسباب اور اس کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولوی بشیرالدین صاحب جو البشیر نام ایک زعفران زار اخبار کے ایڈیٹر ہیں ان کے اختراعات اور جدت طرازیوں کی داد دیتے دیتے گو ہم تھک گئے ہیں لیکن مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیے کہ ان کا یہ مایہ ناز صناع اپنی صنعت گری کے نت نئے تماشا نمائیوں سے نہیں تھکتا، اس کی

ایک تازہ ایجاد ۲۶ر ستمبر کے البشیر میں ظاہر ہوئی ہے، غریب کے نزدیک دنیا اور اس کی ضرورتیں صرف ایک ہی گھروندے سے عبارت ہے، جس کا نام ان کی زبان میں "علی گڑھ کی مرکزیت" ہے، حاشا کہ میں علی گڑھ کی تحریک کا مخالف نہیں لیکن اس کے نادان دوستوں کی حمایت پر بے اختیار ترحم آمیز ہنسی آتی ہے، دارالمصنفین کے قیام اور اس کی تاسیس وترقی کی داستان اگر ان کے لیے خوش آئند نہیں تو ہم دعا کریں گے کہ خدائے پاک انہیں وہ عمر دراز دے جو ملت مرحومہ کی ایک ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے سیکڑوں مرکزی مجمعے اور مجالس ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں، غالباً یہ متوقع الحصول موقع ان کے لیے سب سے زیادہ اندوہ گیں اور پر حسرت ہوگا:

ع مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

دارالمصنفین کی بے اہمیتی کی ان کے نزدیک سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اس سے واقف نہیں ہیں، اس بنا پر تو دنیا کی بڑی بڑی مہمات کا ماتم کرنا پڑے گا کہ اس کو مولوی صاحب سے تعارف کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا:

لذت شناس رندی و مستی نہ بودہ است آں بوالہوس کہ در گرد عز و ناز بود

(معارف اکتوبر ۱۹۱۶ء)

سید صاحب کی یہ دعا قبول ہوئی اور مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم نے واقعی اتنی عمر پائی کہ ان کو ایک کیا بیسیوں اداروں کے قیام کا داغ برداشت کرنا پڑا، اس مخالفت میں مولوی صاحب معذور بھی تھے، درحقیقت سرسید اور علی گڑھ کے پرانے پرستاروں میں کچھ لوگوں پر ان کا اتنا سحر تھا کہ وہ سرسید کے علاوہ کسی دوسرے انسان کی اہلیت اور علی گڑھ کالج کے سوا کسی ادارہ کی ضرورت واہمیت کا تصور ہی نہیں کرسکتے تھے، ان کے نزدیک مسلمانوں کے سارے امراض کا مداوا اور ان کی تمام ضروریات کا متکفل علی گڑھ کالج تھا، اس کے سوا اور کسی ادارہ کی ضرورت کو وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے، بلکہ اس کو علی گڑھ کالج کی مخالفت تصور کرتے تھے لیکن پھر مولوی صاحب مرحوم دارالمصنفین کے کاموں کو دیکھ کر

اس کی افادیت کے قائل اور اس کے مداح وثنا خواں ہو گئے تھے۔

دارالمصنّفین کی تقلید میں بعض اداروں کا قیام: بعض لوگوں نے دارالمصنّفین کی نقل و تقلید میں علمی ادارے قائم کیے، چنانچہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبداللہ عمادی نے ''دائرہ معارف مشرقیہ'' کے نام سے لاہور میں ایک ادارہ قائم کیا، سید صاحب نے معارف میں اس کا خیر مقدم کیا، چنانچہ ستمبر ۱۹۱۶ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''ہم کو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ملک میں خالص علمی چیزوں کی تاسیس و اشاعت کے سامان پیدا ہوتے جاتے ہیں، دکن میں انجمن ترقی اردو جناب مولوی عبدالحق صاحب کی زیر ادارت دو سال سے مفید تصنیفات کی اشاعت میں غیر معمولی مستعدی ظاہر کر رہی تھی کہ اب پنجاب میں ہمارے دوست مولوی ظفر علی خاں بی، اے اڈیٹر زمین دار و دکن ریویو اور ہمارے صدیق محترم مولانا عبداللہ العمادی دائرۂ معارف مشرقیہ قائم کر رہے ہیں، امید ہے کہ خداوند عالم ان بے لوث خدمت گذاران علم کو ان کے اداروں میں کام یابی اور ان کے کارناموں میں سعادت نصیب فرمائے:

غلام ہمت دردی کشان یکرنگم ‌ ‌ ‌ نہ آں گروہ کہ ارزق لباس و دل سیہ اند

یہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا عبداللہ عمادی دونوں کی عمر اور قلم کے شباب کا زمانہ تھا، مولانا ظفر علی خاں کے زورِ قلم کی پورے ہندوستان میں دھوم تھی اس کے باوجود یہ ادارہ نہ چل سکا اور اس کا نام اب صرف اخبارز میں دار کے فائلوں میں مل سکتا ہے۔

تقریباً دو سال تک دارالمصنّفین کا کام آہستگی سے جاری رہا اور اس درمیان میں اس کے متعلق اخبارات میں مضامین نکلتے رہے مگر ابھی اس کے کاموں کا پورا متخیلہ نقشہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا اس لیے ستمبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں سید صاحب نے دارالمصنّفین کے متخیلہ اعمال کے عنوان سے اس کی پوری تفصیل تحریر کی جو حسب ذیل ہے:

دارالمصنّفین کے کاموں کا خاکہ سید صاحب کے قلم سے: دارالمصنّفین کی حقیقت کی نسبت دو برس سے اخبارات میں سلسلہ مضامین جاری ہے لیکن پیچھے مڑ کو جود یکھتے ہیں تو

آب بھی نشان پا معدوم اور منزل مقصود کا پتہ مفقود پاتے ہیں، اکثر احباب پوچھتے ہیں کہ اس پریشان روی سے مقصود کیا:

گاہ بر دل زندہ گاہ زند بر ایماں   یار زلف تو ندانم کہ چہ در سر دارد

جواب میں اپنی داستان کئی بار دہرا چکے ہیں، تاہم موضوع اب تک محتاج تکرار ہے:

یک حرف بیش نیست غم عشق وایں عجب   کز ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

ملک وملت کی ترقی و رفعت کے لیے مردان سوز ودرد جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہر حال سزاوار تحسین وآفرین ہے لیکن اصل یہ ہے کہ ہم میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ ہے کہ ہم میں اشخاص موجود نہیں، اشخاص کو کون پیدا کرتا ہے، اتفاقیات سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ نسل صرف سنجیدہ اور صحیح خیالات کی پیداوار ہے، قوموں کے خیالات کی تصحیح، ان کے معلومات کی توسیع، ان کے عیوب و امراض کی تشریح، ان کے فرائض و اعمال کی تذکیر، واقعات عالم پر اطلاع وعبور و بقائے قومیت کا انکشاف، اسرار اخلاق و مذہب کی دعوت و تعلیم، جس شعبہ کو لو اس غیر ذی روح معلم اور گنگ ناطق کا فیض اثر ہے جس کا نام کتاب ہے۔

انسانیت کی تکمیل جن ذرائع سے عمل میں آئی ہے وہ پیغمبرانہ قوت کے نتائج ہیں لیکن یہ قوت کتاب مسطور اور ''صحف مطہرہ'' کے ذریعہ ظہور میں لائی گئی ہے، حکمائے عالم کے خیالات نے جو دنیا میں تموج پیدا کیا ہے وہ بھی اسی دریائے ذخار کی متواتر لہریں ہیں، آج بڑا رونا یہ ہے کہ مذہب، زبان، فلسفہ، صناعت، اخلاق، ہماری ترقی کے لیے جن قوائے نامیہ کی بھی ضرورت ہے ان کے تغذیہ اور نشو ونما کے لیے ہمارے یہاں کوئی سامان نہیں۔

یہ سچ ہے کہ ملک میں روز بروز تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور لائق

ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشا پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ ملک میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان جو فراغ بالی جو ذخیرہ چاہیے وہ مہیا نہیں، ان میں سے اکثر حوصلہ مندوں کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں، جو انتخاب اور اقتباس کے کام میں آئے، اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دل جمعی اور اطمینان خاطر کے اسباب نہیں، ان باتوں کے ساتھ کہیں کوئی علمی مجمع نہیں کہ ایک دوسرے سے استشارہ اور مبادلہ افکار ہو سکے اور خاتمۃً یہ کہ اگر ان عوائق کی دیواریں ہٹ بھی جائیں تو طبع واشاعت کی راہ ان کے لیے اس قدر دشوار اور ناقابل گزار ہے کہ اکثر ارباب حوصلہ ایک دو بار سے زیادہ حوصلہ آزمائی کی جرأت نہ کر سکے۔

ان مشکلات اور دقتوں کے حل، تصنیف وتالیف کی ترقی اور ملک کے خیالات کی توسیع وتصحیح کے لیے ضروری ہے کہ ایک دارالتصنیف قائم کیا جائے۔

۱۔ جس کے احاطہ میں ایک وسیع کتب خانہ ہو۔

۲۔ مصنّفین کی اقامت وسکونت کے لیے جس میں مسلسل عمارات اور حجرے ہوں۔

۳۔ جہاں مصنّفین کی دل جمعی اور اطمینان خاطر کے لیے وظائف کا سامان ہو۔

۴۔ جہاں طبع واشاعت کے اسباب مہیا ہوں۔

ہم نے ان خطرات کی راہ میں جہاں تک مسافت سفر طے کی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کتب خانہ: دارالمصنّفین کا کتب خانہ مشرقی ومغربی علوم کا مجمع البحرین ہونا چاہیے، مغربی تصنیفات کا ذخیرہ ہمارے پاس نہایت ہی قلیل ہے، انسائیکلوپیڈیا اور ورلڈ ہسٹری کے علاوہ

قدیم تاریخ، قانون اور بعض لٹریری تصنیفات نیز مذہب اسلام اور آنحضرت ﷺ کے متعلق تمام کتابیں گو ہمارے پاس موجود ہیں لیکن علوم وفنون کی تصنیفات ہمارے پاس ایک دو کے سوا مطلقاً نہیں، اس حصہ کو ابھی بہت کچھ ترقی دینا ہے، کم از کم اس قدر ضروری ہے کہ ہر علم وفن پر انگریزی کی ایک دو مستند کتابیں موجود ہوں۔

مشرقی علوم کی تصنیفات میں فارسی کا سرمایہ بھی مختصر ہے لیکن گراں مایہ ہے، عنقریب گب سیریز اور ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات سے اس میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔

عربی زبان میں تفسیر وحدیث کی تمام تر مطبوعہ کتابیں موجود ہیں، اسماء الرجال کا سلسلہ بھی مکمل ہے، معقولات وریاضیات کی تعداد کم ہے، ادب ولغت کی شاید ہی کسی نادر تصنیف کی ہمارے ذخیرہ میں کمی ہو، تاریخ کا سرمایہ بھی ایک حد تک مغتنم ہے، بعض کتابوں کی حاجت ہے، وہ عن قریب پوری ہو جائے گی۔

چند قلمی اور نایاب کتابیں بھی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

امید ہے کہ پانچ ہزار کی رقم اگر میسر آجائے تو ایک حد تک انگریزی علوم کی کتابیں اور تمام تر مشرقی تصنیفات ہمارے کتب خانہ میں مجتمع ہو جائیں گی، بالفعل ہم صرف پچیس روپیہ ماہوار کتب خانہ کی ترقی واضافہ پر صرف کر رہے ہیں۔

بیوت المصنّفین: بڑے شہروں میں ہم کو اس ابتدائی حالت میں بمشکل زمین مل سکتی تھی لیکن یہاں بیرون شہر آبادی سے اس قدر متصل دس[1] بیگھہ زمین ہم کو مل گئی ہے جو مخصوص دار التصنیف اور دیگر علمی ضرورتوں کے لیے وقف کر دی گئی ہے، اس زمین کے اندر دو بنگلے پہلے سے بنے تھے، ایک خود مولانائے مرحوم کا تعمیر کردہ تھا، جو بالفعل لائبریری ہال ہے، دوسرا بنگلہ کسی قدر رمیم کے ساتھ سکریٹری آفس ہے، ہال کے اطراف اور گوشوں میں متعدد

[1] اس میں بعد میں چار بیگھوں کا اور اضافہ ہوگیا، اس وقت دار المصنفین کا رقبہ چودہ بیگھہ پختہ ہے۔

حجرے اور کمرے ہیں، جہاں مصنّفین اور رفقا قیام پذیر تھے، لیکن یہ مسکن ان کے لیے کچھ زیادہ مناسب نہ تھا۔

مئی ۱۹۱۶ء میں مجموعاً کئی ہزار کی رقم ہم کو مل گئی ہے، ہم نے سب سے پہلے بیوت المصنّفین کا سلسلہ شروع کر دیا، ستمبر میں یہ تکمیل کو پہنچ گئی، مسلسل پانچ کمروں کی ایک قطار ہے، سامنے برامدہ ہے، داہنے بائیں غسل خانے ہیں، وسط سلسلہ میں کھانے کا کمرہ ہے، بیوت المصنّفین کے دوسرے پہلو پر دارالمصنّفین کا آفس تعمیر ہوا ہے، یہ تمام مکانات پختہ، بلند اور مستحکم وخوب صورت بنے ہیں، آفس کے پہلو میں کسی قدر خام عمارات کا سلسلہ ہے، جو دارالاشاعت اور دارالطباعت ہے۔

سلسلہ تعمیر میں ہم کو سب سے زیادہ ایک مستحکم، پختہ، وسیع، روشن اور ہوادار عمارت کتب خانہ[1] کی ضرورت ہے، جہاں کتابیں اتفاقات سے محفوظ رہ سکیں اور ہر موسم میں جہاں بیٹھ کر مصنّفین کام کر سکیں، اس عمارت پر تقریباً پندرہ ہزار صرف آئے گا۔

خدا کے فضل وعنایت سے امید ہے کہ آئندہ موسم سرما میں دارالمصنّفین کا وفد درد مندان ملک کی خدمت میں پیش ہوگا تو قدر شناسان شبلی کی بحمداللہ ملک میں اتنی تعداد ہے کہ شاید وفد کو اپنی کامیابی کے لیے زیادہ سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

وظائف اور سرمایۂ مالی: یہ وہ ضرورت ہے جس کے بغیر دین ودنیا کی کوئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی، اب تک عام اور پبلک چندوں نے ہماری کوئی اعانت نہیں کی اور نہ ہم نے اس کے لیے کبھی دست طلب بڑھایا، سرمایہ مالی کے چار ذرائع ہیں:

۱-	حیدرآباد وبھوپال کی ماہانہ اعانت	۵۰۰/ماہوار
۲-	جائداد موقوفہ کی آمدنی	۱۵۰/سالانہ (تقریباً)
۳-	ممبروں کے سالانہ چندے	۳۰۰/سالانہ (تقریباً)

---

[1] کتب خانہ کی یہ وسیع عمارت ۱۹۲۸ء میں تعمیر ہوئی ہے۔

۴۔ دارالاشاعت کا منافع ۲۰۰ رسالانہ (تقریباً)

بالفعل تقریباً تین سو ماہوار رفقا اور مصنّفین کے وظائف پر صرف ہوتا ہے، پچیس ماہوار کتب خانے کے لیے مخصوص ہے اور تقریباً پچاس ماہوار انتظامی اشخاص اور دفتر کے لیے، بہر حال ہمارے پاس اس وقت اتنا سرمایہ ہے کہ تین مشرقی اور مغربی علوم کے مصنّفین اور چار رفقائے تصنیف (فیلو) کسی قدر ایثار کے ساتھ باطمینان گزار سکتے ہیں۔

دارالاشاعت: دارالاشاعت کے لیے چند کمروں کی قطار ہمارے پاس ہے جو خزانۃ الکتب (بک ڈپو) ہے، اسی احاطہ میں ایک پریس قائم کیا گیا ہے جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے، ۱۹۱۷ء تک امید ہے کہ یہاں مشین آجائے، اس وقت دارالاشاعت کو اپنی کامیابی کے لیے بہترین موقع ہاتھ آئے گا، تمام ہندوستان میں خالص مصنّفین کے لیے بغیر تاجرانہ ارادہ و نیت کوئی پریس قائم نہیں، اگر ہماری کامیابی ہمارے حوصلے کے مطابق ہوئی تو امید ہے کہ یہ سب سے بڑی کمی دارالاشاعت سے پوری ہو جائے، بعض دوستوں کی رائے ہے کہ ہمدرد وغیرہ کی طرح پبلک کے مشترک سرمایہ سے پریس کو ترقی دی جائے لیکن ہمارا جواب یہ ہے کہ اولاً ہم کو ہندوستان میں مشترکانہ کاموں کی کامیابی سے ناامیدی ہے، ثانیاً اگر پبلک کی شرکت بغرض منافع ہو تو اس سے اصلی غرض مفقود ہو جائے گی اور ایسے اشخاص کا وجود جو اخلاص نیت کے ساتھ بلا ارادہ مزد و فوائد مالی شرکت فرمائیں کبریت احمر سے نادر تر ہے۔

خزانۃ الکتب (بک ڈپو) میں اس وقت تک صرف مولانائے مرحوم اور دارالمصنّفین کے ممبروں کی تصنیفات ہیں، ارادہ یہ ہے کہ اردو کے خیار الکتب (سلکٹیڈ بکس) کی تجویز عمل میں لائی جائے، یورپ میں جہاں ہر روز سیکڑوں کتابیں ہر فن پر شائع ہوتی ہیں ایک شخص تمام عمر کتابوں کو تو نہیں خرید سکتا اور نہ عام کتب فروشوں سے معلوم کر سکتا ہے کہ ان مطبوعات یومیہ میں بہترین کتابیں کون ہیں، وہاں قاعدہ یہ ہے کہ بعض معتمد فضلائے عصر کے ایما سے خیار الکتب کی فہرست شائع ہوتی ہے اور صرف ان کے مذاق کے اعتماد پر لوگ

ہر فن کی وہی کتابیں منگواتے ہیں جو اس فہرست میں درج ہوتی ہیں، ہندوستان میں بڑی مشکل یہ ہے کہ اچھی کتابیں بہت دیر میں نکلتی ہیں اور خریداروں کو دیر میں خبر ہوتی ہے اور اگر پانچ سو خریداروں کے نام تیار ہوں تو پھر اس میں کوئی دقت پیش نہ آئے، ہندوستان کی خر بازاری میں جہاں گوہر وخذف ایک ہی دام بکتے ہیں اور پریس کی سہولتوں نے ہر قلم گیر کو مصنف کا درجہ عطا کر دیا ہے، دار الاشاعت اور فہرست خیار الکتب نہایت ضروری شے ہے، اس بنا پر ارادہ ہے کہ اردو کی تمام مستند تصنیفات دار الاشاعت میں جمع کی جائیں اور ان کی یورپین کیٹلاگ کے طریقہ پر فن وار ایک فہرست ترتیب دی جائے، اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ اس وقت ہماری زبان میں کیا سرمایہ ہے اور کام کتنا ہو چکا ہے۔

دار التصنیف: ہم چند فقرائے ملت نے اپنے حوصلے سے بلند تر وہ فرائض اپنے سر لیے ہیں جو صرف شاہانہ ہمتوں کے شایان شان تھے، وحملها الانسان انه كان ظلوماً جهولا۔

۱- ہمارا مقصد صرف اردو زبان کے سرمایہ کی ترقی نہیں ہے بلکہ اولاً ملک میں ایک ایسی جماعت پیدا کرنا ہے جو قوم کی دماغی قوتوں کے نشوونما کا سامان کر سکے۔

۲- اسلامی علوم وفنون اور علمائے اسلام کی قدیم نادر تصنیفات کو بربادی اور گم شدگی سے بچانا اور اگر ممکن ہو تو اس کے طبع واشاعت کا سامان کرنا۔

۳- مشرقی اور مغربی علوم پر اپنی زبان میں مستند تصنیفات کا وجود۔

دار التصنیف میں اس وقت صرف دو فیلوز (رفیق) ہیں، مولوی معین الدین ندوی، یہ ندوہ کے فارغ التحصیل ہیں، مذاق صحیح رکھتے ہیں اور مولانائے مرحوم کے عہد سے سلیقہ تحریر وتصنیف کی تعلیم حاصل کر رہے ہے، مولوی محمد سعید انصاری، انہوں نے کان پور کے مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن قدرت کی فیاضیاں دشت وچمن میں ہر جگہ یکساں نظر آتی ہیں، تقریباً ایک سال سے وہ دار التصنیف میں قیام پذیر ہیں، ان دونوں عزیزوں کی

تحریریں عام اخبارات اور خود معارف میں نکلتی ہیں، ان سے معلوم ہوگا کہ آئندہ ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

عن قریب دارالتصنیف میں دو اور رفیقوں (فیلوز) کا اضافہ ہوگا۔

اسلامی علوم وفنون اور علمائے اسلام کی قدیم نادر تصنیفات کا تحفظ ایک عام کتب خانہ کی تاسیس سے ممکن ہے اور وہ قائم ہو چکا ہے، ان میں سے مفید و نادر تصنیفات کے طبع و اشاعت کا سامان ایک بڑے سرمایہ کا طالب ہے کہ ملک میں ان کتابوں کی مانگ کم ہوگی، تاہم اگر دو سو ایسے خریدار پیدا ہو جائیں جو اس قسم کی ہر کتاب کو فوراً خریدنے پر آمادگی ظاہر کریں تو کسی حد تک مشکل آسان ہو جائے گی۔

مشرقی اور مغربی علوم پر مستند کتابوں کی تالیف وتصنیف ہی ایسا کام ہے جو ہمارے موجودہ تخیلات کا محور ہے، ابھی دارالمصنفین کی عمر صرف دو برس کی ہے، مستند اور عمدہ کتابوں کی تصنیف کے لیے ایک دو برس کی مدت کافی نہیں، برسوں صرف ایک موضوع کے لیے کتابوں کی ورق گردانی، خیالات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط میں صرف ہو جاتے ہیں۔

ہم نے یہ بھی طے کرلیا ہے کہ متفرق رسائل کے بجائے مسلسل تصنیف پر زیادہ زور دیا جائے گا، متفرق رسائل کا تو ہر جگہ انتظام ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن کسی طویل سلسلہ کی بہت کم ہمت کی جاسکتی ہے، درمیان میں موقع موقع سے بطریق شذرات متفرق تصنیفات بھی معرض تحریر میں آئیں گی۔

مشرقی تصنیفات کے سلسلہ میں ہمارے یہاں اہم کام سیرت نبویؐ اور سیرۃ الصحابہؓ کی تحریر وتکمیل ہے اور یہ کام مسلسل انجام پارہا ہے، اگر یہ دونوں کام ہمارے منتہائے خیال کے مطابق تکمیل کو پہنچ گئے تو ہم ایسا نمونہ پیش کریں گے جس کی نظیر اسلام کی تمام علمی تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی، اس کے ساتھ متفرق رسائل بھی لکھے جاتے ہیں، ارض القرآن اور سیرت عائشہؓ پہلی کتاب سو صفحے کے بہ قدر چھپ چکی ہے اور دوسری تصنیف کے آخری

ابواب زیر تحریر ہیں۔

سیرت الصحابہؓ ایک عظیم الشان سلسلۂ تصنیف ہے، اگر یہ فرض باحسن وجوہ ادا ہو جائے تو ایک بڑی اسلامی خدمت بن آئے گی، سیرت الصحابہؓ کے موضوع اور خصوصیات کے متعلق ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے، اس سلسلہ کے اختتام کے بعد ہندوستان کی ایک محقق اور مستند تاریخ کا مسئلہ ہے، علوم اسلامیہ کی تاریخ پیش نظر ہے، ایک انسائیکلو پیڈیا لکھنا ہے، تاریخ اسلام یعنی اسلام کی تیرہ سو برس کی سیاسی تاریخ بھی ضروری چیز ہے، ہیروز آف اسلام کی تکمیل بھی کچھ کم ضروری نہیں، اکابر علمائے اسلام کی سوانح عمریاں لکھنا، قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا۔

مغربی تصنیفات کے سلسلہ میں ابھی صرف ایک کتاب قابل ذکر ہے، انقلاب الامم موسیو لیبان جن کی تمدن عرب گھر گھر پھیلی ہے، ان کی فرنچ تصنیف ہے، مصر کے ایک نامور فاضل نے اس کو عربی میں منتقل کیا، قوموں کے عروج وزوال اور موت وحیات کے اصول اوران کی ترقی وانحطاط کے قانون نہایت دل چسپ پیرایہ بیان وطریقہ استدلال میں ادا کیے ہیں، ہمارے لائق دوست مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کو اپنے مخصوص طرز تحریر میں اردو کا جامع پہنایا ہے اوراس پر ایک وسیع مقدمہ لکھ کر قرآن مجید کی آیات اور مسلمان مؤرخین کی تصریحات سے دکھایا ہے کہ اس موضوع کے متعلق اسلام کے پاس کیا سرمایہ موجود ہے۔

مغربی علوم کے سلسلہ کے متعلق بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ وہ کس اصول کے تحت شروع کیا جائے تقریباً یہ طے شدہ ہے کہ منتشر رسالوں کے بجائے اس میں بھی تدریج و تسلسل وجامعیت کا لحاظ رکھا جائے، اب تک ہمارے یہاں یہ ہوتا آیا ہے کہ کبھی فلسفہ تعلیم پر کسی کتاب کا ترجمہ ہوگیا، کبھی سائنس کے ایک نہایت چھوٹے ٹکڑے پر ایک کتاب لکھوادی، اردو کی دریوزہ گری ان کوڑیوں سے نہیں جائے گی، ہم کو نہایت سنجیدگی سے پہلے جدید علوم

وفنون کی ایک فہرست تیار کرنی چاہیے اور تقدم وتاخر کی ترتیب تدریجی کے بعد ہر علم وفن پر ایک متوسط الحجم کتاب لکھوانی چاہیے۔

تمام ہندوستان میں اس غرض کے لیے آنریبل مولانا سید کرامت حسین سے بڑھ کر کوئی شخص ہم کو نہیں مل سکتا، مولانائے موصوف نے ازراہ عنایت جو تجویز اس کے لیے قرار دی ہے ان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں، عقلیات کو حسب ذیل تقسیم فرمایئے:

۱- نطقیات: اس کو منطق پر ترجیح ہے، علوم کے نام میں یکسانی ہوتی ہے۔

۲- حسابیات: ادائے مفہوم میں ریاضی سے بہتر ہے۔

۳- سماویات: فلکیات اور ہیئت دونوں سے بہتر ہے۔

۴- ارضیات: اس میں جغرافیہ طبعی وسیاسی وفزیا گرافی وجیالوجی وغیرہ ہیں۔

۵- طبعیات: علم الحرکت والسکون، حرارت، آواز، برق، نور، مقناطیس وغیرہ داخل ہوں گے۔

۶- عنصریات: اس کو کیمیا پر ترجیح ہے، اس سے اول تو یہ پتہ ملتا ہے کہ عناصر سے بحث ہے، پھر دوم اساسی علوم میں یکسانی ہوتی ہے۔

۷- حیاتیات: اس میں علم نباتات وحیوانات وتشریح وعلم وعمل الاعضاء وغیرہ داخل ہوں گے۔

۸- نفسیات: یہ سائیکالوجی کا مرادف ہے۔

۹- قومیات: سوشیالوجی کا مرادف ہے، اس میں تمام وہ علوم داخل ہوں گے جو انسان سے بحالت اجتماع بصورت قوم باحث ہیں، علم الاخلاق وغیرہ اس میں داخل ہوں گے۔

ہمارے ایک فاضل دوست جن کا نام ان کی اجازت کے بغیر لینا ان کے مجموعہ تعزیرات کا ایک سنگین جرم ہے، اس فہرست میں حسب ذیل ترمیم واضافہ چاہتے ہیں:

۱-فلسفیات

۱-الٰہیات (تھیالوجی)،۲-علمیات (ایپسٹمالوجی)، ۳-اخلاقیات (ایتھکس)، ۴-منطقیات (لاجک)، ۵-نفسیات (سائیکالوجی)، ۶-جمالیات (ایستھیٹکس)، ۷-اجتماعیات (سوشیالوجی)، ۸-اقتصادیات (اکانمی)،۹-سیاسیات (پالیٹکس)

۲-حکمیات

۱-حیاتیات (بیالوجی)،۲-عضویات (فزیالوجی)،۳-تشریحات (اناٹمی)،۴-حیوانیات (زولاجی)،۵-نباتیات (باٹنی)،۶-عنصریات (فزکس)

اس خواب کوسن کر احباب کوگھبرانا نہ چاہیے۔

فیض روح القدس ار بارند وفرماید دیگراں نیز کنند انچہ مسیحا می کرد

اردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین کی تجویز اور اس کا خاکہ: مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی ابتدا سے سنجیدہ علمی مذاق رکھتے تھے اوران کے مضامین نے طالب علمی ہی کے زمانہ میں علمی حلقہ میں شہرت حاصل کر لی تھی،مولانا شبلی کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں وہ بھی ان کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے اور اپنے ذوق کے اعتبار سے شبلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے،اس لیے اسی زمانہ سے ان کے اور سید صاحب کے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے،چنانچہ انہوں نے جب دارالمصنّفین قائم کیا تو مولانا عبدالماجد صاحب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی،وہ ملازمت کی قید و بند پسند نہ کرتے تھے،اس لیے اس شرط پر دارالمصنّفین کے کارکنوں میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کی کہ اعظم گڑھ میں قیام کی قید نہ ہوگی،ان کے تعلقات راجہ صاحب محمود آباد (راجہ علی محمد خاں مرحوم) سے تھے،راجہ صاحب علمی مذاق رکھتے اورقومی وملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے،مولانا عبدالماجد صاحب نے ان کے سامنے اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز پیش کی،انہوں نے اس کو پسند کیا اور اس کے لیے ایک لاکھ روپیہ

دینے کا وعدہ کیا، سید صاحب ۱۶/نومبر ۱۹۱۶ء کے خط میں سید عبدالحکیم صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہیں:

''ماجد صاحب اس شرط پر دارالمصنفین آتے ہیں کہ قیام اعظم گڑھ کی قید نہ ہو، آج کل راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں آمد و رفت ہے اور انسائیکلو پیڈیا کی تجویز ہے، ایک لاکھ دیتے ہیں، گفتگو جاری ہے لیکن کہتے ہیں کہ مرکز لکھنؤ ہو۔''

اس کے بعد ۵/دسمبر کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسٹر عبدالماجد شریک کار ہیں اور اب شاید باضابطہ ہماری جماعت میں منظم ہو جائیں، انسائیکلو پیڈیا کے چیف ایڈیٹر بھی وہ ہوں گے، ستارۂ صبح ابھی دھندلا ہے، شاید اس کے بعد صبح محشر ہو۔''

یہ تجویز اس حد کو پہنچ گئی کہ سید صاحب نے دسمبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں اس کی حسب ذیل تفصیلی اسکیم شائع کی:

''ہندوستان کی ترقی کا شور وغل اس وقت تک صدائے بے اثر ہے جب تک اس میں کوئی جامعیت پیدا نہیں، ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف زبانوں کا گھر ہے، ان مختلف النسل، مختلف المذہب اور مختلف اللسان افراد کو جماعت اور مختلف جماعتوں کو ایک قوم بنانا صرف اسی طریقہ سے ممکن ہے کہ ان میں نسلی یا مذہبی یا لسانی اتحاد پیدا کیا جائے، ہندوستان کی مختلف نسلی جنسیتوں کو ایک کرنے کا خیال ایک بے سود اور ناقابل عمل تخیل ہے، تمام ہندوستان کو صرف ایک مذہب کا پیرو بنا دینا گو عقلاً ممکن ہے اور دائرۂ عمل کے اندر داخل ہے لیکن بیرونی مشکلات کی بنا پر ایک وسیع مدت تک تقریباً محال ہے، اس لیے تمام ہندوستان کو اگر ہم ایک متحد قوم بنانا چاہتے ہیں تو صرف زبان ہی کا اشتراک ایک ایسی چیز ہے جو ان اختلافات کو مٹا کر تمام ہندوستانیوں کو ایک مشترک و متحد ہندوستانی قوم بنا سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی سیکڑوں زبانوں میں سے اس عمومیت اور

اشتراک کی صلاحیت کس کو حاصل ہے اور اس صلاحیت اور استحقاق کا معیار کیا ہے؟

۱- فطرۃً اس میں عمومیت اور تمام ملک میں چھا جانے کی صلاحیت موجود ہو۔

۲- کسی صوبہ کی خاص زبان نہ ہو بلکہ عموماً ملک کے ہر گوشہ میں اور ہر حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔

۳- اس میں علوم و فنون کا سرمایہ اور ہر قسم کے بلند خیالات کا ذخیرہ ایک حد تک موجود ہو۔

دو اول الذکر حیثیتوں سے اردو زبان کے ترجیحی تفوق کے پہلو کو کوئی دبا نہیں سکتا، اردو سے زیادہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں ایک عمومی اور ملکی زبان بننے کی قابلیت نہیں، ملک کی دوسری زبانیں صرف بھاشا اور سنسکرت کی پیداوار ہیں لیکن اردو نہ صرف ہندوستان کی تمام زبانوں کا مجموعہ ہے بلکہ غیر ملکی الفاظ کا بھی اس میں میل ہے، اس بنا پر ہندوستان کی مختلف الاجزا قومیت کے لیے اردو سے زیادہ اس قومیت کی ترجمان بننے کی کسی اور میں صلاحیت نہیں ہوسکتی، بنگالی زبان ہندوستان کے تمام دیگر صوبوں کے ہندو مسلمان اور ملک کے عام باشندوں کے لیے بالکل بے گانہ ہے، یہی حال مرہٹی اور گجراتی کا ہے کہ اپنے اپنے صوبوں کے حدود سے جب ان کا قدم باہر نکلے گا تو ہمیشہ ان کے خیر مقدم ملک کے باشندوں کی طرف سے بے گانہ وار ہوگا، برخلاف اردو زبان کے کہ ملک کی آبادی کا تیسرا اسلامی حصہ ہر صوبہ اور ہر گوشہ میں اس کو بطور مادری زبان کے بولتا اور سمجھتا ہے، ملک کی دوسری کثیر التعداد قوم یعنی ہندو بھائی ملک کے بڑے بڑے صوبوں میں مثلاً پنجاب، دہلی، صوبہائے متحدہ، بہار اور اسلامی ریاستوں میں مادری زبان کی طرح اس کو بولتے ہیں، بنگال، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط، راج پوتانہ، کشمیر، بڑودہ کی ریاستوں میں اس کو وہ نہایت آسانی سے سمجھتے ہیں اور ضرورت کے وقت اسی میں اظہار مطلب کرتے ہیں۔

وجوہ بالا کی بنا پر اردو زبان کو بھی اب ملک کی عمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہے اور

اس دعویٰ کی تردید عملاً ناممکن ہے اور ہندوستان کی مختلف قوموں کا میل جس حد تک ترقی کرتا جائے گا، اردو زبان کی ہمہ گیری اور عالم گیری بھی اسی حد تک وسیع ہوتی جائے گی، اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ ملک کے تمام صوبوں اور گوشوں سے ملک کے نائبوں اور قوم کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان مجلس شوریٰ قائم ہے، ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ ہم کو کس زبان میں مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے لب ریز ہے لیکن کیا پنجابی اس کے خیالات کی ترجمانی کرے گی، کیا بنگالی اور مرہٹی زبان ان مختلف بولیوں والے مجمع کی گرہ کشائی کر سکے گی، وہ یقیناً صرف اردو ہی زبان ہوگی، جو اس عظیم الشان قومی مجمع شوریٰ میں مبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن سکے گی۔

اب ایک چیز رہ گئی یعنی یہ کہ ہماری آئندہ مشترک اور عمومی بننے والی زبان علوم و فنون کے لحاظ سے دوسری تمام زبانوں سے زیادہ دولت منداور ذی ثروت ہو اور ہر قسم کے بلند اور عالی خیالات کی اداوتعبیر کا سامان اس میں ہو، موجودہ حالت میں اردو زبان بنگالی اور مرہٹی وغیرہ ملک کی دوسری زبانوں سے علانیہ اس معرکہ میں بازی نہیں لے جاسکتی، اس لیے ہم کو اردو زبان کو ملکی اور عمومی زبان تسلیم کرانے کے لیے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم علوم وفنون کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی زبان میں فراہم کرلیں، جو علمی، ادبی، قومی، تجارتی، سیاسی، تمدنی، اخلاقی ہر قسم کے علوم و خیالات کے ادا و تعبیر کی کفالت کر سکے، ایسا مجموعہ جو ان گوناگوں علوم وخیالات کا کفیل ہو، ایک اردو کے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کے سوا کوئی اور شے نہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم الشان اور اہم اور مصارف طلب تجویز ہے کہ ہندو مسلمانوں میں سے کوئی قوم بھی اس کے لیے بآسانی آمادہ نہیں ہوسکتی، اس کی تالیف وطبع واشاعت کی ضروریات کے لیے ایک شاہی خزانہ اور شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیوں کی ضرورت ہے،

دنیا میں ہمیشہ اس قسم کے کام امراوسلاطین زمانہ کی زرپاشیوں سے انجام پائے ہیں، آج ہم میں گو بکرماجیت، سوائی سنگھ، مامون الرشید اور اکبر نہیں لیکن:

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　دیگراں نیز کنند انچہ مسیحا می کرد

ہم میں بہت سے ہمت والے موجود ہیں، جو اپنی وسیع قومی حوصلہ مندیوں، بے پایاں علمی فیاضیوں اور غیر محدود سیاسی انجام بینیوں کے لحاظ سے ہمارے موجودہ دور تاریخ کے سب سے بڑے ہیرو ہیں، ان میں کا ہر شخص جو صرف مسلمانوں کے لیے "جامعہ اسلامیہ" کے لیے ایک لاکھ دے سکتا ہے، وہ ہندو مسلمانوں کے متحد "جامعہ لسانیہ" کے لیے کیا دو لاکھ نہیں دے سکتا، ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے قومی فیاضیوں کا دست کرم اس تجویز کی اعانت سے کوتاہ نہیں۔

دوسری شکل مؤلفین اور ارباب قلم کی ایک کثیر جماعت کے حصول کی ہے لیکن سرمایہ کے امکان کے بعد ہم اس مشکل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، ایک دو چیف ایڈیٹر بے شک نہایت لائق درکار ہیں لیکن الحمدللہ کہ یہ دولت اس تجویز کو حاصل ہو چکی ہے، ان کے علاوہ اٹھائیس متوسط لیاقت کے مترجم اور انگریزی داں اور انشاپرداز ہم کو چاہئیں جن کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری نہیں، صاحب لیاقت ہونا البتہ ضروری ہے، انگریزی کے ساتھ کسی قدر عربی کے واقف کاروں کو ترجیح دی جائے گی، کام بجائے ماہوار تنخواہ کے صفحات کے معاوضہ پر ہوگا۔

کتابوں کی غیر معمولی مقدار کی بھی ہم کو حاجت نہیں، انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، چیمبرس انسائیکلوپیڈیا، پاپولر انسائیکلوپیڈیا، امریکن انسائیکلوپیڈیا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عربی میں دائرۃ المعارف، فارسی میں کشاف اصطلاحات الفنون جیسی جامع کتابیں موجود ہیں، اردو کے مشہور علمی رسائل میں اکثر مباحث پر نہایت قابلیت کے مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے ممکن الحصول مواد اور مآخذ اس تجویز کے پیش کنندوں

کے سامنے ہیں، تحقیق وکاوش نہایت احتیاط کے ساتھ عمل میں آئے گی اوران شاءاللہ چیف ایڈیٹروں کی قابلیت اوران کا ذوق تحقیق اس کے پایۂ اعتبار واستناد سے گرنے نہ دے گا۔

تالیف وترجمہ کی درخواست بھیجنے والوں کے لیے حسب ذیل امور تحریر ہیں:

۱- مؤلف ومترجم کے لیے مذہب وملت کی تخصیص نہیں۔

۲- انگریزی لیاقت مسلم ہو، اردو کا انشاپرداز ہو، فارسی بقدر ضرورت جانتا ہو، کوئی صاحب ان زبانوں کے ساتھ عربی بھی جانتے ہوں یا علوم وفنون جدیدہ کی کسی شاخ سے واقفیت ہو تو ان کو ترجیح دی جائے گی۔

۳- ترجمہ کا نمونہ بھیجنا چاہیے۔

۴- انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا صفحہ کو پیش نظر رکھ کر اطلاع دینی چاہیے کہ فی صفحہ کیا زر معاوضہ قبول فرمائیں گے۔

اس زمانہ کے بیش تر اردو اخبارات، ہمدم لکھنؤ، وکیل امرتسر، العصر کلکتہ، الفضل قادیان، پیام مشرق گورکھ پور، ناصر الاخبار جون پور، کسان لاہور وغیرہ نے اس کی پرزور تائید کی، علمی طبقہ کی جانب سے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا اوراس کی تائید میں مضامین نکلے، بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید یہ انسائیکلوپیڈیا مستقل تصنیف نہیں بلکہ معارف کے مضمون میں جن کتابوں کا تذکرہ ہے ان کا ترجمہ ہوگی، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ۷؍فروری ۱۹۱۷ء کے ہمدم میں اس کا مفصل خاکہ شائع کیا۔

دائرۃ المعارف یا اردو انسائیکلوپیڈیا جس کی تحریک ماہ گذشتہ میں شائع ہو چکی ہے، اس کے متعلق عام واقفیت اوراطلاع کے لیے معلومات ذیل میں بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں نے بجائے خود یہ سمجھ لیا ہے کہ اس تحریک سے انگریزی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ترجمہ مقصود ہے لیکن یہ خیال غلط اور بے بنیاد ہے، درحقیقت ہمارا دائرۃ المعارف

اس سے بالکل علاحدہ اور ایک مستقل تالیف ہوگی، مشرقی مسائل میں یہ تالیف خود یورپ کو سبق دے گی اور تحقیقات کا ایک نیا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی، مغربی معارف میں بے شبہ برٹانیکا اس کا ایک مآخذ ہوگی اور بس، ہر مضمون پر حتی الامکان بہترین مضمون نگار تلاش کر کے اس سے اوریجنل (مستقل) مضامین لکھائے جائیں گے، البتہ جن مباحث پر کوئی بھی کتاب قابل اطمینان لکھنے والا نہ مل سکے گا، وہاں بے شبہ مجبوراً ترجمہ پر قناعت کرنی پڑے گی لیکن ایسے مواقع نادرالوقوع ہوں گے۔

کام کا جو خاکہ پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ علوم کو مختلف صیغوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر صیغہ کو ایک ذمہ دار ایڈیٹر کے ہاتھ میں تفویض کر دیا جائے گا، اب تک اس قدر عنوانات علوم تجویز ہوئے ہیں:

۱- مذہبیات: جو دنیا کے تمام ادیان، مذاہب، تصوف، روحانیت وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہوگا۔

۲- لسانیات: جس کے تحت دنیا کی مختلف زبانیں اور ان کے لٹریچر آ جاتے ہیں۔

۳- تاریخ۔

۴- جغرافیہ۔

۵- فلسفہ، نفسیات، الٰہیات، منطقیات، اخلاقیات، جمالیات وغیرہ جملہ مباحث فلسفہ پر یہ عنوان حاوی ہے۔

۶- حکمیات: یعنی اصناف سائنس یعنی طبعیات، ارضیات، حیاتیات وغیرہ۔

۷- ریاضیات: جس کے ذیل میں ہندسہ، حساب، جبر و مقابلہ وغیرہ شامل ہیں۔

۸- طبیعیات: طبیعیات، ڈاکٹری، یونانی، ویدک وغیرہ اس کے زیر عنوان آ جاتے ہیں۔

۹- سیاسیات: یعنی اصول سیاسیات و قانون وغیرہ۔

۱۰-عمرانیات: اقتصادیات، منزلیات وغیرہ کا یہ عنوان جامع ہے۔

۱۱-حربیات: فن حرب، اصول جنگ بحری وبری وغیرہ۔

۱۲-صناعیات: اس کے ماتحت فنون لطیفہ وفنون نافعہ دونوں آجاتے ہیں۔

۱۳-لہویات: یہ وہ شے ہے جسے انگریزی میں Games and Sports سے موسوم کرتے ہیں، شکار، گھڑدوڑ وغیرہ کا ذکر اس ذیل میں آجائے گا۔

۱۴-تعلیمات: مسائل متعلق بہ تعلیم وتربیت۔

۱۵-زرعیات: علم زراعت وفلاحت۔

۱۶-تجارت۔

۱۷-شذرات علوم یا متفرقات یعنی معلومات عامہ کی وہ ضروری چیزیں جو کسی خاص عنوان کے تحت نہیں آسکتیں۔

ان میں سے ہر صیغہ کے لیے ایک مستند فاضل بہ طور ذمہ دار ایڈیٹر کے طور پر کام کرے گا اور اس طرح گویا صیغہ دار ایڈیٹر ہوں گے، ان اصحاب کے اسمائے گرامی ابھی قطعیت کے ساتھ نہیں پیش کیے جاسکتے تاہم کوشش ہو رہی ہے کہ بہتر سے بہتر انتخاب عمل میں آئے، سردست مثال کے لیے دو چار صیغوں کے مجوزہ ایڈیٹروں کے نام پیش کرتے ہیں:

مذہبیات کے لیے پروفیسر نواب علی، ایم، اے (بڑودہ کالج)

لسانیات کے لیے پروفیسر شیخ عبدالقادر، ایم، اے (الفنسٹن کالج، بمبئی)

فلسفہ کے لیے مولانا سید کرامت حسین، سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ (لکھنؤ)

حکمیات کے لیے ڈاکٹر ولی محمد، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، (علی گڑھ کالج)

تاریخ کے لیے مولانا عبدالحلیم شرر

تعلیمات کے لیے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (مشیر تعلیمات بھوپال)

سیاسیات کے لیے مسٹر سید حسین، ایڈیٹر، بمبئی کرانیکل (بمبئی)

شذرات علوم یا متفرقات کے لیے جو ایک لحاظ سے اہم ترین صیغہ ہے، مولوی عبدالحق، بی، اے، سکریٹری انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد)

غرض اس طرح کل سترہ مستند اصحاب اپنے اپنے صیغہ کے ذمہ دار ہوں گے، ابھی ان میں سے بعض بزرگوں سے منظوری نہیں حاصل کی گئی ہے، تاہم ان اسما سے اس کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مجوزین کے پیش نظر کس قسم کے افراد ہیں، صیغہ جات بالا میں سے ہر ایک صیغہ بجائے خود متعدد شعبوں پر تقسیم ہوگا، ہر شعبہ کا ایک ناظم ہوگا اور اس کی مدد کے لیے متعدد مضمون نگار ہوں گے، مثلاً صیغہ مذہبیات کے تحت میں اسلام، ہندویت، مسیحیت، بدھ، سکھ، تصوف وغیرہ کے متعدد شعبے ہوں گے، جس پر وہی مضمون لکھیں گے جو اس کی اہلیت و منصب رکھتے ہوں گے، مذہبی عنوانات سے متعلق اس کا التزام رکھا جائے گا کہ ناظم و مضمون نگار وہی اصحاب ہوسکیں گے جن کی قیادت یا سرداری اس مذہب یا فرقہ کے لوگوں کے نزدیک مسلم ہوگی، ہندومت پر کوئی ہندو ہی لکھے گا، فرقہ آریہ سماج پر کسی آریہ ہی سے لکھایا جائے گا، خود اسلامی فرقوں میں شیعہ، حنفی، اہل حدیث، احمدی غرض ہر فرقہ سے متعلق اس کے مسلم علما سے مضامین حاصل کیے جائیں گے، اسی طرح صیغہ حکمیات، ارضیات، طبیعیات، کیمیائیات وغیرہ آٹھ دس شعبوں میں تقسیم ہوگا اور ہر شعبہ کے لیے مستقلاً ایک پورا اسٹاف ہوگا، چنانچہ طبیعیات کے لیے پروفیسر فیروزالدین مراد، بی، اے، ایم، ایس، سی، (علی گڑھ کالج) اور کیمیائیات کے لیے ڈاکٹر خداداد خاں پی، ایچ، ڈی، (اسلامیہ کالج لاہور) کا نام بہ حیثیت ناظمین کے زیر نظر ہے، یہی حال ہر صیغہ اور اس کے ماتحت جملہ شعبہ جات کا ہوگا۔

ناظمین شعبہ اور مضمون نگار حضرات کی تعداد اس وقت ایک سو تک پہنچ گئی ہے اور امید ہے کہ ان میں اضافہ ہوتا رہے گا، پوری فہرست شائع کرنا قبل از وقت ہوگا لیکن

بہ طور نمونہ چند نام پیش کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۱- پروفیسر مرزا محمد ہادی، بی، اے،۲- مولانا عبدالباری فرنگی محلی،۳- مولانا سید ناصر حسین قبلہ مجتہد لکھنؤ،۴- مولانا سید احمد لکھنوی، ۵- مولانا عبداللہ عمادی، ٦- مسٹر ظفر علی خاں، بی، اے، ۷- مسٹر سجاد حیدر، بی، اے،۸- پروفیسر عباس، بمبئی،۹- مولانا حمید الدین بی، اے، ۱۰- مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ۱۱- پروفیسر فضل الرحمٰن خاں، ایم، اے، علی گڑھ کالج،۱۲- صاحب زادہ آفتاب احمد خاں جوائنٹ سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۳- ڈاکٹر سید محمود، پی، ایچ، ڈی،۱۴- ڈاکٹر ناظم الدین حسن، ایم، اے، ایل، ایل، ڈی، ۱۵- خواجہ کمال الدین، بی، اے، ۱٦- پنڈت منوہر لال زتشی، ایم، اے، ۱۷- پنڈت کشن پرساد کول بی، اے، ۱۸- پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، (انجمن خادمان ہند)، ۱۹- میجر لطافت حسین خاں، آئی، ایم، این، ۲۰- سید محفوظ علی، بی، اے، ۲۱- مسٹر غلام حسین، بی، اے، سب ایڈیٹر آئی، ڈی، ٹی، ۲۲- مسٹر مشیر حسین قدوائی، ۲۳- ڈاکٹر عبد اللہ المامون سہروردی، ۲۴- مسٹر محمد علی، ایم، اے، ۲۵- خواجہ حسن نظامی، ۲٦- مرزا مہدی کوکب، حیدر آباد، ۲۷- مفتی انوار الحق، ایم، اے، ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال، ۲۸- مولوی عبد الرزاق مؤلف البرامکہ، ۲۹- سید ظفر الحسن، ایم، اے، ۳۰- پروفیسر فضل محمد خاں، ۳۱- حسرت موہانی۔

ان میں سے اکثر حضرات نے شرکت کا وعدہ فرما لیا ہے اور امید ہے کہ باقی حضرات کی منظوری بھی عن قریب حاصل ہو جائے گی، مراسلت کے ذریعہ سے اس قدر عظیم الشان کام کے مراتب کا تفصیل کے ساتھ طے ہونا ایک دن کا کام نہیں، اس کے لیے ایک مدت دراز درکار ہے اور بغیر تفصیلات کے طے کیے کام شروع کر دینا سخت خطرناک غلطی ہوگی۔

کام کرنے والی چند جماعتیں ہوں گی، سب سے پہلے چیف ایڈیٹروں و سب ایڈیٹروں کی ایک مرکزی جماعت لکھنؤ میں ہوگی، جس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، راقم ہذا، مسٹر عبدالعالی، بی، اے، (سابق ایڈیٹر معلومات) اور دو ایک اور حضرات ہوں گے،

دوسری جماعت صیغہ وار ایڈیٹروں کی ہوگی، یہ چار جماعتیں عامل یا کام کرنے والی ہوں گی، ان کے علاوہ ایک مختصر جماعت شوریٰ بھی ہوگی، جس کے ارکان وہ بزرگ ہوں گے جن کا فضل وکمال مسلم ہے، مگر جو بہ سبب کبرسنی یا کسی مشغولیت کے اس کام میں کوئی نمایاں عملی حصہ نہیں لے سکتے، ان اصحاب کی رائے ومشورہ سے پورا فائدہ اٹھایا جائے گا اور یہ لوگ ارکان شوریٰ سمجھے جائیں گے، یہ جماعت غالباً ارکان ذیل سے مرکب ہو:

۱-نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی، بی، اے، سی، ایس، آئی -صدر مجلس

۲-ڈاکٹر ضیاالدین، ایم، اے، ڈی، ایس، سی علی گڑھ کالج -صیغہ سائنس

۳-مسٹر محمد علی، بی، اے، سابق ایڈیٹر کامریڈ-تاریخ

۴-جسٹس عبدالرحیم، مدراس ہائی کورٹ-قانون وسیاسیات

۵-ڈاکٹر محمد اقبال، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، -فلسفہ واقتصادیات

۶-سید راس مسعود، بی، اے، آئی، سی، ایس،
ڈائرکٹر تعلیمات، حیدرآباد- تعلیمات وادبیات مغربی

۷-حاذق الملک حکیم اجمل خاں-طب مشرقی

۸-ڈاکٹر انصاری، ایم، ڈی، سی، ایم، -طب مغربی

۹-خان بہادر میرا کبر حسین اکبر-ادبیات مشرقی

نوٹ:-تمام اخبارات ورسائل سے جن کو اردو کا درد ہے استدعا ہے کہ اس مراسلت کو اپنے صحائف میں نقل کریں۔

اس خاکہ کے مطابق اکتوبر ۱۹۱۷ء سے اس کام کے آغاز کا اعلان کیا گیا، چنانچہ جنوری ۱۹۱۷ء کے معارف میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''اردو انسائیکلو پیڈیا کی جو تحریک ہماری طرف سے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی ہے ہم کو خوشی ہے کہ اکثر ارباب قلم اور معاصر اخبارات ورسائل نے دل سے اس کا خیر مقدم کیا، اس

کام کی حقیقی ابتدا تو اکتوبر ۱۹۱۷ء سے ہوگی لیکن ابتدائی کام کا نقشہ ابھی سے تیار ہو رہا ہے، تمام علوم کو سترہ اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر صنف کو ایک دائرہ بنایا گیا ہے، اس طریقہ سے سترہ دائرے اب تک قائم کیے گئے ہیں ہر دائرہ کا الگ الگ ایک دبیر خصوصی ہوگا، جو ملک کا مشہور و مقبول عالم ہوگا، ملک کے جن اشخاص سے علمی اعانت کی امید ہوسکتی تھی زبانی یا تحریری ان سے تبادلۂ خیال ہو چکا، انسائیکلوپیڈیا میں مغربیات کے علاوہ مشرقیات کا حصہ بھی جی لگا کر لکھا جائے گا اور تحقیق کے معیار سے ایک حرف بھی فروتر نہ ہوگا، اس طرح امید ہے کہ اردو انسائیکلوپیڈیا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا کام دے گی، مغربیات میں تمام علوم وفنون جدیدہ کے چیدہ اور منتخب حصے آ جائیں گے، جدید علوم پر بیسیوں کتابوں کے لکھنے سے جو بات حاصل نہ ہوتی وہ اس مجموعہ سے ان شاء اللہ حاصل ہوگی۔"

سال چھ مہینہ تک اخبارات میں اس تحریک کا چرچا رہا مگر راجہ صاحب محمود آباد نامعلوم اسباب کی بنا پر اس سے الگ ہوگئے، مالی امداد کا دارومدار ان ہی پر تھا، مولانا عبدالماجد صاحب بھی کچھ دنوں کے بعد حیدر آباد چلے گئے، بعض دوسرے ارکان بھی منتشر ہوگئے، اس لیے اس تحریک نے عملی قدم بھی نہ اٹھایا تھا کہ ختم ہوگئی۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد ہی مرہٹی زبان کی انسائیکلوپیڈیا کی تحریک اور اس کا خاکہ اخبارات میں آیا، اس سے پھر اردو انسائیکلوپیڈیا کی تحریک کے خاتمہ کا زخم تازہ ہوگیا، چنانچہ فروری ۱۹۱۸ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

"دسمبر ۱۶ء میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی جو تحریک میری اور مولوی عبدالماجد صاحب بی، اے، کی طرف سے ملک میں پیش کی گئی تھی، اخبارات اور اہل قلم کی طرف سے جس گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا گیا وہ نہایت حوصلہ افزا تھا لیکن مالی اعانت اور خریداروں کے نام کا جب سوال آیا تو "عالم گیر زبان" کے بولنے والوں میں سے ایک کی زبان سے بھی صدائے ہمت بلند نہ ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا متوسط طبقہ ایک حد تک فرض شناس ہوگیا ہے لیکن امرا کی طبقہ

جس کی سرپرستی کے بغیر یہ کام انجام نہیں پاسکتا، اب تک اپنے پہلے جمود پر قائم ہے، ہندوستان کی ایک بڑی شخصیت نے از خود اس کی آمادگی ظاہر کی تھی لیکن جب لکھنؤ کے اہل قلم کا ایک ممتاز وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان سے افسوس ناک سرد مہری کا برتاؤ کیا گیا، یہ ہماری وہ عملی دلیل ہے جو ہم اپنی زبان کو ہندوستان کی مشترک اور عالم گیر زبان کہنے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، فردوسی نے سچ کہا ہے:

ع صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

دوستوں آؤ آج ہم تمہیں ایک بلند ہمت قوم کا قصہ سناتے ہیں، مرہٹی زبان بولنے اور سمجھنے والے شاید پونہ سے ناگ پور تک ایک کروڑ سے زیادہ نہ ہوں گے لیکن اپنی زبان کی ترقی کے لیے ان کی کوششیں تمام ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے بھی زیادہ ہیں، مسلمان سیاسی معاملات میں اکیس کروڑ ہندوؤں کے تعداد سے ڈرتے ہیں لیکن حقیقت میں سوال تعداد کا نہیں بلکہ قوت کا ہے، سات کروڑ مسلمان اگر اکیس کروڑ ہندوؤں کی ہندی زبان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو کیا ایک کروڑ مرہٹہ اور ڈیڑھ کروڑ بنگالیوں کی زبان کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

ناگ پور میں مرہٹی زبان کی انسائیکلو پیڈیا لکھنے کی تحریک کچھ دنوں سے شروع ہوئی ہے، مرہٹی انسائیکلو پیڈیا کا نام "مہاراسٹری دیان کوپ" تجویز ہوا ہے، اس کی بیس جلدیں ہوں گی، دس ہزار صفحے ہوں گے، سو روپے قیمت ہوگی، اس کے چیف ایڈیٹر شری دہرونیک ٹیش کیتکر، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی ہیں، اس میں دو سو مضمون نگار کام کررہے ہیں، ۱۹۲۲ء میں تمام جلدیں مکمل ہو جائیں گی، اس کے لیے خاص پریس ہے، اس کا ایک لمیٹیڈ آفس ہے، اس کا نام مرہٹی انسائیکلو پیڈیا منڈل آف لمیٹیڈ کراڈک ناگ پورہ ہے۔

ہلیال ملک کرناٹک کا ہمارا ایک پرجوش عزیز جو اردو پر جان دیتا ہے اس غم وغصہ میں اس کی زبان میں کیوں یہ سرمایہ پیدا نہ ہوا، اس نے اردو چھوڑ کر مرہٹی شروع کردی ہے کہ ایسی کشتی پر کیوں نہ سوار ہو جس سے اتنا بڑا سمندر قبضہ میں آتا ہے۔"

اردو کانفرنس کے قیام کی تجویز: دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ لیگ اور کانگریس کے جو تاریخی اجلاس ہوئے تھے، وہ ہندو مسلمان اتحاد کی تاریخ میں یادگار رہیں گے، اس سلسلہ میں ایک اردو کانفرنس بھی ہوئی تھی، اس وقت تک اردو کی خدمت کے لیے کوئی مستقل ادارہ نہ تھا، انجمن ترقی اردو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک بے جان اور بے عمل شعبہ تھا اور اس کا بھی دائرہ مسلمانوں تک محدود تھا، اس لیے کانفرنس میں ایک مستقل ادارے اردو کانفرنس کی تجویز پاس ہوئی، کانفرنس کے منتظمین کہتے تھے کہ اس کام کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبہ ترقی اردو کافی ہے، اس کے لیے مستقل ادارے کے قیام کی ضرورت نہیں لیکن پبلک کا اصرار تھا کہ ایک مستقل اردو کانفرنس قائم ہونی چاہیے، سید صاحب بھی ان ہی میں تھے، ان کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اردو کا مسئلہ ہندوؤں کی شرکت کے بغیر حل نہیں ہوسکتا، اس لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جس کے دروازے ہندو مسلمان دونوں کے لیے کھلے ہوئے ہوں، چنانچہ معارف جنوری ۱۹۱۷ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

> ''ہم کو انجمن ترقی اردو یعنی محمڈن ایجوکشنل کانفرنس کے شعبہ علمیہ سے تعرض نہیں لیکن اگر وہ کانفرنس نہیں بنا سکتی تو ہم کو خود ایک الگ اردو کانفرنس بنانی چاہیے، جس کا دروازہ بے حجاب ہندو مسلمانوں کے لیے کھلا ہوا ہو اور جو دونوں قسموں کے ممبروں سے مرکب ہو، جس کا مقصد موانع کو ہٹا کر ملک میں اردو کی اشاعت و ترویج ہو۔''

قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش اور اس کی اشاعت کی تحریک: مسلمانوں نے جس سرزمین میں بھی قدم رکھا، علم و فن کا ذوق اپنے ساتھ لے گئے اور جہاں جہاں ان کی حکومت قائم ہوئی، وہ ملک علم و فن کا مرکز بن گئے، چنانچہ ہندوستان میں علم و فن کا ذوق اس قدر عام تھا کہ امرا و سلاطین اور علمی و تعلیمی مرکزوں کا ذکر نہیں، ہر تعلیم یافتہ اور خوش حال گھرانے میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ ضرور ہوتا تھا، جس میں بعض وقت بڑی نادر کتابیں مل جاتی تھیں اور اس قسم کے کتب خانے سارے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور بڑے کتب

خانے کو نادر و نایاب کتابوں کا مخزن تھے، انگریزی حکومت کے قیام اور جدید تعلیم کی اشاعت کے بعد ان کتب خانوں کے اور اسلامی و مشرقی علوم وفنون کے قدردان بہت کم رہ گئے تھے، خصوصاً جن خاندانوں میں جدید تعلیم کا چرچا تھا، ان میں ان علوم کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی تھی اور انقلاب ۵۷ء میں بڑے بڑے خاندانوں کی تباہی کے ساتھ ان کے بیش قیمت کتب خانے بھی ضائع ہو گئے تھے، مگر انگریز خود ایک علم دوست قوم ہے، اس نے ہزاروں نادر و نایاب کتابیں کوڑیوں کے مول خرید کر اپنے ملک کے کتب خانے ان سے سجائے اور نادر و اہم کتابوں کی اشاعت کے لیے مستقل ادارے بھی قائم کیے، ہندوستان میں علم وفن کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اس کی تباہی و بربادی کے بعد بھی ان کا اچھا خاصہ ذخیرہ باقی رہ گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر ان کے تحفظ کی جانب توجہ نہ کی گئی تو کچھ دنوں میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا، اس لیے وقتاً فوقتاً ان کے تحفظ اور اشاعت کی تحریکیں ہوئیں، دارالمصنّفین کے مقاصد میں ایک مقصد اس قسم کی کتابوں کی تلاش اور ان کی اشاعت بھی تھی، چنانچہ جب دارالمصنّفین کا قدم کچھ آگے بڑھا تو سید صاحب نے اس اہم اور ضروری کام کی جانب بھی توجہ کی اور نادر و نایاب کتابوں کی حفاظت و اشاعت کی ازسرنو تحریک کی، چنانچہ ستمبر ۱۹۱۷ء کے معارف میں لکھتے ہیں:

"قدیم قلمی تصنیفات کے ساتھ ہمارے رؤسا اور علمی انجمنوں کو جو بے التفاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال سیکڑوں کتابیں ہندوستان سے یورپ منتقل ہو رہی ہیں، تیموریوں کا وہ عظیم الشان کتب خانہ جس کو درحقیقت علمی عجائب خانہ کہنا چاہیے، اس کا ایک ایک ورق اس طرح منتشر ہو گیا ہے کہ ایشیا و یورپ کے کسی ایک کتب خانہ میں اس کی دس کتابیں یک جا نہ ہوں گی، تاہم یورپ اور ایشیا کا کوئی کتب خانہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے نوادر کا کچھ حصہ نہ ہو، جرمنی، فرانس اور انگلینڈ میں جو کتابیں موجود ہیں یا ہندوستان میں ٹونک، رام پور، حیدرآباد، لکھنؤ، بانکی پور اور کلکتہ کے کتب خانوں میں جو کتابیں موجود ہیں، بہرحال وہ محفوظ ہیں لیکن اب بھی سیکڑوں کتابیں ایسی

ہیں جو لکھنؤ، آگرہ اور دلی کے قلمی کتب فروشوں کے یہاں پڑی ہیں یا ذاتی ملکیت میں برباد ہو رہی ہیں، کیا ان کی حفاظت کی بھی ضرورت ہے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے ابتدائی مقاصد میں ایک یہ بھی تھا کہ قدیم علمی تصنیفات کو بربادی سے بچایا جائے، ندوہ کے کتب خانہ کی مصلحت بھی یہی بتائی جاتی ہے، دارالمصنفین بھی اس مقصد سے بے گانہ نہیں ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ مجلسیں باہمی مشوروں سے کوئی ایسی اسکیم تیار کریں جس کا ذریعہ اگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ تمام قطرے ایک سمندر میں جمع ہو جائیں تو کم سے کم یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایک دو صاحب ذوق اہل علم جن کو قلمی کتابوں سے واقفیت ہو ان کو ماہوار تنخواہ اور مصارف دے کر ہندوستان کے ایک ایک گوشہ میں بھیجا جائے اور وہ ہر جگہ جا کر ان نوادر کو تلاش کریں اور ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع کریں اور کام ختم ہونے کے بعد ان کی کوشش اور عمل کے نتائج ترتیب دے کر شائع کیے جائیں۔

اس میں تین قسم کی فہرست معلومات ہونی چاہیے:

۱-ہندوستان میں مشرقی کتب خانے ذاتی یا سرکاری یا قومی کہاں کہاں واقع ہیں، وہاں کی کتابوں کی مجموعی اور قلمی و مطبوع کتابوں کی الگ الگ تعداد، نوادر کتب کی تفصیل، کتب خانے کی مختصر تاریخ اور حالت موجودہ۔

۲-ہندوستان کے تمام کتب خانوں میں قلمی کتابیں فن وار کتنی موجود ہیں، مع نام مصنف، تاریخ تصنیف، تاریخ کتابت اور نام جہاں وہ موجود ہیں۔

۳-فہرست بہ ترتیب حروف ابجد۔

ہماری ہمت افزائی اور ہمارے حوصلہ کی کارفرمائی کے لیے ایک تجویز سامنے موجود ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے چند سال سے ایک خاص صیغہ اسی غرض سے قائم کیا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا سے اس کے لیے وہ امداد پاتی ہے، ڈاکٹر مامون سہروردی اس صیغہ کے نگراں اور ہمارے دوست حافظ نذیر احمد صاحب مفتش کتب ہیں، سال رواں میں حافظ صاحب موصوف نے

ہندوستان کے مختلف کتب خانوں کا معائنہ کیا اور ۱۵۲ قلمی کتابوں کے حالات بہم پہنچائے، ہمارے احباب کہیں گے کہ سوسائٹی جب ایک کام کو کر رہی ہے تو ہم کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے، ہم عرض کریں گے کہ اسی وقت تو کام کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے اور اس کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

مگر یہ کام تنہا دارالمصنّفین کے بس کا نہ تھا اور کسی سمت سے اس کی عملی تائید نہیں ہوئی، اس لیے اس وقت یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی، تاہم یہ آواز بے اثر نہ رہی اور اس کے پندرہ سولہ سال بعد دائرۃ المعارف[1] کے ناظم مولانا محمد ہاشم صاحب ندوی نے جو سید صاحب کے قریبی عزیز ہیں اور ادارے کے کاموں میں ان سے مشورہ لیتے رہتے تھے، اس کام کو انجام دیا، انہوں نے نہ صرف ہندوستان کے تمام اہم مشرقی کتب خانوں کا جائزہ لیا بلکہ مصر وقسطنطنیہ اور یورپ کے مشہور کتب خانوں کے کیٹلاگ اور مختلف اہل علم کی تحریروں اور ان تمام مآخذ اور مصادر سے جہاں نایاب و نادر تصانیف کا ذکر تھا، تلاش کر کے مختلف علوم وفنون کی ۳۷۶ اہم تصانیف اور نادر مخطوطات کی ایک فہرست تذکرۃ النوادر کے نام سے مرتب کی جو ۱۹۳۱ء میں ادارہ کی جانب سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور ادارہ ان کو وقتاً فوقتاً شائع کرتا رہتا ہے۔

ہوم رول سے پہلے ہوم لینگوئج: ہر آزاد ملک کے لیے ایک مشترک ملکی زبان ضروری ہے، اس لیے ہندوستان کی آزادی کے ابتدائی تخیل کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ ہندوستان کی مشترک ملکی اور ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو گی، اردو اور ہندی کا پرانا

---

[1] دائرۃ المعارف ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کی نادر اور اہم تصانیف کی اشاعت کا سب سے بڑا ادارہ ہے، اس کو نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، نواب فضیلت جنگ، مولانا انوار اللہ صدر الصدور دولت آصفیہ اور مولانا عبدالقیوم صاحب حیدر آبادی کی کوشش سے ۱۸۸۹ء میں قائم ہوا تھا، اب تک وہ اسلامی علوم وفنون کی سیکڑوں عربی نادر و نایاب تصانیف شائع کر چکا ہے اور اپنے خدمات میں مصر و شام کے اداروں کی ہمسری کرتا ہے۔

قضیہ اس وقت بھی موجود تھا، ایک جماعت اردو یا ہندوستانی کو جو درحقیقت ہندوستان کی مشترک زبان ہے، اس کا مستحق سمجھتی تھی اور ایک جماعت ہندی کو جو اس زمانہ میں بالکل نامانوس تھی، یہ درجہ دینا چاہتی تھی، اس زمانہ میں گاندھی جی بھی اسی جماعت میں شامل تھے، چنانچہ جولائی ۱۹۱۷ء میں انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کی تجویز پیش کی تھی، سید صاحب نے لسانی اور تعلیمی دونوں نقطۂ نظر سے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے معارف میں اپنے خیالات پیش کیے تھے اور یہ دکھایا تھا کہ ان دونوں حیثیتوں سے اردو یا ہندوستانی ہی ہندوستان کی عمومی اور مشترک زبان ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں آج کل سیاسی خیالات میں جو مد و جزر نمودار ہو رہا ہے، اس سے توقعات کے کشت زار میں نئی امنگیں پیدا ہو گئی ہیں، گو مسلمانوں کو ایک عرصہ دراز تک برادران وطن کے سیاسی خیالات سے ہمدردی نہیں رہی لیکن اب واقعات کی رو بالکل بدل گئی ہے، اب یہ خیال ہے کہ سیاسیات کی سطح میں جنبش تو پیدا ہو رہی ہے، جب دریا اپنی اصلی رو پر آئے گا تو اپنی رو کا رخ ہر طرف پھیر لے گا۔

ان ہی مباحث میں سے سب سے اول زبان کا مسئلہ ہے اور ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ہوم رول سے بہت پہلے حل ہونے کے لائق ہے، افسوس ہوتا ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ یہ سیاسی خیالات بے گانہ زبان کی ترجمانی محض ہے، یہ خلاق عالم کی مخلوق زبان کی آواز نہیں ہے بلکہ امریکن ایڈیشن کی مصنوعی حجری زبان کی آواز ہے، دسمبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی تقریب سے جو مضمون ہم نے لکھا تھا، اس کی تمہید میں عرض کیا تھا:

اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ملک کے تمام صوبوں اور گوشوں سے نائبان ملک اور نمائندگان اقوام کی ایک عظیم الشان مجلس شوریٰ قائم ہے، ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ ہے کہ ہم کو کس زبان میں مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے لب ریز ہے لیکن کیا پنجابی زبان اس کے خیالات کی ترجمانی

کرے گی، کیا بنگالی کیا مرہٹی زبان اس مختلف اللسان مجمع کی گرہ کشائی کر سکے گی۔"

اس لیے ہوم رول کے تخیل سے پہلے ورنہ کم از کم ساتھ ساتھ ہوم لینگو یج کا فیصلہ کر لینا چاہیے، ہمارا برادران وطن اس متخیلہ سے غافل نہیں ہیں اور اس مشکل پر ان کی نظر ہم سے پہلے پہنچ چکی ہے، جولائی ۱۹۱۷ء کے اخبارات میں مسٹر گاندھی کا وہ عاقلانہ مضمون شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے ہندی نام ایک عنقا صفت زبان کو ہندوستان کی عمومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک کی ہے، آخر دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اس مجلس کا اجلاس ہو چکا ہے، جس کا مقصد تمام ہندوستان میں ایک زبان اور ایک خط جاری کرنا ہے اور اس سے مراد ان کی ہندی ہے۔

۱۰ راگست ۱۹۱۷ء کی یو پی اسپیشل کانگریس کے پلیٹ فارم پر رفاہ عام کلب کے وسیع ہال میں الہ آباد کے مشہور لیڈر سے جب انگریزی میں تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی تو اس نے کہا:

"آپ لوگ ہوم رول چاہتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ انگریزی میں بولو، کیا ہوم رول ملنے پر کوئی انگریزی میں بولا کرے گا، اگر ہوم رول کے بعد بھی آپ انگریزی میں بولا کریں گے تو ہوم رول کچھ فائدہ کی چیز نہ ہوگی، اگر آپ کے پاس ایسی زبان نہیں جس میں اپنی ضرورت کی باتوں کو کہہ سکیں تو ہوم رول کی آپ کو کچھ ضرورت نہیں ہے۔"

اس روح کا سب کا بڑا مظہر مسٹر گاندھی کی اس تجویز میں ہے کہ امسال آل انڈیا کانگریس کے صدر مجلس کی تقریر اردو، ہندی یا ہندوستانی میں ہو، اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو مسلم لیگ کے لیے بلکہ سب سے زیادہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے ایک تازیانہ ہوگا، جہاں صدر مجلس کے لیے اردو بولنا انتہائی تحقیر ہے، ہمارے نوجوان انگریزی خواں معترض ہیں کہ جمعہ اور عیدین کا خطبہ عربی میں ہونا بالکل بے فائدہ ہے کہ خطبہ سے مقصود موعظت اور نصیحت ہے اور وہ اس زبان میں ہونا چاہیے جس کو حاضرین مجلس سمجھتے ہوں، شاید ہماری قومی مجلسیں جو جامع مسجدوں کا اگر حکم نہیں رکھتیں تو عیدگاہوں کا حکم ان پر ضرور عائد کرنا چاہیے کہ

لباسہائے فاخرہ کی سالانہ نمائش گاہ وہ بھی ہے، ان قومی عیدگاہوں میں انگریزی تقریریں مساجد کے عربی خطبوں سے کہیں زیادہ بے سود اور کہیں زیادہ بے فائدہ ہیں۔

اصل یہ کہ ہندوستان جس مرض کا بیمار ہے اس کا صرف ایک علاج ہے اور وہ ملکی زبان میں تعلیم ہے، جب تک اس نسخہ کی آزمائش نہ ہوگی، ہماری مشکلات کا خاتمہ نہ ہوگا۔ ہماری تعلیمی ترقی کا سب سے صحیح راستہ وہی تھا جو سائنٹفک سوسائٹی کے مشعل میں سرسید کو ۱۸۶۳ء میں نظر آیا تھا اور جس پر ایک مدت تک وہ قدم زن بھی رہے، اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے، چنانچہ اس سوسائٹی کے ذریعہ سے چالیس کتابیں اردو زبان میں لکھی اور چھاپی گئیں، تیس ہزار کی لاگت سے علی گڑھ میں اس کے لیے عمارت بنی اور چند ہی دنوں میں اس نے ملک اور حکومت دونوں میں رسوخ پیدا کرلیا، وزیر ہند نے اس کی سرپرستی قبول کی۔

اس سوسائٹی سے ۱۰ رمئی ۱۸۶۶ء کو برٹش انڈین ایسوسی ایشن پیدا ہوئی، جس نے یکم اگست ۱۸۶۷ء کو وائسرائے کی خدمت میں حسب ذیل عرض داشت پیش کی:

۱- اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

۲- دیسی زبانوں میں ان ہی مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳- جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بہ معاوضہ تحصیل لیاقت عطا ہوئی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو عطا ہوا کریں جو ان ہی مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔

۴- یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جدا دیسی یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔

یہ اصلی نظام کار تھا جس پر اہل ملک کو کام کرنا چاہیے تھا، ایسوسی ایشن کی اس تجویز کو گورنمنٹ نے بھی نظر قبول سے دیکھا لیکن پھر خدا جانے وہ کون سا جادو تھا جس نے سرسید کے خیال کو مشرق سے مغرب کی جانب پھیر دیا اور ۱۸۸۴ء میں جب دیسی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو انہوں نے نہایت دلیری سے اس کے خلاف گواہی دی اور وہ مدرسۃ العلوم مسلمانان جس کا مقصد ایک مشرقی یونیورسٹی کا قیام تھا، ایک خالص انگریزی کالج سے مبدل ہو گیا، اب گو مسلم یونیورسٹی کا تخیل سامنے ہے تاہم سفر کا رخ چشمۂ حیواں کی طرف نہیں بلکہ ظلمات کی سمت ہے۔

پچاس برس کے بعد مردہ ہڈیوں میں پھر جان آئی، یعنی گورنمنٹ کے سامنے دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی گئی، اگست ۱۷ء کی بیچ کی تاریخوں میں بہ مقام شملہ اس غرض سے جو مجلس منعقد ہوئی تھی، ہز ایکسلنسی نے اس میں اپنے خیالات ان الفاظ میں ظاہر فرمائے:

> ''آپ کو زیر بحث مسائل پر صرف تعلیمی نقطہ نظر سے بحث کرنی چاہیے، یعنی انگریزی تعلیم کی ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے، تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہو یا دیسی زبانیں ہوں اور انگریزی لازمی زبان ثانوی کے طور پر سکھائی جائے یہ امر اب خارج از بحث ہے کہ ہم اپنے پہلے طریقہ تعلیم کے مسلمہ طرز کو بالکل بدل ڈالیں۔
>
> تعلیم یافتہ جماعتوں کے فوائد انگریزی تعلیم کی سطح پر قائم ہیں جواب تمام ہندوستان کی قومی زبان ہو گئی ہے، اگرچہ مجھے ان اصحاب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے جو دیسی زبانوں سے بے پروائی کیے جانے کے شاکی ہیں لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا عملی پالیٹکس سے باہر ہے، اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت مختلف دیسی زبانوں کا وجود ہے جس کا کوئی قابل اطمینان علاج اب تک پیش نہیں کیا گیا۔
>
> ہز ایکسلنسی ہم کو اپنے جائز حق سے محروم نہیں کرتے بلکہ مختلف دیسی زبانوں کے تصادم

کا علاج پوچھتے ہیں، ہمارے نزدیک تو صرف اس کا علاج اردو زبان ہے، جس کی عملاً ہمہ گیری اور عمومیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اور اگر دیگر ملکی فرقوں کو اس فیصلہ سے اتفاق نہیں تو کانگریس و مسلم لیگ کے بیسیوں مختلف العقائد مذاہب سیاسیہ کا حل ایک مخصوص مشترک جلسہ سے کیا جاچکا ہے، زبان کی اہمیت کا مسئلہ اس قدر پست نہیں ہے کہ اس کی خاطر ثانی مشترک فیصلہ کن اجلاس انعقاد نہ پاسکے۔

اردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اٹھاتے ہیں وہ درحقیقت زبان کے فلسفہ سے بے گانہ ہیں، زبان کے خط کے لحاظ سے تو یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان کس خط میں لکھی جائے لیکن اس سوال کو صوبوں کے رواج پر چھوڑ دینا چاہیے، رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود مٹ جائیں گے، ہم کو اصل زبان کے ذخیرہ الفاظ پر غور کرنا چاہیے۔

زبان میں تین چیزیں ہوتی ہیں، اسما، افعال اور حروف، زبان کی اصل ماہیت افعال اور حروف ہیں، اسما دوسری زبان سے آتے رہتے اور مٹتے جاتے اور بدلتے جاتے ہیں، عربی زبان میں سیکڑوں لفظ دوسری زبان سے آئے ہیں، فارسی میں ہزاروں الفاظ مستعمل ہیں، انگریزی میں لاتعداد یونانی اور لیٹن لفظ ہیں، تاہم ان کو عربی اور فارسی اور انگریزی ہی کہیں گے، اسی طریقہ سے اگر ہماری اردو میں آدھے فارسی اور عربی اسما مل گئے ہیں تو اس سے وہ ہندی ہونے سے خارج نہیں ہوسکتی، جب کہ اس کے تمام تر افعال، حروف اور نصف اسما بھاشا اور ہندی المولد ہیں، یہ سچ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی قومی اور مذہبی ضرورتوں کے لحاظ سے جو کبھی مٹ نہیں سکتی ان کا خزانہ عاریت باختلاف قومیت عربی و فارسی و سنسکرت ہی رہے گا اور اس میں کچھ حرج نہیں، مصر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہیں۔

(معارف، اکتوبر ۱۹۱۷ء)

مسلمانان ہند کی تنظیم مذہبی: دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے بلکہ وہ ان دونوں کا جامع ایک مکمل نظام حیات ہے، جو دنیاوی و اخروی

جملہ ضروریات پر حاوی ہے، اس کے بہت سے قوانین حکومت کے بغیر نافذ اور مسلمانوں کے بہت سے معاملات اس کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مکمل اسلام حکومت کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتا، اس لیے اسلام اور اس کی حکومت کا تصور ساتھ ہی ساتھ آیا اور اسلامی خلافت دین و دنیا دونوں کی جامع تھی، اس لیے جب تک مرکزی خلافت کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی اس وقت تک مسلمانوں کے لیے کسی الگ مذہبی نظام کی ضرورت نہ تھی، اس کے زوال کے بعد جب عجمی حکومتوں نے اس کی جگہ لی تو ان کے حکم رانوں کو خلفا کی طرح مذہبی تقدس حاصل نہ تھا، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے مذہبی معاملات کے نظام کے لیے شیخ الاسلام کا ایک مستقل عہدہ الگ قائم کیا۔

چنانچہ ترکی حکومت میں جو خلفائے اسلام کی جانشینی کی مدعی تھی، یہ عہدہ تھا اور شیخ الاسلام کا اتنا وقار تھا کہ ترکی سلاطین بھی ان کا احترام کرتے تھے، ہندوستان میں اس مقصد کے لیے صدر جہاں کا عہدہ تھا، حتی کہ یورپ کے ان ملکوں تک میں جہاں کسی زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت رہ چکی تھی اور وہاں ان کی آبادی تھی، اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد شیخ الاسلام کا عہدہ اور اس کا مذہبی نظام الگ قائم رہا اور بلقان کی بعض ریاستوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں اب بھی مسلمانوں کا مذہبی نظام الگ ہے، ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ابتدائی دور تک مسلمانوں کے مذہبی معاملات کے فیصلہ کے لیے قاضی مقرر ہوا کرتے جس کا سلسلہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا، مگر بہت سے معاملات مثلاً نکاح، طلاق، خلع، تفریق بین الزوجین، وراثت اور وقف وغیرہ کا مذہبی قوانین کے مطابق انجام پانا ضروری ہے اور اس کے لیے مستقل مذہبی نظام کی ضرورت ہے، اس لیے اس کے قیام کے لیے ہمیشہ مسلمانوں کا مطالبہ رہا، مگر درمیان میں یہ آواز کچھ دب گئی تھی، ۱۹۱۷ء میں دوبارہ اٹھائی گئی اور اس کے لیے فرنگی محل لکھنؤ میں علما کا اجتماع ہوا، سید صاحب اس کے پرزور حامیوں میں تھے، انہوں نے نومبر ۱۹۱۷ء کے معارف میں اس مسئلہ کی مذہبی اور تاریخی اہمیت پر ایک مفصل

مضمون لکھا جو حسب ذیل ہے:

”باز گل بانگ پریشاں می زنم آتشے در عندلیباں می زنم

حجلۂ گل بہر من کردند و من سر بدیوار گلستاں می زنم

ہندوستان کی آبادی جس طرح سیکڑوں مختلف قومیتوں کا مسکن ہے اسی طرح سیکڑوں مختلف مذہبوں اور ملتوں کا مرکز ہے لیکن اسلام کی حیثیت ان سب سے الگ ہے، دنیا کے تمام مذاہب پہلے مذہب بنے اور اس کے ایک مدت کے بعد حکومت اور فرماں روائی تک پہنچے، پہلے کلیسا اور دیران کے یہاں تعمیر پائے اور پھر قصر وایوان ان کو نصیب ہوئے، پہلا قدم منبر پر رکھا اور صدہا سال کے بعد دوسرا قدم تخت وسریر پر پڑا، پہلے گوشہ نشین کاہن اور قسیس پیدا ہوئے اور اس کے بعد فاتح اور کشور کشا ملوک اور سلاطین۔

لیکن اسلام مذہب اور حکومت ساتھ ساتھ بنا، اس کا دیر وکلیسا اور ایوان وقصر ایک ہی سادہ عمارت تھی، اس کا منبر اور تخت ایک ہی ہیزمی نشست گاہ کے دو نام تھے، اس کے رات کے گوشہ نشین کاہن وقسیس ہی دن کے کشور کشا ملوک وسلاطین تھے، وہ جس دن مذہب بن کر آسمان سے اترا اسی دن اس نے روئے زمین پر اپنی بادشاہی کا فرمان پڑھا۔

دین اور دنیا کا اختلاط اور جامعیت خواہ فلسفہ مذاہب کے رو سے عیب ہو یا ہنر ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت یہی ہے، اس کے داعی اولؐ نے یروشلم کے واعظ (حضرت عیسیٰؑ) کے طرح سے نہیں کہا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اس کے نزدیک قیصر کا حکم خدا کے حکم کے سوا کچھ اور نہیں ہونا چاہیے۔

اب تاریخی حیثیت سے غور کرو کہ ہندوؤں کے وید غیر معلوم عہد تاریخی میں ترتیب پائے لیکن ان کی حکومت کا سلسلہ عہد تاریخی کے اندر ہے، ان کے یہاں برہمن مذہب کے لیے اور راج پوت حکومت کے لیے ہیں، یہودیوں کا مذہب حضرت موسیٰؑ کے عہد میں پیدا ہوا لیکن فرماں روائی کا دن حضرت داؤدؑ کی پیدائش سے شروع ہوا، پارسیوں میں زردشت بانی مذہب تھا، بانی

حکومت نہ تھا، یروشلم کے مسیحی فقرا کو چار سو برس کے بعد قسطنطنیہ کے سواحل پر فرماں روائی کا نظارہ دکھائی دیا، دنیا کے دیگر مذاہب کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔

اس اختلاف کا ضروری اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے آئین وقوانین مذہبی میں حاکمانہ اور مقتدرانہ روح موجود ہے، وہ صرف نظری نہیں بلکہ عملی مذہب ہے اور اس کے احکام صرف واعظانہ نہیں بلکہ نافذانہ اختیارات رکھتے ہیں، زندگی کے بہت سے لوازم اور ضروریات جو دوسرے مذاہب میں متروک یا غیر ضروری سمجھے گئے ہیں وہ اس کے نزدیک فرض اور واجب ہیں، نکاح، طلاق، وراثت، تفریق بین الزوجین، فسخ نکاح، شفعہ وہ احکام ہیں جن کے مسائل دوسرے مذاہب میں مطلق نہیں ہیں یا بہت کم ہیں، خصوصاً ہندو قوم تو سرے سے ان مباحث سے پاک اور معری ہے، اسلام میں نکاح کے قواعد اور اس کی صحت کے شرائط، رمضان وعیدین، طلاق، ابطال نکاح، فسخ نکاح، تفریق، معاملات شفعہ، تعزیرات وحدود، قربانی، انتظامات حج، اوقاف، مساجد، مدارس، غرض سیکڑوں مذہبی فرائض ہیں جن کی تنظیم وترتیب کی حاجت ہے۔

اصل یہ ہے کہ دیگر مذاہب میں چوں کہ حاکمانہ اختیارات کا عنصر اصلی نہیں ہے، اس لیے احکام کے نفاذ کی حیثیت ان میں محض شرعی اور دینی ہے لیکن اسلام میں یہ دونوں حیثیتیں الگ الگ نہیں، اس لیے اس کے احکام شرعی کے لیے نافذانہ قوت ایک ضروری شے ہے، اسلام کا بادشاہ اس کا امام ہوتا ہے، اس کے حکام شرع کے قاضی ہوتے ہیں، اس کے سپاہی مجاہدین ہوتے ہیں، اس بنا پر اسلام دنیا کے جس خطہ میں پہنچا وہ مذہب وحکومت ساتھ لے کر گیا لیکن دوسرے مذاہب کی حالت اس سے مختلف ہے، وہ محکومانہ یا وحشیانہ حالت میں پیدا ہوئے اور اسی حالت میں انہوں نے نشوونما پائی، اس لیے وہ حاکمیت کے بغیر بلکہ نظم حکومت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔

چھ سو برس تک جب اسلام اپنی حاکمانہ قوت کے ساتھ روئے زمین پر فرماں روا رہا، اس کے تمام احکام شرعی اپنی اصلی حالت پر انجام پاتے رہے، عہد نبوت سے لے کر چھٹی صدی ہجری تک جب تک خلافت عباسیہ برائے نام بھی قائم رہی، اس کے زیر اہتمام دنیائے اسلام کی

مذہبی زندگی برقرار رہی، تاتاریوں نے سیلاب نے اگرچہ آن واحد میں عراق، ترکستان اور ایران کی مذہبی عمارتوں کو مسمار اور اسلامی آبادیوں کو ویران کر دیا تاہم چند ہی سال کے بعد مسلمانوں نے اس نئی حکومت کے تمام جز وکل پر قبضہ کرلیا، چنانچہ نئے سرے سے مسجدیں آباد ہوئیں، قضاۃ کا تقرر ہوا، ائمہ نصب ہوئے، ان کے اوقاف کے انتظامات ہوئے، مدارس عربیہ کھل گئے، ان کے بعد ترکوں، مغلوں اور پٹھانوں نے خروج کیا، چوں کہ ترک، مغل، پٹھان بادشاہوں کو وہ دینی وقار اور مذہبی تقدس حاصل نہ تھا، اس لیے حکومتوں میں شیخ الاسلام کا ایک جدید عہدہ وضع ہوا، بادشاہ کے دینی ودنیاوی دو مرکب اور ممزوج حیثیتوں میں سے وزیر دنیاوی اور شیخ دینی حیثیت کے مظہر تھے۔

ہندوستان میں بھی یہی طرز عمل جاری تھا، صدر جہاں ایک خاص عہدہ تھا جس کی زیر نگرانی تمام مذہبی احکام اور فرائض انجام پاتے تھے، قاضی ہوتے تھے، جو مذہبی احکام فیصل کرتے تھے، برطانیہ نے ہندوستان پر جب قبضہ کیا ہے تو یہ سب عہدے قائم اور جاری تھے اور ابتدائے عہد انگریزی تک جاری رہے، چنانچہ غدر تک کے فیصلوں پر ''خادم شریعت قاضی'' کی مہریں کاغذات سرکاری پر ملیں گی لیکن رفتہ رفتہ یہ عہدے مٹتے گئے اور آخر معدوم محض ہوگئے بعض صوبوں میں مثلاً بنگال میں ''قاضی نکاح'' کا عہدہ صرف رہ گیا ہے جس کی حیثیت اسی قدر ہے کہ وہ ایک رجسٹر نکاح کا مالک ہے اور دس پندرہ ماہوار سے اس کی خدمت کی جاتی ہے۔

ہندوستان کے علاوہ اور دیگر اسلامی ممالک جو مسلمانوں سے نکل کر فرانس، اٹلی، آسٹریا، امریکہ، روس، ریاستہائے بلقان، ہالینڈ کے زیر اختیار آئے ان ہی معاہدوں کے رو سے اب تک یہ شیخ الاسلام کے ہاتھ میں ہیں، بعض یورپین سلطنتوں نے خود اپنے زیر حکم شیخ الاسلام مسلمانوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے جو ان کی مسلمان رعایا کا مذہبی نگراں ہے، چنانچہ روس، الجیریا، ٹیونس، طرابلس، بوسنیا، ہرزگونیا، بلغاریہ، فلپائن وغیرہ میں اسی طریقہ پر مسلمانوں کے لیے خاص انتظامات ہیں۔

ہندوستان میں جو اسلامی ریاستیں ہیں بلکہ بعض ہندو ریاستوں تک میں مسلمانوں کے

مذہبی احکام اور فرائض کے لیے مذہبی عہدہ دار قائم ہیں، حیدرآباد میں ناظم امور مذہبی کا ایک مستقل صیغہ ہے، بھوپال میں قاضی مفتی کے عہدے ہیں، مجلس العلما قائم ہے، ہندوریاستوں میں مسلمانوں کے مذہبی امور سخت انتشار اور بے ترتیبی کی حالت میں ہیں، مسجدیں ویران ہیں، اماموں اور مؤذنوں کی حالت سخت قابل اصلاح ہے، مدرسے کسم پرسی میں پڑے ہیں، ہندوستان میں جس قدر مذہبی مدارس ہیں ان میں باہمی نظم وسلسلہ نہیں، اوقاف کی حالت سخت قابل افسوس ہے اور روز بہ روز وہ شخصی تغلب میں آتے جاتے ہیں، مسلمانوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، ملک کے بڑے بڑے رقبے مذہبی جہالت کی بنا پر اسلام اور حکومت دونوں کے لیے خطرناک ہیں، طلاق و نکاح و فسخ و تفریق کے ہزاروں معاملات جو دن رات پیش آتے ہیں، تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ان کا کوئی انتظام نہیں، اس کے لیے گورنمنٹ کی سول عدالتوں کو تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے جس میں ایک طرف تو عدالتوں کی اصول اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر نہایت شدید غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو ان کے مذہبی احکام میں غیر مسلم عدالتوں کی مداخلت سے آزردگی اور ناگواری پیدا ہوتی ہے اور اکثر علما کے نزدیک ان معاملات میں غیر مسلم عدالتوں کا فیصلہ قبول کرنا جائز ہے۔

ادنیٰ ومتوسط مسلمان طبقوں کی اجتماعی حالت ہندوستان میں تنظیم مذہبی نہ ہونے کے باعث سخت تکلیف میں ہے اور اگر اس دعویٰ کی مزید تشریح کی ضرورت ہو تو دارالمصنفین، ندوہ، دیوبند اور دیگر عربی مدارس اور ممتاز علما کے یہاں جا کر روزانہ ڈاک میں استفتا کے خطوط پڑھو، اس سال کے اخبارات کے فائل زوجہ معلقہ کے متعلق مشہور وگرم تیز مضامین سے مملو ہیں، اسی طرح مسلمان خواتین کی کثیر تعداد بے کسی میں گرفتار ہے، ابھی میرے پاس جالون سے ایک خط آیا ہے جس میں ایک شریف خاتون کی سرگذشت لکھی ہے جو ایک ظالم شوہر کے پنجہ میں گرفتار ہے، مولانا اشرف علی صاحبؒ نے لکھا کہ کسی اسلامی ریاست میں جا کر قاضی کے سامنے تفریق کراؤ لیکن جب بھوپال کے قاضی صاحب کو لکھا گیا تو انہوں نے بہت درست جواب دیا کہ چوں کہ فریقین

میں سے کوئی ریاست بھوپال کا باشندہ نہیں اس لیے مجھ کو مداخلت کا حق نہیں۔

مسجدوں کے مقدمات پڑھیے، مقلد، غیر مقلد، حنفی، شافعی، قادیانی وغیرہ وغیرہ کے مقدمات کس کے سامنے پیش ہوتے ہیں مسٹر جیمس کے، آمین بالجہر اور بالسر کے مسئلہ کا کون فیصلہ کرتا ہے، مسٹر گھوش، نکاح وطلاق کے صحت و عدم صحت کا کون فرمان جاری کرتا ہے، ہرنام سنگھ، قرآن، کتب احادیث وفتاوائے فقہ کا کہاں ڈھیر لگتا ہے بوٹ کی جگہ پر، فیالدمعۃ علی الاسلام ویادمعۃ علی المسلمین۔

اوقاف کی حالت پر غور کرو تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے کروڑوں روپے کے اوقاف ہیں، وہ انتظاماً جس قدر برے ہاتھوں میں ہیں ان کا رونا ہر روز اسلامی اخبارات میں ہوتا ہے، جس کار خیر کے لیے وہ وقف ہیں اس میں ان کا کس قدر حصہ صرف ہوتا ہے وہ ذاتی جائداد کی طرح متولیوں کے موروثی قبضہ میں ہیں اور روز بہ روز برباد ہوتے جاتے ہیں۔

قربانی، رمضان، عیدین کے موقعوں پر مذہبی انتظامات جاری کرنا، تاریخوں کا متعین کرنا، رویت ہلال کے اطلاعات بہم پہنچانا، حج کے لیے مختلف شہروں میں اور خصوصاً بمبئی میں انتظام اور حاجیوں کے مصائب کا کم کرنا ایسی ضرورتیں ہیں جن کے لیے مستقل صیغہ کی ضرورت ہے اور گورنمنٹ نے ان میں سے بعض کے لیے مثلاً محافظت حجاج کے لیے انتظامات کیے بھی ہیں لیکن تمام ہندوستان کا اس سے انتظام نہیں ہوسکتا۔

الغرض ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی حالت ایسی افراتفری اور پراگندگی کی حالت ہے کہ شاید دنیا کے کسی خطہ میں جہاں مسلمان آباد ہیں اس قدر پراگندہ اور منتشر نہ ہوگی، یہ حالت مسلمانوں کے لیے اور حکومت کے لیے دونوں کے لیے قابل غور ہے اور اس لائق ہے کہ ہماری حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہمارے رہنمایان سیاسی اور ہمارے علمائے دینی سب مل کر ان معاملات پر غور کریں اور کوئی مستقل اور پائیدار تدبیر ان کے لیے اختیار کریں۔

ہمارے نزدیک بہترین تدبیر یہ ہے کہ اسلام کی گذشتہ روایات اور موجودہ رسوم جاریہ

کے مطابق مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی صیغہ ہندوستان میں قائم کیا جائے جس کا اعلیٰ عہدہ دار شیخ الاسلام ہو، جس کی عزت ووقار کا سرکاری اعتراف کیا جائے، اس کو ایک بڑی تنخواہ دے کر اس کے اعزاز کو بڑھایا جائے، اس کا تقرر مسلمان جماعتوں کے انتخاب اور گورنمنٹ کی منظوری سے ہو، اس کے ماتحت صوبوں میں اور صوبوں کے ماتحت ضلعوں میں اس کے عہدہ دار ہوں، جو اپنے حدود کے انتظامات کریں، اس صیغہ کے ماتحت حسب ذیل چیزیں ہیں، احکام ومسائل شرعی کا اجرا اور نفاذ، منازعات مذہبی کا فیصلہ، اوقاف، مساجد اور مدارس کا انتظام، دارالافتا کا قیام، یہ تمام صیغہ واقف قانون، ذی فہم اور روشن خیال علما کے ماتحت ہوں، جن کو مخصوص نصاب تعلیم کے مطابق پڑھایا جائے، ورنہ ڈر ہے گا کہ مسلمانوں کے پاؤں میں ایک نئی آہنی بیڑی نہ پڑ جائے۔

اس تجویز کی منظوری کے لیے دو فریق مخاطب ہیں، مسلمان اور گورنمنٹ مسلمانوں کو تو بدل وجان یہ تجویز منظور ہوگی، اب رہ گیا گورنمنٹ کا معاملہ جس کی اعانت کے بغیر یہ کام انجام نہیں پاسکتا، گورنمنٹ کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم مسلمان اس سے ایک ایسی چیز کے خواہش مند ہیں جس کے ہم جائز حق دار ہیں:

۱- ہماری قوم میں مذہباً اور قانوناً جب تک ہم دنیا کے فرماں روا رہے یہ عہدہ قائم رہا۔

۲- ہندوستان کے گذشتہ عہد میں بھی یہ صیغہ قائم تھا۔

۳- تمام بلادِ اسلامیہ میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں اور جن میں سے اکثر یورپین طاقتوں کے ماتحت ہیں اور امریکہ کے ماتحت بھی کچھ حصہ ہے، وہاں یہ صیغہ خود سرکاری انتظام و اعانت سے موجود ہے۔

۴- خود ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں بھی اس قسم کے انتظامات جاری ہیں۔

۵- حکومت برطانیہ کے آغاز عہد میں اس قسم کے انتظامات ملک میں رائج تھے لیکن رفتہ رفتہ مٹ گئے اور چوں کہ ہماری قوم مصائب غلامی کے باعث اس درجہ مرعوب اور مبتلائے ہول تھی کہ وہ اپنی مذہبی بربادی اور جائز حقوق کے چھیننے پر بھی کچھ بول نہ سکی لیکن اب جب کہ ہماری قوم

میں اشاعت تعلیم کے باعث امن وسکون پیدا ہو رہا ہے اور گورنمنٹ بھی مہربانی سے عطائے حقوق میں روز بہ روز فیاض ہو رہی ہے، اس لیے چند سال پہلے جو غلطی حکم رانوں سے ہوئی ہے ہم اس کی اصلاح کے طالب ہیں، قانون وقف اولاد کی مثال ہمارے سامنے ہے، ان ہی دلائل کی بنا پر جب اصلاح کا مطالبہ کیا گیا تو گورنمنٹ نے فوراً اپنی غلطی کا احساس کر کے ہمارا مطالبہ تسلیم کرلیا۔

ایک اتنے بڑے عظیم الشان صیغہ کے قیام میں ممکن ہے کہ گورنمنٹ مالی دشواری محسوس کرے لیکن اس کا حل نہایت آسان ہے، جب ہمارے اوقاف اور دیگر مذہبی صیغوں کی حالت درست ہو جائے گی تو خود بہ خود مصارف نکل آئیں گے، مقدمات میں اسٹامپ کی آمدنی کافی ہوگی اور بہت سے نئے ذرائع پیدا ہو جائیں گے۔

اس وقت جب کہ وزیر ہند ہمارے درمیان موجود ہیں حقوق ملکی کی تفصیل اور مطالبہ ہر ہر فرقہ آزادی سے کر رہا ہے، ہمارے علما نے یکم نومبر کے اجتماع فرنگی محل میں اپنی مذہبی پریشان حالی کا احساس کرلیا ہے، ۱۵؍ سے ۲۰؍ نومبر تک کی تاریخوں میں علمائے ہند کا مقدس وفد بارگاہ وزارت میں پیش ہو رہا ہے تو ان وجوہ سے اس مطالبہ اور درخواست کا اس سے بہترین موقع کوئی دوسرا نہ ہوگا۔''

انجمن علمائے بنگال کی صدارت: صوبہ بنگال اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا مگر یہ اکثریت زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے نومسلموں پر مشتمل تھی، جن کی ذہنی ودماغی حالت بہت پست تھی، وہ ہندوستان کی اسلامی حکومت کے مرکزوں سے بہت دور تھے، ان کا ان سے کوئی علاقہ نہ تھا اور ایک زمانہ تک انگریزوں کی پالیسی بنگال کے مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کی رہی، وہ مذہبی، تعلیمی اور تہذیبی حیثیت سے بہت پیچھے تھے اور ہندو عقائد وخیالات اور تہذیب ومعاشرت کا ان پر بڑا اثر تھا، ان کی بڑی تعداد برائے نام مسلمان تھی، ہندو بنگالی زندگی کے تمام شعبوں پر چھائے ہوئے تھے، مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہ تھی، البتہ ایک طبقہ میں مذہبی تعلیم کا ذوق تھا، اس لیے بنگال میں بھی بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری عربی مدارس تھے اور بنگالی مسلمان بہار، یو۔پی اور دلی وغیرہ کے مدارس میں بھی حصول تعلیم کے

لیے آتے تھے، مگر کچھ اپنی دماغی پستی اور کچھ بنگال کے نظام تعلیم اور نصاب کی ابتری کی وجہ سے عربی تعلیم سے بھی پورا فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے، اس لیے قدیم اور جدید تعلیم اور اسلامی تہذیب و معاشرت میں ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں سے بہت پیچھے رہے اور ان میں نمایاں اور ممتاز شخصیتیں بہت کم پیدا ہوئیں، اسی لیے کثرت تعداد کے باوجود ان کا کوئی وزن اور وقار نہ تھا اور بنگالی مسلمانوں کی پستی و جہالت کی وجہ سے عیسائی مشنری بھی ان پر چھاپے مارتے تھے، جس کا احساس یہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو تھا اور انہوں نے اس صورت حال کی اصلاح کی کوششیں شروع کر دی تھیں، بنگال کے مسلمانوں کی بے داری میں سب سے بڑا ہاتھ الہلال کلکتہ کا تھا، ان اصلاحی کوششوں میں انجمن علمائے بنگالہ کا بھی قیام تھا، دسمبر ۱۹۱۷ء میں اس نے اپنے سالانہ اجلاس کا صدر سید صاحب کو بنایا، اس انجمن کی تاریخ میں یہ اجلاس نہایت اہم تھا، سید صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں بنگال میں مسلمانوں کی تاریخ، اس کی اہمیت اور ان کی موجودہ حیثیت، ان کی تعلیمی و مذہبی ضروریات وغیرہ تمام پہلوؤں کا نہایت گہرا جائزہ لیا اور اس صورت حال کی اصلاح کے لیے نہایت مفید مشورے دیے، یہ خطبہ صدارت کتابی شکل میں بھی چھپا تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتہ: اسی زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور لیگ و کانگریس کے اجلاس بھی کلکتہ میں ہوئے تھے، کانفرنس کے اجلاس میں سید صاحب نے ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد حکومت میں کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ[1] پڑھا جو بہت پسند کیا گیا اور ۱۹۱۸ء کے معارف کے کئی نمبروں میں شائع ہوا، اب اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ پاکستان سے شائع ہو گیا ہے۔

کانگریس اور لیگ کے اجلاس پر تبصرہ: کانگریس اور لیگ کے اجلاس کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھتے ہیں:

---

[1] یہ مقالہ مقالات سلیمان جلد اول میں بھی آ گیا ہے۔

''دسمبر کے آخری ہفتہ میں کلکتہ میں کیا دیکھا، جوش وخروش، ہجوم وآواز لیکن اس دریا کا جوش وخروش جس کی تہہ میں موتی نہیں، ان ہستیوں کا ہجوم جن کے اثبات وجود کے لیے خوردبین کی حاجت ہو، ان آوازوں کا تلاطم جو معانی سے تہی ہوں، ہر ذرہ کو مدعی انا الشمس اور ہر قطرہ کو قائل انا البحر دیکھا۔

علمائے نفسیات کے لیے اب کے اجلاس میں بڑے رموز و نکات تھے، میں نے مقامات مقدسہ کے متعلق پاس شدہ رزولوشن پر ایک دیوانہ مقرر کو روک دیا کہ تم کو بولنے کا حق نہیں، اس نے چلا کر کہا، مسلمانو! دیکھو مقامات مقدسہ کے تحفظ کے باب میں بھی کسی کو یہ بولنے نہیں دیتے، یہ نامرد حق وصداقت سے کس قدر ڈرتے ہیں، ایسے لعنتی جلسے سے ابھی اٹھ جاؤ، دفعۃً بہت سے مسلمان اٹھ گئے، میں نے دیکھا کہ:

ع آہن بہ آہن تواں کرد نرم

میں نے کہا، مسلمانو! تم اپنے الفاظ سے خواہ وہ کس سخت وخلاف قانون ہوں، اپنے دل کی حقیقی ترجمانی نہیں کرسکتے، یہ جو خاموش مقدس علمائے کرام کی بزرگ صورتیں بیٹھی ہیں یہ بیہودہ گو مقرر کیا ان سے زیادہ مقامات مقدسہ کا درد رکھتا ہے، فوراً ان الفاظ نے دریا میں سکون پیدا کردیا اور ہر طرف سے صدائے مرحبا بلند ہوگئی، آخیر میں پنجابی اخبارات کی بدولت اب کلکتہ بھی لاہور ہوگیا[1]، ہر وہ شخص جو ایک رم کاغذ کا مالک ہے ایک اخبار نویس ہے، والدہ محمد علی کا ورود عوام کے حق میں مفید ہوا، کانگریس اور لیگ دونوں میں پریسیڈنٹ کے پہلو میں ان کو جگہ ملی، مسلمانوں کا ایک ہی ساز ہے اور وہ ان کا اللہ اکبر کا جنگی قرنا، محمد علی کی والدہ[2] کا جلوس، مسلمانوں کے نعرہ اللہ اکبر اور ہندوؤں کی مائی جی کی آواز کے ساتھ پڑتا تھا، مجھے گو شیخ کافر کہے لیکن برہمنوں کا کلمہ محبت (یعنی مائی جی کی جے) میرے دل سے لگتا تھا، انجمن ترقی اردو میں شیخ عبدالقادر کی تقریر مخزن کی ولادت شباب اور موت کے

---

[1] جس پر جوش مقرر نے سید صاحب عدول حکمی کی تھی وہ بھی پنجاب کا ایک اخبار نویس تھا۔ [2] مولانا محمد علی مرحوم کی والدہ بی اماں مرحومہ نے بھی کانگریس اور لیگ کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔

حالات پر مشتمل تھی، مولوی عبدالحق کی رپورٹ حسب معمول بڑی مرعوب کن تھی، باقی پیچ، وہی تعلیم نسواں کی ضرورت، رزرویشن، تہنیت وتعزیت اور گورنمنٹ سے درخواست، دوسرے تیسرے دن کانفرنس (یعنی اجلاس) میں خاک اڑتی تھی، لیگ میں خاصہ مجمع تھا، کانگریس میں سات سو صرف عورتیں ڈیلیگیٹ تھیں، پنڈال لکھنؤ سے بڑا تھا۔" (مکتوبات سلیمان، جلد اول، ص ۸۱ تا ۸۳)

ندوۃ العلما کے اجلاس ناگ پور میں شرکت ۱۹۱۸ء: مارچ ۱۹۱۸ء میں ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی صدارت میں ناگ پور میں ہوا، یہ اجلاس ندوہ کی تاریخ میں یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے اس کے مقاصد کو بڑا فائدہ پہنچا، سید صاحب نے اس اجلاس میں شرکت فرمائی تھی، اس کی روداد ان ہی کے قلم سے سننے کے لائق ہے، اپریل ۱۸ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

"امسال اجلاس ناگ پور متعدد حیثیتوں سے کام یاب رہا، یاد ہوگا کہ گذشتہ دسمبر کے اجلاسہائے کلکتہ پر ایک شذرہ میں ہم نے اظہار افسردگی کیا تھا، ندوہ کے اجلاس ناگ پور نے اس کی پوری تلافی کردی، کلکتہ میں ایک طرف کانگریس کا جوش وخروش اور دوسری طرف لیگ اور کانفرنس کی افسردگی دیکھ کر ہر مسلمان بجائے خود اپنی ذلت محسوس کرتا تھا لیکن اصل یہ ہے کہ یہ خود ہماری غلطی ہے، مسلمانوں کے جوش وخروش اور قوت عمل کا نظارہ صرف ایک ہی تماشہ گاہ میں ہوسکتا ہے اور وہ مذہب ہے اور اسی کے اندر سب کچھ ہے۔

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر ندوۃ العلما اور مولانا شاہ سلیمان صاحب کے استقبال میں وہ جوش اور اژدحام اور ولولہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آج ناگ پور کی تاریخ بدل جائے گی، والنٹیر جس ہمت اور ذوق دینی سے مصروف کار تھے وہ تماشا دیکھنے کے لائق تھا، باہر سے اس کثرت سے مہمان آئے تھے کہ سچ یہ ہے کہ میزبان اس بار کو بہ مشکل سنبھال سکے، جو سو ڈیلیگیٹ مختلف مقامات سے آئے تھے، ان میں زیادہ تعداد تو خود صوبہ کے اندر کی تھی، باہر کے صوبوں میں زیادہ مدراس کے لوگ تھے، رات کی مجلس وعظ میں پانچ ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔

تیسرے دن جب چندہ کی تحریک ہوئی ہے تو گو چندہ کی کوئی بڑی رقم کی امید نہ تھی کہ یہاں امرا کی آبادی نہیں لیکن ہم نے اپنے ان ہی غریب بھائیوں میں وہ جوش دیکھا کہ تین تین میزیں مختلف مقامات پر بچھائی گئی تھیں لیکن حالت یہ تھی کہ ہر جگہ ایک بھیڑ لگی تھی اور بہ مشکل یہ مہلت کارکنوں کو ملتی تھی کہ وہ ان کے صحیح نام اور پتے لکھ سکیں مذہبی تعلیم اور علوم اسلامیہ کے احیا کے جو وعظ وہ سن رہے تھے اس کا یہ اثر تھا کہ لوگوں پر گریہ اور رقت طاری تھی اور بعض علما اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو اس خدمت گزاری کے لیے نثار کر رہے تھے اور ہم بہ مشکل ان میں سے چند کو لے سکے، یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ مسلمان جنٹل مین جو اس قدر آزاد ہیں کہ اپنی لڑکیوں کو بہ شوق انگریزی تعلیم بے پردہ دلا رہے ہیں وہ بھی اپنے اصلی جوش مذہبی کا نہ دبا سکے اور اپنے عزیزوں کو اسی وقت انہوں نے مذہبی تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔

وہ سماں نہ بھولے گا جب ایک ہندو برہمن نے اپنی دس روپے کی رقم ان الفاظ کے ساتھ جلسہ میں پیش کی کہ میں یہ حقیر رقم ان احسانات کی یادگار میں دیتا ہوں جو مسلمان بادشاہوں نے ہمارے اسلاف پر کیے تھے اور یہ روپے اسی فارسی زبان کی تعلیم پر صرف کیا جاوے جس میں ہمارے بزرگوں کو سلاطین سے سندیں ملتی تھیں۔

اس اجلاس کا سب سے مفید کام یہ ہوا کہ صوبہ برار اور متوسط کے لیے ایک انجمن بنام معین الندوہ قائم ہوئی، جس کے کارکن بھی اسی اثنائے اجلاس میں منتخب کر لیے گئے، انتخاب کا معیار عزت و جاہ نہیں بلکہ درد دینی اور ذوق عمل قرار دیا گیا، یہ مجلس اب پورے صوبہ میں مذہبی دعوت اور تعلیم کا کام انجام دے گی، بالفعل اس کے ماتحت ایک عربی کا مدرسہ قائم ہوگا۔"

شبلی سوسائٹی: ایم مہدی حسن افادی مولانا شبلی کے ادب وانشا کے بڑے قدر دانوں میں تھے، اس لیے ان کی تجویز تھی کہ یورپ کے خیام کلب کے طرز پر ہندوستان میں شبلی سوسائٹی قائم کی جائے، جس کا مقصد مولانا مرحوم کی ادبی تصنیفات کی تدوین واشاعت اور اردو زبان کے ادبیات لطیفہ کی خدمت ہو، یہ تجویز انہوں نے ایک مفصل مضمون کی شکل میں

پیش کی جو جون ۱۹۱۸ء کے معارف میں شائع ہوا، مگر یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی۔

سیرت النبیؐ حصہ اول کی اشاعت اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں اس کی پیشکش: اگست ۱۹۱۸ء میں سیرت النبی کا پہلا حصہ جس کا غلغلہ سارے ہندوستان میں بلند تھا، شائع ہوا، اس تالیف واشاعت درحقیقت نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کی رہین منت تھی، ان ہی کی امداد سے اس اہم کام کا آغاز ہوا تھا، جس کی جانب مولانا شبلی نے اس قطعہ میں اشارہ کیا ہے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے

رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں ایک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

اور یہ امداد دارالمصنفین کے قیام کے بعد بھی جاری رہی، اس لیے یہ مقدس تحفہ خود سید صاحب نے لے جا کر نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں پیش کیا، ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''چار برس کے شدید انتظار اور شدید مزاحمتوں کے بعد آخر سیرت النبیؐ جلد اول شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ گئی، یہ جیسی بھی اور جس طرح بھی چھپی وہ موجودہ حالات میں نہایت مغتنم ہے، آئندہ جلد کے لیے جو بالکل تیار ہے یہ سامان بھی مشکل ہے، کاغذ کی قیمت اور تگنے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے، پھر بھی نایاب ہے، کوشش کی جارہی ہے کہ کاغذ میسر آجائے تو تیسرے حصہ میں بھی ہاتھ لگایا جائے۔''

۱۶/ اگست ۱۹۱۸ء کو سیرت النبی ﷺ کی دو مطبوعہ جلدیں لے کر میں اس آستانہ پر حاضر ہوا، جہاں آنکھیں اس کے دیدار کی سب سے زیادہ مشتاق تھیں، یعنی سرکار عالیہ ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال خلد اللہ ملکہا، ہر ہائنس نے تاریخ مقرر پر باریابی بخشی، یہ شرف یابی کا دوسرا موقع تھا، ہر ہائنس نے خود اپنے دست مبارک سے دونوں جلدیں

اٹھائیں اور فرمایا کہ "الحمدللہ! اتنا بڑا کام ہوگیا" پھر اس کی فہرست ملاحظہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ فہرست اتنی بڑی ہے تو کتاب کتنی بڑی ہے، عرض کیا کہ یہ جلد تو کتاب کا چھٹا حصہ ہے، اس کے بعد دیر تک قومی، تعلیمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو فرماتی رہیں، اثنائے کلام میں دریافت فرمایا کہ "مولوی صاحب! آپ نے رسول اللہ ﷺ کو بھی خواب میں دیکھا ہے؟" عرض کیا، دو دفعہ لیکن چہرۂ مبارک نگاہوں سے اوجھل رہا تو پھر فرمایا کہ یہ کیا زیارت ہوئی۔

سیرت النبیؐ کی بقیہ جلدوں کی طباعت کے لیے ایک مستقل پریس کی ضرورت تھی، حضرت سید صاحب نے اس کے معارف میں تین ہزار کی اپیل کی تھی، اس سفر میں بیگم صاحبہ بھوپال نے پریس کی خریداری کے لیے تین ہزار مرحمت فرمائے۔

نظام حیدرآباد کی قدر دانی: مولانا شبلی مرحوم کو ریاست حیدرآباد سے تین سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا، دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا مرحوم کے کاموں کی تکمیل کے لیے اعلیٰ حضرت نظام دکن نے یہ وظیفہ دارالمصنفین کی طرف منتقل کر دیا تھا، اس لیے ان کی خدمت میں بھی سیرت النبیؐ کا ایک نسخہ پیش کیا گیا جس کو انہوں نے بڑی عقیدت سے قبول کیا، سید صاحب ۱۹۱۸ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

> "اعلیٰ حضرت ناصر الاسلام والمسلمین ہز اکزالٹڈ ہائنس شہریار دکن خلد اللہ ایام دولتہ کی پیش گاہ معلی میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات کا ایک نسخہ خاص دو مہینے ہوئے ارسال کیا گیا تھا، ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں جب یہ کتاب پیش ہوئی تو نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ جب تک اس کتاب کو ختم نہ کرلوں گا دوسرا کام نہ کروں گا، یہ کلمات اس حقیقی عقیدت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں جو شہریار دکن کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ہے اور یہ ہم خادمان بارگاہ نبوت کے لیے بڑے فخر و انبساط کا باعث ہے۔"

ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت اور دوسرے علمی کام: ۱۹۱۸ء میں ارض القرآن کا دوسرا حصہ شائع ہوا، اب اس کا انگریزی ترجمہ کئی سال ہوئے مولوی مظفر الدین صاحب

ندوی ایم،اے کے قلم سے کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے اور معارف میں متعدد فاضلانہ مضامین سید صاحب کے قلم سے نکلے،ان کو حضرت امام مالک کی مؤطا سے بڑی عقیدت تھی،چنانچہ انہوں نے ان پر الندوہ میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا،اس کو بڑھا کر حیات امام مالک کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا،۱۹۱۷ء میں اہل سنت کے عقائد پر معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا تھا،اس کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا،۱۹۱۸ء میں ''مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا[1]،جو کئی نمبروں میں شائع ہوا،اس میں بڑی تفصیل سے اسلامی عہد میں ہندوؤں کی علمی ترقی دکھائی گئی ہے،یہ مضمون بہت مقبول ہوا،کئی سال ہوئے اس کا انگریزی ترجمہ کتابی شکل میں پاکستان سے شائع ہوا ہے،پہلی جنگ عظیم کے دوران میں علی برداران،مولانا ابوالکلام اور حسرت موہانی وغیرہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر نظر بند کر دیے گئے تھے،جو جنگ کے بعد چھوٹے،مولانا حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں سید صاحب نے ''نظر بندان اسلام'' کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں سرفروشان اسلام کے ابتلا اور قید و بند کے واقعات نہایت موثر انداز میں تحریر کیے۔

---

[1] اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے،اس کے مختلف نمبروں کے عنوان مختلف ہیں،یہ مقالات سلیمان جلد اول میں بھی آ گیا ہے۔

باب چہارم

قومی وسیاسی خدمات

۱۹۱۸ء-۱۹۲۶ء

دارالمصنّفین کے کاموں کی شہرت سید صاحب کی تصانیف اور ان کے فاضلانہ مضامین کی اشاعت سے پوری ملک خصوصاً مسلمانوں میں اس کی عظمت مسلم ہوگئی تھی اور ان کے جملہ معاملات ومسائل میں قوم کی نظریں سید صاحب کی طرف اٹھنے لگی تھیں، ان کا اصل ذوق علمی تھا، وہ عملی سیاست کے آدمی نہ تھے لیکن ان کی جیسی شخصیت کا اہم تحریکوں سے دامن بچانا مشکل تھا اور خود مسلمانوں کے مصالح ان کو ان کی شرکت پر مجبور کرتے تھے، اس لیے اس دور کی تمام قومی اور سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا اور مسلمانوں کا کوئی کام خواہ وہ ملکی وملی ہو یا مذہبی وسیاسی ان کی شرکت ورہنمائی سے خالی نہ ہوتا تھا، اس لیے ان کے کام اتنے متنوع اور گوناگوں ہیں کہ ان کو سمیٹنا آسان نہیں ہے اور یہ کام سب ایک ساتھ جاری تھے اور بیش تر ایسے تھے جن کی کئی کئی حیثیتیں تھیں، مثلاً ایک ہی کام ایک حیثیت سے مذہبی تھا، دوسری حیثیت سے علمی اور تیسری حیثیت سے تعلیمی، ان کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے الگ الگ ابواب میں لکھنا بہت دشوار تھا، اس لیے سنہ وار لکھنے کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں تھی، اس سے ان کے خیالات کے ارتقا اور ان کے کاموں کی مرتب تاریخ بھی سامنے

آ جائے گی، البتہ سیاسی کاموں میں شرکت ایک خاص زمانہ تک محدود رہی، اس لیے اس کو ایک مستقل باب میں لکھنا مناسب معلوم ہوا، آئندہ ابواب سنین کی ترتیب سے ہوں گے، البتہ آسانی کے لیے ان کو مختلف دوروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف شریف حسین کی بغاوت: نسلی اور وطنی قومیت اور قومی حکومت کا جوصور یورپ نے پھونکا تھا، جزیرۃ العرب بھی اس سے محفوظ نہ رہا تھا، ترکوں کی سیاسی غلطیوں نے اس جذبہ کو اور ابھار دیا تھا، اس لیے ترکوں اور عربوں میں حقوق کی کشمکش عرصہ سے چلی آرہی تھی، حجاز کے حکمراں شریف حسین اس کے لیڈر تھے، یہ کشمکش جاری تھی کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور ترکوں کو اپنے حالات ومصالح کی بناپر اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دینا پڑا، انگریزوں کو عربوں اور ترکوں کی کشمکش کا پورا اندازہ تھا، انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور شریف حسین کو عرب، عراق، شام وفلسطین کی متحدہ بادشاہت کا خواب دکھا کر ان سے بغاوت کرادی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارے ملک ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

ترکی کی حکومت کا خاتمہ اور اس کی قلم رو پر اتحادیوں کا قبضہ: انگریزوں نے ایک طرف شریف حسین کو متحدہ عربی حکومت کا خواب دکھایا، دوسری طرف اسی زمانہ میں یہودیوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے فلسطین کو ان کا قومی وطن بنانے کا وعدہ کرلیا اور دنیائے اسلام کو الگ یقین دلاتے رہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ان کے مقامات مقدسہ میں کوئی دست اندازی نہ کی جائے گی، مگر اختتام جنگ کے بعد فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنا کر ان کی حکومت قائم کردی گئی اور ساری دنیا سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کیا جانے لگا جس نے آگے چل کر دنیائے عرب کے لیے ایک مستقل خطرہ کی شکل اختیار کرلی اور انگریزوں کا لگایا ہوا یہ پودا اب برگ وبار لا رہا ہے، عربوں نے ہر چند اس کے خلاف احتجاج کیا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، شریف حسین کو حجاز کی بادشاہت ملی اور شام کی حکومت شریف حسین کے بڑے بیٹے امیر فیصل کو جنھوں نے شام پر اتحادیوں کا قبضہ کرایا تھا، پیش کی گئی، مگر اس سے پہلے کہ ان کو تخت

نشینی نصیب ہو فرانس نے ان کو نکال باہر کیا اور انگریز ان کی کوئی مدد نہ کر سکے، شام کے تخت و تاج سے محرومی کے بعد اشک شوئی کے لیے انگریزوں نے اپنی نگرانی میں عراق میں امیر فیصل کی اور اردن میں ان کے چھوٹے بھائی امیر عبداللہ کی حکومت قائم کی، لبنان میں فرانس کے ماتحت وہاں کے باشندوں کی قومی حکومت قائم کی گئی، اس طرح دنیائے عرب میں ایک متحدہ حکومت قائم کرنے کے بجائے اس کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا، جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے اقتدار میں تھیں۔

دوسری طرف قسطنطنیہ پر اتحادی فوجیں قابض ہو گئیں اور ترکی کی شہنشاہیت اناطولیہ، آرمینیا اور تھریس میں محدود ہو کر رہ گئی، دوسرے مال غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ بھی اتحادیوں میں زیر غور تھا، آرمینیا کو آزاد کرنے کے لیے وہ ارمنوں سے بغاوت کرا رہے تھے اور ارمنی سارے یورپ میں اپنی مظلومی اور ترکوں کے ظلم وستم کی جھوٹی داستانیں مشہور کرا رہے تھے، ترکوں کا خلیفہ اتحادیوں کی نگرانی میں تھا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ترکی کی حکومت کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا یا کم سے کم وہ اتحادیوں کی نگرانی میں ایک معمولی ریاست بن کر رہ جائے گا، اس ناامیدی کے عالم میں امید کی صرف ایک کرن تھی کہ ایک جاں باز ترک مصطفیٰ کمال بک بے سروسامانی لیکن سرفروش جماعت کے ساتھ اپنے اسلاف کی اس یادگار کو بچانے کی آخری جدوجہد کر رہا تھا۔

ہندوستان میں مجلس خلافت کا قیام: ترکی کی حکومت کا خاتمہ تنہا ترکی کا مسئلہ نہ تھا، بلکہ اس سے دنیائے اسلام کے ٹکڑے ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے سارے مقامات مقدسہ خطرہ میں پڑ گئے تھے، ارض حرم تک بالواسطہ انگریزوں کے اقتدار میں آ گئی تھی جس سے ساری دنیائے اسلام خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی تھی، اس لیے ترکی حکومت کی بحالی کی کوشش کے لیے مجلس خلافت کے نام سے ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا[1]۔

---

[1] اس کے بانیوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی (حسب روایت ماجد میاں چودھری خلیق الزماں بھی)، مولانا کفایت اللہ، مولانا محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور دوسرے علما اور سیاسی لیڈر تھے۔

ہندوستان میں انقلاب اور ہندو مسلمانوں میں اتحاد: اب تک ہندو مسلمانوں کی سیاست بڑی حد تک الگ الگ تھی، کانگریس کا قدم بھی آئینی حقوق طلبی سے آگے نہ بڑھا تھا، پہلی جنگ عظیم میں ایسے واقعات پیش آ گئے جنہوں نے انقلاب اور ہندو مسلم اتحاد کا سامان فراہم کر دیا اور وہ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس جنگ عظیم میں ایک وقت ایسا آ گیا تھا جب اتحادیوں کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس لیے انہوں نے ان کی ہمدردی اور امداد حاصل کرنے کے لیے اعلان کیا کہ سلطنت کی احتیاج کے وقت ہندوستان کی ترقی کے لیے ایک موقع ہے، اس اعلان میں اختتام جنگ کے بعد اصلاحات کے دینے کی طرف اشارہ تھا، اس اعلان پر ہندوستانیوں نے اس جنگ میں اتحادیوں کا پورا ساتھ دیا اور جان و مال ہر طریقہ سے اس کی مدد کی۔

مگر اس اعلان کے ساتھ ہی حکومت ہند نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے نام سے ایک ایکٹ نافذ کر دیا اور بہت سے ہندوستانی بغیر مقدمہ چلائے ہوئے نظر بند کر دیے گئے اور جنگ کے خاتمہ کے بعد مارچ ۱۹۱۹ء میں اس ایکٹ کو اور زیادہ سخت کر کے رولٹ ایکٹ کے نام سے نافذ کر دیا گیا، اس نئے قسم کے اصلاحات پر ہندوستانیوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور گاندھی جی نے ۶/اپریل ۱۹۱۹ء کو اس کے خلاف ستیہ گرہ کی، پورے ہندوستان میں مکمل ہڑتال ہوئی اور ہر جگہ جلسے کیے گئے، یہ گویا ہندوستان کی تحریک آزادی کا سنگ بنیاد تھا۔

ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح امرتسر میں بھی جلسہ ہوا، اس کے رہنما ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال تھے، پنجاب گورنمنٹ نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا، اہل شہر کو خبر ہوئی تو انہوں نے ان کو چھڑانے کے لیے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر دھاوا کر دیا، پولیس نے مجمع پر گولی چلا دی جس میں کئی آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے، اس واقعہ نے عوام کو بے قابو کر دیا اور انہوں نے محض سرکاری دفتروں اور عمارتوں کو لوٹ کر آگ لگا دی، یہ صورت حال

دیکھ کر جنرل ڈائر نے امرتسر کو اپنے قبضہ میں لے لیا، ۱۳ اپریل کو امرتسر کے باشندوں نے ایک مقام جلیان والا باغ میں پھر ایک جلسہ کیا، اتفاق سے اسی دن اسی مقام پر بیساکھی کا میلہ تھا، بہت سی عورتیں اور بچے بھی میلہ دیکھنے کے لیے آئے تھے، جنرل ڈائر نے جلسہ گاہ میں پہنچ کر بے تحاشا گولی چلوادی، جس میں سیکڑوں آدمی قتل اور زخمی ہوئے اور بے شمار گرفتار کیے گئے اور ان کو مختلف قسم کی نہایت ذلت آمیز سزائیں دی گئیں، اس واقعہ نے پورے ہندوستان میں آگ لگا دی اور امرتسر کو ہندوستان کی زیارت گاہ بنادیا۔

اس واقعہ نے ہندو مسلمانوں میں اتحاد کا راستہ پیدا کردیا، چنانچہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس اور خلافت کمیٹی دونوں کے اجلاس امرتسر میں ہوئے، اس زمانہ میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بیتول جیل میں نظر بند تھے[1]، امرتسر کے اجلاس کانگریس کے قریب رہا کر دیے گئے، رہائی کے بعد دونوں سیدھے امرتسر پہنچے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں سخت بے چینی تھی، جلیان والا باغ کے قتل عام نے پورے ہندوستان کو برہم کردیا، ان دونوں واقعات نے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا موقع فراہم کردیا، چنانچہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، گاندھی جی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی کوشش سے احیائے خلافت کی تحریک نے ہندو اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمان شریک ہوگئے، اس سے دونوں تحریکوں کو بڑا فائدہ پہنچا، ایک طرف خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبات میں وزن پیدا ہوگیا، دوسری طرف مسلمانوں کی شرکت سے کانگریس میں جان پڑ گئی اور ہندو مسلمان لیڈروں کے مشورے سے اتحادیوں کے سامنے خلافت عثمانیہ کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے خلافت کمیٹی کی جانب سے ۱۹۲۰ء میں ایک وفد لندن اور فرانس بھیجا گیا۔

وفد خلافت کی رکنیت: دارالمصنفین کے قیام سے پہلے سید صاحب کی علمی شہرت کا آغاز

[1] یہ دونوں بھائی ۱۹۱۶ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت نظر بند کیے گئے تھے۔

ہو چکا تھا، دار المصنّفین کے قیام، معارف کے اجرا، مکاتیب شبلی، ارض القرآن اور سیرت النبیؐ کی اشاعت سے دار المصنّفین کی شہرت کے ساتھ سید صاحب کی شہرت بھی آل انڈیا ہوگئی، اس دور کے علما میں سید صاحب ہی قدیم وجدید کے جامع تھے اور دین کے ساتھ سیاست اور نئے مسائل پر بھی ان کی نظر تھی، اس لیے وفد خلافت میں خلافت کی مذہبی ترجمانی کے لیے سید صاحب کا انتخاب ہوا، اس کے ارکان حسب ذیل تھے، مولانا محمد علی، رئیس وفد، سید صاحب اور سید حسین مرحوم، حسن محمد حیات صاحب سکریٹری، ہندوستان کی جانب سے ترجمانی کے لیے بنگال کے مولوی ابوالقاسم صاحب بھیجے گئے تھے،، اس وفد کے مطالبات حسب ذیل تھے:

۱- سلطان ترکی کی حکومت خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے قسطنطنیہ، تھریس، اناطولیہ اور آرمینیا میں مستقل اور آزاد قائم رکھی جائے۔

۲- حجاز، شام، فلسطین اور عراق کو جہاں مسلمانوں کے مقامات مقدسہ ہیں اور جن کے مجموعہ کا نام جزیرۃ العرب ہے، غیر اسلامی اقتدار سے محفوظ رکھا جائے اور ان کے تحفظ کے بارہ میں حکومت برطانیہ نے جو وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کیا جائے۔

۳- ہندوستان کی آزادی کے لیے رائے عامہ ہموار کی جائے، کیوں کہ بلاد اسلامیہ کا تحفظ ہندوستان کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں

وفد کی روانگی: یہ وفد آخر جنوری ۱۹۲۰ء میں روانہ ہوا، بمبئی میں اس کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا، ۳۰؍جنوری کو باشندگان بمبئی کی جانب سے مسٹر تلک کی صدارت میں ایک الوداعی جلسہ ہوا جس میں سید صاحب نے بھی ایک مؤثر تقریر کی، یکم فروری کو یہ وفد لندن روانہ ہوا، راستہ میں ایک دن جہاز کراچی ٹھہرا، یہاں بھی وفد کے استقبال میں ایک جلسہ ہوا، لندن پہنچنے کے بعد یہاں کے مقیم کئی مسلمان جن کو مسئلہ خلافت سے زیادہ دل چسپی تھی، وفد کے کاموں میں شریک ہوگئے، ان میں مشیر حسین قدوائی مرحوم نے نمایاں خدمات انجام دیں؛ ان کے

علاوہ عبد الرحمٰن صدیقی اور شعیب قریشی نے جو اس زمانہ میں لندن میں زیر تعلیم تھے، اپنی خدمات پیش کی، عبد الرحمٰن صدیقی نے انتظامی امور اپنے ذمہ لیے اور شعیب قریشی نے مسلمانوں کے اخبار مسلم آؤٹ لک کی ادارت سنبھالی، اس اخبار کے مالک مسٹر اصفہانی تھے۔

اس وفد کی کارگزاری کی روداد بہت طویل ہے، اس لیے اس کا اجمالی اور سید صاحب کے مساعی کا کسی قدر تفصیلی ذکر کیا جائے گا، سید صاحب کی حیثیت محض ایک رکن وفد کی نہیں بلکہ ایک مفکر، محقق، فاضل کی بھی تھی، انہوں نے اس سفر میں ہر چیز کا بڑی گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا اور اپنے مکاتیب میں جا بجا ان کا تذکرہ کیا ہے۔

مصوع میں: ہندوستان کو خیر باد کہنے کے بعد وفد نے سب سے پہلے جس سرزمین میں قدم رکھا، وہ مصوع ہے، جو اٹلی کے افریقی مقبوضہ علاقہ ارٹیریا کا بندرگاہ ہے، یہاں اثنائے سفر میں جہاز کچھ دیر کے لیے ٹھہرا تھا، اس کی آبادی خالص عرب ہے، اس لیے ارکان وفد نے اس کی سیر کی، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ پہلا موقع ہے کہ میرے پاؤں ہندوستان کے سوا کسی اور ملک میں نکلے اور ایک عرب گورنمنٹ کے اہتمام و انتظام کی ایک جھلک بھی نظر سے گزری، راہ میں ایک مسجد نظر آئی، نماز مغرب کے لیے وہاں گئے، نماز کے بعد لوگوں نے اجنبی سمجھ کر ہم لوگوں کی طرف دیکھا، السلام علیکم کے بعد ہمارے مقاصد سفر سے جب وہ مطلع ہوئے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چہروں سے کیسے شگفتگی کے آثار نمایاں تھے، فوراً سب نے ہماری کامیابی کے لیے دست دعا دراز کیے، بدحال حبشی عرب تھے، سیہ فام تھے، ژولیدہ مو تھے لیکن ذوق چشیدۂ ایمان تھے، ہماری آنکھیں قیامت تک ان کے چہروں کی شگفتگی، ان کی دست بوسی اور بغل گیری کے جلووں کو نہیں بھلا سکتی۔'' (برید فرنگ، مکتوب نمبر ۸)

> ''مصوع میں ہندوستانی آبادی کو دیکھ کر تعجب ہوا، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کچھ کے ہندو بنیا اور بوہرے خوجے مسلمان یہاں تاجر ہیں، اردو کی فرماں روائی دیکھیے کہ افریقہ کے ریگستان تک

وسیع ہے، اتفاقاً ہندوستانی بھائیوں سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے اس قدر آؤ بھگت، خاطر داری اور مہمان داری کی کہ اظہار مشکل ہے، دوسرے جہاز سے لالہ لاجپت رائے اور مشیر حسین قدوائی اترے، خلافت کے متعلق باتیں ہوئیں، مشیر حسین نے حقیقت میں بڑا کام کیا، وہ کہتے تھے کہ سر آغا خان کی کوششیں بھی شکریہ کے لائق ہیں روسی آذربائیجان میں اسلامی ریپبلک کا قیام اور حکومت انگریزی کا اس کو تسلیم کرنا ان ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔'' (برید فرنگ، مکتوب نمبر ۹)

وفد نے جہاز ہی سے اپنے مقاصد کی تبلیغ شروع کر دی، چنانچہ راستہ میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی ملی، سب کو مقصد سفر سے آگاہ کیا اور اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

پورٹ سعید میں: ان مقامات میں جہاں ہم کو موقع ملا، مسلمانوں سے ملے، ان کو ان کا فرض یاد دلایا اور اپنے کام سے آگاہ کیا، ہم نے ہر جگہ پایا کہ دلوں میں آگ سی لگی ہے، قاہرہ کا خیال تھا لیکن گاڑی کا مناسب وقت نہ مل سکا، مگر پورٹ سعید میں جو مصر کی آخری سرحد ہے اور جہاں سے یورپ کا پہلا قدم شروع ہوتا ہے، صرف ایک شب بسر کی، جامع عباسی میں مغرب کی نماز پڑھی، یہ سن کر ہندوستانی مسلمانوں کو تعجب ہوگا کہ ایک ہی صف میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نماز پڑھ رہے تھے اور امام سب کی رعایت کر رہا تھا، اتفاق سے مسجد میں بعض اخبارات کے مضمون نگاروں سے ملاقات ہوگئی، اپنے وفد کے مقاصد ان سے بیان کیے، امام جامع نے ہمارا خیر مقدم کیا، نماز مغرب کے بعد وہاں کے ایک شیخ فقہ کا درس دینے بیٹھے، جس میں فقہ شافعی کے مسائل انہوں نے بیان کیے، اکثر مقتدی جو جماعت میں شریک تھے، اس حلقہ میں شریک ہوئے جن میں ہوٹلوں کے خانساماں اور ملازمین بھی تھے، شیخ درس کے بعد مجھ سے عربی میں باتیں کرتے رہے، میں نے بہ تفصیل اپنے مطالب جب ان کو بتائے تو تمام حلقہ درس جوش و مسرت سے لبریز ہوگیا، شیخ نے دعائے نصرت مانگی اور سب نے آمین کہی۔

حلقہ سے اٹھ کر نماز عشا پڑھی، پھر مسجد سے نکلے تو ہر جگہ ہمارا چرچا تھا، بازار میں

ایک جگہ عربی اخبار خریدنے کو گاڑی روکی، تو چاروں طرف اس قدر ہجوم ہوا اور اترنے اور قہوہ پینے کے لیے اس قدر اصرار ہوا کہ ہم کو خوف ہوا کہ کہیں میلہ سا نہ لگ جائے، مخالفین اسلام اور ظالمین ارض پر اس قدر اعلانیہ تبرا کیا گیا کہ قیاس میں نہیں آ سکتا، ایک مصری نے جو اردو جانتا تھا، قریب آیا اور زور زور سے بدترین ہندوستانی گالی ان کے حق میں پوری قرأت کے ساتھ ادا کی، ہم سمجھے کہ مصر آج کل کوہ آتش فشاں ہو رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجمع کوئی غضب آلود شکل اختیار کرلے، اس لیے بدقت تمام جان چھڑا کر ایک عرب ہوٹل میں گئے، وہاں مصری کھانا کھایا، حسن اتفاق سے ہوٹل میں سربرآوردہ رہنمایان شہر سے ملاقات ہوئی، دیر تک گفتگو رہی، مصر کے اخبارات میں شاید ہمارے متعلق حالات شائع ہوئے ہوں۔ (برید فرنگ، ص ۹-۱۰)

وینس کا حال: دوسرے دن ایک بجے کے قریب وینس آیا لیکن ساحل تک پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی، یہ شہر چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک جال ہے، ہر جزیرے سے گزرتے ہوئے آخر میں بڑے جزیرے کے قریب لنگر انداز ہوئے، جو اصل شہر ہے، یہ بڑا جزیرہ بھی بیچ بیچ کی چھوٹی چھوٹی سیکڑوں نہروں پر منقسم ہے، جن کو جا بجا پلوں کے ذریعہ باہم ایک کیا ہے، بجائے سڑکوں کے نہریں ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ کشتیوں سے آتے جاتے ہیں، چنانچہ ہم ہوٹل کشتی پر گئے، اسٹیشن بھی کشتی پر گئے، تمام شہر یادگار تاریخی عمارتوں کا مرقع ہے، تمام راستے سنگی یعنی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں، یہاں کا ہر پتھر تاریخ کا ایک صفحہ ہے، گویا دہلی مرحوم کا نقش مرقوم ہے لیکن دہلی ویران ومنہدم ہے اور یہ عمارات اب تک زندہ قائم ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۱)

کام کا آغاز: یورپ کی سرزمین میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی ہمارے رفقانے کام شروع کردیا، وینس کے ہوٹل میں جانے کے ساتھ جو اخبار ملا، اس سے معلوم ہوا کہ لندن میں صلح ترکی کے لیے جلسے ہو رہے ہیں، کل کی گاڑی نہ مل سکی، اس لیے ٹھہرنا پڑا لیکن دن بیکار نہ گیا،

شام کو وینس اترے اور کچھ کھا پی کر فوراً ڈاک خانے اور تار گھر گئے اور تین بجے شب تک وہیں محمد علی اور سید حسین صاحبان نے بیٹھ کر بہ تفصیل اپنے مطالبات کے تار وزیر ہند، وزیر اعظم، لیبر پارٹی اور بڑے بڑے اخباروں کے نام بھیجے، اٹلی کے اخبارات کے نامہ نگار ملاقات کو آئے، ان سے اپنے مطالب بیان کیے اور دوسرے دن اکثر اخبارات میں وہ شائع ہو گئے۔ (ایضاً ص ۱۲)

فرانس کی روانگی: ۲۳؍ کو فرانس روانہ ہوئے، ۲۵؍ کی صبح کو پیرس پہنچنے کے ساتھ ارکان وفد کو معلوم ہوا کہ کل ہی شب کو ہاؤس آف کامنس میں قسطنطنیہ پر مباحثہ ہونے والا ہے، اس لیے اسی وقت وزرا اور لیبر پارٹی کے لیڈر کو تار دیا اور پہلی ٹرین سے لندن روانہ ہو گئے۔

لندن میں ورود اور ہاؤس آف کامنس کے مباحثہ میں شرکت: ۲۶؍ کی رات کو وفد لندن پہنچا اور اسی وقت ہاؤس آف کامنس روانہ ہو گیا، معزز مہمانوں کی صف میں اس کی نشست کا انتظام کر دیا تھا، وزیر اعظم کی تقریر ہو چکی تھی، دوسرے ممبران تقریر کر رہے تھے، لیبر پارٹی کے بعض ممبر وفد کے طرف دار تھے، وزرا اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھ میں رہے، آخر میں مسٹر بونرلا نے ایک بسیط تقریر کی اور معترضین کا جواب دیا لیکن وزرا اور ممبروں میں سے جو بھی وفد کے موافق کہلاتے تھے، وہ صرف اپنی مصلحتوں کی بنا پر قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھ میں لفظاً رکھنا چاہتے تھے، حقیقی طور پر وہ بھی نہیں یعنی ترکوں کو قسطنطنیہ پر کوئی اختیار نہ ہوگا، تمام قلعے مسمار کر دیے جائیں گے، جہاز ڈبو دیے جائیں گے اور مکانات منہدم کر دیے جائیں گے۔

ترکوں کے خلاف ارمنوں اور یونانیوں کا پروپگنڈا: وفد کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آ رہی تھی کہ ارمنوں اور یونانیوں نے ترکوں کے خلاف پروپگنڈے کا ایسا جال پھیلا دیا تھا کہ سارے یورپ اور امریکہ میں ان ہی کی آواز گونج رہی تھی، جس یورپین یا امریکن سے بھی ملاقات ہوتی تھی، وہ آرمینیہ میں ترکوں کے مظالم کا تذکرہ کرتا تھا، اس کے لیے ناول

لکھے گئے تھے، جن میں ترکوں کے مظالم کے فرضی افسانے بیان کیے گئے تھے، اخبارات میں روزانہ قتل عام کے تار چھپتے تھے، چنانچہ ہاؤس آف کامنس کے بھی اکثر ممبروں کی تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ چوں کہ قسطنطنیہ میں بیٹھ کر ترک آرمینیہ پر ظلم کرتے ہیں اس لیے قسطنطنیہ ان کے ہاتھ سے چھین لینا چاہیے، اخبارات میں اعلان شائع ہوئے تھے کہ مظلوم اور بے کس آرمینیوں کی حمایت کے لیے اپنے اپنے دائرے کے ممبران پارلیمنٹ کو تار دو اور اس پروپگنڈے کا جواب صرف روپے کے ذریعہ ہوسکتا تھا۔

وفد کی جدو جہد: ان حالات کی بنا پر ارکان وفد کو بڑی محنت اور جدو جہد سے کام لینا پڑا اور ان کا سارا وقت مشغولیت میں صرف ہوتا تھا، اخبارات کے قائم مقاموں سے ملاقات، ارمنوں کے مضامین کے جوابات، لوگوں سے ملنا جلنا، اخبارات کو پڑھنا، مخالف مضمونوں کا جواب لکھنا، وزرا اور ممبروں سے خط و کتابت، پہلے جو لوگ لندن میں اس کام کو انجام دے رہے تھے، ان سے تبادلۂ خیالات، مجلسوں اور انجمنوں میں شرکت وغیرہ۔ (ایضاً ص ۱۴-۱۵)

قائم مقام وزیر ہند سے وفد کی ملاقات: ۲ر مارچ ۶ ربجے شام کو وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کے قائم مقام مسٹر فشر سے وفد کی ملاقات ہوئی، مولانا محمد علی اور مسٹر سید حسین نے بڑی آزادی اور صفائی سے اپنے مطالبات اور مسلمانوں کے خیالات پیش کیے اور کہا کہ ہم کو انگریزی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو ادب کے ساتھ تنبیہ پیش کرنے کے مفہوم کو ادا کرسکے، جس میں تہدید نہ ہو، سید حسین صاحب نے وفد کے مطالبات کے بارہ میں ہندوؤں کی تائید اور اس پر ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کا ذکر کیا اور موقع پا کر اس بارہ میں گاندھی جی کے مرتبہ یادداشت کے اقتباسات بھی سنا دیے۔

اس کے بعد مسٹر فشر سید صاحب کی طرف متوجہ ہوئے، انہوں نے خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت واضح کی اور کہا کہ نہ میں پولیٹکل آدمی ہوں اور نہ میں جن کا قائم مقام ہوں وہ پولیٹکل آدمی ہیں، ہم لوگ خالص علمی اور مذہبی خدمت گزار

ہیں، اس لیے میرا اس وفد میں شریک ہونا خود اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ہم جس مقدمہ کو آپ کی عدالت میں پیش کر رہے ہیں وہ خالص مذہبی ہے۔

مسٹر فشر نے کہا، وزیر اعظم اس وقت بہت مشغول ہیں، وہ وفد سے ملنے کی پوری کوشش کریں گے، مگر شاید جلسہ صلح کے بعد، مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ جلسہ صلح کے بعد ان کا شرف ملاقات بخشنا بیکار ہے، ہم لوگ اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ عرض مطلب کے لیے ان سے ملنا چاہتے ہیں، تعجب ہے کہ موسیو وینی زیلاس (ترکی کے حریف یونان کے وزیر اعظم) جب بھی چاہیں وزیر اعظم سے مل سکتے ہیں اور ہم مسلمانان ہند کے قائم مقام ایک دفعہ بھی ان کے سامنے نہ جا سکیں۔

مسٹر فشر نے آرمینیہ کے مظالم کا تذکرہ کیا، مولانا محمد علی نے کہا، ان فرضی قصوں کو کون باور کر سکتا ہے، اگر آپ واقعی حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو مسلمانان ہند کا ایک کمیشن مقرر کر دیجیے اور ممکن ہو تو کسی انگریز جج کو بھی شامل کر لیجیے، اگر ترکوں کا قصور ہے تو ہم ان سے ہاتھ دھونے کو تیار ہیں، مسٹر فشر نے جوابی تقریر میں کہا کہ مسلمانان ہند اطمینان رکھیں، ترکوں کے ساتھ صلح میں ہم ان کے مذہبی جذبات کا پورا لحاظ رکھیں گے، مشکل یہ ہے کہ ہم تن تنہا نہیں تاہم حتی الامکان کوشش سے دریغ نہ کریں گے۔

حکومت کے انڈر سکریٹری صاحب نے جو کبھی بنگال کے گورنر رہ چکے تھے، فرمایا کہ مقامات مقدسہ کے دائرہ میں عراق کیوں کر داخل ہو سکتا ہے، زیارت مقابر تو تمہارے یہاں جائز نہیں، مولانا محمد علی نے اس مولویانہ اعتراض کا یہ جواب دیا کہ ہاں ہمارے یہاں ایک فرقہ اہل حدیث ایسا ہے، ورنہ تمام مسلمان اس کو جائز اور کار ثواب سمجھتے ہیں، خصوصاً شیعہ فرقہ زیارت عراق کو ضروری جانتا ہے اور یہ کوشش کسی ایک فرقہ کے خیال کے مطابق نہیں بلکہ تمام فرقوں کی طرف سے ہے۔ (ایضاً ص ۱۴-۱۶)

سید صاحب کے فرائض ومشاغل: سید صاحب کا کام مطالبات کی مذہبی حیثیت کو بتانا

تاریخی اور مذہبی حیثیت سے انگریزی اخبارات میں وفد کے مطالبات کے متعلق جو مضامین نکلیں ان کا جواب دینا، اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کران کو تحریک سے آگاہ کرنا تھا، چنانچہ مارننگ پوسٹ میں ایک اطالوی پروفیسر مشرقیات کا ایک مضمون ''سلطان بہ حیثیت خلیفہ'' شائع ہوا، سید صاحب نے اس کا جواب لکھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''دیکھیے کون اخبار چھاپے، کم بخت کہتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے خلافت دنیائے اسلام میں رہی نہیں، فیوچر آف خلافت ان کا ایک رسالہ ہے جو اطالین وزارت خارجہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔''

مستشرقین سے مسئلہ خلافت پر خط و کتابت: سید صاحب نے وفد کے بارے میں مستشرقین سے بھی خط و کتابت کی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہاں مستشرقین میں براؤن ہمارے ساتھ ہیں اور مارگولیتھ ہمارے مخالف، براؤن صاحب کو چار صفحہ کا عربی میں مسائل حاضرہ پر خط لکھا ہے اور ان سے تائید چاہی ہے، اپنی کتابیں بھی بھیجی ہیں، دیگر مستشرقین سے بھی اس مسئلہ میں خط و کتابت کا ارادہ ہے۔ (بریدفرنگ، ص ۲۰)

مسٹر اسکوتھ سے ملاقات: ۱۰؍ مارچ کو مسٹر اسکوتھ سے ملاقات ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ تک سوال و جواب ہوتا رہا (ع ح ص ۲۱)، چلتے وقت سید صاحب نے ان سے کہا کہ عیسائیت تو اپنی حمایت کے لیے بیسیوں حامی دین[1] سلاطین رکھتی ہے، کیا اسلام کو ایک حامی دین سلطان کی اجازت بھی نہ ملے گی، اس کا جواب مسٹر اسکوتھ نے صرف ایک تبسم سے دیا۔ (ایضاً ص ۲۴)

وزیراعظم سے ملاقات: لندن میں دو مہینہ قیام کے بعد خدا خدا کر کے وہ وقت آیا جب وزیراعظم مسٹر لائیڈ جارج نے ملاقات کا موقع دیا، چنانچہ ۱۹؍ مارچ کو وفد ان کی خدمت میں

---

[1] یورپ کے متعدد بادشاہوں خصوصاً انگلستان کے بادشاہ کے القاب میں ایک لقب حامی دین بھی ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

باریاب ہوا، عربی و فارسی کے یورپین عالم بھی بلا کر بیٹھائے گئے، ڈیڑھ گھنٹہ تک ملاقات رہی، مولانا محمد علی اور مسٹر سید حسین نے بڑی خوبی سے اپنے مطالبات پیش کیے، لائڈ جارج نے اس کے جواب میں جس کو سوال سے کوئی تعلق نہ تھا، فرمایا کہ سلف ڈٹرمنیشن کا وصول عیسائی اور مسلمان سب حکومتوں کے لیے برابر ہے، تھریس میں یونانی زیادہ ہیں، اس لیے وہ اس کے مستحق ہیں اور سمرنا میں گو مسلمان زیادہ ہیں لیکن یونانی النسل ہیں اس لیے ان کا بھی یونان مستحق ہے۔ (برید فرنگ، ص ۲۸)

مولانا محمد علی نے اس کا جواب دینا چاہا تو فرمایا ہم از سر نو مباحثہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ رات تک بیٹھنے کا یہاں خیال ہے اور یہ کہہ کر اٹھنے لگے، مگر اٹھتے اٹھتے مولانا محمد علی نے یہ کہہ دیا کہ اس وصول کے مطابق ترکی کے کسی صوبہ میں حتی کہ آرمینیہ میں بھی عیسائی قوم کی کثرت نہیں ہے۔ (ایضاً ص ۳۵)

وفد کے مطالبات کی حمایت میں ایک متفقہ جلسہ: مارچ کی آخری تاریخوں میں لندن میں مسلمانوں اور ترکوں کی ہمدرد انگریزوں کی جو انجمنیں ہیں ان سب کی جانب سے ایک متفقہ جلسہ ہوا، جس میں ارکان وفد کے علاوہ قادر بھائی بیرسٹر بمبئی، ڈاکٹر عبدالمجید بیرسٹر مونگیر، مسز سروجنی نائیڈو، مسٹر پاریمن اور چند انگریزوں نے تقریریں کیں۔ (ایضاً ص ۳۱)

حجاز اور شام کے عربی وفود سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات: اسی زمانہ میں حجاز اور شام کے وفود بھی اپنے اپنے مطالبات لے کر لندن آئے تھے، ان کے اور وفد کے مقاصد میں بڑا اختلاف تھا، اس لیے ان سے ملنا ضروری تھا، چنانچہ ۱۲/ اپریل کو ان سے وفد خلافت کی ملاقات ہوئی، اس کی روداد سید صاحب ہی سے سننا زیادہ دل چسپ ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حجاز و شام کے عربوں کا وفد لندن آیا ہے، نوری سعید پاشا اور حداد پاشا نائبین امیر فیصل اس کے سرگروہ ہیں، پہلے صاحب مسلمان اور دوسرے عیسائی ہیں اور بھی چند ممبر مسلمان اور عیسائی ساتھ ہیں، ایک دن پہلے عربی میں ان سے خط لکھ کر دریافت کیا کہ اگر کوئی مانع سیاسی نہ ہو تو

ہم لوگوں کو ملنے کی اجازت دیجیے،ٹیلیفون سے جواب آیا کہ ۱۲راپریل ۱۰ر بجے دن ملیے، میں اور مولانا محمد علی ملنے گئے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی، نوری سعید ایک نوجوان، تیز طبع اور ہوش مند شامی عرب ہیں پہلے ترکی فوج میں لفٹنٹ تھے اور اب جنرل بنے ہیں، افسر فوج کی وردی میں تھے، بہت محبت اور تپاک سے ملے، میں نے عربی میں خلافت اور جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کی کیفیت اور ان کے مطالبات مذہبی بیان کیے اور ذرا موثر اور شاعرانہ عبارت میں مطلب ادا کیا، وفد عربی کے اکثر ممبر انگریزی سمجھتے تھے، محمد علی صاحب سے نہ رہا گیا، انہوں نے انگریزی خطبہ شروع کر دیا، ترک و عرب کے اختلاف اور جنگ نے اسلامی مصالح کو کہاں تک نقصان پہنچایا، اس کی تفصیل بیان کی، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کا درد اور ملت کا غم زیر خاکستر انگارہ ہے، جو عرب و عجم و ترک ہر دل میں کلمہ اسلام سے گرم چھپا ہوا ہے، تقریروں کا سلسلہ ایسا موثر ہوا کہ دونوں کے دل بھر آئے اور آنکھوں سے اپنی بے کسی کے آنسو ٹپک پڑے، محمد علی کے دیدۂ پرنم نے اوروں کو بھی رلا دیا، جنرل نوری سعید نے کہا، میں خدا اور رسول اور اپنی عزت کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ یقین کرو کہ ہم ترکوں کے مخالف تھے اور نہ ہیں اور نہ خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کی خلافت کے منکر ہیں اور نہ خاندان عثمانی سے کوئی بغض و عداوت رکھتے ہیں، ہم کو ان چند نوجوان ترکوں سے مخالفت ہے، جو سالہا سال سے ترکی عنان حکومت پر قابض ہو گئے ہیں اور جن کی پالیسی ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لیے مہلک ثابت ہوگی، یہ یقین کرو اور خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ یقین کرو کہ ہم عراق و شام و فلسطین و عرب کے استقلال تام اور آزادی کامل کے طالب ہیں، اگر ہماری زمین کا ایک چپہ بھی کسی نے دبانا چاہا تو ہم لڑیں گے اور لڑیں گے، اتحادی سلطنتوں کے تعلقات دوستانہ کے ہم دل سے خواستگار ہیں لیکن رعایا اور حاکم کے تعلقات ہم کبھی قبول نہ کریں گے، مسلمانان عالم کو ہم پر اعتبار کرنا چاہیے، عرب ترکوں سے زیادہ خدمت اسلام کے مدعی ہیں، ہم نے کہا اگر ہم کو یہ یقین ہو جائے کہ عرب موجودہ مشکلات عالم کا بار اٹھا سکیں گے اور دشمنوں سے مقابلہ کی طاقت پیدا کر سکیں گے تو ان سے زیادہ اسلام کی عزت و آبرو کا حامی اور کون

ہوسکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ یقین کرنے کے وجوہ ہمارے پیش نظر نہیں ہیں، صرف پرزور دشمنوں کا مقابلہ نہیں بلکہ چالاک ترین حیلہ ساز دشمنوں کا مقابلہ ہے، جن کے دعووں کے الفاظ مقابل کی قوت وضعف کو دیکھ کر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، جن کے فلسفہ اخلاق میں عدل وانصاف اور صداقت وایمان داری کے ابواب نہیں، جنرل نوری سعید نے کہا، تاریخ میں نے بھی پڑھی ہے اور جانتا ہوں کہ احوال کیوں کر بدلتے ہیں، ہم اپنے ملک کے لیے خالص آزادی کے طالب ہیں، کسی حکومت کی حکم برداری یا حمایت یا کسی اور قسم کی مداخلت ہرگز ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔

اس معاملہ میں تمام عرب عیسائی، یہودی، مسلمان سب ایک دل و یک زبان ہیں، عیسائی ممبروں نے کہا کہ ہم سب اس معاملہ میں متفق ہیں، ہم کو ارمنوں پر قیاس نہ کرو، ان کی قومیت الگ ہے، ان کی زبان الگ ہے، ہماری زبان ایک ہے اور ہمارا ملک ایک ہے۔''

ارمنوں کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ ان کی مظلومی اور قتل عام کی داستانیں محض یاروں کی گپ ہے اور وزارت قانون کی من گھڑت ہے، ہم ترکوں سے تھریس، قسطنطنیہ اور سمرنا چھین لینے کے حامی نہیں، ونزیلاس سے ہم نے یہ صاف کہہ دیا ہے، محمد علی صاحب نے کہا کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح حکومت برطانیہ اور کینیڈا اور آسٹریلیا میں تعلقات شہنشاہی ہیں اسی طرح ملک عرب پوری آزادی اور مستقل حقوق کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کی شہنشاہی کے تحت قائم رہے، اس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا کہ مسلمانان ہند یہ تصور کر کے کہ عرب کی مقدس سرزمین بھی ان کے لیے اب امن وامان کا گھر نہیں غم زدہ ہیں، وہ حاجیوں سے یہ سن کر کہ وہاں انگریزی فوج برسر اقتدار ہے، خون کے آنسو روتے ہیں، ہندوستان کے مقدس ترین عالم، علمائے ہند کے مسلم شیخ اور ہمارے ملک کے پیشوائے ملت وامام شریعت مولانا محمود الحسن صاحب نے ہندوستان سے ہجرت کر کے ''بلدالامین'' میں اقامت اختیار کی، وہ سیاست اور پالیٹکس کے نام سے بھی آگاہ نہیں، وہ کفرستان ہند سے بھاگ کر نور وایمان کے مسکن میں گئے تھے لیکن وہاں بھی انہیں پناہ نہ ملی، کیا یہ اس بلدالحرام

کی تحقیر نہیں، جو عاصی و آثم کا بھی مامن ہے لیکن مامن نہیں تو اس مسلمان کے لیے نہیں جو ملت بیضا کا ہادی اور شریعت غرا کا شارح ہے، ہمارے صوبہ کی کونسل میں جب ان کی قید کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب ملا کہ ان کو برٹش گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے، اگر یہ سچ ہے تو کیوں کر کسی عرب حکومت کو خود مختاری کا مسلمانان ہند کو یقین آئے، حداد پاشا نے کہا میں نے بھی اس کے متعلق کچھ سنا ہے، نوری سعید نے کہا مجھے معلوم نہیں ہے، میں اس کی تحقیق کروں گا اور مولانا کا نام ایک کاغذ پر لکھ لیا، اس کے بعد شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوئے، دروازے تک نوری سعید نے مشایعت کی۔ (برید فرنگ)

لیبر پارٹی کی ایڈوائزری کمیٹی سے ملاقات اور اس پر تنقید: لیبر پارٹی جس سے لندن میں کچھ امید ہے، اس کی ایڈوائزری کمیٹی سے ۱۰/اپریل کو ملاقات ہوئی، ایک گھنٹہ تک گفتگو رہی، ۲۳/اپریل کو دوبارہ ملاقات کا وعدہ کیا ہے، ۱۲/اپریل کو عثمانی برطانی مجلس (برٹش اٹومن سوسائٹی) کا جلسہ تھا، سر گریہم صدر تھے، مقررین میں زیادہ تر انگریز تھے، ۲۲/اپریل کو ہمارا ایک شان دار جلسہ ہونے والا ہے، لیبر پارٹی کے پیر مغاں جارج لیبنری اس کے صدر ہوں گے۔

لندن کی لیبر پارٹی کی ان ہمدردیوں سے یہ قیاس نہ کیجیے کہ وہ اپنے ملک میں جس اظہار فیاضی کے لیے تیار ہیں، اس سے ایشیا کی بیمار و بے بس قومیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں، انگلستان کی آزاد سے آزاد پارٹی بہر حال انگریز ہے اور کبھی اس کی خصوصیات اس سے الگ نہیں ہوسکتیں، لندن میں ہم لوگ ڈیڑھ مہینہ کے قریب رہے، ہر طبقہ اور فرقہ کے آدمیوں سے ملے، پیرس آئے ابھی ایک دن گزرا ہے لیکن قسم بخدا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ مہینہ سے بہتر تھا، اسلام اور مسلمانوں سے محبت رکھنے والوں کی تعداد یہاں نظر آتی ہے، انگلینڈ میں ہمدرد انگریز بھی نفع زر کے لیے کام کرتا ہے۔ (ص ۴۸)

اتحادیوں کا دلی منشا: وفد خلافت نے کوشش اور جد و جہد کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا،

مختلف انجمنوں اور مجالس سے بھی اس کی تائید ہو رہی تھی، بہت سے انگریز بھی حمایت میں تھے، بعض عمال حکومت بھی ظاہری تالیف قلب کر رہے تھے، مگر اتحادیوں کا اصل منشا یہی تھا کہ ترکی کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، سید صاحب پر یہ حقیقت پوری طرح اضح ہو چکی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''معاملہ کی حالت یہ ہے کہ اتحادی یہ چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں اور غالباً اس خط کے پہنچنے تک واقعہ ہندوستان کے اخباروں کے ذریعہ آپ کے سامنے رونما ہو جائے گا کہ حسب دستور قسطنطنیہ کے خائن وزرا کا ایک مجمع کر کے من مانی صلح کے کاغذ پر دستخط کرالیں، اسی کے لیے سب کچھ ہو رہا تھا، ترکی پارلیمنٹ کے ان تمام ممبروں کو جو صحیح قومیت خواہی اور ملت پرستی کا جذبہ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے پابہ زنجیر مالٹا بھیج رہے ہیں اور آج معلوم ہوا کہ خائنوں کی ر[illegible]ت قائم ہو چکی، چند روز میں دستخط کی خبر بھی پڑھ لیجیے گا، انگریز اس وقت نہیں سمجھ رہے ہیں اور ہر برسر قوت قوم اپنے عہد ترقی میں نہیں سمجھتی ہے لیکن یہ یقین کرنا چاہیے کہ انگریز قوم لائڈ جارج کے ہاتھوں اپنی شہنشاہی کا مقبرہ آپ تیار کر رہی ہے۔'' (ایضاً ص ۵۲)

ترکوں کی مخالفت میں ایک کتاب: اتحادیوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کیسی کیسی ذلیل تدبیریں اختیار کی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہاؤس آف لارڈس کے ایک ممبر لارڈ برائس نے ترکوں کے مفروضہ مظالم پر تقریباً تین سو صفحوں کی ایک کتاب لکھی جو حکومت برطانیہ کی جانب سے شائع کی گئی ہے، اس میں مشنریوں، اخبارات اور دوسرے ذرائع کی ان تمام شہادتوں کو جمع کیا گیا ہے، جس کی بنیاد پر ترکوں کا ظلم و ستم اور ارمنوں کی معصومی اور بے چارگی ثابت کی جا سکے۔

مختلف ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات اور ان کی ترقی کی توقعات: اس زمانہ میں پیرس اسلامی وفود کا مرکز بنا ہوا تھا، مختلف ملکوں کے وفد یہاں آئے ہوئے تھے، سید صاحب نے ان سب سے ملاقات کی اور ان کے دلوں کو آزادی کی تڑپ اور ترقی سے معمور

پایا، چنانچہ ان کے مستقبل کے متعلق یہ پیشین گوئی فرماتے ہیں:

''مختلف ملکوں اور مختلف سلطنتوں کے مسلمانوں سے مل کر یہ بات اچھی طرح پورے یقین کے ساتھ ذہن نشین ہوگئی کہ مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکلنے کے لیے ان حوادث اور مصائب کی تنبیہ کی ضرورت تھی، اس لیے ان مسلمانوں کا احساس جو غیر حکومت میں رہتے ہیں بہت تیز ہے کیوں کہ ان کے مصائب شدید تر ہیں لیکن مسرت کی بات یہ ہے کہ اب ہر جگہ امید اور توقع کی روشنی نظر آتی ہے، مجھے اتنے ملکوں کے مسلمانوں سے ملنے کا موقع ملا، ترکی، شام، مصر، ٹیونس، روس، چین، ملایا ہر جگہ ترقی کے آثار، خیالات کی بلندی، احساسات کی بے داری، دست بروز مانہ کا علم، جدید آلات عمل، جدید علم وفن، جدید تدبیر وسیاست سے آگاہی، اسلامیت کا درد، قومیت کا وجدان، اتحاد عالم پر زور خواہش، دوست و دشمن کی تمیز، دشمنوں سے کامل عداوت اور دوسرے ملکوں کے اسلامی بھائیوں کی تلاش وجستجو پیدا ہے:

ع این بہ بیداری است یارب یا بخواب

مجھے یقین کامل ہوگیا ہے کہ دنیا ابھی ایک بار اور پلٹا لے گی، توقعات اور زیادہ پیدا کریں، موجودہ حوادث ایک بادل ہے، جس کے پیچھے خوشی اور مسرت کی بجلیاں چمک رہی ہیں، نوجوان مسلمان ایک نوجوان اسلام پیدا کریں گے، پرانی دیواریں اگر گر گئیں تو گر جانے دیجیے، تیرہ سو برس پہلے کی مضبوط بنیادوں پر نئی دیواریں قائم ہورہی ہیں۔'' (ایضاً ص ۵۸)

مسٹر مانٹیگو سے دوسری ملاقات: آخری اپریل میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو سے دوسری ملاقات ہوئی، بڑی ہمدردی سے گفتگو کی اور کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گا اور وہ دن دور نہیں جب میری جگہ کوئی مسلمان سکریٹری آف اسٹیٹ ہو، زیادہ سے زیادہ چھ برس کی دیر ہے، اگر ایرانی انگلش معاہدہ کے طریقہ پر عراق میں کارروائی ہو تو تم پسند کرو گے، سید حسین صاحب نے کہا کہ ہم ہندوستانی تو سمجھتے ہیں کہ ایران ختم ہو چکا، جواب نہیں، یہ غلطی ہے، تم چند سال میں دیکھ لو گے کہ ایران اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، مولانا محمد علی نے

برجستہ کہا، مگر دوسروں کو ڈھکیل نہ سکے گا، مجھے ایک مثال بھی دیجیے جہاں کوئی یورپین طاقت جا کر واپس آئی ہو، ہنس کر کہا "میسور ہیلو گولینڈ" یہ گویا ظریفانہ جواب تھا، یہ بات انہوں نے بھی تسلیم کی کہ کسی ایسے مسلمان یا ہندو سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی جو اب ہندوستان سے آیا ہو اور یہ نہ بیان کیا ہو کہ مسئلۂ خلافت پر تمام ہندو مسلمان متفق ہیں اور شدید جوش و خروش پیدا ہو گیا ہے۔

آخر میں سید صاحب نے فرمایا کہ میں مولانا محمود الحسن دیوبندی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو مالٹا میں بے قصور نظر بند ہیں، حالاں کہ ان کی نسبت پالیٹکس کا اطلاق ان کی تحقیر ہے، اس کا انہوں نے وہی جواب دیا جو صوبہ متحدہ کی کونسل میں مل چکا تھا کہ ان کو برٹش گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے، سید صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ عجب تماشا ہے، مستند عرب ارکان سے جب ہم لوگوں نے پوچھا تو انہوں نے اس سے صاف انکار کیا، محمد علی صاحب نے کہا، اگر عرب گورنمنٹ ان کو پسند نہیں کرتی تھی تو ہندوستان کے سپرد کر دیتی، مالٹا تو اس کے حدود مقبوضات میں نہیں ہے، مسٹر مانٹیگو نے اپنے سکریٹری کو اشارہ کیا کہ اس کو یادداشت میں لکھ لے، سوا گھنٹے یہ گفتگو رہی اور مولانا محمد علی اور سید حسین صاحب نے بڑی دلیری اور صفائی کے ساتھ باتیں کیں۔" (ایضاً ص ۶۳)

مختلف اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات: ارکان وفد کو اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے ملنے کا جو موقع ملتا تھا اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور اس کا سلسلہ ان کے سفر بھر جاری رہا، چنانچہ پیرس و لندن میں بھی مصر، تیونس اور تاتاری مسلمانوں سے ملاقات ہوئی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پیرس میں خدیو عباس حلمی پاشا کے بھائی پرنس محمد علی کی ملاقات نہایت دل چسپ رہی، خود انہوں نے بلوایا، تیسرے دن ہمارے وفد نے بھی ان کو کھانے کی دعوت دی، مصری وفد نے ۱۶ اپریل کو پیرس میں ہمارے وفد کو ڈنر دیا، سعد زاغلول پاشا سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی،

زیادہ تر وہ مجھ سے عربی میں باتیں کرتے رہے، خلافت اور جزیرۃ العرب کے مسئلہ میں وہ دل و جان سے شریک ہیں لیکن انہوں نے کھلے دل سے بار بار مصریوں کی طرف سے معذرت چاہی اور ایسے اسباب بتائے جن کی بنا پر مصالح اسلام اسی کے متقاضی ہیں کہ وہ زبان سے خاموش رہیں، تیونسی مسلمانوں سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، عبدالعزیز ثعالبی ان کے لیڈر ہیں اور پاس شدہ لیڈر یعنی جلا وطنی اٹھا چکے ہیں، ملنے کے بعد میں نے پہچانا اور انہوں نے بھی پہچانا، ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے زمانہ میں کلکتہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، وہاں کی عربی زبان اچھی ہے، جدید ترقی کے آثار نمایاں ہیں، وہاں کا جامع زیتون عربی کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، ایک ہزار طالب علم اور چالیس کے قریب مدرس ہیں، پیرس میں فرنچ کی تعلیم کے لیے تیونسی طالب علم ملے، بعض قانون اور بعض ڈاکٹری پڑھتے ہیں، پیرس میں میں نے عربی میں تقریر کی، اس کا فرنچ ترجمہ ایک تیونسی ڈاکٹر قرطبی نے سنایا، ان کے اجداد قرطبہ کے رہنے والے تھے، تاتاری مسلمانوں سے مل کر ان کی جدید ترقی کے حالات معلوم ہوئے، دو چینی مسلمان طالب علموں سے ملاقات ہوئی، ایک ملائی طالب علم لندن میں ملا۔'' (ایضاً، ص۶۴)

انگلینڈ، فرانس کی جمہوریت کی حقیقت: یورپ کی جمہوریت کا ساری دنیا میں غلغلہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی ایک طبقہ کی حکومت رہتی ہے، جس میں عوام کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور حقیقی جمہوریت وہاں بھی مفقود ہے۔

ہندوستان میں بیٹھ کر یورپ کی جمہوریت اور آزادی و حریت کے بڑے قصے سنتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً یہاں بھی ارباب حکومت اسی درجہ مستبد ہیں جس درجہ مشرق میں، عوام کو صرف یہ اختیار ہے کہ ممبر منتخب کرلیں، ممبروں کو یہ اختیار ہے کہ وزرا منتخب کریں، اس کے بعد نہ عملاً عوام کو ممبروں پر اور نہ ممبروں کو وزرا پر اختیار ہے، فرانس جوری پبلک کہلاتا ہے، وہاں کی حالت انگلینڈ سے بھی بدتر ہے، عوام کو حکومت کی پالیسی میں ذرہ برابر دخل نہیں، اب سمجھ میں آیا کہ یہاں سوشلزم کے برگ و بار پیدا کرانے کے کیا اسباب ہیں، یہاں امیر و

غریب طبقوں میں معاشرۃً اس درجہ بعد ہے جس قدر خدا اور بندے میں۔

یکم مئی کو لندن میں مزدور پیشہ لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس نکلا، سب کے ہاتھوں میں سرخ پھول، گلے میں سرخ ٹائی اور جیب میں سرخ رومال اور کئی جھنڈے تھے، ہائڈ پارک میں جا کر جو یہاں کا سب سے بڑا باغ ہے، جلوس ختم ہوا، میرے ایک دوست کہتے تھے کہ ان میں کوئی حقیقی جوش نہ تھا، اور بر بنائے معلومات میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انگریزوں میں نیشنل اسپرٹ اس قدر ہے کہ انٹرنیشنل احساس ان میں مشکل سے پیدا ہو سکتا ہے۔ (ایضاً، ص ۷۶)

انڈیا آفس لائبریری کی سیر: لندن میں سید صاحب کے مذاق کی اصل چیز انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریاں تھیں، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے، اس لیے اس کو کئی مرتبہ دیکھا، ان کے متعدد مکاتیب میں اس کا ذکر ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے پچھلی ڈاک میں آپ کے نام انڈیا آفس لائبریری کی اردو کتابوں پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا ہے، پہنچا ہوگا[1]، اس میں قلمی کتابوں کا تذکرہ نہیں ہے کیوں کہ ان کی کوئی فہرست مرتب نہیں، تاہم میں نے پروفیسر اسٹوری (یہ پہلے علی گڑھ میں تھے، اب یہاں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں) سے کہہ دیا تھا کہ پروفیسر بلومہارٹ سے جو ان قلمی کتابوں کے انچارج ہیں، ملنا چاہتا ہوں، پروفیسر اسٹوری کا خط مانچسٹر میں ملا کہ وہ ۴ر مئی کو ملیں گے، اتفاق سے واپسی جلدی ہوئی اور ۴ر کو حسب وعدہ انڈیا آفس میں بلومہارٹ صاحب سے ملاقات ہوئی، دیکھ کر تعجب ہوا، بہت بڈھے آدمی ہیں، ۸۰ سے کم عمر نہ ہوگی، بالکل سن سپید اور خمیدہ پشت ہیں، ۱۸۷۰ء میں ہندوستان گئے تھے، اردو عمدہ، فصیح اور صحیح مخارج سے بولتے ہیں، برٹش میوزیم میں بھی اردو کا صیغہ ان ہی کے متعلق ہے، بہرحال انہوں نے انڈیا آفس کی اردو کی قلمی کتابوں کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ مجھے دیا، یہ

[1] یہ مضمون جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں چھپا ہے۔

فہرست بھی بے ترتیب ہے، کوئی خاص ترتیب پیش نظر نہیں رکھی گئی ہے، اس سے کسی چیز کا نکالنا بہت مشکل نظر آیا، بہر حال اتنا معلوم ہوا کہ اردو کی کل ۳۰۰ قلمی کتابیں یہاں ہیں، یہ زیادہ تر دلی سے آئی ہیں، سعادت یار خان رنگین کی دس بارہ تصنیفات ہیں، ہندی کی قلمی کتابیں کل سو ہیں، ہندی بھی پروفیسر بلومہارٹ ہی سے متعلق ہے، پروفیسر موصوف اردو کے بہت مداح ہیں، اردو کو ہندوستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کے مؤید ہیں، ہندی کے مقابلہ میں اردو کو ہندوستان میں زیادہ پھیلنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں، ملکی حقوق کے بھی حامی ہیں، ان کے مقابلہ میں نوجوان اسٹوری سچے اینگلو اِنڈین ہیں۔" (ایضاً،ص ۷۷)

اڈنبرا، مانچسٹر اور کیمبرج میں وفد کا دورہ اور پروفیسر براؤن سے ملاقات : وفدِ خلافت کی آواز کو پورے انگلستان کے کانوں تک پہنچانے کے لیے ارکان وفد نے اڈنبرا، مانچسٹر اور کیمبرج کا دورہ کیا اور ان مقامات میں جلسے کر کے یہاں کے باشندوں کو اپنے مقاصد سے آگاہ کیا، اس کی تفصیلی روداد سید صاحب کے مکاتیب میں موجود ہے۔

کیمبرج میں پروفیسر براؤن سے ملاقات ہوئی، کیمبرج دیکھا، آپ کے معارف کے صفحات میں بھی اور انگلینڈ کی سرزمین میں بھی پروفیسر براؤن سے ملاقات ہوئی، بڑی مہربانی سے ملے، برابر مجھ سے ازراہ تلطف باتیں کرتے رہے، فارسی زبان میں گفتگو رہی، ان کو ایران سے بے حد محبت ہے، تاریخ جہاں کشا کی دو جلدیں مجھے ہدیۃً دیں اور یادگاری دستخط اس پر ثبت کیے، ترکوں کی نسبت ان کا خیال تھا کہ یورپ کے اہل سیاست نے نوجوان ترکوں کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا، تونس اور الجیریا کی نسبت کہتے تھے کہ فرانس ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا، ایک فارسی کا اخبار ہدیۃً دیا، اس کا نام کاوہ ہے، درفش کاویانی تو آپ کو یاد ہی ہوگا، اسی سے وہ لیا گیا ہے۔

پرسوں ہمارا قافلہ پھر رودبار انگلستان کو عبور کر کے پیرس جائے گا، ترکی ڈیلیگیشن آج کل میں پہنچنے والا ہے، مسٹر مانٹیگو نے ۲۶/اپریل کو وفد سے ملاقات کی تھی، پھر خاص محمد

علی صاحب کو بلا کر دیر تک باتیں کیں جن کی تفصیل کی اجازت نہیں، میری ذاتی رائے تو مانٹیگو صاحب کی نسبت یہ ہوتی ہے کہ وہ باتیں میٹھی کرتے ہیں اور بس۔

اتحادیوں کا فیصلہ اور ترکی حکومت کا خاتمہ: ابھی وفد کی کوششیں جاری تھیں کہ اتحادیوں نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ایک ایسا صلح نامہ مرتب کیا جس میں ترکی حکومت کے ٹکڑے کرکے اس کو تقسیم کر دیا گیا، کچھ علاقے آزاد کر دیے گئے، کچھ اتحادیوں کی حکم برداری میں دے دیے گئے، کچھ یونان کے حوالے کر دیے گئے، حجاز میں شریف حسین کی خدمات کے صلہ میں ان کی حکومت قائم کر دی گئی، قسطنطنیہ میں برائے نام اتحادیوں کی نگرانی میں ترکی حکومت قائم رکھی گئی، صلح نامہ کی دفعات کا خلاصہ یہ ہے:

۱- یورپین ترکی کا کل علاقہ یونان کے حوالہ کیا جائے، ۲- سمرنا یونان کو دیا جائے، ۳- آرمینیہ اور کردستان کو آزاد کر دیا جائے، ۴- قسطنطنیہ ترکوں کے زیر حکومت لیکن درۂ دانیال اتحادیوں کے قبضہ میں رہے گا، ۵- عراق و شام اتحادیوں کی حکم برداری میں رہیں گے، ۶- حجاز شریف حسین کے ماتحت آزاد ہوگا، ۷- مقامات مقدسہ حکومت برطانیہ کے زیر حفاظت رہیں گے، ۸- مصر، سوڈان اور قبرص انگریزوں، مراکش اور تیونس فرانسیسیوں اور طرابلس اٹلی کے زیر حمایت ہوں گے اور ان ممالک کے متعلق ترکی حکومت کے تمام سابق معاہدے منسوخ ہوں گے، ۹- روس اور جرمنی حکومتوں کے ساتھ اس کے معاہدے کالعدم ہوں گے، ۱۰- ترکی حکومت کوئی فوج نہیں رکھ سکتی، اس کی فوج کی تعداد مع پولیس ۱۵ر ہزار ہوگی، وہ بھی اتحادیوں کی نگرانی میں رہے گی، ۱۱- کوئی جنگی اور ہوائی جہاز ترکی حکومت کے قبضہ میں نہ رہے گا، ۱۲- تمام فوجی اسکول اور کالج بند کر دیے جائیں گے، صرف ایک اسکول ہوگا جس میں نان کمیشنڈ افسر تعلیم پائیں گے، ۱۳- وائرلیس ترکی میں نہ رہے گا، اس کے کل موجودہ اسٹیشن توڑ دیے جائیں گے، ۱۴- اتحادیوں کے لیے ترکی اپنے خرچ سے ہوابازوں کے لیے اسٹیشن بنائے گی، ۱۵- جو بغداد ریلوے ترکی سے گزرے گی وہ اتحادیوں کی نگرانی

میں رہے گی، جو نئے اسٹیشن بنیں گے وہ اتحادیوں کے زیرِ حکومت ہوں گے اور اس ریلوے کے لیے مزدور ترکی حکومت مہیا کرے گی، ۱۶- ترکی کے تمام مالی و اقتصادی صیغے اتحادیوں کے ہاتھ میں ہوں گے، ۱۷- اتحادیوں کے تار گھر ترکی میں الگ ہوں گے، ۱۸- چھوٹی تعداد کی قومیں مجلس اقوام کے زیرِ نگرانی اور کیتھولک بشپ کی نگرانی میں ہوں گے، ۱۹- حجاز میں تمام قوموں کو تجارت کی عام آزادی ہوگی، ۲۰- ترکی اپنی بندرگاہوں میں محصول نہ لے گی۔

یہ مسودہ پیرس میں اتحادیوں کی ساختہ و پرداختہ ترکی حکومت کے وفد کے حوالہ کر دیا گیا، اس صلح نامہ کے معنی ترکی حکومت کے خاتمہ کے تھے اور ایسا ذلت آمیز صلح نامہ کوئی مسلمان یا ترک کیا قبول کرتا، منصف مزاج یورپین بھی پسند نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ ترکی کے اخبار ''پیام صباح'' کے ایڈیٹر علی کامل تک نے جو اتحادیوں کا پٹھو تھا اور وہ اس کو ترکی کے مدبر اعظم کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، لکھ دیا کہ یہ صلح نامہ ناقابل قبول ہے۔

مگر ابھی یہ صلح نامہ کا مسودہ تھا، جس کے رد و قبول کا ترکوں کو اختیار تھا اور مصطفیٰ کمال کی پارٹی اپنے وطن کی آزادی اور ترکی حکومت کی بقا کے لیے سرفروشی کر رہی تھی، اس لیے وفدِ خلافت نے بھی اپنی کوشش جاری رکھی۔

مسٹر مانٹیگو سے مولوی ابو القاسم بنگالی کی گفتگو: بنگال کے ایک نامور مسلمان مولوی ابو القاسم اس زمانہ میں انگلستان میں تھے، جو وفدِ خلافت کے معین و مددگار ہو گئے تھے، ایک ملاقات میں مسٹر مانٹیگو نے ان سے کہا کہ مجھے مسلمانوں سے بڑی ہمدردی ہے اور میں نے ان کے لیے پوری کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، مگر اب شرائطِ صلح پیش کیے جا چکے ہیں اور تصفیہ ہو چکا ہے تو بہتر ہے کہ اب اس معاملہ کو ختم کر دو، مولوی ابو القاسم نے کہا کہ اگر یہی ہے تو کل آپ مسلمانوں کو مسجد جانے سے روک دیں گے اور جب وہ شور و غل کریں گے تو آپ فرمائیں گے کہ خیر اب جو ہو چکا بہتر ہے، اب اس معاملہ کو ختم کر دو، جواب دیا کہ نہیں

ایسا کہیں ہوسکتا ہے، دونوں معاملوں میں بڑا فرق ہے، مولوی ابوالقاسم نے کہا کہ اس فرق کا فیصلہ ہم ہی کر سکتے ہیں۔(برید فرنگ،ص۹۶)

آکسفورڈ یونیورسٹی: آخر جون میں ارکان وفد آکسفورڈ یونیورسٹی گئے، حضرت سید صاحب نے بڑے غور سے اس کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا، جس کا ذکر ان کے متعدد خطوط میں ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''۳۰؍جون کو ہمارا قافلہ آکسفورڈ گیا تھا، وہاں کے عجائبات علمیہ دیکھے، متعدد کالجوں کا مشاہدہ کیا، کتب خانے دیکھے، انگلستان چوں کہ جزیرہ ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کو مجبوراً ملاح ہونا چاہیے اور اسی لیے انگلستان دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت ہے لیکن معلوم ہے یہ قوت بحری اپنی تعلیم کا آغاز کہاں سے کرتی ہے، کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے، دونوں جگہ منجملہ ورزشوں کے کشتی رانی کا بھی انتظام ہے اور یہ وہاں کا ایک ضروری حصہ ہے، شہر میں فطری اور مصنوعی نہریں ہیں جن کے کناروں پر کالج کا اپنا گھاٹ ہے، جس میں اس کالج کی کشتیاں پڑی ہیں، ہر کالج کی علاحدہ علامت اور نشان ہے، جو کالج کی عمارتوں پر، طلبہ کے لباسوں پر، کشتیوں کے ہیزی گھاٹوں پر بنا ہے، طلبہ اپنے وقت کا بڑا حصہ کشتی رانی میں صرف کرتے ہیں، سال میں ایک مرتبہ لندن آکر کیمبرج اور آکسفورڈ کا مقابلہ ہوتا ہے۔''(برید فرنگ،ص۱۰۵)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''آکسفورڈ اور کیمبرج دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ مشرقی اور مغربی طرز تعلیم میں کیا فرق ہے، مشرقی طالب علم کا مدعا یہ ہے یا یوں کہیے کہ مشرقی مدارس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم زیر درس علوم میں ماہر ہو جائے لیکن مغربی طرز تعلیم کا منشا یہ ہے کہ طالب علم کے تمام قویٰ جسمانی و دماغی و اخلاقی میں بالیدگی ہو، علاوہ تعلیم کے لہو ولعب، ورزش جسمانی اور کشتی رانی کی خاص مشق کرائی جاتی ہے، ان کے یہاں انجمنیں اور مجلسیں ہیں جن میں پالیٹکس پر آزادانہ بحثیں ہوتی ہیں، ابھی ابھی ایک انگریز طالب علم جس کو حقیقت میں پروفیسر کہنا چاہیے ملا، دیر تک بالشوزم پر گفتگو کرتا رہا، اس نے

ایک انجمن ایشیا ٹک ایسوسی ایشن قائم کی ہے، جس میں ایشیا کے متعلق ہر حیثیت سے بحث کی جاتی ہے، ترکی کی شرائط صلح پر بحث کی جاچکی، پچھلے ہفتہ عراق کے مسئلہ پر بحث تھی، پروفیسر ٹوایسی ایک بزرگ ہیں جو ترکوں کے شدید دشمن ہیں، گورنمنٹ کی طرف سے آرمینیہ کے قتل عام پر جو کتاب ازرق لارڈ برائس کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف یہی صاحب ہیں، آئندہ پروفیسر ممدوح اپنے خیالات عالیہ کی اشاعت کے لیے آکسفورڈ کی مجلس مذکور میں جانے والے ہیں۔

بہر حال اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے محکمہ تعلیمات کا یہ اصول کہ پالیٹکس کو احاطہ تعلیم کے اندر نہ داخل ہونا چاہیے اور طلبائے ہند سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھیں کس حد تک یورپین طریقہ تعلیم کے منافی ہے اور اس روک تھام سے ہمارے محکمہ تعلیم کا مدعا کیا ہے، اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

آکسفورڈ میں کل ۱۸-۱۹ کالج ہیں، جن میں طلبہ کی تعداد دو ہزار ہوگی، ان میں ۷۵ر طلبہ ہندوستانی ہیں، ان میں ۳۰ر کے قریب مسلمان ہیں، اس سے زیادہ تعداد کیمبرج میں ہے، کیمبرج اور آکسفورڈ دونوں مقامات میں جس قدر کالج ہیں، ان کی عمارتیں بالکل قدیم طرز کی ہیں اور فخراً ان کو اسی حالت میں باقی رکھا گیا ہے، تا کہ ان کی قدامت کا اظہار ہر حیثیت سے ہوتا رہے، یہ قومیں وہ ہیں جو غیروں کی غلامی سے پاک رہی ہیں، اس لیے ان کی قدامت کے یہ آثار اب تک باقی ہیں۔'' (ایضاً، ص ۱۰۷، ۱۰۸)

یورپ کی جمہوریت کی حقیقت: یورپ کی جمہوریت جس کی صدائے بازگشت سے ساری دنیا گونج رہی ہے، ایک مبصر کی نگاہ میں اس کی یہ حقیقت ہے:

''یورپ کی جمہوریت کا رعب تو یہاں آکر فوراً اتر گیا، یورپ کی جمہوری ترقی کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ ابتدائے ایام میں صرف بادشاہ مالک ہوتا تھا، اس کے بعد زمیندار اور تعلقہ دار ونواب مالک ہوگئے تھے، جن کو ٹوریز یا کنزرویٹوز کہتے ہیں، اب تمام تر قوت تاجروں، دولت مندوں اور سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے، جن کا نام لبرل ہے، ان کی سیاست کا مقصد

صرف اپنی تجارت کی رونق اور دولت کا حصول ہے اور بس۔'' (ایضاً، ص ۱۰۹)

جمہوریت کے معلم فرانس کی جمہوریت کے متعلق رائے:

''فرانس کی جمہوریت اور آزادی کا افسانہ تو بہت سن چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم انگریزوں سے بھی زیادہ مستبد اور اقتدار پسند ہے، عوام کو سلطنت میں کوئی دخل نہیں، صرف ارباب جاہ وثروت کے ہاتھوں میں حکومت ہے، پہلے یہ سن کر بہت خوشی تھی کہ فرنچ اپنی حکومت کو شہنشاہی اور بادشاہی اور نوآباد شہریوں کو محکوم اقوام اور دیگر اقوام محکومہ کو انگریزوں کی طرح رعایا نہیں کہتے، بلکہ اپنی حکومت کو کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) اور رعایا کو سٹیزن یعنی شہری کہتے ہیں، گویا فرانس کے زیر سایہ بسنے والے ایک ملک وشہر کے سب بھائی بھائی ہیں لیکن افسوس یورپ آ کر معلوم ہوا کہ ہر لفظ سے اس کا اصل مفہوم مراد لینا ضروری نہیں، جیسے لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) انڈپنڈنٹ (استقلال وخودمختاری) مانڈیٹ (حکم برداری) سلف ڈٹرمنیشن (اختیار ذاتی) وغیرہ الفاظ کے معنی یورپ میں وہ نہیں سمجھے جاتے جو ایشیا میں از روئے لغت سمجھے جا سکتے ہیں، فرانس کا حق شہریت فرنچ انڈیا، مراکش، الجیریا اور تیونس وغیرہ کے باشندوں کو آپ جانتے ہیں، کب حاصل ہو سکتا ہے؟ جب وہاں کے باشندے فرنچ قانون اختیار کر لیں، فرنچ حکومت تسلیم کرنے کے بعد فرنچ قانون اختیار کرنے کے معنی آپ سمجھے؟ یعنی دیگر قوانین حکومت کے ساتھ نکاح، طلاق، وراثت اور دیگر معاملات میں اپنا مذہبی اور قومی قانون چھوڑ دیا جائے، جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلام یا ہندو دھرم کو خیر باد کہو تب فرانس کے حق شہریت کی دولت عظمیٰ مل سکتی ہے اور تب نوآبادکاری کا باشندہ ایک فرنچ کے برابر اور مساوی حقوق پا سکتا ہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اپنی قومیت وجنسیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کر لو، ظاہر ہے کہ مسلمان اس کو قبول نہیں کر سکتے، اس لیے وہ حق شہریت سے محروم ہیں اور حقوق میں ایک فرنچ مین کے برابر نہیں ہو سکتے، جمہوریہ فرانس کا شعار (موٹو) یہ چار الفاظ ہیں، اخوت، مساوات، عدالت، آزادی، حکومت کے ہر دفتر اور ایوان کے صدر دروازے پر یہ الفاظ آپ کو کندہ ملیں گے لیکن اس کے معنی وہ نہ سمجھیں جو لغت کی زبان آپ کو بتاتی ہے۔

ایک مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی مسینان کی مجھ سے خط وکتابت ہوئی تو میں نے پوچھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں، اس نے سچ کہا کہ ان الفاظ کو نہ دیکھو جو دیوار و در پر کندہ نظر آتے ہیں، بلکہ ان کو دیکھو جو دلوں میں منقوش ہیں۔" (ایضاً، ۱۲۷-۱۲۶)

حجاز کے وفد سے دوبارہ ملاقات: گو اتحادیوں نے شرائط صلح ترکوں کے حوالہ کردیے تھے، مگر ابھی اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے، اس لیے وفد نے اپنی کوشش برابر جاری رکھی اور حجاز کے وفد سے بھی تبادلۂ خیال ہوتا رہا، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس ہفتہ تیونس، مصر، شام اور عراق کے ارباب فہم سے ملاقات ہوئی اور طبیعت خوش ہوئی"۔ "والسکوت تارة افصح من النطق" حجاز کے عرب وفد سے آج پھر ملنے گیا، چوں کہ عربوں کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں سخت غصہ ہے اس لیے ناممکن ہے کہ پہلی ملاقات میں کوئی غیور مسلمان اپنی گفتگو میں اعتدال قائم رکھ سکے، خود میرا پہلی ملاقات میں یہی حال ہوا تھا لیکن بعد کو خیال ہوا کہ اب اس سے کیا فائدہ، اب تو بھلائی اسی میں ہے کہ اخلاص ومحبت کے ساتھ ان کو عواقب ونتائج سے خبردار کیا جائے، چنانچہ بعد کو ان سے یہی وطیرہ اختیار کیا، جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی سالہا سال کے غم وغصہ کھانے کے بعد ابھی پہلی دفعہ ہم لوگوں کے ساتھ ان سے جا کر ملے، بس جاتے ہی برس پڑے، بڑی کوشش سے ان کو روکا مگر وہ کسی طرح نہ رکے، دو گھنٹہ تک بتیا بحثی رہی، وہ اسباب ومصالح اور وجوہ بیان کرتے رہے اور یہ اعتراض کرتے رہے، مجھ سے بدگمان نہ ہوجیے گا اگر میں یہ کہوں کہ اب مجھے عربوں سے ہمدردی نہ رہی ہے۔

ترکی کا معاملہ اس خط کے پہنچنے سے پہلے سر بہ مہر ہو چکا ہوگا، اس وقت کی پوزیشن یہ ہے کہ اناطولیہ کے ترک جواب قوم اور مملکۃ میں ان شرائط کے تسلیم واعتراف پر تیار نہیں، قسطنطنیہ کی حکومت جو اتحادیوں کی توپوں کی زد میں ہے وہ معذور ومجبور ہے۔" (ایضاً، ص ۱۲۹-۱۲۸)

ترکی کا معاملہ اب صرف مصطفیٰ کمال کے زور بازو پر موقوف ہے، یہاں عربوں سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں، ان کے بیانات بھی سنے، یورپ کی تعلیم نے تمام اقوام عالم کے

کانوں میں قومی وجنسی تفریق کا جو منتر پھونک دیا ہے، وہ اب کسی ردسحر سے اترنہیں سکتا، گو اتحاد اسلامی کے خواب سب کو نظر آتے ہیں اور کوئی دل اسلام کے انجام کی فکر سے خالی نہیں لیکن ساتھ ہی اب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی ماتحتی قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں، عرب ممبروں نے رائے دی ہے کہ مسلمانان ہند کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ اپنے مطالبات کے ساتھ ایک وفد کی صورت میں شریف کے پاس پہنچیں، جو مسئلہ خلافت اور دیگر مسائل کو ان کے سامنے پیش کرے، عربوں کو شکایت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہم سے خفا، برہم اور ہماری دست گیری سے بے پرواہیں، ان کو قسطنطنیہ اور تھریس کی دھن ہے لیکن بلاد مقدسہ کی کوئی فکر نہیں، ہم نے کہا، اول تو یہ کلہاڑی آپ ہی نے اپنے پاؤں پر ماری ہے، اس کے علاوہ یہ اعتراض غلط ہے، ہمارے یہ رسالے اور کاغذات یہیں لیجیے اور پڑھیے، کعبہ کو چھوڑ کر ہم کو اور کون آستانہ مل سکتا ہے۔ (برید فرنگ، ص ۱۲۰)

صلح نامہ پر دستخط: ۱۱راگست ۱۹۲۰ء کو قسطنطنیہ کی حکومت کے نمائندوں نے صلح نامہ پر دستخط کردیے مگر اس کو ترکی قوم اور ترکی کی نمائندہ حکومت نے تسلیم نہیں کیا، مولانا عبدالباری مرحوم کو لکھتے ہیں:

> ''قسطنطنیہ کے بعض آدمیوں نے آکر ۱۱راگست کو صلح کے معاہدہ پر دستخط کردیے لیکن نہ اس کو ترکی گورنمنٹ کا اعتراف کہا جاسکتا ہے اور نہ ترک قوم نے اس کو جائز تسلیم کیا ہے، حقیقت میں دنیا کے سیاسی پلیٹ فارم پر ایک تماشا کھیلا گیا ہے، یہ فقط ایک قسم کی سیاسی صنعت گری ہے، اس معاہدہ کو واقعی ترکوں سے تسلیم کرانے کے لیے لوہے کا قلم اور خون کی سیاہی درکار ہے...... ترکی کا یہ معاہدہ وحی آسمانی نہیں جو بدل نہ سکے، صرف استقلال اور صبر علی الحق درکار ہے، ربنا ثبت اقدامنا۔'' (ایضاً، ص ۱۲۶-۱۲۴)

مقامات مقدسہ کی آزادی ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے: صلح نامہ پر دستخط ہوجانے کے بعد لندن میں وفد کا قیام بے کار تھا اور اگر مستقبل میں کوئی امید باقی تھی تو وہ

صرف ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سے اس کے بغیر مقامات مقدسہ بھی آزاد نہیں ہو سکتے تھے، ایک خط میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:

''خاتمہ بحث کے طور پر سفر یورپ کے خاتمہ پر اپنا سیاسی ایمان وعقیدہ اب آپ کے سامنے اور آپ کے ذریعہ تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں، ہم مسلمانوں نے تقریباً اپنی عمر کی نصف صدی اس طرح بسر کی کہ ہندوستان کی پالیٹکس سے عملاً کوئی غرض اور مقصد نہیں رکھا اور آوارہ وسرگرداں افریقہ وایشیا کے صحراؤں اور بیابانوں میں سر مارتے پھرے، ہماری مثال بالکل ایسی تھی کہ ہمارے ہی گھر سے کھڑے ہوکر ہمارے دشمن ہمارے ان بھائیوں پر تیر برسا رہے تھے جو ہمارے گھر سے باہر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے، ہم ان کو بچانا چاہتے تھے تو اس طرح کی اپنے گھروں سے نکل نکل کر دیوانہ وار اپنے بھائیوں کے گھروں کی طرف دوڑتے تھے اور ان کی چھتوں پر کھڑے ہوکر دشمنوں کو کبھی زجر وتوبیخ سے اور کبھی طعن وطنز سے اور کبھی تملق وخوشامد سے اس فعل سے روکتے تھے، کیا یہ حماقت نہیں ہے؟

اگر یورپ کا چھ مہینہ کا سفر، وزرا سے ملاقاتیں، ارکان سیاست سے مباحثے، پولیٹکل مجلسوں کی شرکت، عالم گیر اثر واقتدار کے اخبارات کے ایڈیٹروں سے گفتگو، ممالک اسلامیہ کے حالات پر اطلاع، یورپ کے سیاسی نظامات پر عبور اور موجودہ دنیا کی رفتار سے آگاہی کوئی تسلی بخش یقین واطمینان قلب میں پیدا کر سکتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان آزاد کرانا چاہیے، اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں، بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے، اب علمائے کرام کو نہ صرف درس وافتا کی خدمات انجام دینا چاہیے بلکہ ان کو صحیح راستہ سے مسلمانوں کو وہ سمجھانا چاہیے جس سے وہ اپنے ملک کے آپ مالک ہوں، اب کانگریس اور مسلم لیگ صرف چند وکلا اور پیشہ ور اہل سیاست کی جولان گاہ نہ ہوگی، بلکہ تمام مسلمان اپنے پورے مذہبی جوش اور دینی غیرت وحمیت کے ساتھ اس مقدس کام کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اور اس وقت تک آرام نہ لیں گے جب تک وہ خود اپنے ملک میں آزاد

نہ ہوں گے، وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین والسلام علی من اتبع الہدی۔'' (ایضاً، ص۱۷۹-۱۷۸)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمان خود نصف صدی تک ہندوستان کی پالیٹکس سے الگ رہے اور بے فائدہ ہندوستان کے باہر کوہ وبیابان بحر وبر اور صحرا اور ریگستانوں میں آوارہ پھرتے رہے، حالاں کہ منزل مقصود خود ان کا گھر تھا، اگر ان کے ہاتھ خود ان کے گھر میں مضبوط ہوتے تو گھر سے باہر بھی ان کی آواز کی قوت ہوتی، آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان اور ہندوستانی ہونا ہندوستان سے باہر کس ذلت آمیز تخیل کو پیدا کرتا ہے، اس ذلت آمیز تخیل کے ساتھ بڑے سے بڑا دعویٰ جو اس کے منھ سے نکلتا ہے، وہ اس کے منھ پر کہاں تک کھلتا ہے لوگ ہم سے کہتے ہیں اور ہم شرمندگی سے اس کا جواب نہیں دے سکتے کہ تم جو اس زور وقوت کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کو آزاد کرانا چاہتے ہو پہلے تم خود تو آزاد بن لو، کیوں کہ تم جن لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہو ان کی گرفتاری کے حقیقی سبب بھی تو تم ہی ہو، جو خود تمہاری تلواروں کا مقتول ہو اس کے سرہانے تم اب ماتم کیوں کرتے ہو۔'' (برید فرنگ، ص۱۷۷)

وفد خلافت کی واپسی اور اٹلی میں امیر فیصل سے ملاقات: وفد خلافت یکم ستمبر کو لندن سے روانہ ہوگیا، حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں شریف حسین کے لڑکے امیر فیصل یورپ جارہے تھے، راستہ میں اٹلی میں وفد خلافت نے ان سے ملاقات کی، اس کی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اخبارات کی معرفت یہ پہلے معلوم تھا کہ امیر فیصل یورپ آرہے ہیں، عزم قطعی تھا کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہوں، ہمارا راستہ بھی سارے یورپ کو طے کر کے نکلتا تھا، اس لیے یقین تھا کہ راہ میں کہیں نہ کہیں مٹ بھیڑ ہوگی، پہلے خیال تھا کہ سوئزرلینڈ شاید نقطۂ اتصال ہو لیکن یہ غلط نکلا اور آخر اٹلی آکر ان کے اسٹاف اور ہمارے وفد میں تصادم ہوا۔'' (ایضاً، ص۱۸۵)

معلوم ہوا کہ امیر فیصل چند روز پیش تر یہیں میلانوں میں تھے اور اب یہاں سے

کچھ دور ایک قصبہ میں مقیم ہیں، چنانچہ منزل مقصود قریب پا کر اسی وقت ان کو ۱۰ بجے رات کو ٹیلیفون کیا، وہاں سے اسی وقت جواب آیا کہ کل ۱۱ بجے ملاقات کا وقت ہے، دوسرے دن ۱۰ بجے کے قریب روانہ ہوئے اور موٹر سے سوا گھنٹہ کا راستہ تھا، سوا گیارہ کے قریب ان کے ہوٹل میں پہنچے، ان کی طرف سے ایک شامی عیسائی امیر لطف اللہ اور امیر حیدر ایک شامی مسلمان نے استقبال کیا اور ان کے کمرے میں لے گئے، کمرہ میں ان کے علاوہ نوری سعید ایک فوجی افسر جن سے لندن میں اور امیر حیدر جن سے پیرس میں ملاقات ہو چکی تھی اور امیر فیصل کے چھوٹے بھائی امیر زید تھے، رسم ملاقات کے بعد میں نے عربی میں ان سے گفتگو کی، طعن وطنز، ذکر ماضی، فتنہ حاضرہ، مصائب اسلام کے موضوع کے بعد یہ بحث چھڑی:

ع گرزی جو گزرنی تھی اب چاہیے کیا کرنا

گفتگو میں بجائے جلالۃ الملک (ہز میجسٹی) کے دولت الامیر (پرنس) اور جلالۃ الملک حسین کے بجائے شریف حسین کہتا رہا، یہ گویا اشارہ تھا کہ مسلمانان ہند نے تمہارے خطابات کو تسلیم نہیں کیا ہے، انہوں نے کہا کہ میری نسبت، میرے والد کی نسبت، میرے خاندان کی نسبت اور عموماً تمام عربوں کی نسبت ساری اسلامی دنیا خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سے غلط خیالات پیدا اور بہت سے الزامات قائم ہیں، افسوس ہے کہ واقعات اس قدر پر پیچ اور مخفی ہیں کہ فیصلہ مشکل ہے، مگر جب وہ اعلان میں آجائیں گے تو ہم کو امید ہے کہ یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، محمد علی صاحب نے ان کے سامنے بہت سی باتیں پیش کیں، خلافت کے مسئلہ کا ذکر کیا، بلاد مقدسہ کے مستقبل کی گفتگو ہوئی، جو گمان تھا وہ یقین کو پہنچا کہ ان سے انگریز اور فرانسیسی چال بازوں نے اس قدر پرزور زبانی اور تحریری عہد و مواثیق کیے تھے کہ وہ مستقبل کو نہ سمجھ سکے، ان سیاسی کھلاڑیوں نے جس طرح مشرق کے ہر سیاسی خائن سے برتاؤ کیا ہے وہی ان کے ساتھ بھی کیا، گو وہ اب بھی بہت کچھ امیدیں دلاتے ہیں لیکن جن کو پہلے پر اعتبار نہیں وہ آئندہ پر کیوں کر اعتبار کر سکتا ہے۔

تحریک خلافت کی علمی خدمت: سید صاحب نے تحریک خلافت میں عملی شرکت کے ساتھ اس تحریک کو اپنی تحریروں سے بھی بڑی تقویت پہنچائی اور خلافت اسلامیہ کی دینی اور سیاسی اہمیت پر مسلسل مضامین لکھے، جن میں سے بعض مضمون کتابی شکل میں شائع ہوئے، پہلا مضمون ''خلافت اور ہندوستان'' کے عنوان سے لکھا، جو دسمبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں شائع ہوا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خلافت کی تحریک محض ایک سیاسی لہر نہیں ہے بلکہ خلافت اسلامیہ سے ہندوستانی مسلمانوں اور یہاں کے مسلمان سلاطین کو بڑا قدیم اور گہرا تعلق رہا ہے، ان کو آستان خلافت سے بڑی عقیدت مندی رہی ہے، اس مضمون پر ایڈیٹر صبح امید (چکبست لکھنوی) نے چند تاریخی اعتراضات کیے، سید صاحب نے فروری ۱۹۲۰ء کے معارف میں اس کا مفصل اور مدلل جواب دیا، پھر مارچ ۱۹۲۱ء میں ''خلفائے اسلام کا اثر و اقتدار'' کے عنوان سے اس کا تکملہ لکھا جس میں یہ دکھایا ہے کہ خلافت عباسیہ کے ضعف و زوال کے زمانہ میں بھی اس کی مذہبی سیادت اور مرکزیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، ساری دنیائے اسلام اس کی دینی سیادت کو تسلیم کرتی تھی، پھر ستمبر ۱۹۲۱ء کے معارف میں اس کے مزید ثبوت میں بعض غزنوی سلاطین کے بیعت ناموں پر ایک مضمون لکھا، اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ''خلافت اور ہندوستان'' کے عنوان سے پھر ایک مضمون لکھا، جس میں آل عثمان سے سلاطین ہند کا تعلق اور ان کی عقیدت دکھائی گئی، اس مضمون کو پہلے مضمون کا تکملہ سمجھنا چاہیے، پھر نومبر اور دسمبر ۱۹۲۱ء اور فروری و مارچ اپریل ۱۹۲۲ء کے پرچوں میں ''خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا، جس میں خلافت عثمانیہ کے ساتھ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی عقیدت دکھائی گئی ہے، پھر جون ۱۹۲۲ء کے معارف میں خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر اس سلسلہ کو ہر پہلو سے مکمل کر دیا، تحریک خلافت کے زمانہ میں ان مضامین کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان میں سے بعض مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنا پڑا۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے اثرات محض ترکی حکومت تک محدود نہ تھے، بلکہ اس سے حرمین اور جزیرۃ العرب میں اتحادیوں کی مداخلت کا اندیشہ تھا، اس لیے سید صاحب نے بہار خلافت کانفرنس کے خطبہ صدارت میں مذہبی نقطہ نظر سے جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کی مداخلت پر بڑی مفصل بحث کی اور مذہبی و تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ ارض مقدس پر مسلمانوں کے سوا اور کسی کا حق نہیں ہے اور اس میں کسی غیر مسلم کی مداخلت گوارا نہیں کی جاسکتی، اس خطبہ کا ایک حصہ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے معارف میں شائع ہوا، پھر نومبر ۱۹۲۳ء ''ارض حرم اور اس کے احکام و مصالح قرآن مجید کی نظر میں'' کے عنوان سے معارف میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ دکھایا ہے کہ اسلام نے نہ صرف مشرکین عرب بلکہ یہود و نصاریٰ کے عقائد و اعمال، دینی سیادت و دنیاوی اقتدار پر بھی ضرب لگائی تھی، اس لیے وہ ابتدا ہی سے اس کے دشمن بن گئے تھے اور ان سب نے مل کر اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی پوری کوشش کی اور جزیرۃ العرب میں ان کا وجود ان دونوں کے لیے مستقل فتنہ تھا، ان کی موجودگی میں توحید کا احیا اور اسلام کی اشاعت اور اس کا تحفظ ممکن ہی نہ تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ سرچشمہ اسلام کو ان کے ہر قسم کے اثرات سے محفوظ رکھا جائے، اس لیے ارض حرم میں ان کی قربت اور جزیرۃ العرب میں ان کے قیام کی ممانعت کردی تھی، بعد کے واقعات نے اس کو بالکل صحیح ثابت کر دیا، چنانچہ یہود و نصاریٰ ہر زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور جزیرۃ العرب میں ریشہ دوانیاں کرتے رہے، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اگر ان کو جزیرۃ العرب میں قیام کا موقع مل جاتا تو نہ صرف سرزمین حرم شرک سے پاک نہ ہوسکتی بلکہ غیر مسلموں کی آئے دن کی فتنہ پردازیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچتا، اس لیے کسی زمانہ میں جزیرۃ العرب میں کسی غیر مسلم طاقت کی مداخلت گوارا نہیں کی جاسکتی۔

غرض وفد خلافت یورپ میں آٹھ مہینہ قیام کے بعد شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ناکام ہندوستان واپس آگیا۔

تحریک ترک موالات: اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ رولٹ بل کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعہ نے ہندوستان میں بڑا جوش وخروش پیدا کر دیا تھا اور جب اس کی کوئی دادرسی نہ ہوئی تو کانگریس نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ایک خصوصی اجلاس منعقد کر کے حکومت سے ترک تعاون کا رزولوشن پاس کر دیا، اس کے تین مہینہ کے بعد دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگ پور میں کانگریس کا سالانہ تاریخی اجلاس ہوا، اس نے بھی اس رزولوشن کی تصدیق کر دی، اس وقت کے حالات نے ہندو مسلمانوں کو بالکل شیر وشکر کر دیا تھا، چنانچہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے گاندھی کی رہنمائی میں ہندوستان کا دورہ کر کے پورے ملک کو ترک موالات کے غلغلہ سے پر شور کر دیا، سرکاری ملازمین نے اپنی ملازمتیں، طلبہ نے سرکاری مدارس، کونسل کے ممبروں نے ممبری چھوڑنا شروع کر دی، خطاب یافتوں نے خطابات واپس کر دیے، انگریزی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور جو لوگ مانچسٹر کے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے، وہ کھدر پوش ہو گئے، ایسا معلوم ہوتا کہ انگریزی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے، ہندو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا ایسا روح پرور نظارہ پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، اس کی تفصیلات بڑی طویل ہیں، ہمارا مقصود ترک موالات کی تاریخ لکھنا نہیں ہے، اس لیے صرف اس کے خلاصہ پر اکتفا کیا گیا۔

جمیعۃ العلما کا قیام: ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک عرصہ دراز تک علما ہی پیش پیش رہے، دراصل اس تحریک کے بانی وہی تھے اور سب سے پہلے ان ہی نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، سید احمد شہید بریلویؒ اور مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی تک برابر اس کا سلسلہ جاری رہا، اس سے بھی بہت پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے تیموریوں کے دور زوال میں جب مسلمانوں کی حکومت ختم نہ ہوئی تھی، انگریزوں کے روز افزوں اثرات اور اس کے نتائج کو محسوس کر لیا اور ان سے آگاہ کیا تھا اور اس کے روکنے کی علمی و عملی کوششیں بھی کیں، حضرت شیخ الہندؒ نے اس زمانہ میں ہندوستان میں سیاسی انقلاب کی کوشش کی، جب عام طور سے

ہندوستانی آزادی کے صحیح مفہوم سے بھی آشنا نہ تھے، اس کے لیے قید و بند اور جلاوطنی کی مصیبتیں جھیلیں، اس لیے ہندوستان کی سیاسی بے داری کے بعد اس کی آزادی کی جدوجہد کے لیے نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلمائے ہند کا قیام عمل میں آیا[1]۔

وفدِ لندن کی واپسی کے بعد سید صاحب کے سیاسی کام: سید صاحب کا ذوق خالص علمی تھا، علمی کام سکون اور خاموشی کی زندگی چاہتا ہے، سیاست کی ہنگامہ آرائیاں اس کی دشمن ہیں، اس لیے ان دونوں کاموں کو ساتھ چلانا مشکل ہے، جو شخص سیاسی میدان میں قدم رکھے اس کو علمی کاموں کو خیرباد کہنا پڑے گا، اس لیے سید صاحب کے سامنے جو عظیم الشان علمی کام تھے وہ سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ پورے نہیں ہو سکتے تھے، سیرۃ النبیؐ کی تکمیل ان سب پر مقدم تھی، پھر دارالمصنفین اس زمانہ میں ایک نیا پودا تھا، جو سیاست کی آندھی کی تاب نہیں لا سکتا تھا، مگر اسی کے ساتھ سید صاحب اپنے قومی و وطنی فرائض سے بھی غافل نہ تھے اور ایک ایسے زمانہ میں جب پورے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی، سید صاحب کی جیسی شخصیت خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ ان کے لیڈروں کی نگاہیں بھی ان کی جانب اٹھتی تھیں، اس لیے وہ سیاست سے کنارہ کش بھی نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ علمی کاموں کی غیر معمولی مشغولیتوں کے باوجود وہ سیاسی کاموں کے لیے بھی وقت نکالتے تھے، ایک خط میں وہ خود اس کشمکش کے بارہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں پالیٹکس سے نہیں گھبراتا اور نہ سیاست کے خطرات سے خوف زدہ ہوں لیکن قوم مجھ سے ایک ہی کام لے سکتی ہے، یا علم کی خدمت یا سیاست، خدمت علم سکون و اطمینان کی طالب ہے اور سیاست ہنگامہ آرائی اور شور و غل کی مقتضی، جب تک دارالمصنفین اور تکمیل سیرت کی زنجیر

---

[1] اس کے بانیوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ اس عہد کے بہت سے علما ہیں۔

اپنے پاؤں سے نہ کاٹوں اس دنگل میں کودنہیں سکتا کہ ایک وقت میں دو کام نہیں ہو سکتے، بایں ہمہ آپ دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی اپنے گوشہ عافیت سے نکل کر اس دنگل میں بھی کود جاتا ہوں۔''

سیاسی تحریکات میں شمولیت میں ہمیشہ اسی اصول پر ان کا عمل رہا، ان کا زیادہ وقت تالیف وتصنیف میں صرف ہوتا تھا اور ضرورت کے اوقات میں سیاست میں بھی عملی حصہ لیتے تھے، اس زمانہ میں تین ترقی پسند سیاسی جماعتیں تھیں، کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلمائے ہند، سید صاحب ان تینوں کے کاموں میں حصہ لیتے تھے، خلافت اور جمعیۃ العلما کے تو سرگرم رکن تھے اور اس کے جملہ مہمات امور میں ان کا مشورہ شریک رہتا تھا، کانگریس کے اہم جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے اور اس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی ہو گئے تھے۔

ندوہ کی سرکاری امداد کی واپسی: ۱۹۲۰ء کے آخر میں ترک موالات کی تحریک شروع ہو گئی تھی، اس میں سرکاری تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ اور سرکاری امداد کی واپسی بھی تھی، ندوہ کو بھی پانچ سو ماہوار ایڈ ملتی تھی، اس لیے اس کی واپسی کا بھی سوال اٹھا، ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے بہت سے ارکان اور اس کے رکن رکین مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سرے سے ترک موالات ہی کے خلاف تھے، اس لیے ایڈ کی واپسی کے مسئلہ میں سخت اختلاف تھا، مگر سید صاحب کو کوشش سے بڑے بحث ومباحثہ کے بعد مجلس انتظامیہ نے ایڈ کی واپسی کا فیصلہ کیا، نومبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں لکھتے ہیں:

''دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے ارکان انتظامی نے ڈیڑھ دن کے مسلسل وسرگرم مباحثہ کے بعد ۵۰۰ر ماہوار کی سرکاری اعانت لینا بند کر دی، دار العلوم کے لیے یہ رقم اس قدر ناگریز تھی کہ اس کے ہٹ جانے کے بعد فوراً اس کی زندگی گویا معرض خطر میں آگئی ہے، تقریباً ایک ہزار ماہوار کا صرف ہے، سرکاری امداد سے انکار کے بعد صرف سرکار بھوپال کی ۲۵۰ر کی ماہوار کی امداد اس کے پاس رہ گئی ہے، کسی اور رقم کا سرمایہ اس کے پاس نہیں ہے، ہماری درخواست پر مدرسین کرام نے اپنی مقدس جماعت کے رتبہ کے مطابق بڑے ایثار کا ثبوت دیا، تاہم تین برس کے لیے

کم سے کم تیس ہزار روپے کی ضرورت ہے، کیا ہم قوم سے امید رکھیں کہ وہ اس کی جھولی کے بھرنے میں اپنے رتبہ کے مطابق ایثار کا ثبوت دے گی۔"

میرٹھ خلافت کانفرنس کی صدارت: اسی سال میرٹھ خلافت کانفرنس کی صدارت کی اور خلافت کے مسئلہ پر اتنا اہم خطبہ پڑھا جو خلافت کمیٹی کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ہے۔

کانگریس کے اجلاس ناگ پور میں شرکت: آخر دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگ پور میں کانگریس کا تاریخی اجلاس ہوا، جس میں نان کواپریشن کے رزولوشن کی تصدیق کی گئی[1]، سید صاحب اس اجلاس میں شریک ہوئے، سید عبدالحکیم صاحب کو ناگ پور سے لکھتے ہیں:

"دہلی سے دہلی کی جماعت کے ساتھ ناگ پور آیا، ۲۴ر کو ناگ پور پہنچا، ۲۶ر سے کانگریس ہے، گرما گرم بحثیں ہورہی ہیں، بنگال نے تو کندھا ڈال دیا، لالہ لاجپت رائے مذبذب الرائے ہیں، مالوی جی دم بخود، مسلمان ہیں اور گاندھی جی جوایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، امید نہیں کہ ۳۰ر سے پہلے کانگریس ختم ہوسکے، کانگریس کے مقصد کی تجویز پاس ہوگئی، یعنی ہندوستان کا کامل استقلال، آج اس وقت ترک موالات کا رزولوشن پیش ہے۔"

گویہ کانگریس کے عروج کا زمانہ تھا لیکن اس میں کم لوگ ایسے تھے جو انگریزی حکومت کے مقابلہ میں کوئی تیز قدم اٹھانے کے لیے آمادہ ہوں، جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کامل کا رزولوشن صرف مسلمانوں کی حمایت سے پاس ہوا تھا اور ہندو لیڈروں کی ایک جماعت اس کے بعد بھی دل سے اس کے خلاف تھی مگر کانگریس کی خوش قسمتی سے خلافت کے مسئلہ کے بیان پر مسلمان جوش سے معمور تھے اور کانگریس اور خلافت کمیٹی میں ہم آہنگی تھی، اس لیے کانگریس میں بھی جان پڑگئی اور اس زمانہ میں کانگریس میں مسلمان ہی پیش پیش تھے۔

ترک موالات میں اعظم گڑھ کا حصہ: ناگ پور کانگریس کے بعد پورا ہندوستان ترک

[1] یہ رزولوشن کانگریس کے اسپیشل اجلاس منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۰ء میں پاس ہو چکا تھا۔

موالات کی تحریک سے گونج رہا تھا اور یوپی میں اعظم گڑھ اس کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، پورے ضلع میں خلافت کمیٹی کی شاخیں اور پنچایتیں قائم ہوگئیں، عدالتوں سے مقدمات قریب قریب ختم ہوگئے، شراب نوشی اور شراب کی دوکانیں بالکل بند ہوگئیں، اس کا ٹھیکہ لینے والا کوئی نہ ملتا تھا، ایک نیشنل اسکول بھی قائم ہوگیا تھا جس میں دوسو طلبہ تھے، دارالمصنّفین ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈروں کا مرجع بن گیا تھا، اعظم گڑھ ضلع کی تنظیم کا سہرا مولانا مسعود علی صاحب مرحوم کے سر تھا، سید صاحب زیادہ تر صوبہ اور آل انڈیا کاموں میں حصہ لیتے تھے اور کانگریس اور خلافت کمیٹی کے اہم اجلاسوں میں عموماً شریک ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں جتنے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے سب دارالمصنّفین ہی میں ٹھہرتے تھے، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو سب کی میزبانی کا شرف دارالمصنّفین کو حاصل ہو چکا ہے، پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کا تو دارالمصنّفین مستقل مہمان خانہ تھا، جب یہ دونوں کانگریس کے کاموں کے سلسلہ میں یوپی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو دارالمصنّفین ہی کو مرکز بناتے تھے اور کئی کئی دن تک یہاں ٹھہرتے تھے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری: ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد گجرات میں ہوا تھا، سید صاحب نے اس میں شرکت کی اور اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دس ممبروں میں ایک میرا انتخاب ہوا، بڑے بڑے مدعیان سیاست اور ارباب عمائم اس عزت کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے، بالآخر بلا توقع یہ عزت میرے حصہ میں آئی، مگر بجا اعتراف ہے کہ اس سے مجھ کو ایک ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی...... صرف محمد علی صاحب کی وصیت اور حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا امتثال امر ہے، آپ سن کر خوش ہوں گے کہ گاندھی جی نے میرے متعلق بڑی اچھی رائے لوگوں سے ظاہر کی ہے، وہ بے چارہ

مولویوں سے بہت ڈر گیا ہے، گورکھ پور کے حادثہ[1] کا ان پر بڑا اثر پڑا ہے اور سول نا متابعت سے شاید وہ ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار ہو جائے، پرسوں خط آیا ہے، اب تک جواب نہیں دیا ہے۔''

کانگریس اور خلافت کے اجلاس میں شرکت: ۲۳ رنومبر ۱۹۲۲ء میں کلکتہ کے کانگریس اور خلافت کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کی، دسمبر کی شروع کی تاریخوں میں اعظم گڑھ میں ایک پولیٹکل کانفرنس ہوئی جس میں کانگریس کے بہت سے ممتاز لیڈروں نے شرکت کی۔

اس زمانہ میں سید صاحب خلافت کے تمام اہم جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور کئی کانفرنسوں کی صدارت کی مگر صرف ایسی صدارتوں کا پتہ چلتا ہے جس میں انہوں نے تحریری خطبے پڑھے اور وہ شائع ہوئے۔

بہار خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت: ۱۹۲۳ء میں بہار خلافت کانفرنس کی صدارت کی اور ایک اہم خطبہ دیا جو معارف میں ''ارض مقدس کی داستان'' کے عنوان سے چھپا ہے۔

تحریک ترک موالات کا خاتمہ اور ہندو مسلم اختلاف کا آغاز: ۱۹۲۲ء میں چوری چورا ضلع گورکھ پور میں سول نافرمانی کے سلسلہ میں پبلک اور پولیس میں تصادم ہو گیا، پبلک نے تھانہ جلا دیا اور کئی کانسٹیبل جان سے مارے گئے، اس واقعہ پر کانگریس نے جو عدم تشدد کی علم بردار تھی اور حکومت سے مسلح مقابلہ اس کے بس میں نہ تھا، تحریک ترک موالات ختم کر دی، اس کے خاتمہ کے بعد مختلف اسباب اور حالات کی بنا پر جس کی تفصیل بڑی طویل ہے ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلافات شروع ہو گیا، شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے اس میں آگ پر تیل کا کام کیا اور دونوں میں خوں ریز لڑائیاں شروع ہو گئیں جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا اور تحریک خلافت اور ترک موالات میں ہندو مسلم اتحاد کی جو فضا قائم کی تھی وہ ختم ہو گئی، کانگریس اور دوسری قومی جماعتوں نے اس فضا کو بدلنے اور دوبارہ

---

[1] چوری چورا کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی بڑی کوششیں کیں، اس سلسلہ میں کئی کانفرنسیں ہوئیں، ستمبر ۱۹۲۴ء کے آخر میں دلی میں ایک مجلس اتحاد منعقد ہوئی مگر کسی میں کامیابی نہیں ہوئی، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس اختلاف کے اسباب بہت گہرے تھے، ملک میں ایسی فرقہ پرور جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں جن کا اصل مقصد ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا تھا اور کانگریس کا اثر کم ہونے کے بعد ان جماعتوں کی قوت اور ان کا اثر بڑھتا جاتا تھا، جس کا انسداد محض کانفرنسوں اور جلسوں اور پلیٹ فارم کی تقریروں سے نہیں ہوسکتا تھا، اس کے لیے ذہنیتوں کے بدلنے کی ضرورت تھی، حضرت سید صاحب اس اختلاف کے اصلی اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اکتوبر ۱۹۲۴ء کے معارف میں تحریر فرماتے ہیں:

ہندو مسلم اختلاف کی تشخیص اور اس کا صحیح علاج: ستمبر کے آخیر ہفتہ میں دہلی میں جو مجلس اتحاد منعقد ہوئی، اس نے اپنے جانتے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو نزاعی امور پیدا ہیں، ان پر پوری طرح غور کیا اور ان کے متعلق فیصلے صادر کیے لیکن ہم نے جلسہ کے اندر اور باہر بھی جہاں تک غور کیا تمام رہنمایان ملک کے خیالات ان نزاعات کے صرف ظاہری اور سطحی اسباب پر مشتمل پائے، شاید اس لیے کہ زخم میں زیادہ گہرا نشتر نہ دیا جائے، جو تکلیف کا موجب ہو، صرف اوپر کی جلد کا صاف کر دینا کافی سمجھا گیا لیکن یہ نہیں خیال کیا گیا کہ اوپر سے زخم اگر اس طرح مندمل بھی ہو جائے گا تو ڈر ہے کہ اندر اندر موجودہ محدود زخم آئندہ تمام جسم کو اپنے زہر سے پر مواد نہ کر دے۔

ہمارے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نزاع اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک دونوں قومیں ۱۸۵۷ء کے خاتمہ پر اپنے فاتحانہ اور مفتوحانہ جذبات سزا اور انتقام کو ختم نہ کر دے اور تیسری قوم کی غلامی کے عہد سے اپنی تاریخ کا نیا دور نہ شروع کردے، جس میں گذشتہ آٹھ صدیوں کے تلخ واقعات کی یاد قطعاً موقوف کر دی جائے اور مستقبل کی اصلاح و درستی کی خاطر حال کو ماضی کی تکرار میں برباد نہ کیا جائے۔

ہر حکومت کی تاریخ اچھے اور برے، منصفانہ اور ظالمانہ دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں، اس کلیہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ بھی خالی نہیں، مگر ملک کی بھلائی اس میں نہیں ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کی مسلمانوں کی حکومت کی کچھ واقعی برائیاں اور کچھ گھڑ کر مفروضہ افسانے یک جا کیے جائیں اور وہ انجمنوں کے جلسوں میں، لڑکوں کے مدرسوں میں، مطالعہ کی کتابوں میں، اخبارات کے کالموں میں، روز بہ روز کی گفتگوؤں میں، کھیل اور تماشے کے ناٹکوں میں، اس طرح بار بار دہرائے جائیں کہ وہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جائیں اور دونوں قوموں کے درمیان ایک غیر مختتم تلخی اور ناگواری اور بدگمانی اور عداوت راسخ ہو جائے۔

واقعات کی حیثیت سے قطع نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندو اکابر نے اپنی قوم کو جنبش اور حرکت میں لانے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ قوم کی نفرت اور عداوت کے جذبات کو مشتعل کیا جائے، اس کے لیے مسلمانوں کو منتخب کیا، ان کا فاتحانہ جرم اقدام اس کے لیے بہترین مسالہ پیدا کر سکتا تھا، اس طرح مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مواد یک جا کیا گیا اور اس کو تمام ملک میں ہندوؤں کے درمیان پھیلایا گیا، مذہبی حیثیت سے سوامی دیانند نے اور سیاسی حیثیت سے تلک مہاراج نے مسلمانوں کے خلاف ایک جہادِ عظیم کا سامان فراہم کیا، تمام ملک میں دیانند جی کی ستیارتھ پرکاش کی تبلیغ کی گئی، جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر ممکن دلیل سے ہندو قوم کو آمادۂ جنگ کیا گیا ہے، بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قریہ تک میں آریہ سماج کا جال پھیلایا گیا، ان کے ہفتہ وار اور سالانہ جلسوں میں مقررین کا بہترین موضوع اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہنا، مسلمان سلاطین کے جھوٹے مظالم گنانا اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانا قرار دیا گیا، ان کے اخبارات، رسائل اور کتابوں میں باقاعدہ اسلام، بزرگان اسلام، انبیاء اسلام اور سلاطین اسلام کے سب و شتم کا سلسلہ قائم کیا گیا اور اس طرح ملک کے طول و عرض میں

مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع تنظیم کھڑی کی گئی۔

تلک مہاراج نے عام ہندوؤں اور خصوصاً مہاراشٹر کے بہادروں کے مردہ جذبات میں نئی امنگ پیدا کرنے کے لیے شیواجی اور عالم گیر کی مری ہوئی ہڈیوں کو اکھاڑنا شروع کیا، شیواجی کو قومی ہیرو بنایا گیا اور اس کے مقابل میں عالم گیر کو ہر ظلم اور برائی کا مصدر ٹھہرایا گیا، واقعات گھڑے گئے، تاریخیں بنائی گئیں، جعلی تحریریں بنانے کے کارخانے قائم کیے گئے، جھوٹے افسانے، ناٹک اور ناول لکھے گئے اور ان کے دارالاشاعت قائم ہوئے، تھیٹروں اور تماش گاہوں میں ان کی نقلیں دکھائی گئیں اور یہ سلسلہ مراٹھی سے شروع ہو کر گجراتی اور بنگالی تک میں پھیل گیا اور اس زہریلے لٹریچر نے تمام ہندو نوجوانوں کے دل ودماغ کو مسموم کر دیا اور اس طرح ملک میں اب تک یہ نظام عمل پوری قائم اور جاری ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑے ہندو اہل قلم نے قصداً ایسی کتابیں اور تحریریں لکھیں اور اب تک لکھ رہے ہیں اور اس کام میں انگریز اہل قلم نے ان کی پوری مدد بلکہ رہنمائی کی، جن میں مسلمانوں کے عہد حکومت کو ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی اور مسلمان سلاطین پر غلط الزامات قائم کیے اور ہندوؤں پر ان کے انگنت مظالم کو سلیقہ کے ساتھ اوراق میں ترتیب دے کر ان کو مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کے خیالات مسلمانوں کی طرف سے تاریخی طور سے ہمیشہ کے لیے برے کر دیے گئے۔

ہندوستان کی ان دو قوموں میں نفاق ڈالنے کی کوشش کا یہ نظام تیسری قوم کی طرف سے شروع کیا گیا، مگر بہت جلد دوسری قوم نے اس کو اپنا کام بنا لیا اور اس طرح اے بی سی ڈی کے آغاز سے آخیر تعلیم تک ایک ہندو نوجوان کو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے خلاف ایسی باقاعدہ تعلیم دی گئی ہے جس سے پاک وصاف رہ کر اگر اب بھی کچھ تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے خواہاں ہیں تو یہ صرف فطری صلاحیت کی پکار ہے، ورنہ

ماحول کا یہ اقتضا ہرگز نہیں۔

اب ہمارا سوال یہ ہے کہ ان حالات میں جب مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے آریہ سماج کا پورا اور کامل نظام قائم ہے، اس قسم کے لٹریچر کی کم از کم تیس چالیس برس سے عام اشاعت ہے، ناٹکوں اور افسانوں، سنجیدہ مضامین اور مستند مصنّفین کی کتابوں کے ذریعہ سے ان کی تبلیغ ہے کیا مسلمانوں کی طرف سے کیا ایسا نظام سلسلہ کتب، دارالاشاعت، مقررین کا گروہ، انجمنوں کی تنظیم، اہل قلم کی کوششیں، ناٹک اور افسانے، مدارس اور مکاتب کے نصاب تعلیم، کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کا مقصد مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرف سے نفرت اور عداوت کے جذبات کی باقاعدہ پرورش اور نشو ونما ہو، مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہے مدافعانہ ہے۔

فروری ۱۹۲۰ء میں جب وفد خلافت یورپ جارہا تھا تو اتفاق سے پہلے جنم کے مشہور آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے چھ سات برس کے بعد امریکہ سے ہندوستان آرہے تھے، مصوع کے افریقی بندرگاہ میں ہم دونوں کا اجتماع ہوا اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال یعنی ہندو مسلمانوں کے روز افزوں اتحاد کا ذکر آیا، میں نے کہا کہ اب ہندوستان میں آریہ سماجی تحریک کی گذشتہ روش (پالیسی) میں جدید انقلاب کی ضرورت ہے تاکہ ہندوؤں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور عداوت پھیلانے کی سرگرمیوں کی جگہ مصالحت اور اتحاد کی اشاعت ہوسکے، لالہ جی نے اس خیال کی تائید کی مگر آخر اکتوبر کی مجلس اتحاد میں جب مالویہ جی کے اشارہ سے لالہ جی نے اپنی مشہور ترمیم متعلق اعلان حقوق (یعنی ہر شخص کو مذہبی آزادی ہو، مسلمان جس جانور کو جہاں چاہیں ذبح کرسکیں وغیرہ) کو تعویق میں ڈالنے کی غرض سے پیش کی تو اس وقت ان کا وہ خیال جو مصوع میں ظاہر کیا گیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ سمندر پار سے ہندوستان نہ آسکا۔

اس تفصیل کے بعد اب یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ اگر ہم ہندو مسلمانوں کے نزاعات

کا واقعی خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور اس بدنصیب ملک میں خون کی ندیوں کے بدلہ جوئے محبت بہانا چاہتے ہیں تو اس کا اصلی علاج یہ ہے کہ آریہ سماجی روش میں تبدیلی کی جائے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو تبلیغ اور پروپگنڈہ پورے نظام کے ساتھ تقریروں، تحریروں، کتابوں رسالوں، اخباروں، تماشوں، ناٹکوں، افسانوں اور تاریخوں کے ذریعہ پھیلایا جارہا ہے، ان کو یک قلم بند کیا جائے، اسی کے ساتھ لازماً مسلمانوں کی مدافعانہ کوششیں بھی خود بہ خود بند ہو جائیں گی، آریہ سماجی مقررین اور محررین اپنے بیان اور گفتگو کا موضوع اپنے مذہب کی خوبیوں اور اچھائیوں کا اظہار قرار دیں، دوسرے مذاہب کو سب و شتم نہیں اور اسی طرح ہندو اور مسلمان اہل قلم تاریخ ہند کے اسلامی دور کے وہ واقعات تلاش اور یک جا کریں جن سے دونوں میں مصالحانہ روح کو ترقی ہو۔ (معارف اکتوبر ۱۹۲۴ء)

حجاز پر سلطان عبدالعزیز کا حملہ اور انقلاب: اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ترکی حکومت سے بغاوت اور اتحادیوں کی امداد کے صلہ میں جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد شریف حسین کو حجاز، ان کے بڑے لڑکے امیر فیصل کو عراق اور منجھلے لڑکے امیر عبداللہ کو شرق اردن کی حکومت ملی تھی، مگر شریف حسین کی غداری اور ملت فروشی سے ساری دنیائے اسلام ان سے متنفر اور بے زار تھی، خود اہل حجاز بھی دل سے ان کے خلاف تھے، صرف قوت کے زور سے دبے ہوئے تھے، ان حالات میں چند ہی سال میں حجاز میں انقلاب کے اسباب فراہم کر دیے، جنگ عظیم کے اثرات نے ہر ملک کی اقتصادی حالت بگاڑ دی تھی، حجاز پر اس کا بہت زیادہ اثر تھا، بلکہ حکومت جو لاکھوں پونڈ سالانہ حرمین پر صرف کرتی تھی، ختم ہو چکی تھی، دوران جنگ میں راستہ کی بدامنی اور جنگ کے خاتمہ کے بعد حکومت حجاز کی بدنظمی اور اس کے غیر معمولی ٹیکسوں سے حج کو اہل حجاز کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا، تقریباً بند ہو گیا تھا، جس سے حجاز کی مالی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی، حکومت بھی دیوالیہ ہو رہی تھی، شریف حسین نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جائز و ناجائز ہر طریقہ سے روپیہ حاصل کرنا شروع کر دیا،

اس سے ان کے خلاف اور بھی برہمی پیدا ہوگئی۔

نجد کے حکم راں خاندان آلِ سعود اور اشراف مکہ میں پرانی عداوت چلی آ رہی تھی، شریف حسین کی ملت فروشی نے اس کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا، اس کے فرماں روا سلطان عبد العزیز آلِ سعود نے شریف حسین کے مخالف حالات سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۲۴ء میں حجاز پر حملہ کر دیا، سلطان کی فوجی طاقت مضبوط تھی، اہل حجاز شریف حسین کے مظالم سے نالاں تھے، سلطان کے تعلقات انگریزوں سے بھی اچھے تھے اور اب ان کو شریف حسین کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے انھوں نے شریف کی کوئی خاص مدد نہ کی اور سلطان عبد العزیز نے طائف اور مکہ پر قبضہ کر لیا، شریف حسین نے بھاگ کر جدہ میں پناہ لی اور اپنے لڑکے شریف علی کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گئے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں بے چینی: ترکی حکومت کے خاتمہ اور اس کے نتائج سے دنیائے اسلام کے مسلمان پہلے ہی سے مضطرب تھے، حجاز پر سلطان کے قبضہ کے بعد خبر مشہور ہوگئی کہ نجدی فوجوں نے طائف میں قتل عام کیا، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا روضہ مسمار کر دیا، مکہ پر بھی مظالم کیے ہیں اور یہاں کے مشاہد کو ان کے ہاتھوں نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے، نجدیوں کے بدعقائد سے عام مسلمان پہلے سے بدگمان تھے، اس لیے اس خبر سے اور تشویش بڑھ گئی اور جمعیۃ الخلافۃ نے حرمین کے تحفظ، ان کے احترام اور قیام امن کے لیے سلطان عبد العزیز، شریف علی جمعیۃ الاقوام برطانیہ اور دوسری طاقتوں کو تار دیے۔

شریف علی نے جواب دیا کہ وہ خود حجاز میں امن و امان چاہتے ہیں اور محض حرم کو خوں ریزی سے بچانے کے لیے وہ مکہ سے جدہ چلے آئے ہیں اور یہ خواہش کی کہ کوئی شخص درمیان میں پڑ کر دونوں میں صلح کرا دے لیکن سلطان عبد العزیز کا مقصد شریف حسین اور ان کی ذریت سے حجاز کو پاک کرنا تھا، انھوں نے جواب دیا کہ:

''میرا مقصد مکہ معظمہ پر قبضہ نہیں بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور ناقابل برداشت

ٹیکسوں سے نجات دلانا اور مہبط وحی والہام میں شریعت کا احیا اور احکام الٰہی کا نفاذ ہے اور مکہ میں شریعت کے علاوہ کسی بادشاہ کی حکومت نہ ہوگی، سب کو شریعت کی پابندی کرنا ہوگی، مکہ معظمہ سے جملہ مسلمانان عالم کا تعلق ہے، اس لیے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے مطابق طے ہوگی، ہم ان سب کی نمائندہ کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد کریں گے اور ہر اس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی جس سے بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریکوں سے محفوظ ہو جائے اور حجاج کو حرمین کے سفر میں امن وعافیت نصیب ہو، حجاز ہر مسلمان اور ہر نیک بندے کے لیے کھلا رہے گا اور ہم اپنے امکان بھر اس کے راستوں کی حفاظت کریں گے، اس کا بھی انہوں نے یقین دلایا کہ حجاز کے مقابر اور آثار ومشاہد کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے گا۔"

وفد حجاز کی قیادت: خلافت کمیٹی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حجاز میں دنیائے اسلام کے مشورے سے جمہوری اور شرعی حکومت قائم ہو، جس سے شریف حسین اور ان کے خاندان کا کوئی تعلق نہ ہو اور اس مقصد کے لیے جلد سے جلد مکہ میں اسلامی دنیا کی نمائندہ کانفرنس منعقد کی جائے، چنانچہ ان مسائل پر گفتگو اور حجاز کے حالات کی تحقیقات کے لیے اس نے ۱۹۲۴ء میں ایک وفد سید صاحب کی قیادت میں حجاز بھیجا، اس کے ارکان مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی اور مولانا عبدالقادر صاحب قصوری تھے۔

شریف علی جدہ ہی میں تھے، اس لیے پہلے ان سے گفتگو ہوئی، سید صاحب نے ان کے سامنے جمعیۃ خلافت کی تجویزیں پیش کیں اور مختلف ملاقاتوں میں ان سے اور ان کے وزرا سے گفتگو ہوتی رہی مگر شریف علی ان تجویزوں کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے، ان کا عذر یہ تھا کہ حجاز میں جمہوری حکومت ناممکن العمل ہے اور اسلامی ملکوں کے نمائندوں کی کانفرنس بے سود بھی ہے اور ناممکن العمل بھی، البتہ وہ ایسی دستوری حکومت کی تجویز کو مان سکتے ہیں جس کے بادشاہ وہ خود ہوں، جو حجاز کے حالات کے لیے ضروری ہے اور مذہبی معاملات کی حد تک وہ اسلامی ملکوں کے نمائندوں کو مشورے میں شریک کر سکتے ہیں، اس

کے علاوہ اور کوئی شکل ان کے لیے قابل قبول نہیں، یہ شرط ایسی تھی کہ اس کو خلافت کمیٹی اور سلطان عبدالعزیز دونوں میں سے ایک بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا، شریف علی سے گفتگو کے بعد وفد نے سلطان سے گفتگو کرنے کے لیے مکہ جانے کا ارادہ کیا مگر شریف علی نے اس کی اجازت نہیں دی اور کہا کہ پہلے جمعیۃ الخلافہ اور سلطان عبدالعزیز دونوں اس کو بادشاہ مان لیں اس وقت اس کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وفد مکہ جا کر صلح کی گفتگو کرے، سید صاحب نے رئیس الوزرا کو خط لکھا، جس میں اس مطالبہ کی دشواریوں کو سمجھایا اور یہ بھی لکھا کہ ان مشکلات کا حل سلطان سے گفتگو کے بعد ہی نکل سکتا ہے لیکن امیر علی اپنے مطالبہ پر اڑے رہے، اس لیے وفد کی ساری جدوجہد بے کار گئی اور وہ دو مہینہ قیام کے بعد ہندوستان واپس آ گیا۔

سید صاحب اہل مصر سے حجاز کے معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے مصر چلے گئے اور شیخ الازہر اور مصر کے دوسرے ارکان و عمائد سے مل کر ان کو اپنا ہم خیال بنایا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر میں بھی ان کا بڑا کارنامہ سمجھا گیا اور مصر کے اخبارات نے جلی سرخیوں سے اس خبر کو شائع کیا۔

حجاز کے حالات پر تاثرات: ہندوستان کے مسلمان تو حجاز کے مستقبل کے لیے بے قرار تھے اور ان میں حجاز کے مسئلہ پر خانہ جنگی برپا تھی لیکن خود اہل حجاز کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے معاملات میں کسی بیرونی کی مداخلت کو پسند نہ کرتے تھے، حضرت سید صاحب مارچ ۱۹۲۴ء کے معارف میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''گذشتہ ملکی تحریک سرد پڑ جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں پھر فرقہ آرائیوں اور ہنگامہ زائیوں کی گرم بازاری ہے، خصوصاً مسلمانوں کے لیے تو گویا نجد و ہندوستان کی جنگ خود ہندوستان میں ہو رہی ہے، وہاں اگر تیغ و تفنگ کی لڑائی ہے تو یہاں حلف و زبان اور دست و قلم کی معرکہ آرائیاں ہیں، وہاں اگر یہ مسئلہ سیاسی اور وطنی حیثیت رکھتا ہے تو یہاں دین و مذہب کی مگر

اے کاش ہماری قوم کو یہ معلوم ہو سکتا کہ ہم جن کی تائید میں مذہبی دلیلوں اور حجتوں سے جو جذبات ابھار رہے ہیں ان کی نگاہ میں ان کی کیا وقعت ہے، حکومت حجاز کی دلیل اگر مذہب کے ستون پر قائم ہوتی تو کون مسلمان ان کی اس دلیل کو نہ تسلیم کرتا مگر ہندوستان میں اس کے ہمدرد جانتے ہیں کہ ہم عجمیوں کے مقابلہ میں ان کا دعویٰ کیا ہے، حجاز حجازیوں کا ہے اور غیر حجازیوں کو اس میں دخل دینے کی حاجت نہیں، بریدالحجاز جو حکومت حجاز کا آرگن ہے اس کا سرنامہ حب الوطن من الایمان ہے، اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ان کے ہندوستانی ہمدرد بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں۔

پھر اس جذبہ پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں:

''اللہ اکبر! وہ دین جو دنیا میں قومی عصبیتوں، نسلی امتیازوں اور ملکی تفرقوں کو مٹانے آیا تھا اب کے اس کے پیرو خود ان عصبیتوں، امتیازوں اور تفریقوں کو ذریعہ نجات اور طریقہ حیات جانتے ہیں اور ہماری شامت اعمال اب اس حد کو پہنچی ہے کہ قلب اسلام (حجاز) تک یہ عقیدہ سرایت کر گیا ہے اور اس پر فخر ہے، لوگ چاہتے ہیں کہ سرزمین عرب کو یورپ کی غلامی سے آزاد کیا جائے لیکن ہم یہ خیال لے کر لوٹے ہیں کے اس کو یورپ کی دماغی اور ذہنی غلامی سے آزاد کرانا ہمارا فرض ہے، طوطوں کی طرح بعض وزرائے حجاز کی زبانوں سے یورپ کی ان پڑھائے سبقوں کو سننا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس درجہ سوہان روح کا باعث ہوتا تھا، ترکوں کی وطن پرستی کا افسانہ تو پرانا ہو چکا لیکن خبر لیجیے کہ اگر یہ بدمذہبی ہے تو اس بدمذہبی کی بلا کہاں پہنچ چکی ہے:

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب   خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

وہ سرزمین حجاز جہاں کا ذرہ ذرہ کبھی علم کا آفتاب تھا، جہاں دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے تشنگان علم کھنچے چلے آتے تھے، جہاں کی مسجد حرم اور مسجد صلی اللہ علیہ وسلم کے در و دیوار سے کبھی قال اللہ وقال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز آتی تھی، آج درس کی وہ مسندیں خالی پڑی ہیں، وہ پاک چشمے خشک پڑے ہیں، فتن و حوادث کے بادصرصر نے ان مرغان حرم کے آشیانے بکھیر دیے، رسول عربیؐ کے شہر (مدینہ) کی آبادی سو ہزار سے گھٹ کر دس ہزار رہ گئی،

مسلمانانِ ہند سوچیں کہ جنگ عظیم کے کن اثرات نے ان کے گھروں کو ویران کیا ہے

امنے نماند خلوتیان حجاز را دیدی تطاولِ خمِ زلف دراز را

اگست ۱۹۲۵ء میں رپوٹر کی خبر سے معلوم ہوا کہ نجدیوں نے مدینہ طیبہ پر حملہ کردیا اور گولہ باری سے اہل مدینہ کو بڑا نقصان پہنچا، حضرت حمزہؓ کی مسجد شہید کردی گئی، نجدیوں کے عقیدے سے ہندوستان کے مسلمان پہلے سے بدگمان تھے، اس لیے اس خبر سے ان میں بڑا اضطراب پیدا ہوگیا، خلافت کمیٹی نے حالات معلوم کرنے کے لیے سلطان ابن سعود کو تار دیا، انہوں نے یقین دلایا کہ مقابر اور آثار و مشاہد کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے گا، ان کا مقصد حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ حرم کی تطہیر اور حجاز کے باشندوں کو شریف حسین کے مظالم سے نجات دلانا ہے، حجاز پر قبضہ کے بعد دنیائے اسلام کے مشورہ سے وہ حکومت کا نظام بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے دعوت نامہ بھی جاری کردیا، اس لیے جمعیۃ خلافت نے پھر ایک وفد سید صاحب کی قیادت میں مرتب کیا، اس کے ارکان مولانا محمد علی، مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، سید خورشید حسین، مولانا عبد الماجد بدایونی اور شعیب قریشی تھے، مگر کچھ ایسی صورت پیش آگئی کہ سید صاحب اور دو ارکان مولانا عبد الماجد صاحب بدایونی اور سید خورشید حسین نہ جاسکے، باقی ارکان وفد نے مکہ جاکر سلطان سے گفتگو کی اور حجاز کے حالات اور وہاں کے مقابر و مشاہد کی تحقیقات کی، مگر مولانا ظفر علی خاں نجدیوں کے ہم نوا ہوگئے جس سے ارکان وفد میں اختلاف پیدا ہوگیا، یہ وفد ابھی حجاز ہی میں تھا کہ سلطان عبد العزیز نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

حجاز کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب: ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی اکثریت پہلے سے نجدیوں کے عقائد کے خلاف تھی، اس لیے روضہ نبویؐ پر گولہ باری اور دوسرے آثار و مشاہد کے انہدام کی خبر نے ہندوستان میں آگ لگادی اور سلطان

عبدالعزیز کی مخالفت اتنی بڑھی کہ ایک جماعت ان کے مقابلہ میں شریف حسین جیسے ملت فروش کی حامی بن گئی، بریلوی، رضا خانی اور خانقاہوں کے سجادہ نشین اس میں پیش پیش تھے، مگر ان کی مخالفت زیادہ مؤثر نہ ہوتی مگر صورت یہ پیش آئی کہ حرمین کے مقابر اور آثار و مشاہد کے انہدام کی مبالغہ آمیز خبروں نے بہت سے سنجیدہ اور متوازن خیالات کے لوگوں کو بھی سلطان کا مخالف بنا دیا، ان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسی مقتدر شخصیت بھی تھی جن کی قومی اور ملی خدمات مسلم تھے، فرنگی محلی کا حلقہ اثر بڑا وسیع تھا، اس لیے سلطان کے مخالفین کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور اختلاف نے بڑھ کر جنگ کی صورت اختیار کر لی اور اس کے دو محاذ بن گئے، ایک کے لیڈر مولانا عبدالباری مرحوم تھے، دوسرے کے مولانا محمد علی، دونوں کا مرکز لکھنؤ تھا۔

مولانا محمد علی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شریف حسین اور اس کی ذریت سے جو نقصان پہنچ چکا ہے، حرمین کی جو بے حرمتی اور مسلمانوں کی جو رسوائی ہو چکی ہے اس کی تلافی اور آئندہ جو خطرات درپیش ہیں ان کا انسداد سلطان ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، حرمین کے آثار و مشاہد کو جو نقصان پہنچ چکا ہے، اس کی تلافی اور تعمیر و تجدید کے لیے وہ تیار ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے گا اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ حجاز پر قبضہ کے بعد وہاں دنیائے اسلام کے مشورے سے جمہوری حکومت قائم کی جائے گی، اس لیے ان کو ان وعدوں کے ایفا کا موقع دینا چاہیے۔

لیکن جو لوگ نجدیوں کے خلاف تھے، ان کو سلطان کے وعدوں پر کوئی اعتبار نہ تھا اور کسی حالت میں ان کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مولانا محمد علی کی پوزیشن اس اختلاف میں بڑی نازک تھی، ان کو تنہا عام مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اپنے مرشد مولانا عبدالباری کا مقابلہ بھی کرنا تھا، انہوں نے اس کو بچانے کی کوشش کی مگر درانداز وں نے اس میں کامیابی نہ ہونے دی اور مولانا محمد علی اپنے پیر و مرشد کی مخالفت پر بھی مجبور ہو گئے اور

لکھنؤ دونوں جماعتوں کا اکھاڑا بن گیا، اس سلسلہ میں بڑے ہنگامے پیش آئے لیکن ان کو ہمارے موضوع سے تعلق نہیں ہے، اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

کانگریس اور خلافت کے اجلاس کان پور میں شرکت: دسمبر ۱۹۲۵ء کا آخری ہفتہ سیاسی اور قومی اجتماعات کے لحاظ سے بڑا ہنگامہ خیز تھا، اس ہفتہ میں کان پور میں کانگریس اور خلافت کے اجلاس ہوئے، سید صاحب ان دونوں میں شریک ہوئے، جنوری ۱۹۲۶ء کے معارف میں ان جلسوں پر بڑا مبصرانہ تبصرہ ہے:

''سال کے اختتامی ہفتہ میں کان پور اور علی گڑھ کے ہنگامے یادگار رہیں گے، کانگریس میں پانچ چھ برسوں میں جو انقلاب پیدا ہوگیا ہے وہ مخفی نہیں کانگریس اب خوش نما لباسوں، گداگرانہ تجویزوں اور فصاحت و بلاغت کی نمائشوں سے خالی ہوگئی ہے اور اب وہ صرف کام کرنے والوں کی جماعت بن گئی ہے، اس کا تخاطب اب حکومت سے نہیں ملک سے ہے، اب اس کا آزادی کا مطالبہ گورنمنٹ سے نہیں بلکہ خود قوم سے ہے، مسلمانوں کی شرکت نے اس کی ہمتوں کو بڑھادیا ہے۔

ہم سال بھر تک ہندو مسلم بگاڑ کے افسانے بہت سنتے رہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی ایک تعداد مسلمانوں ہی سے لڑنا ہندوستان کی آزادی سمجھتی ہے اور اس کا اکھاڑا ہندو مہا سبھا ہے لیکن کان پور کی کانگریس نے یہ بات ثابت کردی کہ ابھی تک سمجھ دار ہندو مسلمانوں کی تعداد ملک میں کافی موجود ہے، مالوی جی اور پنڈت نہرو کی تجویز و ترمیم بظاہر ایک خاص تحریک سے متعلق تھی مگر درحقیقت وہ محض تجویز و ترمیم کی جنگ نہ تھی، بلکہ دو مقابل کے نظام کار اور طرز عمل کی لڑائی تھی، جس میں مالوی جی کو شکست فاش ہوئی۔

امسال کانگریس کے متعلق یہ شکایت بجا ہے کہ اس کے اعلانات سائن بورڈوں اور کتبوں میں اردو کو جگہ نہیں دی گئی تھی، جس کی وجہ سے ہندی نہ جاننے والوں کو دقتیں پیش آتی رہیں، تاہم اس کی داد دینی چاہیے کہ صدر استقبالیہ نے اپنا پورا خطبہ صاف ستھری اردو میں پڑھا، کانگریس کی صدر محترمہ نے بھی اپنی آدھی تقریر اردو میں کی اور آدھی انگریزی میں اور اپنی لکھی ہوئی تقریر

اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں چھپوا کر تقسیم کی، پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر اکابر نے اردو ہی میں تقریریں کیں۔

خلافت کا اجلاس کان پور گو تزک و احتشام سے خالی تھا، مگر تین چیزیں بالکل صاف اور کھلی ہوئی تھیں، یہاں اعزاز و احترام کا مدار جیب کی گرانی اور دنیاوی اعزاز پر نہ تھا، کام پر تھا، تمام مہمانوں میں سلوک اور برتاؤ کی یکسانی اور مساوات کارفرما تھی، دوسری چیز یہ تھی کہ وہ محض خوش پوش بات بنانے والوں کا مجموعہ نہ تھا بلکہ صرف کام کرنے والوں اور کام چاہنے والوں کا مجمع تھا، تیسری چیز یہ تھی کہ اس کے احاطہ میں مذہب صرف نمائش کے لیے نہیں بلکہ دل اور عمل کے لیے تھا۔

مجلس خلافت کے متعلق ایک بات صاف صاف کہنی چاہیے کہ اس مجلس کی اصل بنیاد گو خلافت کے قیام اور حجاز کی حقیقی آزادی پر رکھی گئی تھی تاہم اس نے کچھ ملکی کام بھی ہاتھ میں لے لیے تھے، خارجی معاملات میں عملی کام بجز تہنیت، اظہار افسوس، وفد بھیجنے، مشورہ دینے اور روپیہ جمع کرنے کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں، حالات بدلتے جا رہے ہیں، اسی نسبت سے ہم کو اپنے رویہ میں تبدیلی کرنی چاہیے، نئے انقلاب کی سب سے بڑی یادگار ہمارے پاس جامعہ ملیہ ہے، مجلس خلافت کو اب اس کام کو اپنا کام سمجھنا چاہیے اور اسی اصل کے ماتحت اس کو اپنی تمام تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کرنا چاہیے۔

امسال اجلاس خلافت میں سب نے اس کو محسوس کیا کہ کوئی بڑا کام استقلال اور مضبوطی سے مسلمانوں سے اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک ان میں دماغی انقلاب و اصلاح نہ پیدا ہو اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک میں مکتب، دارالمطالعہ اور مدارس شبینہ کا جال بچھا دیا جائے، اس کے متعلق امسال ایک برمحل تجویز منظور کی گئی ہے اور گویا یہی تجویز امسال کے اجلاس کا حاصل ہے اور یہی اصل کار ہے۔

جمعیۃ العلما کے اجلاس کلکتہ کی صدارت: مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلما کا سالانہ اجلاس سید صاحب کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا، اس میں انہوں نے ایک مبسوط خطبہ

صدارت پڑھا، جس میں مسلمانوں کے جملہ حاضر الوقت مسائل پر مبصرانہ نگاہ ڈالی، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل وضروریات سے متعلق جو حصہ ہے، وہ خاص طور سے بہت اہم ہے، اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''حضرات! دوسری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کریں، ہمارے خیالات واعمال میں جو ایک طوائف الملوکی پیدا ہے وہ دور ہو، حالت یہ ہے کہ ہم کو مذہبی، تعلیمی، سیاسی، اقتصادی، اصلاحی، تبلیغی، ہر قسم کی ضرورتیں ہیں اور ان ضرورتوں کے لیے ہم نے الگ الگ انجمنیں قائم کرلی ہیں، جن میں روزانہ تصادم رہتا ہے اور ہر ایک کی سرمایہ سے نالاں ہے اور ہر ایک اپنی مرکزیت کے لیے کوشاں ہے، ہم کو معلوم ہے کہ اونچے طبقہ کے لوگ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کی جماعت اس پس روی کے ننگ کو گوارا نہ کرے گی لیکن بہر حال ملت کی کثیر تعداد جو عام طبقوں پر مشتمل ہے، ضرور اس میں شرکت پر آمادہ ہوگی، ہم کو ضرورت ہے کہ ہم پھر اپنی ملت وقومیت اور تنظیم کی بنیاد اپنی سیزدہ صد سالہ بنیاد پر قائم کریں اور اصلی جماعت اسلامیہ بنیں، تاکہ دشمنوں کے مقابلہ میں قوت کا ثبوت دے سکیں۔

ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ آئندہ ہندوستان کی جو شکل وصورت بھی ہو،، بہر حال یہاں کی حکومت اسلامی نہ ہوگی، بہتر سے بہتر جو صورت خیال میں آسکتی ہے وہ ایک متحدہ جمہوریت کی ہے، اس لیے ہر حال میں مسلمانوں کے لیے ضرور ہوگا کہ وہ اپنی قومی ومذہبی ضروریات کے لیے اپنے آپ کفیل ہوں اور یہی ضرورت بعینہ اس وقت بھی ہے، مسلمانوں کی اسلامی ومذہبی تعلیم، ان کے مدرسے، ان کی مسجدیں، ان کے اوقاف، ان کے نکاح و طلاق ووراثت وغیرہ کے قوانین ومسائل خاص محکموں کے محتاج ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے، اس وقت ہم جس بے نظامی اور بے ترتیبی کی زندگی بسر کررہے ہیں وہ حد درجہ قابل افسوس ہے، نظر اٹھایئے ہم سے کہیں کم تعداد میں مسلمان فلپائن، آسٹریلیا، ہنگری، بلغاریا، زیکوسلیویا اور یونان میں ہیں، تاہم ان کے تمام مذہبی وقومی صیغے مفتی اعظم کے ماتحت منظم اور باقاعدہ ہیں، ابھی اسی ستمبر کے

آخیر ہفتہ میں ریوٹر نے ہم کو مطلع کیا ہے کہ پولینڈ کے تمام مسلمانوں نے جمع ہو کر ۵۳ ؍ارکان کی ایک مجلس ترتیب دی ہے اور اس میں چند کارکن منتخب ہوئے ہیں، ایک صدر کا انتخاب کیا ہے تا کہ وہ اس وحدت تنظیمی کے سایہ میں اپنی اسلامی زندگی کو قائم رکھ سکیں، مگر افسوس ہے اس سات کروڑ مسلمانوں کی آبادی پر کہ وہ اب تک وحدت مرکزی کے اصول سمجھنے سے قاصر ہے۔

ہندوستان میں اب اور اب سے زیادہ آئندہ مسلمانوں کو اپنی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک امارت شرعی کے ماتحت اپنے کو منظم کریں، تعلیم یافتہ اصحاب کو شبہ ہے کہ علما اس پردہ میں اپنی کھوئی ہوئی وجاہت کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے یہ صاف کر دینا چاہیے کہ اگر ترکی میں مصطفیٰ کمال، مصر میں سلطان فواد، عرب میں ابن سعود، ریف میں محمد بن عبد الکریم ریاست اسلامی کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور ہم لوگ اس کو قبول کرنے کو تیار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستان میں ایک غیر مسلح، اہل اور صاحب لیاقت قائد کے ہاتھ پر بیعت نہ کر سکیں، اس کے لیے باقاعدہ بوریا نشین عالم ہونے کی ضرورت نہیں، صرف اس کے دل کو اسلام سے آشنا ہونے کی حاجت ہے، اس کے لیے اپنے مذہب اور مذہبی احکام سے ایک حد تک واقف ہونے کی ضرورت ہے، اس قائد کے ماتحت ایک منتخب مجلس شوریٰ ہو، اس کے ماتحت تعلیم و تبلیغ، تالیف و اشاعت، سیاست، اصلاحات، غیر ملکی تعلقات، مالیات کے مختلف شعبے ہوں، ہر ایک شعبہ کا ایک ایک علاحدہ مدیر و ناظم ہو، تمامی محاصل و زکوٰۃ ایک جگہ جمع ہو کر ضروریات پر تقسیم ہوں اور اسی اصول پر صوبوں کی امارتیں ہوں اور ان کے ماتحت اضلاع کی وعلیٰ ہذا القیاس اسی کے ماتحت نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ کے محکمے ہوں، دارالافتا ہوں جہاں سے جدید ضروریات کے متعلق فتوے صادر ہوں اور سارے ملک ملک میں اس مسئلہ میں جو بے ترتیبی ہے وہ دور ہو۔

چند سال پہلے جب اس کے لیے موسم مناسب تھا، محض اس لیے بعض اکابر نے اس سے پہلوتہی کی کہ تمام مسلمان اس پر متفق نہیں ہو سکتے، اس لیے جب تک کوئی اتفاق عام نہ ہو جائے اس کو قائم نہ کیا جائے، میری رائے میں یہ حد درجہ غلطی ہے، یہ ناممکن ہے کہ کسی طاقت کے

بغیر تمام مسلمان از خود ایک مرکز پر متفق ہو جائیں، اس لیے اس خیال خام سے ہٹ کر ہم کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ صوبوں میں اس کے متعلق کوششیں کریں، جن صوبوں میں مسلمان بالکل صفر ہیں، جیسے مدراس، ممالک متوسط وغیرہ، وہاں اس کی سب سے پہلے ضرورت ہے اور جس قدر مسلمان بھی اس مسئلہ پر متفق ہو سکیں اور اس تحریک پر آمادہ ہو سکیں ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہیے، آئندہ اس سلسلہ کی خود وسعت ہوتی رہے گی، تا آنکہ کسی وقت تمام مسلمان اس حلقہ میں آ جائیں، اسلام کے عقیدہ میں نظم و جماعت کے بغیر ہم صحیح اسلامی زندگی پر یقیناً قائم نہیں ہیں کہ نصب الامامۃ واجب۔

جو لوگ اس حقیقت کی تسلیم سے اختلاف کرتے ہیں کیا وہ امامت کے اصولی مسئلہ پر اعتقاد نہیں رکھتے، کیا ان کے نزدیک مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی میں کسی امامت کی ضرورت نہیں، یہ کہنا کہ امامت کے لیے نفوذ و اقتدار ضروری چیز ہے صحیح ہے لیکن یہ کامل امامت کی شرط ہے، مسئلہ کی صورت تو یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی امر واجب کے ادا کرنے کی کما حقہ اور اس کو پورے شرائط کے ساتھ ادا کرنے پر قادر نہیں ہے تو آیا وہ واجب اس سے ساقط ہو جائے گا یا حسب استطاعت جہاں تک اس کی وسعت و قدرت میں ہو اس کو ادا کرنا ضرور ہے، نماز کے لیے قیام و قعود اور قرآن پڑھنا تو ضروری ہے لیکن اگر کوئی بیمار یا اپاہج یا گونگا اس پر قدرت نہ رکھے تو اس سے نماز ساقط ہو جائے گی یا واجب رہے گی اور اس کو ادا کرنا اس کی طاقت اور وسعت کے مطابق فرض ہوگا، لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

حضرات! سوال یہ ہے کہ آیا ہر ناحیہ بعیدہ کی امت پر اپنے اپنے ناحیہ میں نصب امامت واجب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس بنا پر کہ اس کے نفوذ و اقتدار وغیرہ کے شروط پورے نہیں ہو سکتے، وہ واجب اس سے ساقط ہو جائے گا یا جس طرح جس حد تک اور جس صورت تک ممکن ہوگا، اس کا ادا کرنا ضروری ہوگا، مسلمانوں کی تاریخ میں کیا ایسے واقعات نہیں کہ انہوں نے اپنی محکومی اور عدم استطاعت کی حالت میں بھی ایک نوع کی تنظیمی مرکزیت قائم رکھی، چھٹی صدی میں

جب کافر تاتاریوں نے ایران وخراسان وترکستان وعراق پر قبضہ کرلیا تو کیا علمائے وقت نے اس کے لیے مسلمان والی کے مطالبہ کا مسئلہ پیش نہیں کیا؟ جو آج ہماری کتب فتاویٰ کا ایک باب ہے، اس وقت بھی جب مسلمانوں کا اوج اقبال تھا، تجارتی ضرورتوں سے ان کو دوسری غیر اسلامی سلطنتوں میں آمد ورفت وسکونت اختیار کرنی پڑتی تھی لیکن ان کی اسلامی تنظیم وحدت کا سررشتہ یہاں بھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا، تیسری صدی ہجری میں مسلمان تاجروں کی نوآبادی چین کے شہر خانفو میں تھی مگر وہ کس طرح رہتے تھے اور ان کے احکام ومعاملات کس طرح فیصل پاتے تھے، سلیمان تاجر اپنی تیسری صدی ہجری کے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

ان بخا نفوو هو مجمع التجار رجلا مسلما يوليه صاحب الصين الحكم بين المسلمين الذين يقصدون الى تلك الناحيه يتوخى ملك الصين ذالك و اذا كان فى العيد صلى بالمسلمين و خطب و دعا لسلطان المسلمين و ان التجار العراقيين لا ينكرون من ولايته شيئا فى احكامه و عمله بالحق و بما فى كتاب الله عز وجل و احكام الا سلام (۱۴، مطبوعہ پیرس، ۱۸۱۱ء)	شہر خانفو (چین) میں جو (مسلمان) تاجروں کا مرکز ہے، ایک مسلمان ہے، جس کو شاہ چین ان مسلمانوں کے درمیان فصل احکام کے لیے مقرر کرتا ہے جو اس ملک میں جاتے ہیں، شاہ چین اس کو چاہتا ہے اور عید جب آتی ہے تو وہ مسلمانوں کی نماز کی امامت کرتا ہے اور خطبہ پڑھتا ہے اور بادشاہ اسلام کے لیے دعا کرتا ہے اور عراق تاجر اس کی ولایت کے احکام اور حق کے ساتھ اور کتاب الٰہی اور احکام اسلامیہ کے ساتھ اس کے جاری کردہ حکموں سے سرتابی نہیں کرتے۔

عراقیوں کی فارسی زبان میں اس مسلمان والی یا قاضی کا نام ہنرمند تھا جو عام استعمال میں ہنرمن بولا جاتا تھا، خود ہندوستان کے مختلف ساحلی شہروں میں جہاں جہاں مسلمان آبادیاں تھیں یہ ہنرمند غیر اسلامی سلطنتوں میں اسلامی تنظیم وقضا کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے جہاز راں بزرگ بن شہریار اپنے سفرنامہ عجائب الہند میں صیمور (مدراس کے قریب) میں عباس بن ماہان سیرانی ہنرمند کا تذکرہ کرتا ہے:

انـه كـان بـصـيـمـور رجـل من اهل سيراف يقال له العباس بن ماهان و كـان هنـر من الـمسلمين بصيمور ذووجـه البـلـد و الـمنضوى اليه من المسلمين (ص ۴۲، معارف اپریل)	صیمور میں سیراف کا ایک شخص تھا جس کو عباس بن ماہان کہتے تھے اور جو وہاں مسلمانوں کا ہنرمند تھا اور شہر کا ذی وجاہت اور وہاں کے پناہ گزیں مسلمانوں کا مرکز تھا۔

وہاں کا راجہ مسلمانوں کے متعلق اسی کے فتویٰ پر فیصلہ کرتا تھا، اسی مقام میں ۳۰۴ء میں مشہور سیاح مسعودی پہنچتا ہے، وہ کہتا ہے:

عـلـى الهـنـر مـيـنة يومئذ ابو سعيد معروف بن زكريا والهنر مند يرادبه رئيـس الـمسـلـميـن وذلك ان الملك يـمـلك عـلـى الـمسـلـميـن رجلا من رؤسـائهـم تـكون احكامهم مصروفة اليه۔	ہنرمندی کے منصب پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا تھا اور ہنرمند سے مراد رئیس المسلمین ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ راجہ مسلمانوں پر ان کے رئیسوں میں سے ایک کو افسر بنا دیتا ہے، مسلمانوں کے تمام مقدمات واحکام اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

حضرات یہ تو گذشتہ عہد کا بیان تھا، آج بھی مسیحی طاقتوں کے ماتحت جہاں مسلمان آباد ہیں، کسی نہ کسی حیثیت سے اس قسم کی تنظیم جاری ہے، ابھی تو نوپیدا ملک پولینڈ کے مسلمانوں کی مجلس کا ذکر کر چکا ہوں، بالشویک روس میں بھی مسلمان قازان کی مجلس دینیہ اسلامیہ کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں، خود ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں صدر جہاں کے نام سے اس قسم کا عہدہ قائم تھا، جس کے ماتحت تمام قضاۃ ومحتسب وائمہ ہوتے تھے، تاتاری کافروں کے استیلا کے زمانہ میں اس عہد کے علمانے اسی بنا پر ''مسلمان والی'' کے پہلو پر زور دیا، ممکن ہے کہ بعض اصحاب گذشتہ

مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ کہیں کہ اس کے لیے حکومت مستولیہ کی حمایت ومنظوری ضروری ہے، تاکہ یہ منصب صاحبِ نفوذ واقتدار ہو سکے، اگر اس قسم کے معترضین کی اصلی غرض یہی ہے تو ان کو اصل مسئلہ کے انکار کے بجائے صاف صاف اپنی اس نیت کا اظہار کر دینا چاہیے، ہمارے نزدیک تو مقصود مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا ہے اور وہ ان کے گلے میں ایک اور طوق کے اضافے سے ممکن نہیں، اس مسئلہ کے شرعی پہلو پر امارت شرعیہ بہار نے اس قدر مواد فراہم کر دیا ہے کہ شک کی مزید گنجائش نہیں۔

حضرات! اس قسم کے نظم ملت سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت ملی نمایاں ہو، ان کے تمام مذہبی وملی کام منتظم ہوں، ان کی ضرورتیں پوری ہوں، ان کے مصارف ومداخل ملی میں ایک نظم پیدا ہو اور اصلی جماعتی روح ان میں نمایاں ہو، دارالافتا، دارالقضا اور بیت المال کا قیام ہو، ان کے غریبوں اور محتاجوں کی باقاعدہ امداد ہو، ان کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح ہو، تبلیغ واشاعت کا سلسلہ قائم ہو، ان کے مکاتب ومدارس مالی نزاع سے نجات پائیں۔

اس نظم ملت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام اعلیٰ وادنیٰ طبقے نکاح وطلاق و وراثت کی سخت معاشرتی مشکلات میں ہیں، آج کل آپ میں سے جن اصحاب کے پاس ملک کے اطراف سے فتوے آتے ہوں گے وہ گواہی دیں گے کہ اعلیٰ طبقہ کی عورتیں خلع کے رواج پذیر نہ ہونے کے باعث کس قدر مصیبت میں ہوتی ہیں، ظالم شوہروں سے نجات پانے کے لیے انتہا یہ ہے کہ اعلیٰ خاندان کی عورتیں شومی قسمت سے تبدیل مذہب تک کی جرأت کر لیتی ہیں، نیچے طبقہ کی مسلمان عورتوں میں فوری وبدعی طلاق کی صورتیں مفقود الخبری، عدم ادائے نفقہ اور فسخ نکاح کی متعدد صورتیں پیش آتی ہیں، جن کے علاج سے ہم اس نظم وامارت کے بغیر قطعاً مجبور ہیں، کیا امت محمدیہ کی حالت علمائے کرام اور مسلمانوں کی توجہ کے لائق نہیں، اوقاف کی بے ترتیبی، مساجد کی کسم پرسی، اماموں کی جہالت اصلاح کی محتاج نہیں؟

مسلمانوں میں شادی بیاہ کے مراسم، مشرکانہ افعال اور سوئے اعتقاد کی ظاہری مثالیں ہم کو ادائے فرض کی دعوت نہیں دیتیں، مسلمانوں کی اقتصادی بربادی سب سے زیادہ توجہ کے لائق

ہے جس کا بڑا سبب علاوہ دیگر خلاف شرع اعمال کے یہ مراسم بھی ہیں، ہمارے صوبہ بہار میں آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ۱۴/۱۴ رز میں داریاں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں اور ان ہی فضول خرچیوں کی بدولت ۱۴/۱۴ ر دوسروں کے ہاتھ میں ہیں، دو آنے ان کے ہاتھ میں ہیں، اسی لیے ضرورت ہے کہ جدید اقتصادی و مالی مشکلات پر شرعی حیثیت سے علما غور کریں اور جدید اقتصادی و مالی صورتوں میں جس صورتوں میں صورت کا جو حل اور جواب ہو اس کی اشاعت کی جائے، سب سے زیادہ پرشور مسئلہ آج کل ہندوستان میں اخذ ربا کا ہے، غیر سرکاری بینکوں اور کواپریٹیو سوسائیٹیوں سے اخذ منافع کا ہے، نقدین کا کاروبار مسلمان نہیں کرتے، کیا اس کی طرف توجہ کی ضرورت نہیں، تجارتوں کی طرف مسلمان ملتفت نہیں، اسراف ان کا خاص امتیاز ہے، یہ تمام باتیں علما کے طے کرنے اور جمعیۃ العلما کے حل کرنے کی ہیں اور نظم ملت کے فرائض میں ہیں، مسلمان قوموں کے لیے یہ امر کس درجہ باعث شرم ہے کہ ان کی برادری میں بعض ایسی قومیں اور ایسے خاندان بھی ہیں جو وراثت کی نص صریح سے روگرداں ہو کر رواج کو اپنا قانون بنائیں اور اعلانیہ ایک عدالت میں مسلمان اپنی قومیت بتا کر پھر یہ کہیں کہ قرآن پاک ہمارا قانون نہیں، بلکہ خاندانی رواج ہمارا قانون ہے، پنجاب اور بمبئی کی بعض مسلمان قوموں میں ہندو قانون کی پیروی کس درجہ افسوس ناک ہے، لڑکیوں کو ان کے حق وراثت سے محروم رکھنا جاہلیت کا وہ طریق ہے جس کے مٹانے کے لیے سرکار عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، بمبئی کے کچھ میمنوں اور بعض دوسری قوموں میں افسوس ہے کہ اس جاہلیت کی رسم پر اب تک عمل درآمد ہے اور سب سے زیادہ یہ سن کر افسوس ہوا ہے کہ پورنیہ کے بعض بنے ہوئے مولویوں نے ایسے ظالموں کی حمایت میں کچھ مسئلے گھڑے ہیں، اناللہ۔

حضرات! ہندوستانی مسلمانوں کو دشمنوں کے معنوی حملوں سے بچانے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ناقص مسلمانوں کو کامل مسلمان بنایا جائے، شدھی کے روکنے کے لیے یہی تدبیر ہے کہ دیہاتوں اور دور دراز علاقوں اور خاص نو مسلم رقبوں میں بکثرت مذہبی مکاتب جاری کیے جائیں، غور فرمایئے کہ ایک مسلمان کو نا مسلمان بنانا یہی ہے کہ اس کو عملی اسلام سے آگاہ نہ کیا

جائے، اگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ مذہبی تعلیم سے سراسر نا آشنا ہے تو وہ بظاہر جو کچھ ہو عملاً گویا وہ مسلمان نہیں اور اس میں اور اس کے ہم سایہ ہندوؤں میں چنداں فرق نہ ہوگا، اس لیے کیا تعلیمی، کیا اصلاحی اور کیا تبلیغی ہر حیثیت سے دیہاتوں میں مسلمانوں کو مذہبی جہالت سے نکالنا سب بڑا فرض ہے۔

ایہا السادہ! اسی سلسلہ میں جمعہ کے خطبوں کی اصلاح بھی اشد ضروری ہے، اہل حدیث اصحاب اور بہت سے علما نے تو اردو زبان میں خطبے دینے کے جواز کو تسلیم کرلیا ہے، تاہم اب بھی بہت سے علما کو صرف اردو زبان میں خطبہ دینے میں تامل ہے، اگر اتنا بھی تسلیم کرلیا جائے کہ عربی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں دینا جائز ہے تو بہت کچھ اصلاح ہوسکتی ہے، کسی اختلافی مسئلہ کو چھیڑنے کا جرم عائد نہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غیر مجوزین کے پاس عمل سلف کے غیر عربی زبان میں خطبہ کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں عمل سلف کے استدلال کے متعلق عرض ہے کہ طریق سلف کے مطابق خطبہ میں حسب ذیل خصوصیتیں ہوتی تھیں، وہ عربی زبان میں ہوتا تھا، وہ زبانی پڑھا جاتا تھا، کسی کتاب میں دیکھ کر نہیں پڑھا جاتا تھا، اس کی صورت تلاوت اور قرأت کی نہ تھی، بلکہ مختصر زبانی تقریر کی ہوتی تھی، اس میں آیات واحادیث کے التزام کے ساتھ مسائل حاضرہ متجددہ پر مسلمانوں کو فہمائش ہوتی تھی، ایک ہی خطبہ کسی کا لکھا یا رٹا ہوا صدیوں تک نہیں پڑھا گیا، وہ سلاطین زمانہ کی مدح وستائش سے پاک ہوتا تھا، اس میں تغنی نہیں ہوتی تھی، وہ مقفی اور مسجع بے معنی عبارت نہیں ہوتی تھی، مگر ان تمام خصوصیتوں کو تو بلا نکیر ترک کردینا اور صرف عربی کی خصوصیت پر زور دینا قرین صواب نہیں، اگر عربی کی قید ہی ہے تو حصول فوائد کے علاوہ محض ایک ''بدعت'' کو قبول کر کے متعدد بدعات سے محفوظ ہوجائیں گے، جمعیۃ العلما کی تجویز میں یہ چیز بھی آنی چاہیے کہ وہ سال بہ سال اماموں کی ہدایت کے لیے مختلف خطبے جو ضروری اور پیش آمدہ ضروریات پر محتوی ہوں، شائع کرتی رہے، اسی طرح قرآن مجید جو تمام دنیا کے لیے آیا، ضرورت ہے کہ اس کے ترجمے تمام دنیا کی زبانوں میں ہوں، تاکہ قرآن بلسان قومہ ہوکر رب کی ہدایت کو ہر جگہ عام کردے، خدا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور ان کے خاندان پر رحمت بھیجے جنھوں نے فارسی واردو ترجمہ کر کے اس

مسئلہ کو علمائے خلف کے اختلاف آرا سے بچالیا، مصر وترکی میں اب تک قرآن پاک کے جواز ترجمہ اور عدم جواز میں معرکتہ الآرا بحثیں درپیش ہیں لیکن اے صاحبو! اسی کے ساتھ اس فتنہ کو بھی روکنا چاہیے جو آج کل ہندوستان میں عام ہو رہا ہے کہ ہر اہل و نااہل تجارتی اغراض سے ایک نئے ترجمہ کی بدعت میں گرفتار ہے، ان ترجموں میں باہم اس درجہ اختلاف ہے کہ خدانخواستہ اگر اصل (بحکم وانالہ لحافظون) محفوظ نہ ہوتو تحریف کے عملی گناہ سے مفر نہیں، یہاں تک کہ بعض جاہل وطامع تاجروں نے قرآن پاک کے منظوم ترجمہ کی بھی جرأت کی، مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی شرعی امارت و نظم و ملت نہ ہونے سے اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتے۔

اس کے ساتھ قرآن پاک کی طبع و اشاعت کی احتیاط کا بھی سوال ہے ہمارے نزدیک تو قرآن پاک کو غیر اسلامی مطابع میں چھپنے کے قانونی مسئلہ پر زور دینا چاہیے، اسی کے ساتھ مطابع اور اسلامی مطابع تک کی جن میں سب سے آگے لاہور کے مطابع ہیں، قرآن پاک کے اعراب و الفاظ وغیرہ کی تصحیح میں بے پروائی سخت افسوس ناک ہے، ہم نے چند قرآنوں کو ایک ساتھ ملا کر دیکھا تو ہر صفحہ میں غلطیاں نظر آئیں، پیشاور کے ایک بزرگ نے اس قسم کی غلطیوں کی مثالیں چھاپ کر شائع کی ہیں اور افسوس ہے کہ صاحب مطبع ہونے کی بنا پر اس گناہ میں ہم بھی کسی قدر شریک ہیں، مصر وترکی میں قرآن پاک کی تصحیح میں سرکاری طور سے اس قسم کی تصحیح اور صحیح قرآن چھاپنے کی کوشش کی جاتی ہے، ابھی حال میں اسی ترکی میں جس کو شاید بہت سے لوگ بے دین ترکی کہنے کو تیار ہو جائیں گے حکومت نے اپنی خاص نگرانی میں قرآن پاک کی اشاعت کی۔

حضرات! جب یہ سطریں زیر تحریر تھیں، مصر سے ایک نئی تالیف ''نقض کتاب الاسلام و اصول الحکم'' محمد خضر حسین سابق مدرس جامعہ زیتونیہ وہ قاضی محکمہ شرعیہ تیونس بھی موصول ہوئی جس میں مصنف نے قاضی عبدالرزاق مصری کی کتاب الاسلام و اصول الحکم کا جس کے فتنے کا ذکر پہلے آچکا ہے، نہایت شافی و کافی جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام اور سیاست کبھی مذہباً الگ نہیں ہو سکتے اور اسلامی قوانین کی بنیاد شریعت پر رکھی جا سکتی ہے، نہ کہ رومن لا اور قوانین یورپ پر

جزاہ اللہ خیر الجزا ضرورت ہے کہ ہماری جمعیۃ العلما بھی اس بارے میں مصر و تیونس کے علمائے حق کی تائید اور مخالفین سے اپنی برأت ظاہر کرے۔

آخر میں ایک چیز کی طرف مجھ کو مسلمانوں کو متوجہ کرنا ہے اور وہ دارالاسلام ہے، مدت سے یعنی ۱۹۰۸ء سے جب میں ندوۃ العلما کے صیغہ اشاعت اسلام کا نائب ناظم تھا، یہ خواہش میرے دل میں ہے کہ نومسلموں کے قیام و تعلیم و تربیت کے لیے کوئی خاص جگہ بنائی جائے، جس کا نام دارالاسلام ہے، جس طرح یتیم خانے آپ نے قائم کیے ہیں، نومسلم خانے بھی آپ قائم کیجیے، عہد حکومت مغلیہ میں داروغہ جدید الاسلام کے نام سے ایک عہدہ تھا، نومسلموں کی غور و پرداخت وغیرہ اس کا فرض تھا، اس کو بہت سی سرکار اعانتیں ملتی تھیں، آج کل جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں ان کی بہت بری حالت ہوتی ہے، اسلام کے بعد سب سے پہلی تعلیم جو ان کو دی جاتی ہے وہ گداگری کی ہے، کیا یہ اسلام کے شایان شان ہے؟ زکوٰۃ کے مصارف میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا ایک حصہ رکھا ہے اور اس مد سے باقاعدہ اس کے لیے مصارف ادا ہو سکتے ہیں، پھر بتدریج یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے مختلف...... اطراف میں اس قسم کے متعدد دارالاسلام قائم ہوں جہاں ایک سے دوسری جگہ کا نومسلم حسب حال منتقل ہو سکے اور وہاں وہ کچھ اسلامی تعلیم اور کوئی حرفت سیکھے یا مسلمان زمین داروں کے کاشت کاری کے کاموں پر لگائیں، غور کیجیے کہ اس وقت چھوٹی چھوٹی صنعت و حرفت کے تمام کام دیسی نوعیسائیوں کے ہاتھوں میں ہیں، علاقہ ترہت کے راج میں جس قدر دیسی عیسائی ہیں وہ بڑھئی اور لوہار کے کام سے بہ خوشی اپنی پرورش کر رہے ہیں، پونہ، لاہور، لکھنؤ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں جلد سازی، چھپائی اور اس اسٹیشنری کے متفرق کام ان کو سکھائے جاتے ہیں، کیا آپ ایسا نہیں کر سکتے؟

حضرات! ابھی تو کہنے کی بہت باتیں ہیں، خوش نما تجویزوں کا ایک انبار لگایا جا سکتا ہے لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ ہم میں کہنے کی جس قدر قوت ہے افسوس اس قدر کرنے کی نہیں تو وعید لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ سے ڈر معلوم ہوتا ہے:

فلو ان قومی انطقتنی رماحهم نطقت و لکن الرماح اجرت

اگر میری قوم کے نیزے مجھے نطق بخشتے تو میں بولتا لیکن انہوں نے میری زبان بند کردی ہے

ونسـال الله التوفيق لما يحب ويرضىٰ والعاقبة للمتقين ۔

(معارف، مارچ ۱۹۲۶ء)

مؤتمر اسلامی کا انعقاد اور دوسری مرتبہ وفد خلافت کی قیادت: اس دوران میں سلطان عبدالعزیز نے مدینہ طیبہ پر بھی قبضہ کرلیا اور ۱۹۲۵ء میں پورا حجاز ان کے قبضہ میں آگیا، حجاز پر قبضہ کے وہ تمام وعدے جو انہوں نے مسلمانوں سے کیے تھے، فراموش کردیے اور خواہ حالات کی مجبوری کی بنا پر یا[1] محض حکومت کی ہوس میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا، مولانا محمد علی مرحوم نے جس شدت سے سلطان کی حمایت کی تھی، بادشاہت کے اعلان کے بعد اسی شدت سے ان کی مخالفت کی، مگر سلطان جس مؤتمر کا دعوت نامہ جاری کر چکے تھے، اس کو تو منسوخ نہیں کیا لیکن اس کی نوعیت بدل دی، پہلا دعوت نامہ جمہوری حکومت کے قیام اور اس کے نظام پر صلاح و مشورے کے لیے تھا، دوسرا دعوت نامہ جو مارچ ۲۶ء جاری کیا وہ صرف خطرات سے حرمین کی حفاظت، اہل حرمین کی خدمت اور حجاج کے آرام و سہولت کے وسائل پر غور و فکر اور اس قسم کے دوسرے چھوٹے اصلاحی امور پر مشتمل تھا، نظام حکومت سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا، مؤتمر کی تاریخ جون ۱۹۲۶ء تھی، ہندوستان میں یہ دعوت نامہ تین جماعتوں کے نام آیا تھا، جمعیت خلافت، جمعیۃ العلما اور اہل حدیث کانفرنس، ان تینوں نے اپنے وفد بھیجے، جمعیۃ العلما کے رئیس وفد مولانا کفایت اللہ صاحب اور ارکان مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا عبدالحلیم صاحب تھے، جمعیۃ خلافت کے وفد کی قیادت اس مرتبہ بھی سید صاحب کے حصہ میں آئی، اس کے ارکان مولانا محمد علی، شوکت علی اور شعیب قریشی تھے، یہ دونوں جماعتیں حجاز کی حکومت کے آئندہ نظام کے بارے میں اپنے پرانے موقف پر تھیں، دوسرے ملکوں میں مصر، بیروت، شام، فلسطین، سوڈان، عسیر، نجد، یمن، روس، ترکی،

---

[1] اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔

افغانستان اور جاوا کے وفد تھے۔

جمعیۃ الخلافہ اور جمعیۃ العلما کے وفود مئی ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں جدہ پہنچے، یہاں پہنچنے کے ساتھ ان کو جنت البقیع اور مدینہ طیبہ کے دوسرے مزارات کے انہدام کی اطلاع ملی، دوسرے ہی دن دونوں وفد مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے، ۲۷ر کو سلطان عبد العزیز نے شرف باریابی بخشا، رسمی گفتگو کے بعد مولانا شوکت علی نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ حجاز کے معاملہ میں سب سے اہم یہ ہے کہ بیرونی قوموں کو اس میں مداخلت کا موقع نہ دیا جائے اور ان کے اثر ونفوذ سے ان کو محفوظ رکھا جائے، وہ پوری دنیائے اسلام کی دولت ہے تنہا کسی کی ملک نہیں، ممکن ہے اور چیزوں کا آپ ہم سے بہتر علم رکھتے ہوں لیکن غیر قوموں کو ہم آپ سے بہتر جانتے ہیں، ڈیڑھ سو برس سے ہم کو ان کا تجربہ ہے، سلطان نے جواب دیا کہ میں نے اپنی حکومت کے دو اصول مقرر کیے ہیں، جو کسی حال میں نہیں بدل سکتے، ایک یہ کہ ہمارا مرجع کتاب وسنت ہوگا، دوسرے یہ کہ ہماری حکومت اجنبی مداخلت کو کسی حالت میں گوارانہ کرے گی، مولانا محمد علی نے کہا کہ دو امور آپ کے ذہن نشین رہنا چاہئیں، ایک یہ کہ ہم مشرک نہیں ہیں اور کتاب وسنت پر ہمارا بھی ایمان ہے، دوسرے یہ کہ حجاز تمام مسلمانوں کا ہے، اس لیے ہم یہاں اجنبی نہیں ہیں اور حجاز کی خدمت کرنا ہمارا شعار ہوگا۔

سید صاحب نے کتاب وسنت کے مسئلہ پر مفصل روشنی ڈالی، انہوں نے فرمایا کہ دنیا کا کون ایسا مسلمان ہے جو کتاب وسنت سے اعراض کرتا ہو، جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے سب اسلامی فرقے ان کو یکساں قبول کرتے ہیں، بحث جو کچھ ہے وہ اس کے معنی میں ہے، ہر فرقہ اس کا مدعی ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہے، کیا کوئی ایسا فرقہ بھی ہے جو کہتا ہو کہ ہم کتاب وسنت سے روگرداں ہیں اور کسی حکم کو کتاب وسنت کے مطابق سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے ہوں، اختلاف جو کچھ ہے وہ ان کی تفسیر وتاویل احادیث کے ضعف وتوثیق یا دلائل کے قوت وضعف میں ہے اور یہ اختلاف نیا نہیں بلکہ ہمیشہ کا ہے، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ

ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو دلائل کے بجائے قوت سے اپنے مسائل تسلیم کرائے، خود اہل سنت میں مختلف فرقے ہیں اور ان میں آراء و مسائل کا اختلاف بھی ہے، اس لیے یہ موقع نہیں کہ ہم موجودہ کشمکش کے زمانہ میں ان مسائل کو چھیڑیں، اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ کفر کے مقابلہ میں تمام اسلامی فرقوں کو یک جا کریں نہ کہ آپس کے اختلاف کو اور زیادہ بڑھائیں۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رکن وفد جمعیۃ العلما نے فرمایا کہ تفسیر و تاویل کے اختلافات موجود ہیں اور ان کی مثالیں دے کر بتایا کہ کن امور میں شرک کا فتویٰ دینا چاہیے اور کن امور میں نہ دینا چاہیے، سلطان نے ان سب کے جواب میں کہا کہ بہتر ہوگا کہ ان معاملات میں آپ ہمارے علما سے گفتگو کر لیجیے، میں مفتی نہیں ہوں، بلکہ ہمارے علما قرآن و حدیث کے مطابق جو فتویٰ دیتے ہیں ان کو نافذ کر دیتا ہوں۔

۳۰ رمئی کو پھر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا کفایت اللہ، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی صاحب نے سلطان سے ملاقات کی اور پوری صفائی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کیے اور مجلس خلافت کی تجویزوں کو سلطان کے سامنے پیش کر کے ان کو ان کے وعدے یاد دلائے، مولانا شوکت علی نے اتحاد اسلامی اور حرم سے دنیائے اسلام کا تعلق بتا کر کہا کہ اس وقت مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے نہ کہ اختلاف پیدا کیا جائے، آپ نے مزارعات، قبوں اور مآثر کے انہدام کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے مسلمانوں میں نئے سرے سے عقائد کے اختلاف کی جنگ شروع ہو جائے گی، ہم نے بڑی مشکلوں سے اپنے ملک سے اس خانہ جنگی کا خاتمہ کیا ہے اور تمام مسلمانوں کو ملا کر ایک متحدہ صف قائم کی ہے، آپ کے طرز عمل سے ہماری قوت دوبارہ پراگندہ اور تمام دنیائے اسلام میں خانہ جنگی برپا ہو جائے گی، حجاز تمام مسلمانوں کا مشترکہ حرم ہے، کسی اسلامی فرقہ کو یہ حق نہیں کہ وہ صرف اپنے عقیدہ و خیال کے مطابق حرم کے آثار و مشاہد و مقابر میں ایسا تصرف کرے جو دوسرے فرقوں کے نزدیک صحیح نہیں ہے، ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ مذہب اسلام کے اہم

مسائل کا فیصلہ صرف نجد کے علما کے ہاتھوں میں دے دیا جائے، مدینہ منورہ کے مقابر و مشاہد کے متعلق ہم سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مؤتمر اسلامی کے فیصلہ کے بغیر ان کے بارے میں کوئی اقدام نہ کیا جائے گا لیکن اس کی خلاف ورزی کی گئی اور دنیائے اسلام کے جذبات کے خلاف اس کے استصواب کے بغیر ان کو منہدم کر دیا گیا۔

سلطان نے جواب دیا کہ آپ نے جو کچھ کہا صحیح ہے، میں دل سے یہی چاہتا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری قوم سے واقف نہیں ہیں، ان کے متعصب قبائل نے دھمکی دی کہ ہم نے اس لیے جہاد اور اپنا جان و مال اس لیے قربان کیا تھا کہ مراسم شرک کا استیصال اور قرآن و سنت کو قائم کیا جائے، اس لیے جلد سے جلد ان قبوں اور عمارتوں کو منہدم کر دیا جائے ورنہ ہم خود اس کو گرا دیں گے، اس دھمکی کے بعد ہمارے لیے دو ہی صورتیں تھیں، یا ان کو بزور اس سے روکتے یا گرانے کی اجازت دے دیتے، پہلی صورت میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا اور دوسری صورت میں فتنہ و فساد کا، جس سے اہل مدینہ کو بھی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا اور دوسری عمارتوں کو بھی صدمہ پہنچتا اور ان کا مطالبہ غیر شرعی بھی نہیں تھا، بلکہ خدا اور رسول کے حکم اور کتاب و سنت کے مطابق تھا، اس لیے میں نے قاضی القضاۃ سے خواہش کی کہ وہ خود مدینہ جا کر اس کام کو انجام دے دیں، جو چیز خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے اس میں اختلاف نہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد مولانا محمد علی نے سلطان کے سامنے دنیا کی حالت کا نقشہ پیش کیا، غیر مسلموں کی طاقت اور مسلمانوں کی کمزوری دکھائی اور جو اسلامی ملک آزاد ہو چکے ہیں ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کو ظاہر کر کے کہا کہ ان حالات میں ان کی نظریں سلطان پر پڑیں اور ان سے ان کو بڑی توقعات تھیں اور وہ سلطان کو ملک الحجاز کے منصب سے کہیں زیادہ جلیل القدر منصب پر دیکھنا چاہتے تھے، سلطان اس چھوٹے منصب پر کیوں راضی ہو گئے، انہوں نے اس کو کیوں اپنا مطمح نظر بنایا اور اردو کا یہ شعر:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو گوہر نہ ہوا تھا

پڑھ کر کہا کہ وہ قطرہ جو صدف میں جا کر موتی ہی بننے پر قانع ہے، پیرس کے رقاصہ کے گلے کی زینت بھی بن سکتا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں سلطان وہ قطرۂ آب ہوں جو ایک مسلمان کی آنکھ سے آنسو بن کر روضۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر گرایا جائے۔

اس کے بعد سید صاحب نے مقابر و آثار کے متعلق گفتگو کی اور فرمایا کہ مذہبی حیثیت سے مقابر و مآثر دونوں کی حیثیتیں الگ الگ ہیں، مقابر کی تعمیر و بنا کے متعلق احادیث وفقہ میں ممانعت کے تصریحی الفاظ ملتے ہیں، گو ایک فریق ان کی تاویل کرتا ہے اور ایسا نہیں سمجھتا تاہم اس کی ایک شرعی حیثیت ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ علمائے اسلام کے سامنے کھلے طریق سے اس مسئلہ کو پیش کر کے ان کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے، جو یقیناً کثرت تعداد کے لحاظ سے حق کے خلاف نہ ہوگا لیکن مآثر یعنی وہ مقامات مقدسہ جن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی خاص نسبت ہے ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و بنا کی ممانعت سے احادیث نبوی کا تمام دفتر خالی ہے، اس پر اگر بحث ہو سکتی ہے تو صرف ان کی صحت اسناد یا عدم صحت سے، البتہ ان مآثر میں اگر جاہل مسلمان ایسے اعمال کریں جو خلاف شرع ہوں تو دوسری چیزوں کی طرح یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہاں ایسے نگراں یا پولیس کے سپاہی مقرر کرے جو زائرین کو ان کے اعمال سے باز رکھیں، سلطان نے اس کے جواب میں کہا کہ میں مذہبی عالم نہیں ہوں، اس لیے اس کا جواب نہیں دے سکتا، آپ اس بارہ میں ہمارے علما سے گفتگو کیجیے اور اس کے لیے ایک مجلس العلما مقرر کر دی۔

مجلس العلما کا انعقاد: چنانچہ ۳۱ رمئی کو اس مجلس العلماء کا جلسہ ہوا جس میں ان سب اسلامی ملکوں کے علما شریک ہوئے، جو اس وقت مکہ میں موجود تھے، جلسہ کا آغاز سلطان کی تقریر سے ہوا، انہوں نے کتاب وسنت سے تمسک پر زور دیا اور کہا کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت نبوی پر مضبوطی سے قائم رہیں اور اپنے فرقہ وارانہ خیالات کو چھوڑ

دیں، اس کے بعد علامہ رشید رضا مصری نے تقریر کی جو تمام تر اہل نجد کی ثنا وصفت پر مشتمل تھی، اسی طریقہ سے مصر وشام اور سوڈان کے علما نے بھی سلطان کی قصیدہ خوانی کی، اس موقع پر جمعیۃ الخلافت ہی کے دور کے ارکان نے اعلان حق کی جرأت کی، مولانا محمد علی نے اٹھ کر کہا کہ ہم اسی کتاب وسنت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ملوکیت چھوڑ کر جمہوریت اختیار کیجیے اور قیصر وکسریٰ کی سنت کے بجائے صدیق وفاروق کی سنت کو تازہ کیجیے، وفد جمعیۃ العلما کے رکن مولانا عبدالحلیم نے اسلام کے دوسرے فرقوں کے ساتھ رواداری برتنے کی ضرورت ظاہر کی، مولانا کفایت اللہ صاحب نے اس کی تائید میں تقریر فرمائی، ان تقریروں نے سلطان اور قاضی القضاۃ ابن بلیہد کو بہت مشتعل کر دیا اور انہوں نے اس کا غضب آلود جواب دیا، یہ صورت دیکھ کر سید صاحب نے رواداری پر تقریر کی اور فرمایا کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ اہل نجد معمولی معمولی باتوں مثلاً حقہ اور سگریٹ پینے پر لوگوں کو مارتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر تشدد کرتے ہیں یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ بھی سنا گیا ہے کہ رمضان میں تین دن تک بیس رکعت تراویح پڑھی گئی اس کے بعد حکماً سب کو آٹھ رکعت پڑھنے پر مجبور کیا گیا، سلطان نے کہا یہ صحیح نہیں ہے، میں نے خود کئی دن تک بیس رکعت پڑھی ہے، مگر بعد میں مکہ کے دوکان دار میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم لوگ کاروباری آدمی ہیں، بیس رکعت پڑھنے میں وقت زیادہ لگتا ہے، اس لیے ہم کو آٹھ رکعت پڑھنے کی اجازت دیجیے، اس پر ہم نے عمل کیا، عبداللہ شبیلی اور سید حسین نائب حرم وغیرہ نے چند سرکاری ملکی اشخاص نے اس کی تصدیق کی، ان تقریروں کے بعد پہلا اجلاس ختم ہو گیا۔

دوسرا اجلاس یکم جون کو ہوا، سب سے پہلے سید صاحب نے مقابر اور مآثر کے مسئلہ پر ایک پرزور تقریر کی اور احادیث اور تاریخ وسیر کی کتابوں سے ان کا ثبوت دیا، آخر میں انہوں نے فرمایا کہ ہم مجلس خلافت کی جانب سے تین تجویزیں لے کر آئے ہیں، اول یہ کہ کتاب وسنت پر عمل کے ساتھ ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہیے جن میں خود صحابہؓ

اور تابعین مختلف الرائے تھے اور احادیث وعمل صحابہؓ سے اس کی مثالیں پیش کیں۔

دوسرے یہ کہ کتاب وسنت کے تمسک کے نتائج کا سب سے پہلا مظہر حکومت کو ہونا چاہیے یعنی طرز اول کے مطابق خلیفہ کا انتخاب شرعی طریقہ پر ہونا چاہیے جو وراثت سے پاک ہو۔

تیسری چیز مآثر ومقابر کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ مقابر اور مآثر دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں، مسئلہ مقابر میں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احادیث صحیحہ میں بناعلی القبور اور تجصیص قبور وغیرہ کی ممانعت آئی ہے، گو ایک مختصر فریق اس کے دوسرے معنی مراد لیتا ہے، اس لیے اگر سلطان اس مسئلہ میں دنیائے اسلام کے علماء کے فیصلہ کا انتظار کر لیتے تو یقیناً ان کو ناامیدی نہ ہوتی اور اس کی ذمہ داری تنہا ان کی ذات پر آنے کے بجائے تمام دنیائے اسلام پر بٹ جاتی، مآثر کا معاملہ اس سے الگ ہے، مآثر سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو انبیا یا صحابہ کی جانب کسی حیثیت سے نسبت ہے، قرآن وحدیث اور آثار سلف میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان مآثر پر عمارتیں بنانے سے روکتی ہو بلکہ قرآن پاک، احادیث، سیر اور آثار میں ایسے مآثر کا ذکر ہے، اس بنا پر ان مآثر کی عمارتوں کے انہدام کی شدت غلو کے سوا کوئی شرعی توجیہ نہیں ہوسکتی، ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہاں جاہل مسلمان بعض غیر شرعی اعمال کرتے ہیں، ایسے اعمال سے ان کو روک دینا چاہیے یا بعض عمارتیں جو غیر شرعی طور پر اور غیر مستند مقامات پر بنائی گئی ہیں ان کی تصحیح وترمیم کردی جاتی، مثلاً مولد نبوی کی موجودہ شکل یقیناً صحیح نہیں ہے، زمانہ سلف میں اس کی شکل مسجد کی تھی، جس میں نماز پڑھی جاتی تھی، بعد میں موجودہ شکل حقیقی مولد کے کمرے کی بنائی گئی، جو صحیح و مستند نہ تھی، اس کی تصحیح کردینا چاہیے تھا، مگر توڑ دینا شدت وغلو کی انتہا ہے، مقام ابراہیم، صفا و مروہ، چاہ زمزم وغیرہ تمام آثار مآثر ابراہیمی ہیں، کیا خدانخواستہ ان کو بھی منہدم کردیا جائے گا۔

یہ تقریر ایسی پرزور اور مدلل تھی کہ کسی سے اس کا جواب نہ بن پڑا، اس کے بعد

سید رشید رضا نے اٹھ کر کہا کہ چوں کہ ہم اتحاد چاہتے ہیں اس لیے بہت سی چیزوں کا جواب دینا مناسب نہیں ہے، دو ایک عالموں نے وعظ کے رنگ کی تقریریں شروع کر دیں، حافظ وہبہ نے ان سے کہا کہ ہم یہاں شاعری کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم کو کام کرنا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ پانچ چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی جائے جو مؤتمر کا نظام نامہ مرتب کرے، مگر اس کے ممبروں کے انتخاب پر کچھ اختلاف ہوا، اس لیے یہ جلسہ بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہو گیا۔

مگر مؤتمر کے انعقاد سے پہلے اس کمیٹی کا تقرر ناگزیر تھا، اس لیے اس جلسہ کے ایک ہی دو دن بعد کمیٹی بنا دی گئی، اس وقت تک اسلامی ملکوں کے جتنے وفود آ چکے تھے، ان میں سے ایک ایک شخص اس کمیٹی کا ممبر بنایا گیا، اس کمیٹی میں کئی دن تک مؤتمر کے نظام نامہ پر بحث ہوتی رہی، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلما کے نمائندوں نے اس کی پوری کوشش کی کہ مؤتمر کو زیادہ سے زیادہ جمہوری اور بااختیار بنایا جائے اور اسلامی ملکوں کو اس کی آبادی کے تناسب سے مؤتمر میں نمائندگی کا حق دیا جائے، مگر کمیٹی میں سلطان کے آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے ان کی کوشش کام یاب نہ ہو سکی اور سلطان نے مؤتمر سے اپنے حسب منشا کام لینے کے لیے بغیر کسی اصول اور ضابطہ کے اپنے زیر اثر ملکوں کو زیادہ نمائندگی دے دی اور مختلف طریقوں سے اپنے ہم خیالوں کی تعداد بڑھانے اور منتخب شدہ نمائندوں پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کی، اس پیش بندی کے بعد حکومت حجاز کی تشکیل کا مسئلہ بھی ایجنڈا میں شامل کر دیا، جس کو وہ پہلے مؤتمر میں زیر بحث لانا نہیں چاہتے تھے، وفد خلافت نے اس کی مخالفت کی، اس کی دلیل یہ تھی کہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اس لیے جب تک مؤتمر میں مختلف ملکوں کی نمائندگی کے اصول طے نہ ہو جائیں اور اس کے مطابق ان کو نمائندگی نہ دے دی جائے اس وقت تک اس مسئلہ کو مؤتمر میں زیر بحث لانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، مگر حکومت نمائندگی کے معاملہ کو گول رکھنا چاہتی تھی، اس لیے تشکیل حکومت کے مسئلہ کو ایجنڈے سے نکال دیا گیا اور وفد خلافت کی تحریک پر ایک کمیٹی مؤتمر میں پیش ہونے والی تجویزوں کو مرتب کرنے اور دوسری مؤتمر کا دستور اساسی بنانے کے

لیے منتخب کی گئی، وفد خلافت نے موتمر کی صدارت کے لیے ترکی کے رئیس الوفد ادیب ثروت کا نام پیش کیا اور اہل حدیث کے وفد نے حجاز کے شریف عدنان کا، کثرت رائے سے شریف کا انتخاب ہوا اور نائب صدر مولانا سید سلیمان ندوی اور روسی وفد کے رئیس رضا الدین مقرر ہوئے، موتمر کا صدر مقام مکہ معظمہ قرار پایا اور اس کے خاص مقاصد یہ قرار پائے: ۱-مسلمانوں میں باہم تعارف، شناسائی، اتحاد و اتفاق اور اسلامی اخوت پیدا کرنا، ۲-ان کے دینی، اجتماعی اور اقتصادی مسائل اور ان کی ترقی پر غور و فکر اور اس کے لیے عملی جد و جہد کرنا، ۳-حجاز کے مقدس مقامات میں امن و امان کے استحکام پر غور و خوص کرنا اور وہاں آرام و آسائش، حفظان صحت اور مواصلات کے وسائل فراہم کرنا، حج میں سہولتیں فراہم پیدا کرنا اور اس میں جو دقتیں پیش آئیں ان کو رفع کرنا، حجاز اور اس کے حقوق کی حفاظت اور ان کی نگرانی کرنا اور یہ طے پایا کہ حج کے موقع پر ہر سال موتمر مکہ مکرمہ میں ہوا کرے گی اور حسب ذیل اس کے ممبر بنائے گئے۔

۱-افریقہ جنوبی و شمالی، ۲-افریقہ مغربی، ۳-افغانستان، ۴-امریکہ جنوبی، ۵-امریکہ شمالی، ۶-یورپ کے مسلمان باشندے، ۷-ایران، ۸-ترکی، ۹-تیونس، ۱۰-جاوا سماترا، ۱۱-الجزائر، ۱۲-حبش، ۱۳-حجاز، ۱۴-خلیج فارس کی ریاستیں، ۱۵-روس، ۱۶-ریف، ۱۷-زنجبار، ۱۸-مصر و سوڈان، ۱۹-شام، ۲۰-شرق اردن، ۲۱-چین، ۲۲-طرابلس، ۲۳-عراق، ۲۴-عسیر، ۲۵-جزائر فلپائن، ۲۶-فلسطین، ۲۷-کانگو، ۲۸-مراکش، ۲۹-ملایا، ۳۰-نجد، ۳۱-ہندوستان۔

ان میں سے بیش تر ملکوں کو ایک رائے اور بعض خاص ملکوں کو ان کی اہمیت کی بنا پر دو اور تین رائے دینے کا اختیار دیا گیا، دستور اساسی کی باقی تفصیلات انتظامی ہیں جن کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

موتمر کے اجلاس کی تاریخ ۲۱ رجون ۱۹۲۶ء مقرر تھی لیکن بعض ملکوں کے نمائندے اس وقت تک نہیں پہنچے تھے، اس لیے بڑھا کرے رجون کر دی گئی، اس وقت بھی بعض وفود نہیں

پہنچ سکے اور حج کا زمانہ بالکل قریب آ گیا تھا، اس لیے موتمر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، حج سے پہلے اور حج کے بعد، حج سے پہلے کے اجلاس میں حسب ذیل ملکوں کے وفود نے شرکت کی، ہندوستان، وفد خلافت، وفد جمعیۃ العلما اور وفد جماعت اہل حدیث، روس، جاوا، فلسطین، بیروت و شام، مصر و سوڈان، عسیر، نجد و حجاز، حج کے بعد موتمر میں شریک ہونے والوں میں ترکی، افغانستان، یمن، عسیر اور مصر تھے۔

۷؍جون ۱۹۲۶ء کو موتمر کا پہلا اجلاس ہوا، اس موتمر میں جس میں ساری دنیائے اسلام کے نمائندے شریک ہوئے تھے، سید صاحب کو نائب صدر کا اعزاز حاصل ہوا، سلطان کے خطبہ کے بعد مختلف ملکوں کے نمائندوں نے تقریر اور تجویزیں پیش کیں، جس کی تفصیل بہت طویل ہے، اس لیے صرف وفد خلافت اور وفد جمعیۃ کی تجویزوں کو نقل کیا جاتا ہے، انہوں نے حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:

۱-حتی الامکان منہدمہ آثر کو جلد بنایا جائے، ۲- جو قبریں نہیں گرائی گئی ہیں ان کو نہ گرایا جائے، ۳- جو قبریں گرائی جا چکی ہیں ان کی تعمیر اور مرمت ایک کمیٹی کے سپرد کی جائے جو سنی علما اور شیعہ علما پر مشتمل ہو، ۴- حرم میں باری باری سے چاروں مذاہب کے اماموں کو امامت کا موقع دیا جائے، ۵- بلاد مقدسہ کو غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حجاز میں ان کو کسی قسم کے اقتصادی امتیازات اور مراعات نہ دیے جائیں، ۶-اسلامی کمپنیوں سے بھی معاہدہ کرتے وقت یہ شرط کر لی جائے کہ جب کسی معاملہ میں فریقین میں اختلاف ہو تو دونوں کو عدالت حجاز کی طرف رجوع کرنا اور اس کا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا، ۷-کمپنی کے حصہ داروں کو غیر مسلموں کے ہاتھ اپنے حصے بیچنے کی اجازت نہ ہوگی، ۸-غلامی کا انسداد، ۹- جدہ، مکہ اور عرفات کے درمیان سڑک اور قافلہ کی منزلوں پر سراؤں کی تعمیر اور ان میں آرام و آسائش کے سامانوں کی فراہمی، ۱۰-تبلیغ کے نظام کا قیام، ۱۱- مذہب کی آزادی، ۱۲-مطاف ورمی میں...... سہولت و آسانی کی فراہمی۔

قریب قریب یہ سب تجویزیں موتمر نے منظور کیں، صرف چند تجویزیں مسترد کردیں، ۱- بغیر قصاص کے کسی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے، ۲- حکومت حجاز اور دوسری حکومتوں کے درمیان جو معاہدے ہوں وہ عام مسلمانوں کی اطلاع کے لیے موتمر میں پیش کیے جائیں، ۳- حجاز میں غیر مسلم حکومتیں بھی مسلمان قناصل رکھنے کی کوشش کریں۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ وفد خلافت گو اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا مگر اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور موتمر کے فیصلے حکومت کی آئندہ پالیسی پر اثر انداز ہوئے، آخر جولائی ۲۶ء میں وفد ہندوستان واپس آیا۔

حجاز کے مسئلہ خصوصاً آثر و مقابر کے انہدام نے ہندوستان میں بڑی نزاعی شکل اختیار کرلی تھی اور اس سلسلہ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے، اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

اس سفر میں حضرت سید صاحبؒ حج اور زیارت کے شرف سے بھی مشرف ہوئے اور وفد کی ذمہ داریوں اور اس کی مشغولیتوں کے باوجود علمی مقاصد بھی پیش نظر رہے، حرمین کے بڑے بڑے کتب خانوں کو دیکھا اور ان کے فوائد میں ناظرین معارف کو بھی شریک کیا، اس کا ذکر آئندہ اپنے موقع پر آئے گا، اس سفر کی مختصر روداد جو درحقیقت اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ہلکا سا تبصرہ ہے، خود ان کے قلم سے سننے کے قابل ہے، ستمبر ۲۶ء کے معارف میں لکھتے ہیں:

حج و زیارت مدینہ اور اس کی مختصر کیفیت: بحمد للہ تعالیٰ کہ ساڑھے تین مہینہ کی غیر حاضری کے بعد فریضہ حج و زیارت سے مشرف ہو کر آج معارف کا ایڈیٹر پھر اس کی خدمت میں حاضر ہے، ان ساڑھے تین مہینوں میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، کانوں نے جو کچھ سنا اور دل نے جو مشاہدہ کیا، یہ داستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان صفحات کے ذریعہ کبھی کبھی آپ تک پہنچتی رہے گی۔

مکہ معظمہ میں موتمر اسلامی کے سبب سے ڈیڑھ ماہ قیام رہا، مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک بارہ منزلیں طے کرنے میں بارہ دن صرف ہوئے اور بارہ دن مدینہ منورہ میں قیام رہا، مکہ معظمہ سے تو ایک حد تک طبیعت سیر ہو چکی تھی، مگر افسوس کہ مدینہ مبارکہ سے سیر نہ ہوئی:

ع باز ہوائے چمنم آرزوست

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک کی بارہ منزلیں نہایت آسانی سے طے ہوئیں اور ہر منزل میں ایک نئی دل چسپی نظر آتی تھی، میں نے کوشش کی ہے کہ ہر منزل کی قلمی تصویر ناظرین کے چشم خیال تک پہنچا سکوں، راستوں کا نشیب وفراز، پہاڑوں کا سلسلہ درسلسلہ، کہیں چشمے کہیں کنوئیں، کہیں بدوؤں کے جھونپڑے، کہیں ببول کے درخت، کہیں ریگستان، کہیں سنگستان عجیب عجیب منظر نظر سے گزرے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان عجیب فرق نظر آیا، صوفیا کی اصطلاح میں یہ کہنا چاہیے کہ مکہ شان جلال اور مدینہ شان جمال کا مظہر ہے، آب و ہوا، جائے وقوع، آبادی، لوگوں کے اخلاق، خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ کے عمارات، ہر چیز میں یہ فرق محسوس ہوتا ہے اور دل لذت پاتا ہے۔

علمی اور تعلیمی حیثیت بھی ان دونوں شہروں میں یہی فرق ہے، مکہ معظمہ میں پرانے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ کی عمارت موجود نہیں، حرم کے بعض اطراف میں سلطان محمود نے جو مدرسے بنوائے تھے، وہ اشراف کے شخصی تصرفات میں داخل ہو کر محو ہو چکے ہیں، مگر مدینہ منورہ میں اب تک ان مدرسوں کی مستقل عمارتیں خواہ وہ کیسی ہی ویرانی کی حالت میں ہوں، موجود اور مسلمانوں کی حالت زار پر نوحہ خواں ہیں، مکہ معظمہ میں دو عمومی کتب خانے ہیں، بڑا کتب خانہ جو حرم کے اندر ہے سلطان محمود کی طرف منسوب ہے، اس میں ہر علم وفن کی چھ سات ہزار کتابیں ہوں گی جو زیادہ تر قلمی ہیں، دوسرا کتب خانہ ایک ترک عالم شروانی کا موقوفہ ہے اور اس کی نسبت سے کتب خانہ شروانی کہلاتا ہے، وہ مٹ چکا

ہے اور شریف کے عہد میں برباد ہو چکا ہے، اس میں اب صرف چند سو کتابیں ہیں۔

مدینہ منورہ میں اس وقت بھی چودہ چھوٹے بڑے کتب خانے موجود ہیں جن میں سب سے بڑا شیخ الاسلام عارف حکمت بے کا کتب خانہ ہے، جس کا حال معارف کے مئی نمبر میں شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ کتب خانہ محمودیہ اور کتب خانہ سیدنا عثمانؓ قابل ذکر کتب خانے ہیں، ان دو پچھلے کتب خانوں میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی نادر کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔

ہم نے ان تینوں کتب خانوں کی نادر کتابوں کی فہرست مرتب کر لی ہے، ترکوں نے جنگ عظیم میں جہاں مدینہ منورہ کے نادر تحفے قسطنطنیہ منتقل کر دیے وہاں ایک خاص آدمی بھیج کر ان کتب خانوں کی بہت سی نادر کتابیں بھی منتقل کر لیں اور ہم کو معلوم ہوا ہے کہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ عمومی میں وہ موجود ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ ان کتابوں میں جن کے دو نسخے وہاں ہوں گے ان میں سے ایک نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں دے دیا جائے گا۔

یہ تمام کتب خانے ترکی سلاطین کے جمع اور وقف کیے ہوئے ہیں اور ان پر ان کی مہریں ہیں، پہلا کتب خانہ البتہ ایک ترک عالم کا موقوفہ ہے اور دو تین وجوہ سے وہ سب سے بہتر ہے، ایک تو یہ کہ اس کی عمارت اور خود کتب خانہ نہایت اچھی حالت میں ہے، روزانہ باقاعدہ کھلتا اور بند ہوتا ہے، دوسرے اوپر سے لے نیچے تک اس میں ترک ملازم ہیں، تیسرے اس میں ہر علم وفن کی کتابیں ہیں۔

مسجد نبویؐ کو حقیقت میں سلطان عبدالمجید خاں نے عروس المساجد بنا دیا ہے، اس قدر خوب صورت اور اس قدر صنعت کاریاں ہیں کہ بے اختیار زائر کی زبان سے احسنت وجزاک اللہ نکل جاتا ہے، اس مسجد کا تاریخی نقشہ ہاتھ آیا ہے، کبھی وہ آپ کے سامنے آئے گا، اسی کے ساتھ میں نے مسجد نبویؐ کی موجودہ شکل وصورت اور خصوصیات کی الفاظ و حروف کے رنگ میں تصویر اتاری ہے، وہ بھی آپ دیکھیں گے۔

جنۃ المعلیٰ (مکہ کا قبرستان) جنۃ البقیع (مدینہ کا قبرستان) اب عمارتوں، قبوں اور

گنبدوں سے خالی ہے، اکثر قبریں محض قبر کی حیثیت سے باقی اور نمایاں ہیں، اُنپر کوئی دیوار یا حصار یا قبہ نہیں ہے، بعض قبروں پر سے قبے اتار دیے گئے ہیں اور صرف چہار دیواری چھوڑ دی گئی ہے، چنانچہ جنت المعلی میں حضرت ابو طالب اور عبدالمطلب کی طرف جو قبر منسوب ہے، اس کی چہار دیواری اب تک کھڑی ہے، جنۃ البقیع میں کوئی دیوار بھی باقی نہیں ہے، صرف قبریں نمایاں ہیں، ان پر کوئی کتبہ بھی نہیں ہے، سیدنا حمزہؓ کے مزار (واقع احد) کا گنبد بھی اتار دیا گیا ہے اور صرف چہار دیواری باقی ہے اور مسجد کے دالان سے اس کا دروازہ بند کر کے باہر سے اس کا راستہ دیوار توڑ کر بنا دیا گیا ہے اور پھاٹک لگا دیا گیا ہے، یہ صورت حال شرعی ہے یا نہیں اس پر اسلامی فرقوں میں جو جنگ برپا ہے اس کا نتیجہ دیکھیے کیا ہو۔

مسئلہ حجاز کے متعلق سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بہت سی باتیں ہیں، جن کو ہمارے دوست معارف کی زبان سے سننے کے متوقع ہوں گے لیکن اس کی گتھیاں اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ ہم ان کو سلجھانے سے اعلانیہ عاجز ہیں اور معارف کو ان مباحث میں پھنسانا نہیں چاہتے۔

موتمر اسلامی یقیناً ایک دل فریب موضوع ہے، یہ موتمر مسلمانوں کی پوری ایک صدی کے خواب کی ایک تعبیر ہے، اس میں اکیس اسلامی ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی اور کل نمائندوں کی تعداد ۶۹ رکے قریب تھی، اگر اس موتمر میں کمی تھی تو یہ کہ ایران، عراق، چین اور مصر و سوڈان کے علاوہ افریقہ کے مسلمانوں کے نمائندے اس میں شریک نہیں تھے، ایک مہینہ کے قریب اس کے عام جلسے آٹھ بجے صبح سے لے کر ایک بجے تک اور خاص جلسے عصر سے لے کر عشا تک ہوتے رہے، اس میں ان کے قریب مختلف تجویزیں پیش ہوئیں جن کا زیادہ تر تعلق حجاز سے تھا۔

امسال کے حج کی خصوصیت یہ تھی کہ عام حاجیوں کے علاوہ ہر ملک کے ارباب فکر اور اہل علم بھی آئے اور انہوں نے حجاز اور عالم اسلامی کے مسائل پر باہم غور و مشورہ کیا، اگر اس موتمر کو مضبوط اور مستحکم کیا جائے اور اس کی قوت کو سال بہ سال بڑھایا جائے تو عجیب

نہیں کہ مسلمانوں کی لیگ آف نیشنس (جمعیۃ الاقوام) بن جائے۔

امسال سرسری اندازے کے مطابق پونے دو لاکھ حاجی مختلف ملکوں سے آئے جن میں سب سے زیادہ نجد کے لوگ تھے، ان کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، ان کے بعد ہندوستان کا درجہ تھا جہاں سے ستائیس ہزار حاجی آئے تھے، پھر مصری تھے، جو بیس ہزار کے قریب تھے، جاویوں کا اندازہ دس ہزار ہے، یمنی چار پانچ سو ہوں گے، سوڈانی اور تکرونی بھی اسی قدر، بخاری وافغانی دو ہزار ہوں گے، ترک ساٹھ ستر، یوگوسلاویہ اور البانیہ وغیرہ کے بھی حاجی آئے تھے، یوگوسلاویہ کے بیس حاجی تھے، سب سے کم روس اور روس سے بھی کم تیونس، مراکش اور الجیریا کے حاجی تھے، جن کی تعداد چند سے زیادہ نہ ہوگی، شیعوں کی تعداد بھی ہمارے خیال میں ڈیڑھ دو سو ہوگی۔

سب سے دور دراز راستہ سے جو حاجی آئے تھے وہ نائجیریا (افریقہ) کے تھے، یہاں ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کی تعداد ہے، ایک برائے نام سلطان ان پر حکم ران ہے اور اصلی قبضہ انگریزوں کا ہے، یہ حاجی نائجیریا سے مکہ معظمہ تک تقریباً نو مہینہ میں پہنچے تھے اور ان نو مہینوں کا بڑا حصہ انہوں نے پیادہ پا طے کیا تھا، ان میں بوڑھے بھی تھے، نوجوان بھی تھے، مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، جاہل بھی تھے، پڑھے لکھے بھی تھے، مگر بڑے مسکین اور نیک لوگ تھے، نائجیریا سے سوڈان تک پیادہ سفر کر کے آئے تو سوڈان میں ان کو ریل نظر آئی جس پر وہ پورٹ سوڈان پہنچے، پورٹ سوڈان سے جہاز پر جدہ آئے، پھر جدہ سے مکہ معظمہ اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک بادیہ پیمائی تھی، مذہب کے نشہ روحانی کے سوا اور کون چیز ان کی تکالیف کو سہل اور آسان بنا سکتی ہے۔

مہینوں کے بعد ہندوستان بلکہ دنیا سے واقف ہوا ہوں، اس لیے ابھی عرب کے حالات وواقعات سے ناآشنائی ہے، بلکہ ناواقفیت ہے، اس بنا پر شذرات میں اور گوشوں کے متعلق کوئی نقد وتبصرہ نہیں ہوسکتا، ابھی کچھ دن ادھر سے مانوس ہونے دیجیے۔

علمی و تعلیمی خدمات

جامعہ ملیہ کا قیام: اس زمانہ میں اگرچہ حضرت سید صاحب کا زیادہ وقت سیاسی اور قومی کاموں میں گزرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ علمی و تعلیمی کام بھی جاری رہے، اس کو درمیان درمیان میں لکھنے کے بجائے ایک جگہ لکھنا مناسب معلوم ہوا، ہندوستان کا نظام تعلیم انگریزوں نے اپنی ضروریات کے مطابق بنایا تھا، اس میں ہندوستانیوں کے مصالح کا کوئی لحاظ نہ تھا اور وہ قومی روح سے بالکل خالی تھا، اس لیے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ساتھ تعلیمی نقطۂ نظر بھی بدلا، اس لیے نان کواپریشن کی تاریخ میں سرکاری درس گاہوں کی تعلیم کا بائی کاٹ اور آزادی قومی درس گاہوں کا قیام بھی شامل تھا، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور گاندھی جی وغیرہ نے علی گڑھ کالج پر دھاوا کیا، ملک کا اعتدال پسند طبقہ جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، تعلیمی بائی کاٹ کے خلاف تھا لیکن علی گڑھ کے طلبہ کی ایک جماعت نے جس میں طلبہ اور اساتذہ دونوں شامل تھے اور آزادی کے جوش سے زیادہ معمور تھے، کالج چھوڑ دیا اور کالج کے ارباب حل وعقد نے کچھ دنوں کے لیے کالج بند کر دیا، اس سے کالج کو کچھ نقصان ضرور پہنچا مگر وہ ٹوٹنے سے بچ گیا، گاندھی جی اور مولانا محمد علی علی گڑھ کالج میں تو ایک حد تک کام یاب ہو گئے لیکن پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو یونیورسٹی کے احاطہ میں کسی کو قدم نہ رکھنے دیا۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے مقدس ہاتھوں سے علی گڑھ میں پہلی آزاد قومی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، اس کے اصل بانی تو مولانا محمد علی، حضرت شیخ الہند اور حکیم اجمل خاں مرحوم تھے لیکن اس کے ارکان میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، اس زمانہ کے بہت سے ہندو لیڈر بھی شامل تھے، سید

صاحب بھی اس کے رکن رکین تھے اور وہ ایک زمانہ تک اس کے کاموں میں عملی حصہ لیتے رہے، جامعہ ملیہ کے قیام کے تین ہی مہینہ کے بعد دسمبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کالج نے جس کو یونیورسٹی بنانے کی کوشش برسوں سے جاری تھی، مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی، مگر وہ ایسے شرائط پر ملی تھی کہ عام طور سے مسلمان خصوصاً ان کا آزادی پسند طبقہ اس سے خوش نہ تھا لیکن بہر حال مسلمانوں کی ایک یونیورسٹی قائم ہوگئی، اس سے ایک ہی سال پہلی ملکی زبان میں اعلیٰ تعلیم کی پہلی تجربہ گاہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم ہو چکی تھی، اس لیے یہ دور تعلیمی حیثیات سے انقلاب انگیز تھا، سید صاحب نے ان سب میں رہنمائی کا فرض انجام دیا اور جامعہ کے کاموں میں تو عملاً شریک رہے، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

مسلم یونیورسٹی: مسلم یونیورسٹی جن شرائط پر ملی تھی وہ مسلمانوں کے مطالبات اور غیرت کے سراسر خلاف تھے، سید صاحب نے بھی اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا، ۱۷ ماہ حال دسمبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں اس مسلم یونیورسٹی کا افتتاح ہوگیا جو سر سید مرحوم کے رویائے یوسفی کی تعبیر خیال کی جاتی ہے، اگر یہ عید شام کو نہ ہوئی ہوتی تو وائس چانسلر کا نغمہ مسرت اسٹریچی ہال میں گونج کر رہ جاتا، بلکہ اس کی صدائے بازگشت سارے ہندوستان میں سنائی دیتی اور ہم بھی اس کو بغداد و قرطبہ کی کھوئی دولت کا نشان بازیافت سمجھ کر خوش ہوتے لیکن اب تو اگر ہم اس کو آب حیات بھی سمجھنا چاہیں تو بھی مسلمانوں کی مرگ آرا غیرت قلم پکڑ لیتی ہے اور عرفی کی زبان سے کہتی ہے:

منت بازیچہ عیسیٰ کش بہر حیات   ارزش مردن پرس از نقش مرگ آرے من

مسلم یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے یورپین اساتذہ کی مخالفت: انگریز قوم، اس کے علوم اور اس کی تہذیب سے مرعوبیت علی گڑھ کالج کی پرانی روایت ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربی تعلیم کے لیے بھی یورپین اساتذہ رکھے جاتے تھے، یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد بھی یہ روایت قائم رہی، یہ ذہنی غلامی اہل علم اور ارباب نظر کی نگاہوں میں

ہمیشہ کھٹکتی رہی، سید صاحب نے اس کی پرزور مخالفت کی، چنانچہ فروری ۱۹۲۱ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''مسلم یونیورسٹی پر اس وقت سے جب وہ فقط کالج تھا، ارباب نظر کا یہ اعتراض چلا آتا ہے کہ وہاں عربی کی تعلیم کے لیے یورپین عیسائی اور یہودی اساتذہ کیوں رکھے جاتے ہیں اور اب نیا کیوں بلوایا گیا ہے، مذہبی رہنما اور علما سے قطع نظر کر کے جب اسی قابلیت اور لیاقت کے بلکہ اس سے بہتر خود مسلمان پروفیسر مل سکتے ہیں تو سات سمندر پار سے ڈیوڑھی اور دوگنی قیمت پر علوم عربیہ کے یورپین اساتذہ کیوں بلائے جاتے ہیں، ایک فن لغت یا موزانہ السنہ سامیہ اور کتب خانہائے یورپ کی فہرست کتب کو چھوڑ کر علمی حیثیت سے وہ ہمارے مسلمان علمائے ہند سے جنہوں نے جدید طرز سے تھوڑی سی بھی آگاہی حاصل کی ہو ان کی ذات ایک ذرہ بھی ممتاز نہیں ہوتی، بہتر ہوتا کہ ہماری یونیورسٹی میں آئندہ سے فارسی پڑھانے کے لیے بھی کسی فرنچ اور اردو پڑھانے کے لیے کسی جرمن کی خدمات حاصل کی جائیں۔

یہ سن کر ہمارے ارکان یونیورسٹی کو افسوس ہوگا کہ جو اساتذہ وہ ہزاروں روپے تنخواہ پر حاصل کرتے ہیں، وہ ہمارے ہی سیاہ رنگ بھائیوں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر کے عالم بنتے ہیں اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں فخر کے ساتھ قبول کیے جاتے ہیں، لندن کے السنہ مشرقیہ (اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز) میں اردو، فارسی، عربی اور ترکی پڑھانے کے لیے ہندی، ایرانی، عرب اور ترک نوکر ہیں، علی رضا وہاں ترکی اور ایک بغدادی مسلمان اور ایک شامی عیسائی عربی پڑھاتے ہیں اور ہمارے ہی کالج کے تعلیم یافتہ عبدالقیوم اردو سکھاتے ہیں، کیمبرج میں پہلے خالد بے تھے، اب قدری بے، اور ہندوستان کے عبدالحئی عرب ہیں، ڈاکٹر اسپرنگر، سر ولیم میور، ڈاکٹر لیٹز، ڈاکٹر راس، ڈاکٹر آرنلڈ، سر چارلس لائل، جنہوں نے علوم مشرقیہ میں بڑا نام پیدا کیا ان کو یہ فیض اسی ہندوستان سے پہنچا ہے، اس وقت پروفیسر براؤن اور پروفیس مارگولیتھ اور جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے آفتاب و ماہتاب ہیں وہ بر فستانی یورپ میں نہیں بلکہ ایران، مصر و شام کی خاک چھان کر چکے ہیں، فرانسیسیوں کو مشرق کا علم

تیونس اور الجزائر کے جبہ پوشوں سے پہنچا ہے۔

علی گڑھ کالج میں عربی تعلیم کی شاخ کھلنے سے لے کر آج تک دو پروفیسر یورپ سے آچکے ہیں، ڈاکٹر ہارویز اور ڈاکٹر اسٹوری لیکن جس قدر وہ ہمارے طلبہ کو سکھا گئے اس سے زیادہ وہ ہمارے علما سے سیکھ گئے، جب آئے تھے تو سیدھی عربی بھی نہیں پڑھ سکتے تھے اور اب واپس جاکر اکابر مستشرقین میں داخل ہیں، یہ سب سن کر آپ کہیں گے کہ سب سچ ہے لیکن ہم کو جو چیز ملے گی وہ یورپ ہی کی گداگری سے ملے گی، خواہ وہ سیاست ہو یا معاشرت، مغرب کا علم ہو یا مشرق کا۔

لیکن اسی ملک میں اور اسی صوبہ میں ہماری ہی یونیورسٹی کی ہم ذات ایک ہندو بنارس یونیورسٹی ہے، یہاں بھی اس کی مقدس مذہبی زبان کے لیے سنسکرت کے پروفیسر ہوتے ہیں، سنسکرت کے بہترین...... یورپین عالم جرمن اور فرنچ ہیں لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس کی پیشانی پر کسی جرمن یا فرنچ سنسکرت اسکالر کے خدمات کے حصول کا داغ نہیں لگا اور ان کے بغیر خود ہندی پنڈت اپنی زبان کی تعلیم آپ نہایت خوبی سے دے لیتے ہیں، پھر ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے عربی کا وظیفہ ہی سرکار سے اسی شرط پر لیا ہے۔'' (شذرات معارف، فروری ۱۹۲۱ء)

عثمانیہ یونیورسٹی: عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۱۹ء میں قائم ہو چکی تھی، ۱۹۲۱ء میں اس کا پہلا امتحان ہوا، اس کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی اور اس کو مفید مشورے دیے۔

امتحان، نصاب تعلیم اور طرز تعلیم وغیرہ میں اگرچہ عثمانیہ یونیورسٹی سردست (شاید بعض مصالح کی بنا پر) دیگر یونیورسٹیوں ہی کے ناقص نظام کی پیروی کر رہی ہے لیکن ذریعہ تعلیم اجنبی زبان کے بجائے ملکی زبان کو قرار دینا جس پر اس یونیورسٹی کی بنیاد ہے، ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ میں ایک ایسا اصلاحی قدم ہے جس کی بنا پر تمام ملک کی نگاہیں اسی کی جانب لگی ہوئی ہیں، اس لیے اگر نتائج امتحان کے ساتھ ان نتائج کو بھی جو مادری زبان میں تعلیم دینے سے تجربہ میں آئے ہوں گے، ایک مختصر رپورٹ شامل ہوتی تو مناسب تھا۔

ایک اور بڑی کمی علی العموم ہندوستانی یونیورسٹیوں میں یہ ہے کہ خود ہندوستانی و مشرقی علوم والسنہ کے ساتھ غایت بے التفاتی برتی جاتی ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے نتائج کے ساتھ اختیاری مضامین کی جو فہرست موصول ہوئی ہے، وہ خود بھی اگر چہ اس نقطہ نظر سے نہایت ہی مایوس کن ہے، تاہم تاریخ اسلام اور دکنی زبانوں (تلنگی، مرہٹی، کنڑی) کے نام اس میں نظر آتے ہیں جو دوسری یونیورسٹیوں (الا ماشاءاللہ) کی فہرست مضامین میں نہ ملیں گے، تاریخ اسلام لینے والے طلبہ کی تعداد بھی خاصی ہے، یعنی ۲۱، البتہ عربی اور سنسکرت لینے والوں کا اوسط وہی ہے جو کم وبیش دوسرے کالجوں میں رہتا ہے یعنی علی الترتیب آٹھ اور چار، یا وش بخیر، غالباً اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک مستقل ''شعبہ مشرقی'' کے قیام کا اعلان کیا، جس کے معلّمین کے نام بھی شاید سرکاری گزٹ میں شائع ہو گئے تھے لیکن پھر کچھ حال معلوم نہ ہوا کہ یہ شعبہ کہاں تک اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کر رہا ہے۔[1]

(شذرات معارف جولائی ۱۹۲۱ء)

مسلم یونیورسٹی کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت: دسمبر ۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کی، جنوری ۱۹۲۳ء کے معارف میں اس کی روداد پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، گذشتہ دسمبر میں سب سے پہلی دفعہ ہماری قرطبہ اور غرناطہ کی درس گاہوں کو دوبارہ زندہ کرنے والی مسلم یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا، سرسید اور محسن الملک کے عہد کے بعد سے اسٹریچی ہال نے یہ دل فریب منظر نہیں دیکھا تھا، جو ۲۸ دسمبر کو اس کی نگاہوں کے سامنے گزرا، سوٹ پوش ''معززین اسلام'' کی اتنی عظیم الشان نمائش تین سال سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی، سو اس جلسہ میں بحمد للہ دیکھ لی گئی، تقسیم اسناد کے تمام مراسم میں صرف ہر ہائنس سرکار عالیہ بھوپال کا حصہ عمل قابل ستائش تھا، ان کی تقریر کی دعوت عمل و

[1] اس تحریر کے کچھ دنوں کے بعد ہی یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کی طرح نہایت اعلیٰ پیمانہ پر شعبہ مشرقی عملاً قائم ہوگیا۔

اصلاح کی آواز ممکن ہے یونیورسٹی کے حکام پر گراں گزری ہو مگر جو لوگ یونیورسٹی کو یونیورسٹی دیکھنا چاہتے ہیں وہ حرف حرف اس سے اتفاق کریں گے۔

مراسم تقسیم اسناد کا یہ دل کش منظر تھا کہ چانسلر (سرکار عالیہ بھوپال) اور وائس چانسلر (راجہ محمود آباد) دونوں نے اسناد کی تقسیم کے وقت عربی فقرے استعمال کیے جو کاغذ پر لکھے اور چھپے ہوئے موجود تھے، تاہم اس حیرت کی کوئی انتہا نہیں ہوسکتی ہے کہ تمام حاضرین نے بلا استثنا ایک عورت کی صحت تلفظ اور اعراب کو مرد سے بہتر اور لائق تعریف پایا۔

ہماری یونیورسٹی اپنے عطائے خطابات کے اختیار کو سب سے پہلی بار اس دفعہ کام میں لائی، جو آئندہ چل کر ہماری جدید تعلیمی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہوگا کہ اس یونیورسٹی کے خطاب یافتوں میں سرفہرست کس خوش قسمت کا نام ہے، لوگ بے قرارانہ پوچھیں گے کیا وہ کوئی اس عہد کا بڑا عالم، بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا انشاپرداز یا بڑا تعلیمی ماہر تھا، جواب ملے گا نہیں، وہ صرف ایسے بیرسٹر کو ملا جو اس وقت اتفاق سے وزیر تعلیم[1] تھا اور بس، حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخی اہمیت کو مدنظر رکھ کر علی گڑھ کے حلقہ علم اور ادارہ تعلیم میں اگر کوئی موزوں تر اس خطاب کے لیے ہوسکتا تھا تو وہ علمی حیثیت سے مولوی عبدالحق (ناظم ترقی اردو) اور تعلیمی کوششوں کے لحاظ سے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں تھے، ہم نے اپنی یونیورسٹی کے اس طرز عمل کے متعلق دیوان غالب میں فال دیکھی تو یہ جواب ملا:

غالب سوختہ جاں را بچہ گفتار آری   بدیارے کہ نہ دانند نظیری ز قتیل

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت: اسی سال فروری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جلسہ تقسیم اسناد ہوا، اس میں بھی سید صاحب نے شرکت فرمائی، اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"۷ر فروری کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کا دوسرا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا، ہر صوبہ

---

[1] نواب محمد یوسف مرحوم۔

کے قومی کارکن جلسہ میں شریک تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ مشرقی اور مغربی دونوں علوم کے ماہرین پہلو بہ پہلو جلوہ فرما تھے، ڈاکٹر پی سی رائے، ڈاکٹر ضیاالدین، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر انصاری، خواجہ مجید، شیخ معظم علی، سید محفوظ علی، سید ہادی حسن، تصدق شروانی وغیرہ ایک طرف اور مولانا حمید الدین، مفسر نظام القرآن، مولانا ابو الکلام، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا محمد سورتی، حکیم اجمل خاں وغیرہ دوسری طرف، یہ منظر نمایاں کرتا تھا کہ جامعہ کا مقصود مشرق و مغرب دونوں کو یک جا کرنا ہے۔

جلسہ تمام تر سادگی اور صفائی کا نمونہ تھا، پورا ہال، سائبان اور صحن حاضرین سے بھرے ہوئے تھے، سنڈیکیٹ اور اسٹاف کے ارکان اپنے اپنے رنگ کی عباؤں میں تھے، ڈاکٹر رائے جو ہندوستان کے سب سے بڑے سائنٹسٹ خصوصاً بڑے کیمسٹ و ماہر کیمیا ہیں، وہ صدر جلسہ تھے، انہوں نے انگریزی میں اپنا خطبہ صدارت پڑھا جو مسلمانوں کی علمی تاریخ کے بیانات سے لب ریز تھا، انہوں نے کہا کہ جامعہ کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اسلاف کی علمی روایات کو عملیات کی صورت میں پیش کرے۔"

مسلمانوں کی قومی مجالس کے مقاصد اور معاملات میں تغیر کی ضرورت اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ذمہ داری: زمانہ کے حالات اور رفتار کے ساتھ ملک کے معاملات اور مقاصد میں بڑی تیزی کے ساتھ انقلاب ہو رہا تھا لیکن مسلمان اب تک پرانے ڈھرے پر چلے جا رہے تھے، اس دور کے مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھی، جو تعلیمی مسائل کے علاوہ بعض دوسرے معاملات میں بھی مسلمانوں کی ترجمانی کرتی تھی، وہ بھی اسی پرانے ڈھرے پر گام زن تھی، سید صاحب اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اب جب کہ قوم کا مطمح نظر بدل چکا ہے، خیالات میں انقلاب، مقاصد میں تغیر اور حالات میں تبدیلی نمایاں ہے تو ضرورت ہے کہ ہماری پرانی قومی مجلسوں کے ان مطالبات میں بھی

انقلاب، تغیر اور تبدیلی ظاہر ہو، بہت سی باتیں آج سے تیس چالیس برس پیش تر ضروری تھیں، وہ اب بے سود ہوگئی ہیں اور بہت سی باتیں جو پہلے بے سود معلوم ہوتی تھیں اب ضروری ہوگئی ہیں، بہت سی چیزیں جو پہلے ناممکن تھیں ممکن ہوگئی ہیں، بہت سے ناممکنات نے اب ممکنات کی صورت اختیار کرلی ہے، اس لیے اسی دلیل کی بنا پر جو اس تعلیمی مجلس کی سب سے پر زور اپیل تھی کہ

ع زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز

اس میں زمانہ کے مطابق تغیر اور تبدیلی کی حاجت ہے۔

ہمارا یہی خیال ندوۃ العلما کے متعلق بھی ہے کہ اب جب کہ علما کے حالات میں تغیر ہو گیا ہے، جمعیۃ العلما قائم ہو چکی ہے، بلاد اسلامیہ سے تعلق ممکن ہوگیا ہے، اشاعت اسلام کی انجمنیں کام کررہی ہیں، مدارس نئے اصول پر چلائے جارہے ہیں، ضرورت ہے کہ ایک دفعہ بیٹھ کر روشن خیال اور روشن ضمیر علما اس کے بنیادی مقاصد پر ایک تنقیدی نظر ڈال لیں اور اس کے لیے ایک سالانہ اجلاس کی حاجت ہے لیکن کہاں؟

تعلیمی کانفرنس (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) کا نظام اجلاس اس دفعہ شائع ہوا ہے، اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رکن اس نکتہ کو سمجھ گئے ہیں لیکن یہ تغیر اس طرح کیا جانا شاید ان کو منظور خاطر ہے کہ تعلیمی مجلس کو علمی مجلس کی ہیئت میں تبدیل کردیا جائے، چنانچہ اجلاس آئندہ کے مطبوعہ نظام نامہ میں زیادہ تر علمی تقریروں اور خطبوں کی کثرت نظر آتی ہے، اس کے بعد کچھ ''جدید تعلیمی آلات کی نمائش'' کو جگہ دی گئی ہے، تعلیمی نمائش تو اس نمائش گاہ میں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے، ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کانفرنس کی کوشش سے کتنے اسکول کھلے، کتنے مدرسے قائم ہوئے، کتنے طلبہ نے وظیفے پائے، کن کن تاریک مقامات میں کانفرنس کے سفرا نے ٹکٹ فروخت کرنے کے علاوہ تعلیم کی روشنی پھیلائی اور مسلمانوں کو ادھر رغبت دلائی، یہ الفاظ دردمندی سے نکلے ہیں، طعن وطنز اور اعتراض و جواب ان کا مقصود نہیں۔

علمی حیثیت سے کانفرنس کا یہ اجلاس بشرطے کہ مردہ اور فرسودہ تجاویز اور رزولوشنز کو

حسب دستور امسال اول جگہ نہ دی گئی تو یقیناً نہایت دل چسپ اور مفید ہوگا اور ہماری زبان اور ملک میں معلومات کا نہایت عمدہ ذخیرہ مہیا کرے گا، علم دوست اصحاب سے قدر دانی اور قدر افزائی کی امید ہے لیکن کیا کانفرنس کے لیے سوچنے کی بات نہیں کہ اس کے اجلاس کا زمانہ اب بدل جانا چاہیے، آخر مسلمانوں کو کانگریس سے روکنے کے لیے اس کو اسی زمانہ میں منعقد کرنے پر کب تک عمل ہوگا۔" (شذرات، معارف دسمبر ۱۹۲۳ء)

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے خطبہ صدارت پر تبصرہ اور بعض تعلیمی مشورے: کانفرنس کے اس اجلاس کے صدر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے، جنوری کے معارف میں ان کے خطبہ صدارت پر ناقدانہ تبصرہ کیا اور مسلمانوں کی ملی ضروریات کے پیش نظر بعض مفید تعلیمی مشورے دیے، جنوری ۱۹۲۴ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

"علی گڑھ اسلامی تعلیمی کانفرنس کا خطبہ صدارت نہایت جامع تھا، مگر مانع نہ تھا، اس کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ علمی، تعلیمی، سیاسی، مذہبی غرض جس اسٹیج سے بھی اس کو پڑھا جاتا اس کے لیے موزوں ہوسکتا تھا، حتی کہ اگر سرسید مرحوم کی برسی کے دن بھی اس کو پڑھا جاتا تو اس کی موزونی میں فرق نہ آتا، عبدیت و نیابت الٰہی کا فلسفہ جو صاحب زادہ صاحب کا خاص موضوع سخن ہے، وہ بھی اس خطبہ میں پوری طرح موجود تھا۔

خطبہ میں بعض باتیں عمیق فکر و کاوش کا نتیجہ تھیں اور اس کے لیے بہت سے مشوروں سے ہم کو کامل اتفاق ہے، تاہم ہم یہ یقین نہ کر سکے کہ جدید تعلیم ہی ہمارے تمام امراض کا واحد علاج ہے اور تمام قوم اور قومی کام کرنے والوں میں جو کچھ ذہنی، دماغی، جسمانی اور مالی قوت و ستطاعت ہے وہ تعلیم اور صرف تعلیم کی راہ میں صرف کرنا چاہیے، صاحب زادہ صاحب کا یہ مشورہ ہے کہ قوم کا ہر فرد سب کچھ چھوڑ کر حافظ کے مشورے کے مطابق یہ کہتا ہوا صرف جدید تعلیم کی اشاعت میں لگ جائے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

لیکن مشکل یہ ہے کہ جدید تعلیم کے اب ایسے باوفا عشاق سے ہندوستان کی دنیا خالی ہوگئی۔

صاحب زادہ صاحب نے اس امر پر اپنی پورشش صرف کردی ہے کہ سرسید کے علمی، تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور روحانی عقائد کو اس خطبہ میں پوری تفصیل وتشریح کے ساتھ یک جا کردیا جائے تا کہ ''مرتدین'' کے شکوک وشبہات دور کر کے از سرنوان کو سرسید کے مذہب کی دعوت دی جائے، اس مذہب کے چند عقائد کو نمبروار صاحب زادہ صاحب نے یک جا کیا ہے اور ان کو ''غیر متزلزل یقین'' کے ساتھ تسلیم کرنے کا قوم کو مشورہ دیا ہے، گو چند سال پہلے ان پر لوگ بے دلیل ایمان رکھتے تھے مگر کیا کیا جائے، اب قلوب ایسے بدل گئے ہیں کہ ان پر زوردلیلوں سے بھی ان پر ایمان لاتے نہیں بنتا، ہم کو یہ اعتراف ہے کہ صاحب زادہ موصوف سرسید کی شریعت کے بہترین مبلغ ہیں، تاہم اب ان کو خود ''غیر متزلزل یقین'' پیدا کرلینا چاہیے کہ اب وہ شریعت ہمیشہ کے لیے منسوخ ہوچکی اور جس طرح سرسید نے اپنے پہلوں کی طرز روش اور مقصد تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت سمجھی تھی، چالیس برس کے بعد اب ان کے نائبین کو بھی ان حالات میں تبدیلی کی حاجت ہے۔

بایں ہمہ ہم تو مسلم یونیورسٹی پر یہ خدا کی رحمت سمجھتے ہیں کہ صاحب زادہ صاحب امسال یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہوئے، یاد ہوگا اب سے دو سال پہلے معارف کے ان ہی صفحات میں ہم نے صاحب زادہ صاحب کو اس منصب کا بہترین حق دار لکھا تھا کیوں کہ اس جماعت میں ان سے بہتر کوئی شخصیت نہیں، ہم نے اس خبر کو بھی نہایت حیرت کے ساتھ سنا کہ صاحب زادہ صاحب نے انتظام کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ اصلاحات کا آغاز کردیا ہے، بڑی ضرورت اس کی ہے کہ قوم اور یونیورسٹی کے درمیان بے گانگی کی جو خلیج حائل ہوگئی ہے، اس کو پاٹا جائے اور اس خواب کو پورا کیا جائے جو سر سید مرحوم نے خود دیکھا تھا اور قوم کو دکھایا تھا، شبلی مرحوم کے خواب کی تعبیر ملنے کا زمانہ تو ابھی بہت دور ہے یعنی:

ع کہ ایں سررشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

صاحب زادہ صاحب نے یہ سوال نہایت بروقت کیا ہے کہ مسلمانوں کو اس شدید ضرورت کے ایام میں جب شدھی اور سنگھٹن کی مشکلیں پیدا تھیں اور ہیں کیا وجہ ہے کہ ایک طرف ہندوؤں میں بیسیوں بی، اے، ایم، اے، ایل، ایل، بی بیرسٹر اپنی سادہ اور محنت کش زندگیوں کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت میں اس سرے سے اس سرے تک لگے ہوئے ہیں، دوسری طرف مسلمانوں میں ان کاموں کے لیے ایک مسلمان گریجوئٹ بھی نظر نہیں آتا (الا ماشاء اللہ)، صاحب زادہ صاحب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں چوں کہ جدید افراد کم ہیں اور دوسروں میں زیادہ ہیں اس لیے یہ صورت حال ہے، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی میں طلبہ کو بھیج کر اپنے گریجویٹوں کی تعداد بڑھائیں لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس اختلاف حال کی وجہ کیت اور تعداد کی کمی بیشی ہے، اگر آج کسی اعجاز سے مسلمان گریجویٹوں کی تعداد دونی بھی ہو جائے مگر اس کی تعلیم و تربیت کی ذہنی و نفسی کیفیت یہی رہے تو بھی صاحب زادہ صاحب کو یہی افسوس ناک منظر نظر آئے گا، کامیابی کا ذریعہ تعداد کی قلت و کثرت نہیں، بلکہ ایمان کا ضعف وشدت ہے۔

کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله۔ (شذرات معارف جنوری ۱۹۲۴ء)

دارالعلوم ندوۃ العلما کی معتمدی اور اس کی اصلاح و ترقی: دارالعلوم ندوۃ العلما سے سید صاحب کا تعلق ہمیشہ قائم رہا، مجلس انتظامیہ کے رکن کی حیثیت سے برابر اس کی رہنمائی فرماتے اور معارف میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو اس کی طرح توجہ دلاتے رہتے تھے، لیکن اس زمانہ میں ندوہ اس سے زیادہ ان کی توجہ کا محتاج تھا اور مولانا شبلی کی علاحدگی کے بعد سے ندوہ میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو سید صاحب ہی پر کر سکتے تھے، سوء اتفاق سے ۱۹۲۳ء میں مولانا حکیم سید عبدالحیٰ صاحب کا جو بڑی دل سوزی سے ندوہ کا کام انجام دیتے تھے، دفعتہً فالج میں انتقال ہو گیا، اس سے اور بھی کمی ہو گئی، ان کی وفات کے بعد نواب سید علی حسن خاں ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے اور تعلیم کی نگرانی اور اس کی اصلاح و ترقی کے لیے جانشین شبلی ہی پر نگاہ پڑی اور سید صاحب کو معتمد تعلیم مقرر کیا گیا۔

انہوں نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں مختلف حیثیتوں سے ندوہ کی تجدید و اصلاح کی ،نصاب تعلیم میں ضروری اصلاح وترمیم فرمائی ،تعلیم کے لیے لائق اساتذہ کا انتخاب کیا، عرب دنیا کے نامور ادیب تقی الدین ہلالی مراکشی جنہوں نے ندوہ کو عربی زبان وادب کی تعلیم کا مرکز بنادیا، ان ہی کے دور میں آئے ،تعمیری حیثیت سے بعض نئی عمارتوں کا اضافہ ہوا، اس کی تفصیل ندوہ کی روداد وں میں موجود ہے۔

دارالمصنّفین کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کا قیام مستقل لکھنؤ میں نہیں رہ سکتا تھا، لیکن مہینہ دو مہینہ کے بعد پابندی سے جاتے رہتے تھے۔

ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں: ندوہ کی شہرت اور آمدنی کا بڑا ذریعہ اس کے سالانہ اجلاس تھے جو کئی سال سے نہیں ہوئے تھے، اس سے اس کی آمدنی اور شہرت دونوں پر اثر پڑا، اس لیے سید صاحب نے پابندی سے سالانہ اجلاس کے انعقاد کا اہتمام کیا اور ۱۹۲۵ء میں اس کا سالانہ اجلاس مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی صدارت میں ہوا، اس اجلاس میں دارالاقامہ کی تعمیر کے لیے ہر صوبہ سے پندرہ ہزار کی رقم کی فراہمی کی تجویز پاس ہوئی، سید صاحب نے خود بہار کے دیہاتوں کا دورہ کیا اور اس کے لیے معقول رقم فراہم کی، اس کی تفصیل اس اجلاس کی مطبوعہ روداد میں موجود ہے اور سید صاحب بھی مارچ ۱۹۲۵ء کے معارف میں تحریر فرمائی ہے:

> ”۹ر،۱۰ر،۱۱ر فروری ۱۹۲۵ء کو ندوۃ العلما کا انیسواں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا، اخبارات میں آپ نے اس کی روداد یں پڑھی ہوں گی، عام شائقین کے اجتماع کے لحاظ سے تو ہم اس کو کامیاب نہیں کہہ سکتے لیکن علما، خواص اور اصحاب درد کی شرکت کے لحاظ سے یقیناً ایک کامیاب کوشش رہی، قوم نے اپنے چند مخلصوں کی کوشش کے نتائج دیکھے اور اطمینان ظاہر کیا اور امداد کا وعدہ کیا، یہ سب سے بڑی کامیابی تھی جو اس اجلاس عام کو حاصل ہوئی۔
>
> ندوۃ العلما کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت دارالاقامہ کی تعمیر ہے، اس کے لیے

یہ قرار پایا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کی طرف سے دس دس کمروں کا ایک بلاک تیار کیا جائے، جن میں سے ہر کمرہ پر ڈیڑھ ہزار لاگت آئے گی، اس طرح ہر صوبہ کے مسلمانوں سے پندرہ ہزار کا مطالبہ کیا جائے، شکر ہے کہ یہ آواز بے اثر نہ رہی اور ہر صوبہ کی طرف سے متعدد اکابر نے اس پر پرجوش آمادگی ظاہر کی، بمبئی کی طرف سے مولانا شوکت علی نے، پنجاب سے مولانا عبدالقادر قصوری اور سید غلام بھیک نیرنگ نے، بہار کی طرف سے مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی اور مولوی لطف اللہ خلف شیخ وقت مولانا محمد علی مونگیری سابق ناظم ندوۃ العلماء نے، مدراس سے مولوی سید مرتضیٰ صاحب نے، صوبہ متحدہ سے جناب حافظ محمد حلیم صاحب تاجر کان پور نے، اودھ کی طرف سے منشی محمد احتشام علی صاحب نے ایک سال کے اندر رقم کے پورا کردینے کا وعدہ کیا، علاوہ بریں جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے دس ہزار کی رقم جمع کردینے کا وعدہ فرمایا۔

ہم نے اب تک قوم سے کوئی عام چندہ نہیں مانگا ہے لیکن اب خود قوم کی ضرورتیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم بھی کاسۂ گدائی لے کر نکلیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ جس تکلیف و مصیبت کے ساتھ دارالاقامہ کے نہ ہونے سے دارالعلوم میں زندگی بسر کر رہے ہیں شاید انگریزی کا ایک طالب علم بھی اس طرح نہ رہتا ہوگا، اگر ہم کو اپنی دنیاوی تعلیم کا بشدت احساس ہے تو کیا اپنی دینی تعلیم کا اتنا بھی احساس نہیں کہ اس کی تعلیم کے طلب گاروں کے رہنے کے لیے ایک جھونپڑا بھی نہ بنا سکیں، مسلمانوں نے اپنے جوش کے عالم میں لاکھوں روپے دے دیے ہیں لیکن کیا ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر چند ہزار کا سرمایہ بھی فراہم نہیں کر سکتے؟ عن قریب اس رقم کی فراہمی کے لیے ہر صوبہ میں تحریک شروع کی جائے گی، امید ہے کہ ہمدرد اصحاب اپنی علمی توجہ سے ایک ایسی درس گاہ کو نیم جانی سے بچائیں سے جس سے ملک وملت کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔'' (معارف مارچ ۱۹۲۵ء)

مدراس میں سیرت النبیؐ پر خطبات: اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس کی تعلیمی اسلامی انجمن کی دعوت پر مدراس کا سفر کیا اور سیرت نبویؐ پر آٹھ خطبات دیے، جو خطبات مدراس کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، یہ خطبات سیرت النبیؐ کا جوہر اور عطر ہیں، اس سفر کی

مفصل روداد اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء کے معارف میں لکھی ہے، جو مدراس کے مسلمانوں کے متعلق بہت مفید معلومات پر مشتمل ہے، ہم نومبر کی روداد کا ضروری حصہ نقل کرتے ہیں:

''سوا مہینہ مدراس کے قیام کے بعد میں ۹ نومبر کو دارالمصنفین واپس آ گیا، شہر مدراس میں جنوبی تعلیمی اسلامی انجمن کے زیر اہتمام مسلمان طلبہ کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق مسلسل آٹھ خطبے دیے، ان خطبوں کے خلاصے وہاں کے انگریزی اخبارات ہندو اور ڈیلی ایکسپریس میں برابر نکلتے رہے اور دلچسپی سے سنے اور پڑھے گئے، اکثر حضرات کا اصرار ہے کہ ان خطبات کو علاحدہ رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا جائے، اس اصرار کی تعمیل کا خیال پیش نظر ہے۔

شہر مدراس کے علاوہ اس سلسلہ میں بنگلور میں تین خطبے اور وانمباڑی میں دو، ترپانور میں ایک خطبہ مختلف مذہبی عنوانات پر دیے گئے، بنگلور میں دین کامل کے عنوان پر پہلا خطبہ بہت بڑے مجمع میں دیا گیا، جس میں عام مسلمانوں کے علاوہ ریاست میسور کے بعض بڑے ہندو عہدہ دار بعض انگریز اور بنگلور کے اکثر تعلیم یافتہ اصحاب شریک تھے، ایک مسلمان یورپین خاتون جن کا اسلامی نام زینب ہے، وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ جلسہ میں شریک تھیں اور باوجود اردو کم سمجھنے کے بہت غور سے تقریر سنتی رہیں، میری تقریر سے پہلے میسور یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر واڈیا جو پارسی ہیں اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایک پر مغز تقریر نہایت فصیح و بلیغ انگریزی میں کی، اسلام کی اس خود رو اشاعت کو دیکھ کر حیرت کی ضرورت نہیں کہ آفتاب کی روشنی دنیا میں خود چمکتی ہے۔

بنگلور میں میری دوسری تقریر ''زندہ نبی'' کے عنوان پر ہوئی، لوگوں نے غلط فہمی سے سمجھا کہ اس موضوع کے تحت میں ''حیات نبی'' کے پرانے مسئلہ پر شاید گفتگو کی جائے مگر تقریر کے بعد معلوم ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نبی ہونے کے کیا معنی تھے، تقریر میں ثابت کیا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سیرت، اپنی کتاب، اپنی سنت اور اپنی تعلیم کے لحاظ سے زندہ ہیں، اس لیے کسی دوسرے مدعی نبوت کے لیے اس دنیا میں جگہ نہیں۔'' (معارف نومبر ۱۹۲۵ء)

انبالہ کا اجلاس: لکھنؤ اجلاس سے ملک کی توجہ ندوہ کی جانب شروع ہو گئی تھی، مختلف

شہروں اور صوبوں سے اس کے سالانہ اجلاس کے دعوت نامے آنے لگے، چنانچہ لکھنؤ کے اجلاس ہی کے موقع پر تین مقامات علی گڑھ، کان پور اور انبالہ سے دعوت نامے آئے، ان میں زندہ دلان پنجاب کا دعوت نامہ منظور کیا گیا اور نومبر ۲۵ء میں حاجی سر رحیم بخش کی صدارت میں بڑے اہتمام سے انبالہ میں اجلاس منعقد ہوا، اس کی روداد کتابی صورت میں چھپ چکی ہے، سید صاحب نے بھی دسمبر ۲۵ء کے معارف میں مختصر روداد تحریر فرمائی، وہ لکھتے ہیں:

''نومبر کی ۲۸، ۲۹ کو ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس شہر انبالہ میں منعقد ہوا، پرانی اصطلاح کے مطابق ایک جلسہ کی کامیابی کے جو شرائط ہیں وہ بہمہ وجوہ مکمل تھے، سوسوا سو مہمان بھی تھے، علما و واعظین کا بھی مجمع تھا، قومی کارکنوں اور رہبروں کی جمعیت بھی تھی، ڈائس پر معززین کی نشست بھی تھی، استقبال کے جلوس بھی تھے اور اسلامیہ اسکول انبالہ کے بوائے اسکاؤٹس کی خوب صورت مگر پر ہیبت صفیں بھی تھیں، مگر ان تمام محاسن نظر کے ساتھ جو چیز سب سے زیادہ دل کش اور مسرت افزا تھی وہ مختلف الخیال علمائے دین اور رہبران کامل کا دوش بدوش اجتماع تھا، جس کا منظر یوں بھی اور خصوصاً ان دنوں مسلمان دیکھنے کو ترستے تھے۔

علما میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد صاحب جونا گڑھی، مولانا حافظ احمد سعید صاحب، ناظم جمعیۃ العلما، مولانا مناظر احسن صاحب استاذ الحدیث جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، مولانا مفتی عبد اللطیف صاحب، استاذ التفسیر جامعہ عثمانیہ، صدر یار جنگ مولانا شروانی، نواب حسام الملک مولوی سید علی حسن خاں، مولانا عبد الماجد صاحب بی۔ اے، دریابادی، مولانا فاخر الہ آبادی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب پٹیالوی مصنف رحمۃ للعالمینؐ، مولوی حاجی سر رحیم بخش صاحب، مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا حاجی حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوۃ العلما، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری، مولانا قاری عبد السلام صاحب عباسی، مولانا عبد الرحیم صاحب ریواڑی مدرس عربی، سید عطاء اللہ شاہ صاحب

بخاری، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، مصنف ایجوکیشنل کانفرنس، مولانا شاہ نظام الدین پھپھوری، مولوی عقیل الرحمٰن ندوی سہارن پوری، مولوی فضل قدیر صاحب ندوی، مہتمم مدرسہ اسلامیہ، مولوی محمد حسن صاحب ندوی واعظ، مولوی عبد الغفور صاحب ندوی اور خادم العلما سید سلیمان ندوی، رہبران قوم اور معززین میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو، منشی سید شمس الدین صاحب سابق سکریٹری، انجمن حمایت اسلام لاہور، آنریبل شیخ عبد القادر صاحب، غازی عبد الرحمٰن صاحب، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، نواب زادہ صاحب کرنالی، منشی وحید الحسن صاحب رئیس اناؤ اور دیگر اعیان واکابر موجود تھے۔

جلسہ میں عام دستور کے خلاف تین تجویزیں پیش ہوئیں، ایک دارالاقامہ کی تعمیر کے ہر صوبہ سے پندرہ ہزار کا مطالبہ اور دوسری تجویز جس کو ندوۃ العلما کے اس اجلاس کا حاصل کہنا چاہیے، حسب ذیل تھی:

ندوۃ العلما بیس سال سے جماعت علمائے کرام اور عامۃ المسلمین کی خدمت میں یہ دعوت پیش کر رہا ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے فرقہ وارانہ نزاع اور مذہبی بحث ومباحثہ کے غلط طریقوں کو جن سے ملت کی پراگندگی اور انتشار کو ترقی ہوتی ہے، بند کر دیں، اس لیے یہ مجلس اس وقت جماعت علما اور عام مسلمانوں میں جو بعض مذہبی تنازعات غلط طریقہ سے پھیل رہے ہیں، ان پر سخت افسوس ظاہر کرتی ہے اور استدعا کرتی ہے کہ مسلمانوں میں اس رسوا کن فرقہ پروری سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سید سلیمان نے اس تجویز کو پیش کیا اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری، مولانا عبدالرحیم صاحب ریواڑی، مولانا ثناءاللہ امرتسری اور قاضی محمد سلیمان صاحب نے اس کی تائید کی۔

تیسری تجویز اگر انجام کو پہنچ جائے تو اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت ہو، پنجاب اور اودھ کے بعض اضلاع اور بمبئی کی بعض قومیں ترکہ اور میراث میں اصول اسلام کے بجائے رسم و رواج کو شریعت قرار دیتی ہیں، پنجاب جیسے خطہ میں شریعت اسلامیہ کی یہ توہین حد درجہ افسوس کے

قابل ہے، قاضی محمد سلیمان صاحب نے اس تجویز کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا اور مسلمانان پنجاب سے درخواست کی کہ وہ اس قابل شرم رواج کو چھوڑ کر شریعت اسلام کو اپنا اصول بنائیں اور ضرورت ظاہر کی کہ قانونی حیثیت سے ندوہ اس کے متعلق عملی کارروائی کرے اور مسلمانوں میں اس کے لیے باقاعدہ تبلیغ و وعظ کا کام انجام دے، بات تو یہ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کام جس قدر باہر سے کرنے کا ہے اس سے زیادہ خود مقامی علما کو ادھر متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں لدھیانوی نے اپنی تائیدی تقریر میں اس کی جانب توجہ دلائی۔

پنجاب میں ندوہ کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا کام ڈاکٹر کچلو، عبدالرحمٰن غازی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، میر شمس الدین صاحب، میر غلام بھیک صاحب نیرنگ اور مولانا داؤد غزنوی نے اپنے ذمہ لیا، ہمارے مخدوم مولانا عبدالقادر صاحب قصوری اس مجلس کے صدر اور میر نیرنگ صاحب اس کے سکریٹری ہوں گے، یہ ارکان پنجاب میں دورہ کر کے ۱۵ ہزار کی رقم بالفعل فراہم کریں گے۔"

اجلاس کان پور: نومبر ۱۹۲۶ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس حافظ حلیم صاحب رئیس تاجر کان پور کی دعوت پر حکیم اجمل خاں کی صدارت میں کان پور میں منعقد ہوا، یہ اجلاس بھی نہایت کامیاب رہا، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ندوہ کا یہ اکیسواں سالانہ اجلاس تھا، زمانہ کے انقلاب اور حالات کے تغیر نے گو اب پرانی مجلسوں کی وہ رونق قائم نہیں رکھی، تاہم ان کے مقاصد اور ضرورتوں کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ابھی تک ویسے ہی ہیں، ندوۃ العلما کا مقصد علما میں اتحاد و اتفاق و رواداری پیدا کرنا، عربی مدارس میں اصطلاحات رائج کرنا، نصاب تعلیم میں ضرورت زمانہ کے مطابق اصلاح و ترمیم، علما کو جدید علوم و مسائل سے آگاہ کرنا، ایک عظیم الشان مشرقی کتب خانہ کی فراہمی، اسلام کی اشاعت و تبلیغ، ایک دارالافتا کا قیام، مسلمانوں کے مذہبی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے جدوجہد۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ندوۃ العلما نے اپنے تمام مقاصد میں پوری پوری کام یابی

حاصل کرلی، تاہم اس کی دعوت وتبلیغ اور تحریر وتقریر نے علما کے مختلف فرقوں کو ملایا اور ان کے خیالات کو بلند کیا، ان کو اصلاحات سے مانوس کیا، اس نے اپنا ایک مدرسہ بنایا اور تقریباً تیس برس سے اس کو چلا رہا ہے، اس نے اپنی تعلیم کے نمونے بھی پیش کیے، کتب خانہ بھی فراہم کیا اور دارالافتا بھی قائم ہوا، مسلمانوں کے مذہبی فلاح و بہبود کے متعدد کام کیے، جن میں ایک وقف علی الاولاد کی کارروائی ہے، اشاعت وتبلیغ کے کاروبار کو اس نے دو تین دفعہ کھولا اور بند کیا، کیوں کہ مسلمانوں نے ہمت نہ بندھائی۔

بہرحال وہ اپنے مقاصد کی تکمیل واتمام کے لیے ہر وقت آمادہ ہے، مگر ہر قدم پر سوال سرمایہ کا آتا ہے، اس وقت چندے اسی انجمن کو مل سکتے ہیں جو اپنی تبلیغ سب سے زیادہ کرے مگر علما اب تک اس مغربی طرز تبلیغ سے محروم ہیں، اس لیے سرمایہ کی طرف سے ان کی تمام مذہبی انجمنیں اور درس گاہیں غیر مطمئن ہیں، اب یا تو علماء اپنے طرز وطریقہ میں تبدیلی کریں یا مسلمان اپنے احساس کی تیزی اور شدت کا ثبوت دیں ورنہ خطرہ سامنے ہے۔

اس وقت ملک میں تین خالص قومی درس گاہیں ہیں، خالص مذہبی دیوبند، دنیوی مذہب آمیز جامعہ ملیہ، مذہبی دنیا آمیز دارالعلوم ندوہ، قوم کو ان میں سے کسی نہ کسی سے تو دل چسپی ہونی چاہیے، مگر جا کر دیکھو تو ہر جگہ تمہاری غفلت کا ماتم اور تمہاری بے بسی کا رونا ہے، فوری اور عارضی مذہبی باتوں پر تمہارا جوش ضرب المثل ہے، مگر مستقل اور پائیدار کام جس سے تمہاری اصلاح وترقی ہو سکتی ہے، اس کی طرف سے بے گانگی بھی تمہاری سرشت بن رہی ہے، کیا ادھر توجہ ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر تم جان قربان کر سکتے ہو مگر ان کے کام اور پیغام کے لیے روپے کی ایک تھیلی دے سکتے ہو؟ گرز رطلبی......

ندوۃ العلما کا اجلاس کان پور میں تین دن قائم رہا، اطراف سے علما، روسا، معززین اور عام مسلمانوں کا اچھا خاصہ مجمع تھا، جناب حافظ حلیم صاحب استقبالیہ کے صدر تھے اور جناب مسیح الملک حافظ اجمل خاں صاحب اجلاس کے صدر تھے، شرکا میں علمائے کرام، ماہرین تعلیم مختلف

اسلامی اسکولوں اور مدرسوں کے منیجر، مہتمم، رہنمایان قوم، وکلا، رؤسا، اخبارات کے ایڈیٹر، کونسلوں کے ممبر، غرض ہر طبقہ اور درجہ و خیال کے مسلمان شریک تھے، بندیل کھنڈ کے مسلمان کثرت سے آئے تھے۔

صدر استقبالیہ نے ندوۃ العلما کے مقاصد اور نتائج پر دل کش طرز ادا [illegible] اور صدر اجلاس نے ہندوستانی مسلمانوں کے بعض ضروری مذہبی مسائل کو اختصار [illegible] علما اور قوم کے سامنے پیش کیا اور خواہش ظاہر کی کہ علمائے کرام اس بارہ میں عام مسلمانوں کو مذہبی احکام سے مطلع کریں اور موجودہ مشکلات پر غور کریں، عن قریب یہ سوال استفتا کی صورت میں علما کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور ان کے جواب چھاپ کر شائع کیے جائیں گے۔

جلسہ کے مختلف اجلاسوں میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب پٹیالوی مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا محمد علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا غلام احمد صاحب شملوی، مولانا عبدالرحیم صاحب ریواڑی اور سید سلیمان ندوی نے مختلف عنوانات اور تجویزوں پر تقریریں کیں، دارالعلوم کے دو طالب علموں نے، ایک نے عربی میں اور ایک نے اردو میں تقریر کی اور لوگوں نے پسند کی، مولوی ابوالجلال صاحب ندوی نے مذہب کے نفسیاتی فلسفہ پر اور جناب قادری صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول کان پور نے عربی زبان کی فیلالوجی (علم الاشتقاق) اور فضائل پر خطبے دیے جن کو خواص نے نہایت پسند کیا، منشی واحد علی صاحب امیر قدوائی و سابق میر منشی رام پور، جناب وحشی بلگرامی اڈیٹر مرقع اور حافظ فضل حق صاحب عظیم آبادی نے اپنی نظمیں سنائیں۔

ندوہ میں ابھی تجویزوں کی بیماری بہت کم ہے، تعزیت اور تہنیت کے علاوہ باقی تین تجویزیں تھیں، ایک علما اور مسلمانوں میں اتحاد اور باہمی رواداری کے متعلق دوسری عورتوں کے حقوق وراثت کے متعلق اور تیسرے دارالعلوم کی تعمیرات کے لیے دو لاکھ کی اپیل جس کو [illegible] کچلو نے قوم کے سامنے پیش کیا۔

اس اپیل کے جواب میں حاضرین کی طرف سے پہلے خود شرکا نے اپنے چندے لکھوائے، جن میں بڑی رقمیں حسب ذیل تھیں، حافظ محمد حلیم صاحب ڈھائی ہزار، مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب ایک ہزار، نواب سید محمد علی حسن خاں صاحب ناظم ندوۃ العلما پانچ سو، منشی محمد احتشام علی صاحب معتمد مال ندوۃ العلما پانچ سو، جناب قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی پانچ سو، ہم جیسے غریبوں کی رقمیں جو قابل اظہار نہیں، وصول ہوگئیں کل موعودہ رقم ملا کر چھ سات ہزار کی رقم ہوئی۔" (شذرات، معارف نومبر ۱۹۲۶ء)

دوسرے تعلیمی کام، ندوہ کی اصلاحی تحریک کی کام یابی : عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کی تحریک کی کام یابی : کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں تغیر وتبدل اور تجدید واصلاح کا جو غلغلہ ندوہ نے آج تیس سال سے برپا کر رکھا ہے، مقام شکر ہے کہ اب وہ مفید اثر پیدا کر رہا ہے، صوبہ متحدہ کے امدادی عربی مدارس میں ہمارے ولی دوست مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم، اے انسپکٹر مدارس عربیہ کی مسلسل کوششوں سے ایک اہم نتیجہ تک یہ اصلاح پھیل رہی ہے، باقی غیر امدادی عربی مدارس تو وہ بھی زبان کی خاموشی یا انکار کے ساتھ عملاً دل سے اس کی طرف آہستہ آہستہ آرہے ہیں، اسی کے ساتھ یہ مسرت افزا پیام بھی ہے کہ احاطہ مدراس کے علما غالباً اسی مہینہ کے کسی ہفتہ میں جنوبی ہند کے سب سے مشہور اور اہم مدرسہ باقیات الصالحات کی دعوت پر اس کے لیے جمع ہوں گے کہ وہ اصلاح نصاب کے مسئلہ پر غور کریں اور احاطہ مدراس کے تمام مدارس میں ایک متحدہ اصلاحی نصاب جاری کریں، ۴ر شوال کو بہار میں علمائے صوبہ بہار کا ایک جلسہ ہونے والا ہے جس میں اسی مسئلہ نصاب پر متفقہ بحث وتمحیص ہوگی اور صوبہ کے کل عربی مدارس کی تنظیم ہوگی، اسی کے ساتھ سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون صاحب اپنے ایک والا نامہ میں یہ مژدہ سناتے ہیں کہ انہوں نے سندھ کے دارالصدر کراچی میں جو جامعہ اسلامیہ قائم کیا ہے وہ اب بڑھ کر تمام سندھ کو احاطہ کرنے والا ہے اور اسی ضمن میں عربی مدارس کی اصلاح وتنظیم بھی ہوگی، اب ہم اپنے صوبہ پر نظر ڈالتے ہیں، جس کا نام برعکس نہند کافور متحدہ

رکھا گیا ہے، حالاں کہ اسے مختلفہ کہنا چاہیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک علم کا دوسرے کے نیچے آنا تقریباً محال ہے، اس لیے یہاں تمام مدارس کا متحدہ نظام میں داخل ہونا ناممکن ہے۔

ہمارے صوبہ میں چار بڑے عربی مدارس ہیں، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوہ، نظامیہ فرنگی محل، شمس العلوم بدایوں اور بھی شاید دو ایک ہوں گے، اگر ان تمام مدارس کے مدرسین و منتظمین ایک متحدہ کانفرنس تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لیے کہیں یک جا ہوں تو تمام ملک کے عربی مدارس اس سے متاثر ہوں گے اور بہت سے مفید امور انجام پائیں گے، فهل من مدكر۔

صرف کان پور اور دہلی میں چھوٹے بڑے جتنے عربی مدارس ہیں، اگر صرف ان دو شہروں کے عربی مدارس کو متحد و منظم کیا جائے تو بڑی اصلاح ہو جائے اور اس کے بجائے کہ ہر محلہ کی مسجد میں ایک الگ مدرسہ ہو، اگر شہر میں یک جائی قوت سے سب کو ملا کر صرف ایک دو مدرسے قائم کر دیے جائیں تو منتظمین کی پریشانیاں دور ہو جائیں، طلبہ آرام پائیں اور مدرسین مطمئن ہوں، دہلی کا ایک مدرسہ جس کی ماہوار آمدنی ہزار روپے سے زیادہ ہے اور ہزاروں کی رقم اس کے پاس جمع ہے، اگر درست ہو جائے تو دہلی کے دوسرے مدرسوں کو چرم قربانی اور سورت و رانڈیر کے تاجروں کی دست نگری سے نجات مل جائے۔'' (معارف، اپریل ۱۹۲۵ء)

سرکاری عربی تعلیم کے نتائج اور اس کی اصلاح کی ضرورت: انگریزی اسکولوں کا تو مقصد ہی حکومت کے مصالح کے مطابق تعلیم تھی، اس لیے اس کا قومی مصالح سے خالی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی لیکن حکومت نے عربی اور مذہبی تعلیم کو بھی بے اثر کرنے کے لیے مشرقی علوم کی خدمت اور سرپرستی کے بہانے عربی کے سرکاری اور امدادی مدارس اور عربی و فارسی کے امتحانات کا ایک جال بچھا دیا، اس کی سندیں سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی عربی و فارسی کی مدرسی کے لیے کارآمد تھیں، اس لیے ان امتحانات سے عربی و فارسی کی تعلیم کی اشاعت تو ضرور ہوئی لیکن وہ دینی روح سے بالکل خالی اور محض حصول معاش کا ذریعہ بن کر رہ گئی تھی، صوبہ متحدہ میں دینی تعلیم کے بڑے بڑے آزاد دارالعلوم موجود تھے، اس لیے یہاں

بڑی حد تک دینی تعلیم اپنی خصوصیات کے ساتھ قائم رہی لیکن دوسرے صوبوں خصوصاً بنگال میں اس کی حالت نہایت ابتر تھی، یہاں کے کل مدارس مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نظام میں جکڑے ہوئے تھے اور دینی روح سے بالکل خالی تھے، سرکاری تعلیم کے مقاطعہ کے سلسلہ میں عربی کے سرکاری و امدادی مدارس پر بھی حملہ کیا گیا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلما نے سرکاری امداد کی واپسی میں پیش قدمی کی، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''عدم تعاون اور ترک موالات کے مسئلہ نے ہندوستان کے سطح تعلیمی میں جو زلزلہ پیدا کر دیا ہے اس سے عربی مدارس بھی غیر متاثر نہ رہے، مدرسہ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، مدرسہ نور الہدیٰ بانکی پور، دارالعلوم مئو، دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے نام اس سلسلہ میں سننے آئے ہیں، اگر ہم سے پوچھا جائے تو ان مدارس میں اگر یہ تحریک اس وقت عام بھی نہ ہوتی تو بھی مدرسہ عالیہ کا توڑنا ہر حیثیت سے فرض تھا، یہ وہ مچھلی ہے جس نے بنگال کے تمام تعلیمی تالابوں کو گندہ کر رکھا ہے، بنگال کے وسیع رقبہ میں ایک درس گاہ بھی ایسے نہیں جو مدرسہ عالیہ کے جال سے محفوظ ہو، اس وقت صوبہ بنگال میں کم از کم پچیس ہزار طالب علم عربی پڑھنے میں مشغول ہیں اور سیکڑوں مدرسے ہر طرف قائم ہیں لیکن اس طرح مدرسہ عالیہ کے نظم و نسق کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کے دیگر صیغوں اور محکموں کی طرح دست شل ہو کر رہ گئے ہیں، جن میں ہر طرح کی ترقی و تجدید و اصلاح ناممکن ہے اور وہ کسی طرح مسلمانوں کی مذہبی اور تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے ہیں اور ان کا وجود ان کی جگہ دوسرے مدارس کے قیام کے لیے سد سکندری ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں اگر بنگال کی عربی کی تعلیم کی اصلاح کا کام انجام پا جائے تو یہ درحقیقت قوم کی ایک بڑی ضرورت رفع ہو جائے۔'' (معارف)

عربی زبان کی خدمت میں ہندوستانی علما اور عربی درس گاہوں کی ذمہ داری: ایک زمانہ میں ہندوستان نے اتنے بڑے بڑے علما پیدا کیے جن کے علمی کمالات اور زبان دانی کا لوہا اہل زبان عرب تک مانتے تھے، انہوں نے تعلیمی، علمی اور تصنیفی مختلف

حیثیتوں سے عربی زبان کی بڑی خدمت کی، ان علما میں ایسی شخصیتیں بھی تھیں جن کے خدمات کا جواب عرب ملکوں میں بھی نہ تھا لیکن پھر عربی زبان کی تعلیم کا معیار گرتا گیا اور اس کا دائرہ پرانے طرز کی درس وتدریس اور تالیف وتصنیف میں شروح وحواشی تک محدود ہو کر رہ گیا اور ہندوستان سے عربی زبان کی حقیقی خدمت تقریباً مفقود ہو گئی، حضرت سید صاحب نے بڑے درد سے اس کمی کی جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

''اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سنسکرت لٹریری کانفرنس کا سالانہ جلسہ بخیر وخوبی انجام کو پہنچا، اس سے قبل اس کے چھ سالانہ جلسے ہو چکے ہیں، اس کے صدر نشیں ہندو کالج دہلی کے سنسکرت کے پروفیسر پنڈت ہرنرائن شاستری ودیا ساگر تھے، ہندوستان کے ہر گوشہ سے علمائے سنسکرت جمع ہوئے تھے، متعدد عالمانہ خطبات پڑھے گئے، مختلف لسانی وعلمی مباحث پر مذاکرہ ومباحثہ رہا، اور آئندہ کے لیے یہ نظام عمل تجویز پایا کہ ایک سنسکرت رسالہ جاری کیا جائے، ایک سنسکرت یونیورسٹی قائم کی جائے اور دہلی میں ایک عظیم الشان سنسکرت کتب خانہ کھولا جائے، کانفرنس کے آئندہ اجلاس کے لیے متعدد مقامات سے دعوت نامے آئے لیکن منظوری پنڈت مالوی جی کے بنارس کے دعوت نامے کو دی گئی۔

سنسکرت کے متعلق ہمیشہ سے سنتے آئے تھے کہ وہ ایک مردہ زبان ہے، ہمارے مغربی اساتذہ بھی اس قول کی تائید کرتے رہے تھے لیکن آج یہی مردہ اپنی زندگی کا یوں ثبوت دے رہا ہے، اس کے مقابلہ میں ایک ہماری ''مقدس زبان'' ہے، جس میں ہمارا صحیفہ آسمانی نازل ہوا ہے، جو ہماری تاریخ اور قومی روایات کی حامل ہے، جسے دنیا میں لاکھوں افراد بولتے ہیں اور کروڑوں سمجھتے ہیں، جس میں تالیف وتصنیف کا سلسلہ بکثرت جاری ہے، جس میں متعدد اخبارات ورسائل شائع ہوتے رہتے ہیں اور جن کے پرستاروں میں عرب، مصر، شام، عراق، طرابلس اور ہندوستان کے علاوہ بھی چند ممالک کی بڑی آبادیاں شامل ہیں، سوال یہ ہے کہ اس زندہ زبان کے زندہ رکھنے میں ہماری کوششوں کو کہاں تک دخل ہے، انسان پر ذمہ داری صرف اس کی کوششوں کے متعلق عائد ہوتی ہے، اس لیے

سوال صرف ان کی جد و جہد، سعی و کاوش کی بابت کیا جائے گا، کسی شے کا خارجی اسباب و اتفاقی حالات کی بنا پر زندہ و محفوظ رہ جانا ہرگز اس کے فرائض سے سبک دوش نہیں کر سکتا، شام کے عیسائی اس لیے عربی بولتے ہیں کہ وہ ان کی مادری زبان ہے، مصر کے قبطی اس لیے عربی میں تالیف و اشاعت کا کام کرتے ہیں کہ اس پر مجبور ہیں، ان حالات سے ہمارے فرائض کیوں کر ساقط ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں چشم بددور متعدد اسلامی درس گاہیں قدیم و جدید دونوں طرز کی مدت سے قائم ہیں لیکن دنیا کو علم نہیں کہ اب تک ان اسلامی درس گاہوں نے اس اسلامی زبان کی کس قدر خدمات کی ہیں، ندوہ، دیوبند، فرنگی محل، نظامیہ دکن سے زیادہ اسلامی علوم والسنہ کی خدمت گزاری کا دعویٰ کس کو ہو سکتا ہے لیکن کیا ان کے ارباب حل وعقد اپنی دیانت اور ضمیر کا احترام ملحوظ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ام الالسنہ کی کسی معقول حد تک خدمات انجام دی ہیں، علی گڑھ کالج بے شبہ سالہا سال سے ادبیات ولسانیات عرب کی تحصیل و تحقیق کا اشتہار دے رہا ہے لیکن کاش اس کے پوست کے اندر مغز بھی ہوتا، لے دے کر ایک دکن کے دائرۃ المعارف کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے ایک زمانہ میں متعدد مفید و نادر کتب عربیہ کے طبع و اشاعت کا کام کیا تھا لیکن اب مدت سے یہ زندہ کرنے والا صیغہ خود مردہ ہو گیا[1]۔"

مسلم یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی میں شرکت: دسمبر ۱۹۲۵ء کا آخری ہفتہ بڑی ہما ہمی کا تھا، اس ہفتہ میں کان پور میں کانگریس اور خلافت کے سالانہ اجلاس ہوئے اور علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اس سلسلہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا، سید صاحب نے ان تمام جلسوں میں شرکت فرمائی، اس کی کارروائیوں کا غائر نظر سے مشاہدہ کیا اور جنوری ۱۹۲۵ء کے معارف میں ان کے متعلق اپنے تاثرات تحریر کیے، جو قومی و ملی اور علمی اور تعلیمی نقطہ نظر سے درس بصیرت کی حیثیت

---

[1] یہ اس زمانہ کی تحریر ہے جب دائرۃ المعارف بے جان ہو رہا تھا لیکن اس کے بعد پھر اس میں زندگی پیدا ہوئی اور اس وقت سے برابر وہ عربی کی نادر اور اہم کتابوں کی طبع و اشاعت کا کام انجام دے رہا ہے۔

رکھتے ہیں، جوبلی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''جوبلی کا اجلاس ہر حیثیت سے نہایت شان دار تھا، کئی ہزار کا مجمع تھا، بجز دو طبقوں کے ہر طبقہ کے مسلمان بھی تھے، انگلستان اور ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے نمائندے بھی شریک تھے، وائسرائے، حضور نظام، دیگر حکام و مسلمان رؤسا کے تہنیت نامے بھی آئے تھے، افغانستان کی تعلیمی نمائندگی بھی تھی اور لوگوں کو اس سے بے حد دل چسپی تھی، قوم کے مدعیان رہنمائی اور مشاہیر بھی تھے اور یہ ایک دل چسپ نظارہ تھا مگر ان لال ٹوپیوں کے بیچ میں ہماری آنکھیں جبہ و دستار کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں، السنہ مغربی کی یونیورسٹیوں کے نمائندوں کی صف میں ہم اپنی مشرقی درس گاہوں کے فضلا کو بھی دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے مگر وہ نہ تھے۔

بہر حال ایک خاص خیال کے مسلمانوں کا نہایت مغتنم مجمع فراہم ہو گیا تھا اور یہ موقع تھا کہ واقعی علی گڑھ تحریک کی پنجاہ سالہ جدوجہد پر ایک تبصرہ کیا جاتا اور اگر مسلمان دوسرے رہنماؤں کی غلط پیروی میں برباد ہو رہے ہیں تو ان کو صحیح ہدایت کی جاتی اور مسلم یونیورسٹی کو صحیح مسلمان یونیورسٹی بنانے کے لیے غور کیا جاتا اور امرا کی جیبوں کو ٹٹولنے کے علاوہ ارباب دانش کے سینے بھی ٹٹولے جاتے اور آئندہ کے لیے قوم کی تعلیمی اور علمی جدوجہد کے لیے ایک پروگرام بنایا جاتا علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو فائدہ بھی پہنچایا ہے اور نقصان بھی پہنچایا ہے، کاش اصحاب علی گڑھ سکون خاطر کے ساتھ پچاس برس کی قطع مسافت کے بعد ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتے کہ ہم کہاں تک صحیح راستہ پر چلے اور آئندہ منزلوں کو طے کرنے کے لیے کیا ضرورتیں ہیں اور کیا صحیح مشورے ہیں۔

قیامت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی کا نادر موقع جو پچاس برس کے بعد آیا تھا اور اب پھر پچاس برس کے بعد آئے گا، اس کی صدارتی تقریر جو پنجاہ سالہ تجربوں کا نچوڑ اور حسب وعدہ قوم کی پنجاہ سالہ جدوجہد اور سعی و کوشش کا جائزہ اور آئندہ پچاس برس کا پروگرام ہوتی اور وہ محض وقتی زبانی خوش کن ظرافتوں اور چٹکلوں اور گزشتہ دعووں کا اعادہ تھی، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّةَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

تعلیمی اور علمی حیثیت سے جوبلی میں سب سے بہتر تقریر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر پنجاب کی تھی، انہوں نے بالکل بجا طور پر مسلم یونیورسٹی کو ایک علمی یونیورسٹی بنانے کا صحیح مشورہ دیا اور اس کی صحیح نقشہ پیش کیا، جس میں مشرقیات، علوم عربیہ اور اردو کو صحیح جگہ دی گئی تھی، کاش شیخ صاحب کی یہ مفید تقریر آئندہ ہماری مسلم یونیورسٹی کا نظام عمل اور طریقہ کار بن سکتی، جامعہ عثمانیہ کے کام یاب تجربہ کے بعد اب اردو کے ذریعہ تعلیم بننے میں کسی کو کیا عذر ہوسکتا ہے۔

لیکن اردو کی بے کسی کا یہاں بھی وہی عالم تھا، کانفرنس (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) تک تو کچھ خیریت تھی ورنہ سات روز کے اندر کم کسی مشہور لیڈر نے اردو کو شرف بخشا، الا یہ کہ خود انگریزی نے ان کو اپنی واقفیت کے شرف سے محروم کردیا ہو، تاہم دو چار سیکھے سکھائے اور رٹے ہوئے فقروں کا برمحل اور بے محل بول دینا ضروری تھا، اردو کتب فروشوں نے بھی مسلم یونیورسٹی کا نام لے کر اپنی کتابوں کی دوکانیں سجائی تھیں مگر شاید ہی کسی سفید پوش سیاہ پوش نے ادھر نظر اٹھائی ہو اور اسی اسٹیج پر اردو کی بے کسی کا ماتم بھی تھا:

ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

سب سے نمایاں جگہ یعنی صدر کی نشست گاہ کے اوپر علی گڑھ کے کسی خوش مذاق شاعر کا یہ اردو شعر البتہ جلی حروف میں کپڑے پر لکھ کر آویزاں کیا گیا تھا:

وفا شعاری و حب وطن و دین پرستی کی علامت — کہ اپنے قومی نشان میں تاج کھجور اور ہلال بھی ہے

یہ صحیح و فصیح و بلیغ شعر جس کے موزوں پڑھنے میں متعدد باکمال شاعروں کو کافی زحمت اٹھانی پڑی، درحقیقت علی گڑھ کی اصلی اور اندرونی ذہنیت تھی جو اس کے ذرہ ذرہ سے نمایاں تھی، منتظمین کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے علی گڑھ کا دل نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت: ایجوکیشنل کانفرنس کی بہار کے دن تو مدت ہوئی گذر چکے، اس سال توقع تھی کہ اس غیر معمولی مجمع کے موقع پر اس کی کرسیاں

بھی خالی نہ رہیں گی، مگر واقعہ ایسا نہ ہوا، لوگوں کو اس سے کوئی دل چسپی نہ تھی اور اپنے قدیم طلب گاروں کی موجودگی میں بھی اس کی بے رونقی افسوس کا باعث تھی، چند سال سے مسلمان خواتین کو کانفرنس میں اپنا مناسب حق نہ ملنے کی پرخاش تھی، امسال یہ حق زبردستی حاصل کرلیا گیا اور خود کانفرنس کے اسٹیج سے دو خاتونوں کی طلب حق کے لیے ''بغاوت انگیز'' تقریریں ہوئیں، کانفرنس کی تجویزیں اسی پرانی بولی اور اصطلاحوں میں تھیں جواب صرف ایجوکیشنل کانفرنس کے ٹوری ممبروں کی زبانوں سے سنی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سالانہ عرض و معروض کا آخر بجز اس کے حاصل کیا ہے کہ:

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس — در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر صاحب زادہ عبد القیوم کی طرف سے جو خطبہ صدارت پڑھا گیا، ہمارے خیال میں خیالات اور مشوروں کے لحاظ سے اس کے اکثر حصے بے حد عمدہ تھے، خصوصاً تعلیمی نصب العین، مطالعہ و تحقیق (طلبہ میں) اور ذریعہ تعلیم کے عنوانوں کے ماتحت نہایت عاقلانہ اور سود مند تجویزیں پیش کی گئی ہیں، صاحب زادہ صاحب کا یہ پورا خطبہ عملی نقطہ نظر سے حد درجہ قابل غور ہے اور یہ وہی روح ہے جو ان کے ماتحت اسلامیہ کالج کے بعض مسلمان پروفیسروں میں ہے:

ع متاع خویش زہر دکاں کہ باشد

امید ہے کہ اسلامیہ کالج پشاور بھی ان سے عملاً فائدہ اٹھائے گا۔ (معارف جنوری ۱۹۲۶ء)

مسلم یونیورسٹی میں شعبہ علوم مشرقیہ کی تشکیل: مسلم یونیورسٹی کے بعض ارکان کی کوشش اور اس کے نصاب کی ترتیب میں شرکت: ہے کہ یونیورسٹی میں علوم مشرقیہ کا بھی ایک شعبہ قائم ہو کیوں کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے جب روپیہ فراہم کیا جارہا تھا تو مسلمانوں کو اس کی توقع دلائی گئی تھی، اس لیے اب اس وعدہ کے وفا کرنے کے دن آگئے ہیں، چنانچہ اس غرض سے منتظمین یونیورسٹی کی دعوت پر چند ایسے علما جو جدید ضروریات سے آگاہ اور

نصابہائے تعلیم اور درس گاہوں کا تجربہ رکھتے تھے، علی گڑھ میں جمع ہوئے اور متواتر سات اجلاسوں میں جو ۱۱رفروری سے ۱۷رفروری تک منعقد ہوتے رہے، مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھا اور اس کے لیے یہ نقشۂ عمل اور ایک نصاب میٹرک سے ایم ،اے، تک تیار کر کے یونیورسٹی کے سامنے پیش کر دیا۔

اس مجلس کے ارکان حسب ذیل اصحاب تھے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سلیمان اشرف، صدر شعبہ علوم مشرقیہ مسلم یونیورسٹی، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، مولانا امجد علی صدر مدرس معینیہ، اجمیر اور خاک سار، مولانا عبدالعزیز صاحب میمن راج کوٹی استاد ادبیات عربی مسلم یونیورسٹی نے بھی خاص خاص موقعوں پر شرکت کی، علوم مشرقیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، عقلیات، دینیات اور ادبیات اور ہر ایک کا علاحدہ علاحدہ نصاب ترتیب دیا گیا ہے، جو ایف، اے کے پہلے سال سے ایم، اے تک ختم ہوگا، ہمارا کام ختم ہو گیا، اب نہیں کہا جا سکتا کہ منتظمین وارکان یونیورسٹی اس کو رد کریں گے یا قبول کریں گے، ہندو یونیورسٹی نے اپنے یہاں سنسکرت لازمی قرار دی ہے اور ہم کو ابھی رد و قبول ہی میں پس و پیش ہے۔

(شذرات، معارف، فروری ۱۹۲۶ء)

مسلم یونیورسٹی کورٹ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلیمی بورڈ کی ممبری: جنوری ۱۹۲۷ء میں یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب ہوئے، اسی زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور اور تحقیقات کے لیے ایک تعلیمی بورڈ بنایا تھا، سید صاحب کو بھی اس کا ممبر منتخب کیا گیا، مگر کانفرنس سے وہ اس قدر مایوس تھے کہ اس کو بالکل بے نتیجہ تصور کیا، چنانچہ معارف جنوری ۱۹۲۷ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

''سنا ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق جو کچھ اتنے سالوں سے کہا جا رہا تھا، اس کا ارباب کانفرنس کو بھی امسال کے اجلاس میں برأالعین مشاہدہ ہو گیا، یعنی یہ کہ کانفرنس کا تبلیغی دور

ختم ہوگیا اور اب اس کی زندگی عملی دور کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے، اسی خیال سے منتخب اشخاص کا ایک تعلیمی بورڈ جس کا ایک ممبر خود ایڈیٹر معارف بھی بنایا گیا ہے، اس لیے قائم ہوا ہے کہ وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کرے اور اپنی تحقیقات کے نتائج وقتاً فوقتاً شائع کرے اور ان کو مناسب تجویزوں اور مشوروں کی شکل میں تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں اور حکام تعلیم کے سامنے پیش کرے لیکن ہماری پیشین گوئی یہ ہے کہ یہ بورڈ نہ کبھی جمع ہوگا اور نہ کوئی کام کرے گا کیوں کہ ہم میں نہ کوئی ولولہ عمل ہے اور نہ کوئی ہماری منزل مقصود ہے، ہماری بیماری ڈاکٹروں کے اجتماع اور مشوروں سے بہت آگے بڑھ چکی ہے، اٹھارہ آدمیوں کے بجائے ایک آدمی درکار ہے جو سب کچھ اپنی غرض و مقصد پر فدا کر کے عملاً کچھ کر دکھائے۔"

سیرت النبیؐ جلد دوم وسوم اور سیرت عائشہؓ کی اشاعت: اگرچہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۶ء تک کا زیادہ وقت قومی وسیاسی کاموں میں گزرا لیکن علمی کام بھی برابر جاری رہے، اسی زمانہ میں سیرت النبیؐ حصہ دوم کو مکمل کیا، یہ حصہ مولانا شبلی کا لکھا ہوا ہے لیکن جا بجا بیاضیں چھوٹی ہوئی تھیں، ان کو مکمل کیا، ۱۹۲۰ء میں یہ حصہ شائع ہوا، اسی زمانہ میں سیرت کی تیسری جلد لکھی، یہ جلد معجزات پر ہے، اس کا کچھ حصہ مولانا عبدالباری کے قلم سے ہے جس کی تصریح مقدمہ میں موجود ہے، ۱۹۲۴ء میں یہ جلد شائع ہوئی، اسی سنہ میں سید صاحب کی دوسری مشہور تصنیف سیرت عائشہؓ شائع ہوئی۔

اس دور کے دوسرے علمی کام، مغل سلاطین کے متعلق غلط واقعات کی تردید: انگریزوں کی نقل وتقلید میں بعض ہندو اہل قلم نے بھی مسلمان سلاطین کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے افسانے گھڑ کر ان کو تاریخ کے رنگ میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، سید صاحب کے پاس اکثر اس کے بارے میں استفسارات آیا کرتے تھے، اس کے متعلق معارف اکتوبر ۱۹۲۲ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

"ہمارے پاس مختلف گوشوں سے اکثر احباب انگریزی اخبارات ورسائل کے ایسے

مضامین کے ٹکڑے کاٹ کر اس غرض سے بھیجتے ہیں کہ معارف میں اس کی تصحیح کی جائے اور ان کے جوابات لکھے جائیں، اس سلسلہ میں قابل ذکر ہندو اہل قلم میں سر جادو ناتھ سرکار ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین عموماً مسلمان سلاطین تیموری کی تاریخ اور خصوصاً اورنگ زیب عالم گیر کے واقعات کو قرار دیا ہے، ان کی مستقل تصانیف کے علاوہ ہر دوسرے تیسرے مہینہ ان ہی مباحث پر ان کے محبوب رسالے ماڈرن ریویو کلکتہ میں ان کے مضامین نکلتے رہتے ہیں، بنگالی اور مرہٹی افسانہ نویسوں نے تیموری بیگمات کے حسن و عشق کے افسانوں کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ ناواقف ہندو اصحاب ان کو تاریخی واقعات یقین کرنے لگے ہیں۔

سلاطین تیموری میں سب سے زیادہ بدنام مسلمان بادشاہ عالم گیر ہے، اس کو دوست دشمن مشرقی و مغربی تمام مصنفین زہد پیشہ اور متقی جانتے ہیں مگر سرکار نے بڑی محنت سے فرامین عالم گیری کے کسی کہنہ مجموعہ کا پتہ لگایا ہے اور اس کو مع انگریزی ترجمہ کے چھاپا ہے اور اس کی سند پر اس کی ایک خوش خصال کنیز پر فریفتہ ہوکر اور غش کھا کر گر جانے کی داستان لکھی ہے۔

ایک مرہٹی افسانہ نویس نے ایک قصہ گھڑا ہے کہ روشن آرا (بنت عالم گیر) سیواجی پر دل و جان سے عاشق تھی اور اسی ''محبوبہ حرم'' کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سیواجی دلی کی نظر بندی سے بھاگ کر نکل سکا اور اپنے ساتھ اپنی شیدا کو بھی محل سے نکال کر مہاراشٹر کے پہاڑی قلعہ میں لے آیا۔

بمبئی میں آج کل ایک ناٹک کھیلا جا رہا ہے جس میں مہر النساء نامی اکبر کی ایک فرضی لڑکی ایک راج پوت پر عاشق ہوتی ہے۔

چند روز ہوئے ہمارے پاس ایک دوست نے امرت بازار پتر کا مورخہ ۹ ر ستمبر ۱۹۲۳ء کا ایک ٹکڑا بھیجا جس میں ''پرنسلی انڈیا'' مصنفہ ہیم چند رائے، ایم، اے بنگال کے حوالہ سے ''حرم سرائے مغل اعظم'' کے زیر عنوان ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں نہایت بے باکی سے روشن آرا اور سیواجی کے فرضی قصہ کا حوالہ دے کر اورنگ زیب کی ایک فرضی بیوی گلنار بیگم کا قصہ لکھا گیا ہے، راجہ جسونت سنگھ عالم گیر کا ایک دل پسند افسر تھا، جس کو اس نے کابل کی حکومت تفویض کی تھی، راجہ

کے مرنے پر عالم گیر نے اس کے دونوں بیٹوں کو اپنی تربیت میں لینے کا ارادہ کیا مگر رانی اپنے بیٹوں کو راج پوتوں کی مدد لے کر چل کھڑی ہوئی، اس مصنف نے اس واقعہ کو گلنار اور رانی کی باہمی عداوت پر محمول کر کے یہ دکھایا ہے کہ رانی اور اس کے بیٹوں کے ساتھ عالم گیر کا یہ طرز عمل گلنار کی فرمائشوں کی تعمیل تھی اور عالم گیر بادشاہ جس کو ہر مؤرخ مستقل مزاج اور خود رائے کہتا ہے، ہم چند کی تحقیق میں زن مرید تھا۔

شترمرغ آپ جانتے ہیں کہ ایک عظیم الجثہ پرندہ ہے، اس کی نسبت فارسی میں ایک قصہ ہے کہ جب ایک ایرانی شکاری نے اس کو پرند سمجھ کر شکار کرنا چاہا تو اس نے کہا میں تو شتر (اونٹ) ہوں اور جب اونٹ سمجھ کر اپنا سامان اور اسباب لادنا چاہا تو اس نے معذرت کی کہ میں تو مرغ ہوں، اسباب لادنا میرا کام نہیں، بعینہٖ اسی طرح یورپ نے ''تاریخی افسانہ'' کے نام سے ایک علمی شترمرغ خلق کیا ہے، ناظرین کے سامنے جب اس کو پیش کیا جاتا ہے تو یقین دلایا جاتا ہے یا یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سرتاپا تاریخی واقعہ ہے اور جب آپ اس پر تاریخی حیثیت سے اعتراضات کریں گے کہ اس کے یہ مندرجہ واقعات اصلیت سے خالی ہیں تو جواب ملے گا کہ یہ تو افسانہ ہے، اس میں تاریخی تطبیق کی تلاش کیوں ہے، یورپین افسانہ نویسوں نے اسی طریقہ تحریر کے ذریعہ ترکوں کی اخلاقی اور خانگی زندگی کی یورپ میں بدترین تشہیر کی ہے اور اب اس قسم کا پروپگنڈہ مسلمان سلاطین کے خلاف یورپین افسانہ نویسوں کے بہترین مقلد بنگالی، مرہٹی اور گجراتی افسانہ نویس پھیلا رہے ہیں، کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ اس طریقہ سے ملک یا علم کس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔''

محبت الٰہی اور اسلام: مستشرقین کا ایک بڑا اعتراض اسلام پر یہ بھی رہا ہے کہ اسلام کا خدا ایک قہار و جبار، غضب ناک اور صاحب جلال و جبروت شہنشاہ ہے جس سے ہندوؤں کو ہمیشہ ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیے، اس کے برخلاف عیسائی مذہب اس کو محبت، پیار اور محبت و شفقت کے پیکر میں جلوہ گر کرتا ہے، اسی لیے اس کو باپ کے نام سے پکارتا ہے اور

اس کی نصیحتوں میں نرمی اور رحم و کرم کا جذبہ غالب ہے، سید صاحب نے جولائی ۱۹۲۳ء کے معارف میں محبت الٰہی اور اسلام کے عنوان سے اس کا نہایت مفصل اور مدلل جواب دیا۔

واقدی اور اس کی کتاب المغازی کی تحقیق: قدیم اصحاب سیر و مغازی اور ان کی تصانیف میں محمد بن عمر الواقدی اور اس کی کتاب المغازی کو بڑی شہرت حاصل ہے، مگر وہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر غیر معتبر اور رطب و یابس کا مجموعہ ہے، اس لیے مستشرقین اپنے مخصوص اغراض کے پیش نظر اس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اسلام سے متعلق اپنی تصانیف میں فائدہ اٹھاتے ہیں، ۱۹۲۵ء میں ایک انگریز نے مانچسٹر گارجین (لندن) میں ایک مضمون لکھا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض گستاخانہ باتیں تحریر کیں، اس میں یہ بھی تھا کہ نعوذ باللہ آپ بزدل اور ڈرپوک تھے، چنانچہ جنگ بدر میں خون بہتے دیکھ کر آپ کو غش آ گیا۔

خواجہ کمال الدین مرحوم نے جو ووکنگ میں تھے، مضمون نگار سے اس واقعہ کا ماخذ پوچھا تو اس نے مارگولیتھ کی کتاب ''محمد اور ترقی اسلام'' کا حوالہ دیا، ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے واقدی کی کتاب المغازی کے جرمن ترجمہ ولہاوسن کا حوالہ دیا، اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، خواجہ صاحب نے حضرت سید صاحب کی طرف رجوع کیا، انہوں نے واقدی پر جنوری ۱۹۲۶ء کے معارف میں ایک مستقل مضمون لکھا جس میں دکھایا کہ واقدی کو گو کچھ علما اور محدثین معتبر سمجھتے ہیں لیکن قدیم ائمہ اور اصحاب فن نے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اور کتاب المغازی میں سرے سے یہ واقعہ ہے ہی نہیں، وہ کچھ تو ولہاوسن کی عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور کچھ مارگولیتھ کی حاشیہ آرائی ہے، واقعہ صرف اس قدر ہے کہ غزوۂ بدر میں جنگ شروع ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قیام گاہ پر نیند آ گئی اور آپ کو خواب میں مسلمانوں کی فتح اور قریش کی شکست دکھائی گئی، واقدی کی یہ غلطی ہے کہ اس نے اس واقعہ کو جنگ سے پیش تر کے بجائے عین حالت

جنگ میں لکھا ہے، اس روایت میں واقدی کے الفاظ یہ ہیں: فاضطجع فغشية نوم غلبه یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے اور آپ پر نیند طاری ہو گئی، ولہاوسن نے ''غشیہ نوم'' کا ترجمہ نیند طاری ہونے کے بجائے ''غشی آگئی'' کر دیا ہے اور اس پر مارگولیتھ نے خاشیہ آرائی کر کے اور زیادہ بدنما بنا دیا ہے۔

سید صاحب کے اس مضمون کا ترجمہ اسلامک ریویو لندن میں شائع ہوا، اس زمانہ میں ڈرہم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مسٹر گولیم ''روایات اسلام'' کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے تھے، ان کو بھی سیرت و مغازی سے مواد لینا تھا، سید صاحب کا مضمون ان کی نظر سے گزرا تو انہوں نے خواجہ کمال الدین کو لکھا کہ وہ ان اصولوں کو معلوم کرنا چاہتے ہیں جن کی بنا پر کسی مصنف یا راوی کا بیان رد یا قبول کیا جاتا ہے اور جب متقدمین واقدی کو معتبر مانتے ہیں تو بعد کے لوگوں کو اس کے غیر معتبر ٹھہرانے کا کیا حق ہے، اس کے جواب میں سید صاحب نے پھر ''واقدی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر گولیم کے سوالات کا جواب دیا، یہ مضمون جنوری ۱۹۲۷ء کے معارف میں شائع ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کی گستاخانہ تحریر کے خلاف احتجاج اور اس کی تصحیح: یورپ کے مستشرقین اور متعصب مشنریوں نے اسلام، اسلامی تاریخ و تہذیب کے خلاف جو صور پھونکا تھا، انگریزوں کے وسیلہ سے ہندوستان میں بھی اس کی صدائے بازگشت گونجتی رہی، چنانچہ جب مراٹھی انسائیکلوپیڈیا شائع ہوئی تو اسلام کے متعلق اس کی معلومات تمام تر مستشرقین کے خیالات کا چربہ تھی اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت گستاخانہ اور لغو باتیں تحریر تھیں، سید صاحب نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

بعض نادان ہندو اصحاب قلم مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں پر صدہا سال حکومت کی، اس کا خاتمہ بھی ہو گیا، مگر انہوں نے اپنی ہندو رعایا کے لٹریچر سے

واقفیت حاصل نہ کی، اس لغو اعتراض کا بارہا جواب دیا گیا اور دکھایا گیا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم وفنون و ادبیات میں کس درجہ ترقی کی تھی، اگر تمہیں معلوم نہیں تو اپنی جہالت ہے، دوسروں کی نہیں۔

مگر اب موقع آیا ہے کہ اس سوال کو الٹ دیا جائے کہ مسلمان ایک ہزار برس سے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں، ان کے تمام مراسم وعبادات ان کی آنکھوں کے سامنے انجام پاتی ہیں، ان کے پیغمبروں اور بزرگوں کی سوانح عمریاں اردو میں موجود ہیں، ان کے مذہب کے متعلق ہر قسم کے معلومات سامنے ہیں، اس کے باوجود ہمارے جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی نسبت کوئی مذہبی واقفیت نہیں ہے، حتی کہ اسلام کی سب سے بڑی شخصیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ان کی اطلاع ملکی ذریعہ سے نہیں بلکہ غیر ملکی ذریعہ سے ہے، دوستوں کی زبان سے نہیں دشمنوں کی زبان سے ہے۔

سنا ہوگا کہ ناگ پور میں مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کی تالیف واشاعت کا کام ایک عرصہ سے جاری ہے، ابھی حال میں اس کی سولہویں جلد شائع ہوئی ہے، ان سولہ جلدوں میں اسلام، اسلامی تمدن اور اسلامی تاریخ کے متعلق بہت کچھ ہے، مگر جو کچھ ہے وہ سب یورپین مستشرقین اور کرسچین مشنیریز کے خیالات کا عکس ہے، اپنی گرہ کی کوئی چیز نہیں، اغلاط کا ایک انبار خانہ ہے، کیا مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کے مرتب کرنے والوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان مضامین کے لیے بعض مسلمان مراٹھی اہل قلم کی اعانتیں حاصل کریں، ہندوستان میں رہ کر اور ہندوستان کے ایک عظیم الشان مذہب اور ایک چوتھائی آبادی کے مذہب وتاریخ سے ناواقفیت کس درجہ قابل افسوس ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کے ایک پارہ کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو دوست مسلمانوں کی تاریخ اور اس کے پیغمبر کی سیرت سے کس درجہ واقفیت رکھتے ہیں:

"سیرت ابن اسحٰق میں محمدؐ کا جو حال لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چال چلن بہت خراب تھا، اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے وہ جو تجویز چاہتا تھا، اس کو عمل میں لانے کے لیے کبھی پس و پیش نہیں کرتا تھا، نیک نیتی کو بالائے طاق رکھنے کے لیے اپنے پیرووں کو اجازت دے رکھی تھی، بے فکری کے ساتھ جس طرح چاہا خون اور قتل کرایا، مدینہ میں اس کا ظالمانہ عمل دیکھا جائے تو وہ نرا ڈاکوؤں کا ایک سردار دکھائی دیتا ہے، اس لیے کہ فن معاشیات کا علم اس کو اسی قدر تھا کہ لوٹ مار کے جو مال جمع ہو اس کو اپنے پیرووں میں تقسیم کردے بلکہ اس کے پیرووں کو بھی یہ شکایت تھی کہ مال غنیمت کی تقسیم میں وہ بہت طرف داری اور ناانصافی کرتا ہے، وہ خود حد سے زیادہ عیش پرست تھا اور اپنے پیرووں کے لیے بھی عیش پرستی مباح کر رکھی تھی، اس پر بھی وہ جو کام کرتا تھا کہتا تھا کہ وہ سب خدا کے حکم سے کرتا ہوں، اپنی حکومت کے فائدے کے لیے کسی اصول کے پامال کرنے میں اس کو ذرا بھی باک نہ ہوتا تھا۔"

مذکورہ بالا عبارت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دشمن کے قلم سے نہیں نکلی ہے، بلکہ اس کے ایک پیرو نے تحریر کی ہے اور اس کو رد کرنے کی کسی مسلمان مصنف نے کوشش نہیں کی۔

مذکورہ بالا عبارت جو مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کے ایک پارہ کا لفظی ترجمہ ہے، ہمارے تعلیم یافتہ ہم وطنوں کی اسلامی واقفیت کا آئینہ ہے، ابن اسحٰق کی کتاب میں جواب بصورت سیرت ابن ہشام موجود ہے، یہ پارہ کہیں مل جائے تو ہم مصنّفین انسائیکلوپیڈیا کو بشارت دیں گے کہ انہوں نے اسلام کی شکست کے لیے سب سے کام یاب ہتھیار استعمال کیا، شیوا جی کے پرستاروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی علمی تحریروں میں ڈاکو کا لفظ استعمال کریں، کیا یہ علمی تحقیق ہوگی کہ اپنے پڑوسیوں کے مذہب اور بزرگوں کی نسبت سات سمندر پار کے عیسائی مشنریوں کی متعصبانہ تحریروں کو ماخذ اور سند قرار دیا جائے، مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کے ان فقروں کا مراٹھی سمجھنے والے مسلمانوں کے دلوں پر کتنا صدمہ ہوگا، کوئی اس کا اندازہ

کر سکتا ہے؟ کیا مسلمانوں نے رام جی، سیتا جی، کرشن جی وغیرہ ہندو بزرگوں کی نسبت اپنی کسی سنجیدہ علمی تحریر میں اس قسم کے سوقیانہ اور نفرت انگیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (شذرات معارف فروری ۱۹۲۶ء)

اس تحریر پر بمبئی کے مسلمان اخبارات نے بھی احتجاج کیا اور یہاں کے ممتاز مسلمانوں نے حکومت کو اس کی طرف متوجہ کیا، پروفیسر نواب علی نے اس کا سنجیدہ علمی جواب دیا، آخر میں انسائیکلو پیڈیا کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر کیتکر کو اس غلطی کا اعتراف کرنا پڑا اور انہوں نے اس کی تلافی کے لیے معذرت کا یہ خط لکھا:

''مائی ڈیر مولوی صاحب! میرے ایک مسلم دوست نے مجھے آپ کا نام بتایا تھا لیکن جس پرزہ پر میں نے اسے لکھا تھا وہ گم ہو گیا، اس لیے میں آپ کو آپ کے دفتری لقب سے خط لکھ رہا ہوں، میرے ان مسلم دوست نے یہ بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جس عبارت پر یہ صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے، اس کے آغاز کا فخر جناب کو حاصل ہے، آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور میں نے وہ صفحات چوتھی جلد سے نکال دیے۔

مجھے اس سلسلہ میں آپ سے ذرا بھی شکایت نہیں ہے، آپ نے اضطراراً میرے ساتھ بھلائی کی ہے، یعنی جب سے یہ صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے اور مقامی مسلمانوں نے اس میں حصہ لینا شروع کیا ہے، میرے بہت سے مسلمان دوست پیدا ہو گئے ہیں، میں نے آپ کے متعلق بہت کچھ سنا ہے کہ آپ ایک پکے محبِ زبان ہیں اور اردو کی ترقی میں آپ نے بہت کچھ خدمات انجام دی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان تمام اصحاب سے جنھوں نے اپنی مادری زبانوں کی ترقی اپنا مقصد حیات قرار دے رکھا ہے، تعارف حاصل کروں، کیوں کہ میں بھی بارہ برسوں سے اسی ایک مقصد کی تکمیل میں مصروف ہوں۔

اب جب کہ مراٹھی انسائیکلو پیڈیا ختم ہو چکی ہے، میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو جائے، ہر شخص کو اپنی زبان کے ذریعہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنا چاہیے اور

میری تمنا ہے کہ اس کے حصول کے لیے جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکے وہ کروں، میں مراٹھی انسائیکلو پیڈیا کے گجراتی اور ہندی تراجم کا انتظام کر رہا ہوں، اگر آپ اردو میں انسائیکلو پیڈیا تیار کرنا چاہیں تو میں بڑی خوشی سے اپنے تجربات آپ کی خدمت میں پیش کروں گا، میری یہ خدمات آپ ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ جو اردو نویس جماعت بھی اس کام کا بیڑا اٹھائے اس کے لیے بھی ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ اس سے اپنے ناظرین کو بھی مطلع کریں گے، تاکہ کچھ نہ کچھ ابتدا تو ہو ہی جائے اور ایک جماعت اس کے لیے بنائی جائے، برائے عنایت اپنے ناظرین کو بھی یہ بتا دیجیے کہ اگر ڈیڑھ برس کے اندر اندر میں نہ دیکھ لوں گا کہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کا بندوبست ہو رہا ہے تو میں خود اس کام کو شروع کر دوں گا، اس سے میرا مقصد محض یہ ہے کہ کوئی زبان بھی بلا انسائیکلو پیڈیا کے نہ رہ جائے۔"

اس خط کو شذرات میں نقل کرنے کے بعد سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اس خط سے یہ ظاہر ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر کیتکر) اردو والوں کو دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر ڈیڑھ برس کے اندر اندر ان لوگوں نے اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام نہ شروع کر دیا تو پھر وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور اپنی مراٹھی انسائیکلو پیڈیا کا اردو ترجمہ شروع کر دیں گے، ہر زبان اپنے بولنے والوں کی خصوصیات کی جامع ہوتی ہے، مراٹھا قوم کی انسائیکلو پیڈیا اردو بولنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے تمام تر کار آمد نہیں ہو سکتی، اس لیے یہ سوال اس وقت قابل غور ہو گیا ہے، اس کی پوری تفصیل معارف ۲۶ء و ۲۷ء کے شذرات میں موجود ہے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت: ہم دوبارہ کسی "امیر کبیر"[1] کے خزانہ کا لالچ کر کے اردو

---

[1] اس سے راجہ محمود آباد کی طرف اشارہ ہے، دار المصنفین کے قیام کی ابتدا میں جب اردو انسائیکلو پیڈیا کی تالیف کی تحریک ہوئی تو راجہ صاحب نے ایک بڑی رقم اس کام کے لیے دینے کا وعدہ کیا، انسائیکلو پیڈیا کا نقشہ بھی بن گیا، اس کے مقالہ نگار بھی نامزد کر دیے گئے، مگر پھر کسی نامعلوم سبب سے راجہ صاحب نے بالکل خاموشی اختیار کر لی، اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا کا کام شروع کرنا نہیں چاہتے بلکہ جمہور کے بھروسہ پر اس کام کو کرنا چاہتے ہیں، مراٹھی انسائیکلو پیڈیا کا کام غالباً تجارتی اصول پر کیا گیا ہے، یعنی حصہ داروں کے ذریعہ فی حصہ رقم معینہ وصول کر کے کل سرمایہ سے اس کام کو انجام تک پہنچایا گیا، اگر اردو میں بھی اس طرح یہ کام انجام دیا جائے تو کیسا ہے، اس میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے اردو اہل قلم کی کوششیں شامل ہوں گی، امید ہے کہ اہل نظر اور اس کام سے دل چسپی رکھنے والے ہندو مسلمان اصحاب اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔

اس ذیل میں مولوی عبدالحق صاحب بی، اے اورنگ آباد، ڈاکٹر سر محمد اقبال، شیخ عبدالقادر بی، اے (لاہور)، مولانا عبدالماجد صاحب بی، اے (دریابادی) مولوی ظفر علی خاں صاحب، پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ)، پنڈت منوہر لال زتشی، پنڈت کشن پرشاد صاحب کول، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا نیاز فتح پوری، منشی پریم چند، منشی دیا نرائن نگم، ایڈیٹر زمانہ کان پور، پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا، ڈاکٹر بذل الرحمٰن (لکھنؤ)، پروفیسر نامی صاحب (الہ آباد) سے خصوصیت کے ساتھ التفات اور توجہ کی ضرورت ہے۔

اس تجویز کی تائید میں بہت سے خطوط آئے جن میں اس کام کے شروع کرنے کے لیے مختلف تجویزیں پیش کی گئی تھیں، مگر پہلی تحریک کی طرح یہ تحریک بھی آگے نہ بڑھ سکی۔

کیا مسلمان محض ارسطو کے مقلد دوسرے فلاسفہ سے ناواقف تھے: عام طور پر مشہور ہے کہ مسلمان تمام تر ارسطو کے فلسفہ کے مقلد اور اس کے سوا دوسرے فلاسفہ اور ان کے فلسفوں سے ناواقف تھے، ایک یورپین مصنف نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، سید صاحب نے اس کی تردید میں ایک مفصل مضمون فروری ۱۹۲۷ء کے معارف میں لکھا، انگریزی میں بھی یہ مضمون جنوری ۱۹۲۷ء کے اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا، اس میں نہایت تفصیل سے دکھایا ہے کہ مسلمان فلاسفہ اور متکلمین یونان کے تمام بڑے بڑے فلاسفہ اور ان کے علوم و فلسفوں سے واقف تھے، اس شہرت کا سبب یہ ہے

کہ اس زمانہ میں یونان، روم اور مصر میں ارسطو ہی کا فلسفہ چھایا ہوا تھا اور عیسائی متکلمین نے جن کے ذریعہ مسلمانوں میں فلسفہ کا رواج ہوا، ارسطو ہی کے فلسفہ کی اشاعت کی تھی، اس لیے قدرتاً مسلمانوں میں ارسطو ہی کے فلسفہ کا زیادہ چرچا ہوا، اس کی مقبولیت کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ ارسطو کو ابن سینا جیسا فصیح و بلیغ اور ابن رشد جیسا عالی دماغ شارح مل گیا جن کی تحریروں سے مشرق اور مغرب دونوں گونج اٹھے اور ان کے مقابلہ میں دوسرے مسلمان حکما و متکلمین کی آوازیں دب گئیں، تیسرا سبب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی تاریخ فلسفہ کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ صرف فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن رشد، محقق طوسی اور قطب الدین شیرازی کی تصانیف سے عبارت ہے، جنھوں نے ارسطو کے فلسفہ کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا ہے، حالاں کہ صحیح معنوں میں مسلمانوں میں فلسفہ کا دور متکلمین مثلاً علاف ابوالہذیل، نظام، جاحظ اور ابوالحسن اشعری وغیرہ کی تصنیفات ہیں، جن میں قدیم فلاسفہ کے خیالات کی ترجمانی کی گئی اور جو کتابیں عموماً کتاب المقالات اور کتاب الدیانات کے نام سے لکھی گئی ہیں، ان میں یونانی فلاسفہ کے نظریے اور مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

سید صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ مسلمان فلاسفہ اور متکلمین ارسطو کے علاوہ یونان کے تمام بڑے بڑے قدیم فلاسفہ مثلاً ارسطاطالیس، انکساغورث، انکیمانس، اینبذقلس، فیثاغورث، سقراط، افلاطون کے علوم و فلسفوں سے پوری طرح واقف تھے اور اس کے ثبوت میں ان تمام فلاسفہ اور متکلمین کے نام لکھے ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں ان حکما اور ان کے فلسفوں کا ذکر کیا ہے، ان کی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں، ان کی شرحیں لکھیں ہیں یا ان کی تردید و تنقید کی ہے، اس سلسلہ میں یہ بھی دکھایا ہے کہ مسلمان حکما محض ارسطو کے مقلد ہی نہ تھے بلکہ بعض حکما نے اس کے فلسفہ پر تنقید کر کے اس کی غلطیاں واضح کی ہیں، اس لیے یہ شہرت صحیح نہیں ہے کہ مسلمان حکما محض ارسطو کے فلسفہ کے مقلد تھے اور ان کو دوسرے فلاسفہ سے واقفیت نہ تھی۔

باب پنجم

۱۹۲۷ء-۱۹۳۴ء

۱۹۲۶ء کے بعد اگرچہ سیاسی اور ملی ہنگاموں سے فرصت مل گئی تھی لیکن اب سید صاحب کی شخصیت اتنی اہم اور ان کی شہرت اتنی آل انڈیا ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے تھے اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے ان کی طلب بڑھ گئی تھی، اس لیے ۱۹۲۶ء کے بعد کا زمانہ ان کی شہرت کے شباب کے ساتھ ان کی انتہائی مشغولیت کا دور ہے اور اس دور میں انہوں نے گوناگوں کام انجام دیے۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شرکت: اپریل ۱۹۲۷ء میں انجمن حمایت اسلام کی دعوت پر اس کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے، اس سفر کی پوری روداد مئی ۲۷ء کے معارف میں لکھی ہے، یہ روداد بڑی دل چسپ ہے، اس سے اس عہد کے لاہور اور اس کی علمی بزم کا نقشہ نظر آجاتا ہے، اس لیے اس کے بعض اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

پچھلے دس برسوں میں میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا مگر یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ پنجاب جانا اس عرصہ میں نصیب نہ ہوا، پنجاب کے احباب نے بارہا تقاضا کیا لیکن مجبوریاں تعمیل سے مانع رہیں، حمایت اسلام کے کارفرما ہر سال یاد فرماتے

رہے، مگر عدم تعمیل کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ہاتھ آتا رہا، اس سال مزید بہانہ جوئی کے لیے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی اور وسط اپریل میں لاہور جانا ہوا۔

لاہور آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گیا تھا اور اب پھر گیا، اس لیے انجمن کی تقریر میں میں نے کہا کہ لاہور پہلے اس وقت آیا تھا جب میرا آغاز شباب تھا اور اب آیا ہوں جب انجام شباب ہے کہ عمر کا توسن مرحلہ اربعین سے دو تین قدم آگے بڑھ گیا ہے، انجمن میں میری تقریر ''عہد رسالت میں اشاعت اسلام'' پر ہوئی، اس تقریر کا خلاصہ بعض اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

لاہور ہندوستان کا دروازہ ہے، وہاں کی حرکت و جنبش، چہل پہل، رونق، گرم بازاری، جوش و خروش ہر چیز دلوں کے عزم اور ہاتھ پاؤں کی قوت کو ظاہر کرتی ہے، حمایت اسلام اس وقت نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کی تمام اسلامی انجمنوں میں سب سے زیادہ باعمل اور کارکن جماعت ہے، نقائص اور کمزوریوں پر نہ جائیے کہ ان سے تو کوئی انسانی کام کبھی خالی نہیں رہ سکتا، جو اس نے نہیں کیا اس کا گلہ کیجیے، مگر جو اس نے کیا ہے اس کا شکریہ بھی ادا کیجیے، اس وقت وہ ایک بڑا کالج، چند ہائی اسکول، متعدد پرائمری اسکول، زنانہ مدرسے اور یتیم خانے چلا رہی ہے، اس کے اردو اور فارسی نصاب کی کتابوں نے تمام ملک میں مقبولیت حاصل کر لی ہے، تبلیغ کا صیغہ بھی اس میں ہے اور بھی رفاہ عام کے کام وہ انجام دے رہی ہے، اس کا آغاز چند مخلص غریب عملی مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا اور اب وہ امرا اور ذی اثر اشخاص کے حصول عزت کا سامان ہے اور یہی اس کی کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔

اس کے ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ مدت سے لاہور اردو مطبوعات اور اخبارات و رسائل کا مرکز ہے، اب تو اور دیوں نے بھی کچھ کام شروع کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ نصف صدی تک صرف لاہور نے تنہا اس خدمت کو انجام دیا ہے اور اب بھی وہ سب سے آگے ہے اور بھلا برا جو کام بھی اس سے بن آیا، اس نے کیا اور دوسروں کے لیے تقلید کا

نمونہ پیش کیا۔

اصحاب علم اور ارباب ادب کی جمعیت کے لحاظ سے بھی وہ آج کل ہندوستان کی سب سے بہتر مجلس ہے، ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، پرنسپل عبداللہ یوسف علی، پروفیسر محمود شروانی، پروفیسر اقبال، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر سراج الدین آذر، مولوی محمد علی، ایم، اے، خواجہ کمال الدین، پروفیسر سید عبدالقادر، مولوی ظفر علی خان اور متعدد ایسے اہل کمال اصحاب کی سکونت کا فخر اس کو حاصل ہے جس کے یک جا مرقع کمال کی مثال کسی اور شہر میں نظر نہیں آتی، پرانے لوگوں میں سید ممتاز علی، مولوی محبوب عالم اور مولوی انشاء اللہ خاں اپنی بہاریں گزار چکے تاہم ان کی خزاں بھی بہار کی یادگار ہے۔

انشا پردازوں اور ادیبوں اور شاعروں کی محفل بھی وہاں کچھ کم پررونق نہیں، سالک، مہر، تاجور، ابوالاثر حفیظ، غلام ربانی تاثیر، حکیم یوسف حسن (نیرنگ خیال) مولانا عبداللہ، سید امتیاز علی تاج، اختر شیرانی اور کئی معتدد اہل قلم آگے بڑھنے میں مصروف عمل ہیں اور مستقبل ان کی کام یابی کا منتظر اور ان کے خیر مقدم کے لیے تیار ہے اور ان میں سے بعض تو آگے بڑھ کر پہلی صف کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

یہ لکھنے میں میرا دل خوشی اور مسرت سے لب ریز ہے کہ لاہور کے اہل علم اور اہل قلم طبقہ نے اپنی برادری کے اس کم ترین ممبر کو خوش آمدید کہنے میں پوری فیاضی کا ثبوت دیا، مولوی ظفر علی خاں نے تو اپنے گھر مہمان اتارا اور یہ نامناسب بھی نہ ہوا کہ ایک دہقانی ایک ''زمیں دار'' کا مہمان بنا، ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے، ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش قدمی فرمائی، قیام گاہ پر آئے، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانہ میں مدعو کیا، جس کو وہ خود دارالفقرا کہتے ہیں اور میں دارالاقبال کہوں گا۔

مولانا تاجور نے اپنے یہاں چند ہندو مسلمان نوجوان ادیبوں کو میری عزت افزائی

کے لیے چائے پر بلایا، پروفیسر آذر نے چند عشاق کتب کو مجھے اپنا قلمی کتب خانہ دکھانے کے بہانہ سے یک جا کیا، خواجہ سلیم الدین صاحب نے ممتاز اہل علم اور نوجوان دل دادگان فن کو اپنے خوان نعمت پر جمع کیا اور ایک غریب الدیار کی عزت بڑھائی، خضر نسواں مولوی ممتاز علی صاحب نے جو تہذیب قدیم وجدید کا مجموعہ ہیں، اپنے ادب کدہ میں یاد فرمایا۔

ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے، انہوں نے تو ''شمع اور شاعر'' لکھا ہے لیکن میں لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا، قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا، ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح بلند کر رہی ہے، ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات ان کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں، ان کی زمزمہ پردازیوں کا نیا مجموعہ ''زبور عجم'' کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے، میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھوں میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفہ کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا پردہ رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔

لاہور سے محبت کے پیکر محبی مولوی عبدالعزیز صاحب منہاس ایم، اے، ایل، ایل، بی، وکیل گوجراں والا نے گوجراں والا کھینچا، احباب نے یہاں وہ قدر افزائی کی جو مدتوں فراموش نہ ہوگی، شہر میں احناف اور اہل حدیث دونوں فرقے ہیں اور میرا یہ حال:

ع تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو

اس لیے دونوں جماعتوں نے خیر مقدم کیا، یہاں دونوں جماعتوں کے الگ الگ مدرسے ہیں، مولانا عبدالعزیز براس الساری...... کے مولف یہاں کی جامع حنفی کے امام اور مدرسہ کے صدر المدرسین ہیں، مولانا سے مل کر طبیعت بہت محظوظ ہوئی، اہل حدیث جماعت کی مجلس اور اس کا نظام امارت بہت پسند آیا، کاش تمام ملک کے اہل حدیث یہاں کے غیر مقلدین کی تقلید کر سکتے۔ (معارف مئی ۱۹۲۷ء)

جامعہ ملیہ دہلی کو مفید مشورے: جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی مسلمانوں میں آزاد قومی تعلیم کا پہلا نمونہ تھا اور آئندہ اس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، سید صاحب اس کے بنیادی ممبروں میں تھے اور اس سے ان کو بڑا تعلق تھا، اس لیے برابر اس کی رہنمائی فرماتے تھے اور کبھی کبھی جامعہ جاتے بھی تھے، اگست ۲۷ء کے معارف میں قوم کو اس کی جانب توجہ دلائی، اس سلسلہ میں قومی اور مذہبی تعلیم پر بھی بڑے گراں قدر خیالات ظاہر فرمائے تھے جن سے آج بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

ہندوستان کی آزاد قومی درس گاہوں میں جامعہ ملیہ دہلی ایک ایسی درس گاہ ہے جس کا نصب العین ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہے جو مذہبی واقفیت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوں اور اپنے دل میں ملک وملت اور قوم و مذہب کا درد رکھتے ہوں اور اس کی خدمت اپنا مشغلہ زندگی بنالیں، اسی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کا سامان پیدا کر سکیں، جامعہ کے قیام کو ابھی صرف سات برس ہوئے ہیں، یہ مختصر مدت اس فیصلہ کے لیے کافی نہیں کہ وہ اپنے نصب العین میں کہاں تک کام یاب ہوا ہے، (یا بقول اصحاب جامعہ ہوئی ہے۔)

اس مدت میں اس جامعہ کی طرف سے متعدد طلبہ کام یاب ہو کر عملی میدان میں قدم رکھ چکے ہیں اور انہوں نے عموماً قومی خدمت یا تعلیم و تدریس یا تحریر و انشا اور اخبار نویسی کی زندگی اختیار کی ہے اور سادگی، حسن خلق، اپنے وطن اور مذہب کے ساتھ محبت کو انہوں نے اپنا ممتاز شعار قرار دیا ہے، ان کی مذہبی پابندی بھی تمام دنیاوی درس گاہوں کے طلبہ سے اچھی ہے۔

اس کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو چند ایسے ایثار کرنے والے لائق مسلمان اساتذہ مل گئے ہیں جنہوں نے نہایت خوشی سے اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں اور وہ شب و روز اس کی دھن میں مصروف ہیں، جب تک ان کا یہ ایثار، اخلاص اور انہماک باقی

ہے اس کی کام یابی غیر مشکوک ہے۔

جامعہ نے اتنے دنوں ہی میں اپنا ایک اچھا خاصہ مشرقی ومغربی علوم کا کتب خانہ قائم کرلیا ہے اور اردو اکیڈمی کے نام سے ایک علمی مجلس کی بناڈالی ہے، علمی و سیاسی و اقتصادی مسائل کے لیے جامعہ نام ماہوار رسالہ اور تعلیم کے لیے پندرہ روزہ صحیفہ پیام تعلیم جاری کیا ہے، ساتھ ہی مفید تصانیف وتراجم کا سلسلہ بھی شروع کررکھا ہے جس میں اس کو روز بروز خاصی کام یابی ہورہی ہے۔

یکم اگست سے جامعہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا ہے، اس میں طلبہ کے داخلہ اور قیام وتعلیم کے مفصل قواعد مطبوعہ موجود ہیں اور وہ دفتر جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتے ہیں، ایک طالب علم کے لیے مختلف قسم کی فیسوں کی مجموعی تعداد پندرہ روپے کے قریب ہے، جو نسبتہً انگریزی کالجوں سے ارزاں ہے، اس وقت اس کے ابتدائی، ثانوی اور انتہائی درجوں میں دوسو طلبہ تعلیم پارہے ہیں اور امسال مزید اضافہ کی توقع ہے۔

اس سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا اگر اصحاب جامعہ کی خدمت میں چند مخلصانہ گزارشیں پیش کی جائیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ اس مختصر سی مذہبی وعربی تعلیم میں ''مجتہدیت'' کی شان پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے، اگر ایسا ہوا تو جامعہ کے یہ ''پڑھے لکھے جن'' مسلم یونیورسٹی کے ان پڑھ جنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں، اسی طرح یہ خطرہ بھی ہے کہ اس کی معاشرت وسیاست میں ''ہندویت'' کا رنگ نمایاں نہ ہو، ''فرنگیت اور ''ہندویت'' دونوں اسلام سے مغایرت میں یکساں ہیں، ان میں فرق صرف بدیشی اور سودیشی کا ہے، جامعہ کے افتتاح کے وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نصب العین کے متعلق جو الفاظ فرمائے تھے، ضرورت ہے کہ وہ ہر وقت اس کے ہر استاد اور طالب علم کے سامنے رہیں۔

یہ بھی پیش نظر ہے کہ جامعہ یورپ کے صرف سیاسی استیلا سے آزادی کی تحریک

نہیں بلکہ اس سے بدر جہا بڑھ کر اس کے دماغی و ذہنی استیلا سے آزادی کی تحریک ہے، اس سے یہ مقصود نہیں کہ ہم یورپ سے اس کے نئے علوم اور سائنس کے سبق نہ سیکھیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنے مذہبی حقائق، مشرقی علوم و آئین، اصلاح و تجدید کا درس بھی اسی سے حاصل کریں اور اس کی تصدیقی سند و مہر کو ہم ان کے صحت کا معیار جانیں، پیرس کے جامعی طالب علم کے شائع شدہ خیالات اس کی غمازی کر رہے ہیں، دیکھیں ہمارا ''یوسف'' مصر سے جب کنعان واپس آتا ہے تو وطن کے لیے کیا تحفہ لاتا ہے کہ ''برہان ربانی'' اس کے ''دامن خیال'' کو کشمکش کے نتیجہ سے محفوظ رکھے[1]۔

جامعہ اس وقت قوم کے ارباب نظر کی نگاہوں میں آزمائش و امتحان کے دور میں ہے، ضرورت ہے کہ وہ ہر راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھے تا کہ دوسرے چالیس برس کے بعد مسلمانوں کو یہ فیصلہ نہ کرنا پڑے کہ ہم پھر غلط راستہ پر چل کھڑے ہوئے ہیں اور منزل مقصود کی سمت اور ہے۔

جامعہ اور دوسری قومی و مذہبی درس گاہوں کے بارے میں قوم کے فرائض: اسی کے ساتھ اس کے متعلق قوم کے بھی کچھ فرائض ہیں، اس کے ماہ وار مصارف بڑی کفایت شعاری کے بعد غالباً اب ڈھائی تین ہزار ماہ وار ہیں، بظاہر اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں، جناب حکیم اجمل خاں صاحب کی بڑی دوڑ دھوپ اور محنت و جانفشانی کے بعد بعض ریاستوں سے اس کو کچھ ماہ وار امدادیں ملی ہیں، کچھ دہلی سے مقامی اعانتوں کا سامان ہوا ہے، کچھ لوگ باہر سے کبھی کبھی بھیج دیتے ہیں، کچھ فیس کی رقمیں مل جاتی ہیں مگر یہ صورت حال کب تک قائم رہ سکتی ہے، اس پراگندہ روزگاری سے پراگندہ دلی کا پیدا ہونا لازمی ہے،

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے ایک مضمون کی طرف اشارہ ہے، جو اس وقت پیرس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ان کا یہ مضمون رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تھا، وہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا، اس کے بعد بحمد للہ ایسے راسخ العقیدہ مسلمان بن گئے جو بڑے بڑے دین داروں کے لیے قابل رشک ہے۔

ہماری قوم کی شکایت تھی کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان ایثار نہیں کرتے مگر اب ہمارے تعلیم یافتہ ایثار کرنے والے نوجوانوں کو یہ شکایت نہ ہو جائے کہ قوم ہماری واجبی قدردانی نہیں کرتی۔

ندوۃ العلماء کے لیے مالی اعانت کی اپیل: اس وقت خواہ دینی ہو یا دنیاوی آزاد قومی درس گاہوں کا قائم رکھنا سخت مشکل ہو رہا ہے، ملک کے طول وعرض میں اس وقت جتنے غیر سرکاری عربی مدرسے ہیں، ان میں سے جو چند عمومی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی زندگی کا سہارا صرف حیدرآباد اور بھوپال کی ماہوار امدادیں ہیں، اس کے بعد دہلی، بمبئی، کلکتہ اور راندیر کے بعض مسلمان تاجروں کی ہمتیں ہیں، ان کے بعد زکوٰۃ کی رقمیں اور چرم قربانی کی قیمتیں ہیں، ہمارے عربی مدرسوں کی آمدنی کے یہ چار ذریعہ ہیں لیکن روز بروز یہ مشکل پیدا ہو رہی ہے کہ لوگوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹتی جاتی ہے۔

ایک مرکزی دینی عربی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اہتمام وانتظام کا بار ہمارے سپرد ہے، خدا جانتا ہے کہ اس کے مصارف اور ضروریات کے پورا کرنے کی فکر کس طرح شب وروز اس کے کارکنوں پر مسلط رہتی ہے، مگر کامیابی کا کوئی ذریعہ نہیں سوجھتا، اس کی عظیم الشان درس گاہ سالہا سال سے نامکمل پڑی ہے، جوں توں کر کے چونتیس ہزار لگا کر اس کے دارالاقامہ کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا گیا، پچاس طلبہ کے لیے چودہ کمرے گو کسی طرح تیار ہو گئے، مگر بیچ کا دارالمطالعہ ہنوز ناتمام ہے اور اس پر بھی ہم ایک ہندو ٹھیکہ دار کے سات ہزار کے مقروض اور صرف اس کے رحم وکرم کے تقاضے پر آج ایک سال سے جی رہے ہیں، پچھلے سال کان پور کے اجلاس ندوہ میں جن جن صاحبوں نے جو کچھ لکھایا تھا، وہ بار بار کے تقاضوں کے باوجود ہنوز ایفائے عہد کا منتظر:

یوں ہوں میں شکوے سے پر راگ سے جیسے باجا
ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

قوم کے حساس دل اصحاب کو متنبہ ہونا چاہیے کہ اگر ہمارا یہی تغافل قائم رہا تو یہ عربی کی درس گاہیں ایک ایک کر کے حکومت کے تعلقات میں گرفتار ہوتی چلی جائیں گی اور بہت سی چلی گئی ہیں اور کچھ جانے کو تیار ہیں، کیوں کہ ان کے ارکان کو ان کا وجود بہر حال عزیز ہے، ایسی حالت میں قوم کے خدمت گزار اور دین و مذہب اور اس کے علوم کے خدام کا وجود بھی مفقود ہو جائے گا، تمام ملک میں مولوی کے بجائے صرف ''بڈ مولوی'' ہی نظر آئیں گے، اس دردناک منظر کا تخیل آپ کے سامنے ہے؟ اگر ہے تو اس کے لیے کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں۔

عربی تعلیم اور عربی مدارس کو حکومت کے دام میں لانے کی کوشش اور ان کے نتائج: انگریزی استیلا کے بعد جہاں انگریز سپاہیوں نے ہندوستان کو فتح کیا وہاں انگریز عالموں نے یہاں کے دماغوں کو فتح کرنے کی کوشش کی، انگریزی اسکولوں اور کالجوں سے اگر کوئی محفوظ تھا تو بے چارے عربی و فارسی وغیرہ مشرقی علوم کے پڑھنے والے تھے، اس لیے ہندوستان کے دو کثیر التعداد مسلمان صوبوں میں سب سے پہلے ان کے لیے پھندے لگائے گئے، پنجاب و بنگال میں انگریزی حکومت نے مشرقی علوم کی سرپرستی کے لیے اپنا دستِ شفقت پھیلایا، بنگال میں تو مدرسہ عالیہ کا جال ایسا پھیلا کہ اب تک بنگال مرغ تہ دام ہے، پنجاب میں لائٹز صاحب کی مہربانی سے اورینٹل کالج قائم ہوا اور مولوی عالم اور مولوی فاضل کی سندیں بٹنے لگیں اور اس میں ان کو یہ کامیابی ہوئی کہ اب تک پنجاب کے بڑے بڑے علما مولوی فاضل[۱] کا خطاب فخراً اپنے نام کے ساتھ بالالتزام لکھتے ہیں۔

مشرقی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم ہوئیں جن کا سارا نظم و نسق اور تانا بانا انگریزوں کے ہاتھوں یا انگریزوں کے برابر مشرقی علوم کی واقفیت کی علمی سند رکھنے والوں

---

۱ یہ مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم امرتسری کی طرف اشارہ ہے، ان کے اخبار اہل حدیث میں ان کے نام کے ساتھ مولوی فاضل بھی تحریر ہوتا تھا۔

کے ہاتھوں میں رہا اور جہاں تک ممکن ہوا دینیات کی کتابوں سے خالی رکھا گیا، اس طرح نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے وہاں کے طلبہ کو اسلامیت سے پاک رکھ کر خالص عربی علوم سکھائے گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں عربی جاننے والے تو بہت ہوگئے مگر علما کم ہوگئے، پنجاب میں جدت پسندی جو بدعتیں چالیس برس کے عرصہ میں جاری ہوئی ہیں ہم تو ان سب کی اصل اور جڑ اسی غیر مذہبی عربی تعلیم کو قرار دیتے ہیں۔

پھر اس کے ساتھ مزید ترغیب وتحریص کی شکلیں پیدا کی گئیں، یونیورسٹی کی سندوں سے ممتاز کیے گئے اسکولوں اور کالجوں میں ان کی مدرسی کا حق مرجع تسلیم کیا گیا، رجسٹراری اور وکالت وغیرہ کا حق ان کو ملا، یونیورسٹی کے امتحانوں میں صرف انگریزی ادب میں امتحان پاس کر لینے پر دوسرے عام انگریزی طلبہ کے برابر ان کو بی، اے اور ایم، اے کی ڈگریاں دی جانے لگیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال اور پنجاب میں کوئی بڑی آزاد عربی درس گاہ باقی نہ رہی اور نہ ان استحقاقات کے مقابلہ میں وہ قائم رہ سکتی تھی، پنجاب کی اس عظیم الشان اسلامی آبادی میں جہاں تقریباً ہر ضلع میں ایک انگریزی اسلامی اسکول موجود ہے، پورے صوبہ میں کوئی عربی کی بڑی قابل ذکر درس گاہ موجود نہیں اور بنگال میں جو بھی عربی مدرسہ یا مکتب ہے، وہ مدرسہ عالیہ کے پنجہ نظام میں گرفتار ہے۔

اب تک بہار اور صوبہ متحدہ جہاں عربی کے بڑے بڑے مدرسے ہیں، اس جال سے محفوظ تھے، ان دونوں صوبوں میں ان مدرسوں کو سرکاری قابو میں لانے کے لیے ایک ساتھ کام شروع ہوا، بہار میں مدرسہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) ایک ذاتی حیثیت سے شروع ہوکر رفتہ رفتہ مدرسہ عالیہ کے نظام میں پھنس کر وہ خود اس صوبہ کا ایک مرکزی نظام تعلیم ہوگیا اور اسی پرداز پر اب اس کے تمام کل پرزے حرکت میں ہیں، صوبہ کے اکثر مدارس میں اس کا نصاب چل رہا ہے اور اس صلہ میں مالی امداد اور استحقاقات سے وہ نوازے جارہے ہیں، جس سرعت سے اس کو ترقی ہورہی ہے، اسی سرعت سے آزاد مدارس کی کمزوری اور فنا کے

دن قریب آرہے ہیں اور عن قریب اس علم وفن کی سرزمین میں بھی وہی پنجاب اور بنگال کا موسم نمودار ہونے والا ہے، اس صوبہ میں بھی پہلے الہ آباد یونیورسٹی میں ان استحقاقات کے دانے چھینٹے اور مشرقی امتحانات کا جال بچھایا مگر اس صوبہ کے اہل علم نے یہ ثابت کردیا کہ:

ع بدام ودانہ نگیرند مرغ عنقارا

آخر مزید اہتمام کی ضرورت پیش آئی، گورنمنٹ نے دارالعلوم ندوہ کی مالی اعانت سے عربی مدرسوں کی مالی امداد کی نئی روش کا آغاز کیا، اس کے بعد ان مدارس کی دیکھ بھال کے لیے ایک عربی داں گریجویٹ فاضل کا انتخاب ہوا اور اس عہدہ پر بالفعل ہمارے عزیز دوست مولوی ضیاالحسن صاحب علوی ندوی ایم ،اے ممتاز ہیں، انہوں نے نہایت محنت سے ان مدارس کی تنظیم کی ہے، ان کے لیے ایک نیا نصاب تجویز ہوا ہے اور اس نئے نظام کے ماتحت بہت سے عربی مدارس آگئے ہیں اور انہوں نے نہایت خوشی سے اس کو قبول کرلیا ہے، چنانچہ اب وہاں کے امتحانات ملا فاضل و مولوی فاضل کے کام یاب علما کو ہڈ مولوی بننے کا استحقاق حاصل ہوگیا ہے۔

سب سے آخر میں ہمارے صوبے کی سب سے نو عمر لکھنؤ یونیورسٹی نے اس میں قدم رکھا، اس نے چند سال سے فاضل ادب و فاضل حدیث وغیرہ کے نام سے امتحانات کھولے، طلبہ اور دوسرے مدارس سے پڑھ کر ان امتحانات میں شریک ہورہے ہیں، جون کے آخر میں یونیورسٹی نے مزید ترغیب یہ پیش کی ہے کہ اپنے یہاں کے مشرقی امتحانات کا کام یاب طلبہ کو اپنے کالج میں پنجاب کی طرح صرف انگریزی میں امتحان دے کر بی، اے اور ایم، اے کی ڈگری حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، یہ بجلی کسی اور خرمن پر گرے یا نہ گرے مگر ہمارے خرمن پر تو گر کر رہے گی کہ یہ آگ ہمارے خرمن کے دامن ہی میں ہے (لکھنؤ یونیورسٹی اور دارالعلوم ندوہ دونوں ہم سایہ واقع ہیں) طلبہ نہایت آسانی کے ساتھ ان امتحانات میں شریک ہو کر استحقاقات ملازمت حاصل کررہے ہیں اور یہ شعبدہ بازی

عین اس وقت کی جارہی ہے جب کہ پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کی بلند بانگی کا طلسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ استحقاقات سال بہ سال سلب ہورہے ہیں، چنانچہ صرف انگریزی ادب کا امتحان دے کر بی، اے اور ایم، اے کی ڈگری حاصل کرنے کی رعایت بھی غائب ہوچکی ہے، تاہم وہی کھیل جو پنجاب میں کھیلا گیا تھا ہمارے صوبہ میں بھی کھیلا جارہا ہے اور ہم نہایت خوشی کے ساتھ خود اس کھیل میں شریک ہیں۔

اس صوبہ کے عربی مدرسے سمجھ لیجیے کہ تمام ہندوستان میں مذہبی علوم وفنون اور دینی اخلاق وتربیت کا بار اٹھائے ہوئے ہیں اور یہیں سے علما، مدرسین، واعظین، خطبا، مناظرین اور قوم ومذہب کے خدمت گزار نکل نکل کر پھیل رہے ہیں اور درحقیقت وہی اس پورے ملک کی مسلمان قومیت کے اصلی کارکن اور راہ نما ہیں، اگر پنجاب، بنگال اور بہار کی طرح اس صوبہ میں بھی قومی عربی مدارس کی تخریب کی یہ تدبیر آپ کی غفلت، بے توجہی اور عدم امداد سے کارگر ہوگئی تو پھر ہندوستان اسلامی وشرعی علوم کا اللہ مالک ہے۔ (شذرات معارف اگست ۱۹۲۷ء)

عربی مدارس کی زبوں حالی کا ماتم: گذشتہ مہینہ کے شذرات میں ہم نے عربی مدارس کی صورت حال پر جوتوجہ دلائی تھی وہ بے اثر نہ رہی، مگر ایک دفعہ نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ سیکڑوں دفعہ ادھر قوم کو توجہ دلائی جائے اور حقیقت واقعہ اس کو سمجھائی جائے، عربی مدارس کی ضرورت ہے یا نہیں اگر ضرورت نہیں ہے تو ان قدامت پرست اور آگے بڑھنے سے روکنے والے مدرسوں کو ایک بارگی برباد کردینا چاہیے اور اگر ضرورت ہے تو ان کو قائم اور باقی رکھنے کی کوئی صورت کرنی چاہیے۔

قوم کو خبر ہے کہ وہ تمام عربی مدرسے جو گذشتہ چالیس پچاس کے عرصہ میں قائم ہوئے اور جن سے سیکڑوں اور ہزاروں علما وفضلا پڑھ کر نکلے وہ ہماری غفلت کے ہاتھوں فنا ہوچکے ہیں یا دم توڑ رہے ہیں، غدر کے بعد سب سے پہلا شہر جس نے عربی علوم ومدارس کی

سر پرستی کی وہ کان پور ہے، مگر اب اسی کان پور میں جا کر دیکھیے تو نہ وہ عربی مدرسے ہیں نہ وہ علما ہیں نہ وہ طلبا ہیں، ایک عام ویرانی چھائی ہوئی ہے، کان پور کے بڑے بڑے عربی مدرسے جہاں کبھی طالبانِ علم کا ہجوم تھا، اب وہاں ہر طرف خاموشی ہے یا چند طالب علم کہیں چٹائی پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، فیضِ عام کان پور مدت ہوئی بند ہو چکا، دار العلوم (مولانا احمد حسن صاحب کان پوری کا مدرسہ) چند سال سے بے چراغ ہے، جامع العلوم اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

علی گڑھ کا وہ مدرسہ جہاں مفتی لطف اللہ صاحب مرحوم درس دیتے تھے اور جس کے حلقہ سے سیکڑوں فضلا پیدا ہوئے، بے نشان ہو رہا ہے، آرہ کا مدرسہ احمدیہ جس کو مولانا ابراہیم صاحب آروی نے قائم کیا تھا اور جس نے تمام مدارس عربیہ میں اصلاح کا قدم سب سے پہلے اٹھایا تھا وہ معدوم ہو چکا ہے، جون پور کا وہ مدرسہ جو مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب کے دم سے قائم تھا، کثیر آمدنی کے باوجود اس کا عدم و وجود برابر ہے، یہی حال لکھنؤ، بدایوں، بریلی، الہ آباد، بنارس اور سہسرام وغیرہ کا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان ہی شہروں میں جہاں ایک طرف پرانے مدرسے فنا ہو رہے ہیں نئے مدرسوں کی بنیادیں بھی پڑ رہی ہیں مگر چند دنوں کے بعد اس کا نتیجہ بھی وہی ہونے والا ہے کہ یہ تمام مدرسے جو نئے قائم ہوتے ہیں وہ اس لیے قائم ہوتے ہیں کہ عموماً (الا ماشاءاللہ) چند علما اور معلمین کو اپنی اوقات بسری کے لیے کسی نہ کسی سامان کی ضرورت ہے، کوئی قومی، مذہبی، علمی یا قومی جذبہ ان مدارس کے وجود اور بقا کی کفالت نہیں کر رہا ہے، یہ حالت نہایت دردناک اور مایوس کن ہے۔

جو مدرسے آج تک کسی نہ کسی حال میں جی رہے ہیں ان کی زندگی کی وجہ بھی کوئی علمی یا دینی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان پر پہلے سے اوقاف ہیں، ان اوقاف پر تصرف کی ضرورت ہے کہ ان کے متولی کسی مدرسہ کا ڈھانچہ قائم رکھیں اس قسم کے مدارس بکثرت

ہیں اور سہسرام، بہار اور جون پور کا تو ہم کو ذاتی علم ہے، ایسے مخلصانہ اعمال سے علم وفن کی تجدید کی ترقی کا خیال محال قطعی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں اب اس فیض و برکت کی اعلیٰ روح موجود نہیں ہے جو پہلے کبھی ان کے درودیوار سے نظر آتی تھی۔

ادھر یہ حالت ہے ادھر زمانہ کا قوی ہاتھ طالب علموں کے دماغوں میں بھی انقلاب پیدا کر رہا ہے، اب وہاں سے استبداد، حریت، شخصیت، جمہوریت، حق اور آزادی کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، پچھلے چند مہینوں سے ہماری سب سے بڑی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو آپ دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں وہ سب زمانہ کے اثرات ہیں، جہاں جس قدر قدامت تھی اسی قدر دیر میں اس کا اثر پہنچا اور جب پہنچ چکا تو پھر اس کا سنبھلنا مشکل ہے، اب اگر آپ سو تدبیریں بھی کریں تو دیوبند میں پچھلا سکون، وہ گزشتہ عہد امن اور وہ ماضی کی خوردانہ اطاعت اور بزرگانہ شفقت واپس نہیں آسکتی۔

یہ سرسری اور عارضی حوادث نہیں ہیں بلکہ تدریجی موثرات کے لازمی نتائج ہیں، جن کو دوربین نگاہوں نے پہلے سے جان لیا تھا اور ہم اس وقت سے جان رہے ہیں جب وہ خطرہ کی صورت میں ہمارے سامنے آگئے ہیں اور اگر اب بھی ہم نے وقت سے پہلے تدارک اور تلافی کا سامان نہ کیا تو رہی سہی حالت کا بھی خاتمہ سمجھیے، ضرورت ہے کہ مدارس عربی کے مہتممین و منتظمین اور قدیم تعلیم سے دل چسپی رکھنے والے اشخاص یک جا ہوں اور اس پر غور کریں اور اصلاحات کی تدبیریں سوچیں، کیا آئندہ ندوۃ العلما کا اجلاس امرتسر اس کے لیے موزوں نہ ہوگا کہ اس میں عربی مذہبی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا جا سکے۔ (شذرات معارف ستمبر ۱۹۲۷ء)

مجلس العلما ترچنا پلی کے جلسہ کی صدارت: ترچنا پلی مدراس میں مجلس العلما کے نام سے جنوبی ہند کے علما کی مشہور مجلس تھی، ۱۹۲۷ء میں مجلس نے اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کی پیش کش کی، سید صاحب نے دینی و تعلیمی اغراض کی بنا پر اس کو قبول کر لیا اور

ستمبر ۱۹۲۷ء میں ترچنا پلی کا سفر کیا، اس سفر میں عربی کی تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کی خاص طور پر کوشش فرمائی، مدراس کے عربی مدارس کے متعلق معلومات حاصل کیں اور بعض مدارس کا معائنہ فرمایا، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

مجلس العلما کے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل: مجلس العلما کا خطبہ صدارت مسلمانوں کے بہت سے اہم مسائل اور ضروریات پر حاوی ہے لیکن اس کے مخاطب علما تھے، اس لیے اس میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور دینی تعلیم و تربیت پر خاص طور سے بحث کی گئی ہے اور ان سے متعلق مفید مشورے دیے گئے ہیں جو ہمیشہ کارآمد رہیں گے، اس لیے اس کے اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں، ابتدائی تعلیم کی اہمیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

حضرات! اس وقت میں ملک میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت، تبلیغ، تنظیم اور سیاسیات و اصلاحات وغیرہ کی ہر طرف آوازیں بلند ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ صرف ایک ہی چیز ہے جو حفاظت اسلام بھی ہے اور اشاعت اسلام بھی ہے، نشر تعلیم بھی ہے، سیاست بھی ہے، اصلاح بھی ہے اور اقتصاد بھی ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو مسلمانوں میں ابتدائی تعلیم کو رواج دیا جائے جس کے نصاب میں پہلی جگہ مذہبی و اخلاقی تعلیم کو پھر اسلام کی مختصر تاریخ کو اور اس کے ساتھ حساب و جغرافیہ، تاریخ ہند اور کچھ نہ کچھ صنعت و حرفت کو جگہ دی جائے، اب ایک نصاب اس کا تیار کرنا چاہیے اور تمام دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کے محلوں میں ایسے مکتب اور شبینہ مدرسے قائم کر دیے جائیں۔

حضرات! ایسے مکاتب اور مدارس کے لیے کتب نصاب کی تیاری، ہر صوبہ میں خود ایک بڑا اہم مسئلہ ہے، مگر آپ کے صوبہ میں اور بھی زیادہ اہم ہے، مدراس اپنی بولیوں کے اختلاف اور کثرت کے عیب کو نہیں چھپا سکتا، وحدت قومی کے لیے وحدت خیال اور وحدت خیال کے لیے وحدت زبان نہایت ضروری ہے، مدراس کا یہ حال ہے کہ تقریباً ہر سو

میل پر اس کی زبان بدل جاتی ہے، اڑیہ، تلنگی، مرہٹی، کنڑی، تامل خدا جانے کتنی زبانیں یہاں بولی جاتی ہیں، ان سب زبانوں میں ان کتابوں کا تیار ہونا اوران کو ذریعہ بنانا بہت مشکل ہے، مجھے معلوم نہیں کہ اس ملک کے مصلحین اور ارباب کار نے اس کا کیا حل سوچا ہے، بہر حال اس کی ضرورت ہے کہ اردو کو پیش از پیش اس صوبہ میں علمی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے پھیلایا جائے، غالباً آپ لوگ ان کوششوں سے ناواقف نہیں ہیں جو اس صوبہ میں ہندی کی اشاعت کے لیے چند سال سے جاری ہیں، ہمیں ہندی سے مخالفت نہیں ہے بلکہ ہم اس کی تائید کرتے ہیں کیوں کہ وہ عملاً اردو ہی ہے، تاہم ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اردو اور ہندی کی بحثوں کو چھوڑ کر ہندوستانی پر متفق ہو جائیں۔

برداران من! آج مسلمانوں میں سب سے بڑا فتنہ دین و دنیا کی تفریق کا پیدا ہے، اسلام نے اس تفرقہ کو مٹا دیا تھا لیکن اب وہ تفرقہ خود اسی کے اندر آکر پڑ گیا ہے، انتہا یہ ہے کہ علوم و مدارس کی بھی دو قسمیں ہوگئی ہیں، دینی اور دنیاوی، حالاں کہ ان کی ایک ہی قسم ہے اور وہ دینی ہے، بہرحال اب ہم اس مشکل میں گرفتار ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اس سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ دینی مدارس میں بعض دنیاوی ضروری علوم کا اس غرض سے اضافہ کیا جائے کہ ہمارے علما موجودہ حالات اور فضا میں اسلامی خدمات کو بخوبی انجام دے سکیں اور دنیاوی مدارس میں دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ مسلمان بچے اپنے دین و مذہب سے بے خبر نہ رہ جائیں، اس کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں، ایک یہ کہ سرکاری مدارس میں اس بات کی کوشش کی جائے کہ اسکولوں کے شروع یا آخر میں ایک پیریڈ دینی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا جائے، دوسری چیز یہ ہے کہ ہر بڑے شہر میں جہاں متعدد اسکول یا کالج ہوں اتوار کے دن تمام طلبہ کو کسی وقت یک جا کیا جائے اور ان کے سامنے عقائد اسلام، تاریخ اسلام، اخلاق نبویؐ اور تعلیمات اسلامی پر مسلسل لکچر دیے جائیں اور قرآن پاک اور کسی منتخب مجموعہ حدیث کا ترجمہ ان کو اس طرح

سنایا جائے کہ وہ ان کے دل میں اتر سکے اور ان کے مذہبی اخلاق کی تعمیر ہو سکے۔

ہمارے مدارس اور مکاتب میں دو باتوں کی سخت کمی ہے، ایک تو یہ کہ مدارس اور مکاتب محض نوشت وخواند کا پیشہ سکھانے کے کارخانے ہیں، حالاں کہ ان کو اخلاق وعادات اور کیرکٹر بنانے اور درست کرنے کی تربیت گاہ ہونا چاہیے، اگر کوئی لڑکا محنتی اور پڑھنے لکھنے میں ہشیار ہے تو یہ اس کی خوبی کے لیے کافی ضمانت سمجھی جاتی ہے حالاں کہ اس سے زیادہ بلکہ اصل خوبی یہ ہے کہ اس کے اخلاق اچھے اور مضبوط ہوں، وہ جھوٹ نہ بولتے ہوں، اوقات کے پابند ہوں، ان کے اطوار درست ہوں، ان کی عادتیں نیک ہوں اور اس کے لیے مدرسین اسی طرح کوشش کریں جس طرح ان کو امتحان پاس کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

صاحبو! قوم کی تعمیر نوشت وخواند کی کام یابی سے نہیں ہوتی، بلکہ محض اخلاق، عادات اور کیرکٹر کی خوبی سے ہوتی ہے، قرآن پاک نے تمام گذشتہ قوموں کے حالات اور ان کی تباہی وبربادی کے واقعات بیان کیے ہیں، ان میں اس نکتہ کو خاص طور سے اس نے دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے جب ایران فتح کیا، جب رومیوں کو شکست دی، جب مصر وشام پر قبضہ کیا تو اس وقت وہ اہل ایران اور رومیوں سے ظاہری نوشت وخواند اور علوم وفنون میں بہتر نہ تھے تاہم جو چیز ان کی کام یابی کا ذریعہ بنی وہ ان کے اچھے اخلاق، ان کے نیک اطوار اور ان کا بہتر کیرکٹر ہے، آج کل کی زندگی میں بھی جو چیز قوم کو اس ادبار سے نجات دلا سکتی ہے وہ وہی اخلاق اور اعمال صالحہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت اور فضل وکرم کا وعدہ اس قوم سے کیا ہے جو ایمان اور عمل صالح میں بہتر ہے اور دنیا کی کام یابی اسی کے لیے ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (نور-۷)	جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین کا خلیفہ بنائے گا۔

اسی کے لیے آخرت کی کام یابی کا وعدہ ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (فتح-۴)

ایمان اور عمل صالح کرنے والوں سے خدا نے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔

علمائے مدراس! خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے کہ ہمارے قدیم عربی مدارس میں موجودہ حالات کے مطابق سخت اصلاح کی ضرورت ہے، اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف باقیات صالحات ویلور اور دوسری طرف مدرسہ اسلامیہ کرنول میں ہم تجدید واصلاح کے آثار دیکھ رہے ہیں، دلائل، شواہد اور طول عبارت کو چھوڑ کر ہم کو ذیل باتوں کی طرف خاص توجہ مبذول کرانی چاہیے:

۱- عربی مدارس کے طلبہ میں مذہبیت، دین داری، تقویٰ اور حسن اخلاق پیدا ہو۔

۲- ان میں تنزہ، صفائی اور پاکیزگی کی عادت ڈالی جائے۔

۳- ان کے خیالات میں بلندی، علوئے ہمت، اخلاقی جرأت، صبر واستقلال اور محنت وجفاکشی پیدا ہو۔

۴- ان کو رہنے سہنے، کھانے پینے میں سادگی اور قناعت کی تربیت دی جائے۔

یہ چیزیں تو تربیت سے متعلق تھیں، تعلیم میں حسب ذیل باتوں کی ضرورت ہے:

۱- یونانی فلسفہ کے مزخرفات کو جن کو ہم نے بہ ضرورت اپنے نصاب تعلیم میں داخل کر لیا تھا، قطعاً خارج کر دینا چاہیے اور ان کے بجائے جدید علوم میں سے مفید چیزیں اضافہ ہونی چاہییں مثلاً حساب، جغرافیہ، تاریخ، طبیعیات، نفسیات، اقتصادیات (اکانمی) وغیرہ۔

۲- متاخرین کی معما اور چیستان عبارتوں کی کتابیں علاحدہ کر دی جائیں اور ان کے بجائے قدما کی سادہ اور عام فہم کتابیں یا آج کل کے طرز کی کتابیں داخل درس کی جائیں۔

۳- عربی علم وادب اور تقریر وتحریر کی قوت بڑھائی جائے اور ادب میں بجائے

کافیہ اور سجع کی کتابوں کے فصیح و با محاورہ عبارتوں کی کتابیں پڑھائی جائیں جو روز مرہ کی ضرورتوں اور علمی و قومی مضامین کی تحریر و تقریر میں مدد دے سکے مثلاً جاحظ، ابن قتیبہ، ابن مقفع، ابو ہلال عسکری، عبدالقاہر جرجانی، ابن خلدون وغیرہ کی تصنیفات۔

۴- فقہ کی تعلیم میں قدیم مباحث کے ساتھ جدید مسائل کے جوابات کے لیے ان کو تیار کیا جائے۔

۵- حدیث شریف کی تعلیم میں آمین و رفع یدین پر زور دینے کے بجائے اخلاق، طہارت، تقویٰ اور حدیث کی عملی حیثیت پر زور دیا جائے اور شخصی حالات کے ساتھ قومی حالات کی مطابقت کی کوشش کی جائے۔

۶- قرآن پاک پورا نصاب میں داخل کیا جائے اور اس پر مختلف حیثیتوں سے خطبات دیے جائیں، فقہ القرآن، اخلاق القرآن، عقائد القرآن، تاریخ القرآن ہر مطلب کی آیتیں علاحدہ کر کے بتایا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ہر موضوع کے متعلق اسلام کی حقیقی تعلیم کیا ہے اور اس نے اشخاص اور قوموں کی ترقی و تنزل کے اصول کیا بتائے ہیں۔

۷- عقائد کی کتابوں سے گذشتہ مرے ہوئے فرقوں کا بیان علاحدہ یا کم کر کے موجودہ فرقوں کی تردید و مناظرہ سکھایا جائے اور اسلام پر اس زمانہ میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے جوابات بتائے جائیں۔

۸- سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سیرت خلفائے راشدینؓ اور مختصر تاریخ اسلام داخل نصاب کی جائے۔

۹- موجودہ زمانہ کی قوموں اور دنیائے اسلام کے حالات اور سیاست سے ان کو باخبر کیا جائے۔

۱۰- کچھ طلبہ ایسے ہوں جو انگریزی یا کسی دوسری یورپین زبان سے واقف ہوں تاکہ اس زبان میں اسلام کے متعلق جو ذخیرہ ہے اس سے واقف ہو سکیں اور حق کی تبلیغ اس

زمانہ میں کرسکیں اور معترضین کے جواب دے سکیں۔

یہ پورا خطبہ معارف میں چھپا ہے۔

اس سفر کے بعض دل چسپ حالات اور مفید معلومات: اس سفر کی مفید اور دل چسپ روداد نومبر ۲۷ء کے معارف میں لکھی ہے جو خود ان کے قلم سے سننے کے قابل ہے:

مدراس میں چند سال سے مجلس العلما کے نام سے ایک مجلس ہے جس کا صدر مقام ترچناپلی ہے، اس کے ماتحت ایک مدرسہ ہے جس میں غریب مسلمان بچے اور یتیم اور نو مسلم تعلیم پاتے ہیں، نصاب تعلیم میں قرآن پاک اور دینیات کے علاوہ اردو، تامل (ملکی زبان) اور انگریزی داخل ہے، ساٹھ ستر ہزار کی اس کی ایک خوب صورت عمارت ہے، ہزار بارہ سو ماہوار کا خرچ ہے، تبلیغ واشاعت تعلیم بھی اس کے فرائض میں ہے، اس سال اس کی صدارت کا شرف ایڈیٹر معارف کو عطا کیا گیا تھا، اس بنا پر مجھے ستمبر کے وسط میں مدراس جانا پڑا۔

اس سفر پر آمادگی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کئی سال سے مدارس کے احباب سے دارالعلوم ندوۃ العلما کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لیے مالی اعانت کا وعدہ چلا آتا تھا، امید تھی کہ شاید یہ موقع اس عہد کے ایفا کے لیے مناسب ہو، چنانچہ ۱۷ر ستمبر کی صبح کو ترچناپلی پہنچا، اسی دن جلسہ کا آغاز تھا، مدارس کے ان علاقوں کی زبان تامل ہے، اردو یہاں کے مسلمان تک برائے نام سمجھتے ہیں، جلسہ میں تمام تقریریں تامل زبان میں ہوئیں، میرا خطبہ صدارت بھی جو اردو میں چھپا تھا وہاں تامل میں ترجمہ ہوکر اور چھپ کر حاضرین میں تقسیم ہوا۔ جلسہ میں علما کی تعداد بھی ساٹھ ستر کے قریب موجود تھی، مختلف تجویزیں منظور ہوئیں، خیر یہ سب کارروائیاں تو ہوتی رہیں، میرے نزدیک اصل چیز جو ہوئی وہ یہ ہے کہ رات کے وقت میری درخواست پر تمام علما ایک ہال میں جمع ہوئے اور عربی مدارس کی اصلاح وترقی اور اسلام کے موجودہ ضروریات اور علما کے موجودہ فرائض پر ایک وسیع اور

مبسوط تقریر ان کے سامنے کی گئی، جس سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور مقرر کے خیالات سے انہوں نے اتفاق کیا اور ان ضروریات کو پورا کرنے اور ان اصلاحات کے جاری کرنے پر پوری آمادگی ظاہر فرمائی۔

مدراس کے ان علاقوں میں عربی مدرسوں کی کمی نہیں، مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ ان مقامات میں چالیس سے زیادہ ایسے مدرسے ہیں جن پر پچاس ہزار سے لے کر سات لاکھ سالانہ تک کے وقف ہیں، خود شہر مدراس میں عربی کے متعدد مدرسے ہیں، جن میں ایک ساہوکار جمال محی الدین کا مدرسہ جمالیہ ہے، ان کے صاحب زادے جمال محمد صاحب اب دارالاقامہ کی نئی عمارت بنوا رہے ہیں اور اس کے تمام اخراجات وہ خود وقت سے ادا کرتے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ یہ مدرسہ جو پہلے پرانے طرز کا تھا، اس میں اب ایک سال سے نئے طرز کی تجدید و اصلاح کی گئی ہے، نصاب بھی بن گیا ہے جس میں قرآن پاک، حدیث شریف، فقہ اور ادب عربی کے ساتھ حساب، جغرافیہ اور تاریخ کا اضافہ کیا گیا ہے، انگریزی لازمی کی گئی ہے اور ابتدائی درجوں میں تامل اور اردو دونوں کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ خیال ہے کہ اس مدرسہ کو ان علاقوں کے مدرسوں کے لیے نمونہ کا مدرسہ بنایا جائے، اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے۔

آمبور کے قریب وہ تاریخی مقام ہے جس کا نام گڑھ آمبور ہے، یہ ایک پہاڑی کا دامن ہے جس میں حیدرآباد، آرکاٹ اور میسور کی مشہور لڑائی ہوئی تھی، یہ میدان جنگ اب صلح کا میدان ہے، روشن کمپنی کے خوش عقیدہ مالکین اور شرکا میں محمد عمر صاحب نے اپنے نام سے یہاں ایک نو آبادی بسائی ہے، جس میں ان کے ذاتی مکان و باغ کے علاوہ ایک خوش نما مسجد اور ایک عظیم الشان عمارت جامعہ دارالسلام ہے، مدرسہ کی عمارت جس میں درس گاہ، دارالاقامہ، مطبخ، مدرسین کے کمرے اور تمام ضروریات ہیں، نہایت مستحکم اور بلند ہے، ستر اسی لڑکے اور آٹھ دس مدرسین ہے، نصاب میں بھی تجدید و اصلاح کی گئی ہے اور

کوشش کی جارہی ہے کہ یہ درس گاہ پورے احاطہ مدراس میں اصلاح اور رد بدعات اور صحت عقیدہ کی اشاعت کرے، یہاں کے طلبہ اور مدرسین کے سامنے دینی مدارس اور طریقہ درس کے تغیر واصلاح پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی اور جدید نصاب کے متعلق مشورے دیے گئے۔

وانمباڑی ان اطراف کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز ہے، یہاں مسلمانوں کا ایک کالج اور اسکول ہے اور دونوں کی عمارتیں خاصی ہیں، طلبہ کی تعداد بھی معقول ہے، مگر آدھے سے زیادہ طلبہ اور اساتذہ ہندو ہیں اور دونوں مل کر اتحاد واتفاق سے کام کررہے ہیں، مگر سرمایہ تمام تر مسلمانوں کا ہے اور وہی اس کے منتظم بھی ہیں، مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اسکول میں ہندو اور مسلمان طلبہ اکثر درجوں میں اس لیے الگ الگ پڑھتے ہیں کہ ہندوؤں نے اپنے لیے ذریعہ تعلیم تامل اور مسلمانوں نے اردو قرار دیا ہے، ایک ہی شہر ایک ہی کالج اور ایک ہی درجہ کے طلبہ کی اس حیثیت سے تقسیم تعجب انگیز ہے، یہاں بھی میرا لکچر مذہبی تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد پر ہوا۔

وانمباڑی میں اس کے علاوہ چند عربی مدارس بھی ہیں، جن میں بعض بہت پرانے ہیں، چنانچہ وہاں کا مدرسہ مفید عام ۱۳۰۴ھ سے قائم ہے، یہاں سب سے عجیب چیز لڑکیوں کا مدرسہ ہے، جس کے لیے ابھی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے، پس پردہ لڑکیوں کا امتحان لیا، بعض لڑکیوں نے نہایت ہی عمدہ صحت مخارج کے ساتھ قرآن پڑھا، قرآن پاک کا ترجمہ سنایا، اردو پڑھی، فارسی عبارت کا ترجمہ کیا، یہاں بھی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر ایک مختصر تقریر کی گئی، یہاں عربی کا ایک پرانا مدرسہ معدن العلوم ہے، جس میں اس دفعہ دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا، طلبہ کے اصرار پر یہاں عربی زبان میں علما کے فرائض پر بیٹھے بیٹھے کچھ تقریر کی جس کو طلبہ اور علما نے توجہ سے سنا۔

آمبور سے آتے ہوئے راستہ میں ویلور پڑا، یہاں بھی دور اسلامی کے کچھ یادگار کھنڈر ملے، شہر بڑا ہے، یہاں ایک مدرسہ تو پرانا ہے جس کی تاریخ شاہ عبدالعزیز صاحب

دہلوی کے قریب پہنچتی ہے اوران کا فیض بھی یہاں پہنچا ہے، دوسرا مدرسہ باقیات صالحات ہے جس کو شاید تیس برس گزرے ہیں، یہ مدراس کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، مولانا عبد الوہاب مرحوم نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، عمارت بھی نہایت شان دار ہے، درس گاہیں، لڑکوں اور مدرسین کے رہنے کے کمرے بھی بلند و مستحکم ہیں، مسجد بھی عظیم الشان ہے، ریل کا وقت کم رہ جانے کی وجہ سے چند منٹ سے زیادہ ٹھہرنے اتفاق نہ ہوا، سرمایہ اس کے پاس کافی ہے، ابھی چند سال ہوئے کہ سی عبدالحکیم صاحب نے یہاں ایک طب کا شعبہ قائم کرنے کے لیے پچاس ہزار روپے دیے ہیں، اور بھی اس کو بڑی امدادیں حاصل ہیں مگر باایں ہمہ اس کا نصاب درس پرانا ہے۔

اس ضمن میں سب سے اہم کام یہ ہوا کہ میری کوشش سے نہیں بلکہ صرف خدا کے فضل اور بعض مخلص مسلمانوں کی ہمت سے جن میں سب سے پہلا نام ساہوکار جمال صاحب کا ہے دارالعلوم ندوۃ العلما کے دارالاقامہ کے لیے ۲۷ رہزار کی رقم جمع ہوئی جس میں ۲۱ رہزار وصول ہو گئے، اس طرح ارکان ندوۃ العلما کو بڑی فکر سے نجات ملی، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ (معارف نومبر ۱۹۲۷ء)

حیدرآباد کا سفر، جامعہ عثمانیہ کا معائنہ: مدراس سے واپسی میں حیدرآباد کا سفر کیا، وہاں **اور اس کے بارے میں تاثرات:** جامعہ عثمانیہ کو دیکھا، اس کی ایک انجمن کے اجتماع میں تقریر کی، دسمبر ۱۹۳۰ء کے معارف میں اس کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کے متعلق مفید مشورے دیے، فرماتے ہیں:

گذشتہ ماہ اکتوبر میں مدراس سے واپسی میں تقریباً دس برس کے بعد میرا حیدرآباد جانا ہوا اور مسلسل بیس روز تک وہاں رہنے کا اتفاق ہوا، دوران قیام میں شہر کے عمائد، اہل علم اور اہل قلم اصحاب نے نمائندہ دارالمصنفین کی جو قدر افزائی کی وہ اس کی توقع سے زیادہ تھی، ان دس برسوں میں حیدرآباد نے ترقی کا جو سب سے شان دار مظہر پیش کیا

ہے، وہ اس کا جامعہ عثمانیہ ہے، جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے توسط سے حیدرآباد میں تقریباً تمام ہندوستان کی روح کھنچ کر آ گئی ہے، جامعہ عثمانیہ کی انجمن اتحاد کی تقریر میں میں نے ظرافتاً کہا کہ ہم کو ہندوستان میں جو قحط رجال نظر آتا ہے اس کی اصل وجہ یہاں آ کر معلوم ہوئی، یعنی ہندوستان کے فضلا کا بڑا حصہ ہندوستان سے کھنچ کر دکن میں آباد ہو گیا ہے اور ہندوستان خالی رہ گیا ہے، اس وقت میرے خیال میں جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے تعلق سے قدیم و جدید علوم کے ماہرین کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی، اس سے اعلیٰ حضرت فرماں روائے دکن کی قدردانی، مردم شناسی اور علم دوستی کا اندازہ ہوگا اور داغ کا مصرع معنوی حیثیت سے اب موزوں ہوا ہے:

ع حیدرآباد آج کل گل زار ہے

اس باب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی تجویز توقع سے زیادہ کام یاب ہوئی اور بالآخر اس طویل فکری مناظرہ کا کہ مغربی علوم وفنون کی تعلیم مادری زبان میں دی جا سکتی ہے یا نہیں اور اردو زبان اس قابل ہے یا نہیں عملی استدلال سے فیصلہ ہو گیا اور جامعہ عثمانیہ نے ثابت کر دیا کہ مادری زبان ہی میں تعلیم دماغی نشو ونما کے اصلی جوہر کو نمایاں کر سکتی ہے، پروفیسروں اور استادوں کو کیمیا، طبیعیات اور ریاضیات کے دقیق سے دقیق مسائل کو اردو اصطلاحات اور زبان میں تعلیم دیتے ہوئے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ طلبہ پر غیر مادری زبان اور مسئلہ کی دقت کا دوگنا بار نہیں پڑ رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی ہندوستان کو قومی تعلیم کا خیال آئے گا تو عثمانیہ یونیورسٹی ہی اس خیال کا سنگ بنیاد قرار پائے گی۔

یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ خوش قسمتی سے عثمانیہ یونیورسٹی کو ہر علم وفن کے لیے اچھے سے اچھے اور لائق سے لائق استاد جو اس بازار میں مل سکتے تھے میسر آئے ہیں اور اس حیثیت سے وہ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے کم مرتبہ نہیں ہے، بلکہ شاید بہت سی سرکاری یونیورسٹیوں سے اس بارہ میں بہتر ہو۔

کیمیا اور طبیعیات کی تجربہ گاہ بہت کچھ ترقی یافتہ ہے، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ طلبہ کی تعداد سال بہ سال آرٹس کی جگہ سائنس میں بڑھ رہی ہے، یہیں کی تجربہ گاہ میں وہ نادر زمانہ چیز دیکھنے میں آئی جس کو لوگ ریڈیم کہتے ہیں، ایک مختصر کمرے کو خاص اسی مقصد کے لیے موزوں کیا گیا ہے، ہر طرف سے دروازے بند کر کے اور بیرونی روشنی کی آمد کو سیاہ پردوں سے روک کر کوٹھری جب بحرظلمات بنالی گئی اور پھر وہ نور کا ٹکڑا ڈبیہ سے نکال کر آنکھ کے سامنے کیا گیا تو معلوم ہوتا تھا کہ اندھیری رات میں سیکڑوں چھوٹے چھوٹے تارے آسمان سے گر کر ادھر ادھر فضا میں پھیل رہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کا کوئی پہلو اگر قابل افسوس ہے تو وہ شعبہ دینیات ہے، اس شعبہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے فاضل استاد ہیں، جن میں سے ایک بھی اگر ہندوستان کے کسی مدرسہ کو میسر آجائے تو وہ اس کی شہرت کے لیے کافی ہے، مگر بایں ہمہ اس کی طرف طلبہ یا طلبہ کے اولیا کا رجحان نہیں ہے، حالاں کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی غایت دین پروری اور قدر شناسی کی وجہ سے اس شعبہ کے طلبہ کو حقوق ملازمت اور عزت وسند میں وہی درجہ عنایت کیا ہے جو دوسرے شعبوں کے کام یاب طلبہ کا ہے، پھر بھی ادھر لوگوں کا میلان نہیں، اس کو مسلمانوں کی بدبختی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جائے۔

جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی کام یابی درحقیقت اس کے دارالترجمہ کی ممنون احسان ہے، یہی وہ شعبہ ہے جس نے جامعہ کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ مادری زبان میں تعلیم کا اہم کام انجام دے سکے، انگریزی، عربی، فارسی کے ضخیم اور دقیق تراجم کا کام یہاں نہایت عمدگی سے انجام پا رہا ہے، یہاں کے تراجم اگر اردو کتابوں کے عام بازاروں تک آجائیں تو معلوم ہو کہ اس کے ذریعہ سے اردو زبان کو کس حد تک مالا مال کر دیا گیا ہے، سیاسیات، طبیعیات، ریاضیات، اخلاقیات، تاریخ اسلام، تاریخ یورپ، تاریخ ہند، جغرافیہ اور ہر علم و فن کی کتابیں تیار ہو چکی ہیں اور تیار ہوتی جارہی ہیں اور اس وقت تک ایک سو کے قریب

کتابیں چھپ چکی ہیں۔ (معارف دسمبر ۱۹۲۷ء)

ندوۃ العلما کا اجلاس امرتسر: دارالعلوم ندوہ کا اکیسواں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۲۷ء میں مولانا غلام حسین صاحب وزیر تعلیمات و امور داخلہ ریاست بھاول پور کی صدارت میں امرتسر میں منعقد ہوا، سید صاحب نے اس میں شرکت فرمائی، یہ جلسہ ہر حیثیت سے گذشتہ کئی اجلاسوں سے زیادہ کام یاب رہا، اس کی مفصل روداد کتابی صورت میں چھپ چکی ہے، حضرت سید صاحب کے قلم سے مختصر روداد یہ ہے:

امسال ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس امرتسر میں تھا، نومبر کی ۲۵، ۲۶، ۲۷ کی تاریخیں اس کے لیے مقرر تھیں، جناب مولانا غلام حسین صاحب وزیر امور داخلیہ وزیر تعلیمات ریاست بھاول پور اس کے صدر تھے، جلسہ میں علما، تعلیم یافتہ اصحاب اور عام مسلمان شریک تھے، ریاست بھاول پور کو ندوۃ العلما سے اس کے آغاز کار سے جو تعلق رہا ہے، مولانا ممدوح کی صدارت نے اس کو اور بھی مستحکم اور ناقابل شکست بنا دیا ہے، دارالعلوم کی درس گاہ تمام تر اسی ریاست کی ایک شاہی خاتون کی مرہون منت ہے، ہم کو امید تھی کہ اس درس گاہ کا ناتمام حصہ بھی اسی ریاست اسلامیہ کے دست جود و سخا سے انجام کو پہنچے، چنانچہ اس اجلاس میں جناب معلی القاب ہز ہائنس فرماں روائے ریاست بھاول پور خلداللہ ملکہ کی طرف سے ۱۵ ہزار کی گراں قدر امداد مرحمت فرمائی گئی، ہز ہائنس کی اس توجہ اور التفات شاہی سے متاثر ہو ریاست عالیہ کے ارکان و عمائد نے بھی دس ہزار کی رقم فراہم کی اور ریاست کی طرف سے دارالعلوم کے صیغہ وظائف میں تین سو سالانہ کی جو رقم عنایت ہوئی تھی وہ بڑھا کر پانچ سو کر دی گئی۔

جہاں تک مسلمانان شہر کا تعلق ہے، جلسہ کے اہتمام، حسن انتظام اور مہمان نوازی کے مصارف کے علاوہ ان سے خود ندوہ کو مالی امداد ان کی حیثیت سے کم ملی، ڈھائی ہزار کا عام چندہ ہوا مگر اس کی تلافی کا وعدہ جنوری میں کیا گیا ہے یعنی ڈھائی ہزار کی مزید رقم اس

مہینہ میں جمع کی جائے گی، ارکان ندوۃ العلما اس ایفائے عہد کے لیے چشم براہ ہیں۔

اس اجلاس کا معنوی حاصل یہ رہا کہ یہ طے پایا کہ دارالعلوم میں مدرسین اور مبلغین کی تیاری کے لیے دو درجے کھولے جائیں، بڑی مشکل یہ ہے کہ نئے مدرسے جو نئے انداز پر کھل رہے ہیں اس کے لیے لائق مدرسین نہیں ملتے اور روز بہ روز تدریس کا فن کم ہوتا جارہا ہے، اس طرح لائق اور قابل مبلغین کا بھی قحط ہے، میری طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی تھی اور اس پر ایک گھنٹہ تقریر کا سلسلہ جاری رہا، (یہ پوری تقریر اس اجلاس کی مطبوعہ روداد میں موجود ہے) ہم کو خوشی ہے کہ حاضرین نے اس ضرورت کا اعتراف کیا اور اس کے لیے مسرت کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، تجویز تھی کہ ہونہار اور مستعد طلبہ کو اس کام کے لیے دو دو برس کے لیے تیس تیس روپے تک کے وظائف دیے جائیں اور ان کو دارالعلوم میں تدریس و تبلیغ کی تعلیم دی جائے، چنانچہ اب تک اس شعبہ میں جن صاحبوں نے مالی امداد کا وعدہ فرمایا وہ حسب ذیل ہیں، ساہوکار جمال محی الدین صاحب تین وظیفے، مولانا غلام حسین صاحب صدر اجلاس و وزیر داخلہ و تعلیمات بھاول پور ایک وظیفہ، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ایک وظیفہ، جناب حاجی نظام الدین صاحب ناظم مالیات انجمن حمایت اسلام لاہور ایک وظیفہ، مسلمانان ہوشیار پور ایک وظیفہ، جناب منشی امتیاز علی صاحب وکیل فیض آباد ایک وظیفہ، انجمن اسلامیہ امرتسر ایک وظیفہ، دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ جو اس درجہ میں داخل ہونا چاہیں اپنی درخواست معتمد تعلیمات دارالعلوم کے پاس بھیج سکتے ہیں۔

حسب دستور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی دل گداز اور موثر تقریر جلسہ کی روح تھی، دارالعلوم کے طلبہ نے عربی اور اردو میں جو تقریریں کیں وہ نہایت حوصلہ افزا تھیں، مولوی عبدالرحمٰن کاشغری کا عربی قصیدہ اور محمد اکبر اور نجم الدین طالب علم کی تقریریں بہت پسند کی گئیں اور ان کو انعامات دیے گئے اور تین فارغ التحصیل طلبہ مولوی عبدالرحمٰن کاشغری، مولوی قاری محمد منیر لکھنوی اور مولوی عتیق احمد بھاگل پوری کو

سند فراغ دی گئی۔ (معارف دسمبر ۱۹۲۷ء)

پشاور کے اجلاس جمعیۃ العلما میں شرکت: آخر نومبر ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ العلما کا سالانہ اجلاس مولانا سید انور شاہ کشمیری کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس سے کچھ پہلے امرتسر میں دار العلوم ندوۃ العلما کا اجلاس ہو چکا تھا، اس سے فراغت کے بعد سید صاحب جمعیۃ العلما کے اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر سے پشاور تشریف لے گئے، اس سفر کی روداد میں لکھتے ہیں:

امرتسر سے جمعیۃ العلما کے اجلاس سالانہ کی شرکت کے لیے پشاور عمر میں پہلی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا، جمعیۃ العلما کے اجلاس کے حالات اور تجویزیں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں، مولانا انور شاہ صاحب کا خطبہ اپنی جامعیت اور بصیرت افزائی کے سبب سے لائق توصیف تھا، اجلاس میں صوبہ سرحد کے بہت سے علما شریک تھے، عام سرحدی مسلمان بھی بکثرت تھے، تجویزوں میں اہم چیز رسوم و بدعات کے مٹانے اور چھوڑنے کی ہدایت تھی، جو خاص طور سے صوبہ سرحد اور افغانی مسلمانوں میں جاری ہیں، نیز مدارس اسلامیہ کے نصاب میں اصلاح اور جدید مسائل کے تصفیہ کے لیے علما کی ایک مجلس کا تقرر اور صوبہ سرحد میں ایک عربی درس گاہ کا قیام۔

پشاور میں علمی اور تعلیمی حیثیت سے کوئی چیز قابل ذکر ہے تو وہ دار العلوم یعنی اسلامیہ کالج ہے، شہر سے چار پانچ میل دور پشاور شہر اور عبرود کے بیچ میں واقع ہے، وسیع عمارتیں ہیں، درس گاہیں ہیں، دار الاقامے ہیں، کتب خانہ ہے، مسجد ہے، طلبہ کی خاصی تعداد ہے، کئی سو لڑکے ہیں، جن میں خاص صوبہ سرحد کے علاوہ آزاد علاقوں کے لڑکے بھی ہیں، اس کالج کے متعلق مخالف و موافق دو رائیں ہیں، ایک یہ کہ یہ جاہل پٹھانوں کو متمدن اور مہذب بنانے کی مشین ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بہادر اور آزاد پٹھانوں کو غلام اور نامرد بنانے کا مہذب ذریعہ ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس تعلیم جدید سے

قومیت کا احساس زندہ ہو رہا ہے اور پھر ایک ایسی قوم میں یہ احساس جو مذہب، زبان اور نسل میں بالکل متحد اور ایک ہے۔

اسلامیہ کالج کا مشرقی کتب خانہ بھی قابل قدر ہے، اردو اور نادر کتابوں کا خاصہ ذخیرہ اس کی الماریوں میں موجود ہے اور اتفاق سے اس کا ناظم بھی ایک لائق اور شائق علم عالم میسر آ گیا ہے، قلمی کتابوں میں بعض طب اور کیمیا کی ایک دو حدیث کی اور بعض دوسرے علوم کی نادر کتابیں ہیں، بعض نامور مصنّفین کی تحریریں بھی ہیں، کتابیں سلیقہ سے مرتب کی گئی ہیں، کتب خانہ کی چھپی ہوئی مفصل فہرست بھی شائع ہو چکی ہے۔ (معارف دسمبر ۱۹۲۷ء)

نکاح، اختیار بلوغ، خلع اور طلاق وغیرہ: اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب نے بھی عورتوں میں عورتوں کے حقوق کی حمایت : کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے، دوسرے تمام مذاہب میں عورتوں کی حیثیت مردوں کے محکوم کی ہے، شادی بیاہ اور نکاح و طلاق کے معاملات میں بھی جو زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے، عورتوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، دنیا کے بڑے مذاہب میں ہندو مذہب میں نکاح ایک ناقابل شکستہ رشتہ ہے، جو شوہر کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹتا اور بیوہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی اور ایک مرتبہ شادی ہو جانے کے بعد وہ ہر حال میں شوہر کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، عیسائی مذہب میں بیوی کی بیوفائی اور بدکاری کے علاوہ دونوں میں علاحدگی کی اور کوئی شکل نہیں ہے اور علاحدگی کے بعد ان میں سے کسی کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے، یہودی مذہب میں مرد کو ہر وقت طلاق کا حق حاصل ہے لیکن عورتوں کے لیے شوہروں سے علاحدگی کی کوئی شکل نہیں، یہ قوانین اس قدر سخت تھے کہ ان مذاہب کے ماننے والوں کو بھی ان میں تبدیلی کرنا پڑی، خصوصاً یورپ کے نئے قوانین نے عورتوں کو بالکل آزاد کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں اسلام نے عورتوں کو نکاح، طلاق اور خلع وغیرہ کے بارہ میں

جو حقوق دیے ہیں وہ کچھ تو رسم و رواج نے غصب کر لیے اور کچھ تقلید جامد نے، ہندوستان کے مسلمان خصوصیت کے ساتھ ملکی رسم و رواج سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہاں مسلمانوں کا جو پرسنل لا رائج تھا، اس کی بنیاد فقہ حنفی پر تھی، اس میں وہ وسعت نہ تھی جو ائمہ اربعہ کی فقہ میں ہے، مسلمانوں کا اپنا نظام قضا نہ تھا جو حالات کے لحاظ سے دوسرے ائمہ کے اقوال کے مطابق بھی فیصلہ کر سکتا، اس لیے اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں، ان سے بھی وہ فائدہ نہ اٹھا سکتی تھیں اور بعض حالات میں ان کی پوری زندگی تلخ ہو جاتی تھی، جن سے رہائی کی کوئی شکل نہ تھی، اس کے بڑے خراب نتائج نکلتے تھے اور بعض اوقات مظلوم عورتیں ان سے رہائی کے لیے اپنا مذہب تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتی تھیں۔

اس صورت حال نے دوسری قوموں اور خود مسلمان مغرب زدہ طبقہ کو اسلامی قوانین پر طعن وطنز کا موقع ملتا تھا۔

ان مشکلات کو دیکھ کر سید صاحب نے عورتوں کے حقوق پر ایک طویل مضمون لکھا جو ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء کے معارف کے مختلف پرچوں میں چھپا، اس مضمون میں نکاح، خیارِ بلوغ، طلاق اور تفریق وغیرہ میں عورتوں کو جو حقوق حاصل ہیں ان پر مفصل بحث کی اور تقلید شخصی سے ہٹ کر احادیث نبوی اور ائمہ اربعہ کی فقہ کی روشنی میں ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی، اس مضمون نے دوسرے علما کو بھی اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے بھی ان مسائل پر مضامین لکھے اور وسیع نقطہ نظر سے ان کو حل کرنے کی راہ کھلی۔

ساردا بل[1] کی مخالفت: ایک طرف سید صاحب نے عورتوں کے جائز حقوق کی وکالت کی دوسری طرف ایسے قوانین بنانے کے مخالف تھے جن سے مسلمانوں کے حقوق میں مداخلت ہوتی تھی، چنانچہ قریب قریب اسی زمانہ میں ہندوؤں کی طرف جانب سے نابالغوں کی شادی کی عمر کا بل پیش ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ بلوغ سے پہلے نکاح قانوناً جرم قرار دیا جائے،

---

[1] اس بل کا مقصد نابالغی کی شادی کا انسداد تھا۔

نکاح کے مصالح اور مقصد کے لحاظ سے اس کا صحیح وقت بلوغ کے بعد ہی ہے اور بغیر کسی مصلحت اور مجبوری کے نابالغ کی شادی شریعت کی نگاہ میں بھی پسندیدہ نہیں ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض حالات اور مصالح کی بنا پر نابالغوں کی شادی کر دینے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے، اس لیے شریعت میں اس کی مخالفت بھی نہیں ہے، قانون بن جانے کے بعد عمومی نقطۂ نظر سے اس میں یہ خرابی تھی کہ مجبوری اور ضرورت کے وقت بھی نابالغوں کی شادی کی ممانعت ہو جاتی، مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس کے علاوہ دوسری خرابی یہ تھی کہ شریعت نے جس چیز کی اجازت دی ہے وہ جرم قرار پاتی اور مسلمانوں کے دوسرے معاملات میں بھی حکومت کی مداخلت کا دروازہ کھل جاتا، گو یہ بل ایک ہندو نے پیش کیا تھا لیکن وہ ہندو رسم و رواج کے خلاف تھا، اس لیے ہندو مسلمان دونوں نے اس کی پوری مخالفت کی۔

حضرت سید صاحب کے نزدیک بھی نابالغی کی شادی قابل اصلاح تھی لیکن مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر وہ اس کی قانونی بندش کے خلاف تھے، چنانچہ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر انہوں نے اپریل ۱۹۲۸ء کے معارف میں لکھا:

آج کل ہندوستان کی مجلس آئین میں کم سنوں کی شادی کے انسداد اور بلوغ کی مدت کی تعین کا مسودہ قانون پیش ہوا ہے، ہم جانتے ہیں کہ اس مسودہ قانون کے پیش کرنے والوں کی نیت اچھی ہے اور ملک کی ایک معاشرتی اصلاح کی طرف یہ مبارک قدم ہے لیکن کسی ایسی معاشرتی اصلاح کو جو بعض حالات میں انسانوں کے لیے رحمت کے بجائے زحمت کا موجب ہو سکتی ہے، کسی غیر سلطنت کی قوت سے جاری کرنا ملک کی اخلاقی طاقت کے زوال کے راز کو نمایاں کر رہا ہے، بعض خاص حالات کو مستثنیٰ کر کے عموماً کم سنی کی شادی خصوصاً وہ شادی جو باپ کے علاوہ دوسرے اولیا اپنی سرپرستی میں انجام دیتے ہیں، قطعاً روک تھام کے لائق ہے، مگر یہ یاد رہے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق، ہمارے تمدن اور ہمارے مذہب ہر ایک سے متعلق ہے، ایسے مختلف

پہلوؤں سے تعلق رکھنے والی اصلاحوں کا غیر قومی سلطنتوں کے ذریعہ اصلاح کا مطالبہ گویا اس سلطنت کو آئندہ اپنی معاشرت، اپنے اخلاق، اپنے تمدن اور اپنے مذہب پر حملہ کرنے کی خود ترغیب دینا ہے، کیا اس کے لیے آپ تیار ہیں؟

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کا قانون اس بارے میں بجائے خود کامل ہے، ان کو اپنے قانون میں کسی خارجی اصلاح و تکمیل کی ضرورت نہیں اور نہ ایسے مسودہ قانون کی ان کو حاجت ہے جو ان کے مذہبی قانون کی وسعت کو کم یا زیادہ کرے، اگر ان کو کم سنی کی شادی کے رواج کو کم کرنے کی ضرورت ہے تو وہ یہ کام علما، واعظین، اسلامی انجمنوں، رسالوں اور اخباروں سے لے سکتے ہیں، گو یہ راستہ دیر طلب ہے، تاہم خطرات سے پاک ہے:

ع رہ راست بردا گرچہ دوراست

نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کی بحث: مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ اس بل کی موافقت میں بھی تھا، اس لیے یہ بحث پیدا ہوگئی کہ شریعت میں کم سنی کی شادی جائز ہے یا نہیں، ان میں نمایاں شخصیت مولانا محمد علی لاہوری کی تھی، انہوں نے عدم جواز پر مضامین لکھے، پھر اس سلسلہ میں نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر کی بحث چھڑ گئی، مولانا محمد علی کا دعویٰ تھا کہ وہ سولہ سال تھی، فریقین نے اپنے اپنے موقف کی حمایت میں مضامین لکھے اور معارف میں کئی مہینہ تک اس بحث کا سلسلہ جاری رہا لیکن مولانا محمد علی اور ان کے ہم خیال لوگوں کا موقف بہت کم زور بلکہ بے بنیاد تھا، اس لیے علما میں سے کسی نے اس کی تائید نہیں کی، اس بحث کے خاتمہ پر سید صاحب نے اس مسئلہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل میں حکومت کی مداخلت کے بارہ میں اپنے تفصیلی خیالات ظاہر کیے اور اس کی اصلاح کی صحیح شکل پیش کی، چنانچہ نومبر ۱۹۲۹ء کے معارف میں تحریر فرماتے ہیں:

نابالغی کے نکاح کے بارے: میرا مسلک اس بارے میں یکساں اور بالکل صاف ہے، میں

سید صاحب کا مسلک: نابالغوں کا نکاح میرے نزدیک شرعاً جائز ہے لیکن بعض

مخصوص حالتوں کو چھوڑ کر عام طور سے قرآن پاک اور احادیث کے اشارات سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عدم بلوغ کی حالت میں بلا کسی خاص سبب کے نکاح کرنا مناسب نہیں، فروری ۲۹ء کے مضمون میں اس کے وجوہ دے دیے گئے ہیں، اسی زمانہ میں میرے اور مولوی محمد یعقوب صاحب نائب صدر مجلس آئین ورکن مجلس تحقیقات نکاح نابالغہ کے درمیان مراسلات جاری رہے، میں نے ان کو یہی لکھا کہ نکاح نابالغہ جائز ہے لیکن ہر حال میں مستحسن نہیں (افسوس ہے کہ انگریزی میں غیر مستحسن کا ترجمہ قابل نفرت کر دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے) اور قرآن وحدیث سے اس کے وجوہ لکھے، پھر احمدی جماعت کو ہم خیال بنانے کے لیے خود مولانا محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور کو ایک خط لکھا اور اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے پیش کیا، انہوں نے جواب دیا کہ ان کے اصل انگریزی مضمون میں ''عدم جواز'' کا لفظ نہیں۔

بہر حال اب سوال یہ پیش تھا کہ اس کو قانون کی صورت میں شرعاً پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس کے پہلے خاکسار ہندوستان کے چند مشاہیر علما یوپی کونسل کے مقرر کردہ مجلس نکاح وطلاق کے ممبر تھے، اس میں یہ بحث[1] تھی کہ نکاح وطلاق کی رجسٹری مسلمانوں کے مقدمات ومعاملات کے مصالح کے لیے تو مناسب ہے مگر کیا اس قانون کو جبری کر سکتے ہیں یا نہیں، اکثر تعلیم یافتہ ممبر اس کے جبری کرنے کے حامی تھے، ایک اہل حدیث عالم ممبر بھی ان کے ساتھ تھے، شیعہ علما بالکل مخالف تھے، اہل سنت علما میں بریلی کے نمائندے گومگو کے بعد مخالف رہے، مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا قطب الدین، عبدالوالی صاحب فرنگی محلی اور خاکسار نے علاحدہ رپورٹ لکھی، جس میں یہ اصول سامنے رکھا کہ اس قسم کے اصلاحات کا حق امام اور خلیفہ یا حکومت اسلامیہ کو ہے لیکن غیر اسلامی حکومتوں میں مناسب اصلاحات کو قانوناً نافذ کرنے کی صورت یہی ہے کہ حنفی تصریحات کے مطابق مسلمان والی یا قاضی اگر

---

[1] یوپی کونسل میں یہ مسئلہ غالباً حافظ ہدایت حسین مرحوم نے اٹھایا تھا۔

یا قاضی اگر غیر اسلامی سلطنت کی طرف سے مقرر ہو تو اس کے حکم سے یہ اصلاحات جاری ہو سکتی ہیں اور تعزیرات قبول کر جا سکتی ہیں، اسی اصول کے تحت یہ رپورٹ لکھی گئی اور ہم تینوں نے دستخط کیے، اب جب یہ سارد ابل سامنے آیا تو میں نے اسی اصول کی نظر سے اس کو دیکھا اور مولانا کفایت اللہ صاحب کو خط لکھا اور اپنے خیال سے مطلع کر دیا اور اسی اصول کے ماتحت مولوی یعقوب صاحب کو جواب لکھا کہ دو شرطوں کے ساتھ ہم اس قانون کی موافقت کر سکتے ہیں کہ اس سے:

۱۔نفس نکاح عدم بلوغ کے جواز اور اس کے لوازم ولایت، ترکہ اور وراثت وغیرہ کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑے۔

۲۔ہندوستان میں ایک قضاءت اسلامیہ ہو اور اس کے ذریعہ یہ قانون آئے۔

مجلس نے پہلی دفعہ تو قبول کی مگر دوسری نہیں۔

اس گزارش کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی اسلامی قانون میں کسی قسم کی کمی بیشی خواہ وہ اصلاحی ہی کیوں نہ ہو اور نیک نیتی ہی سے کیوں نہ ہو، براہ راست کسی غیر اسلامی سلطنت کے حکم اور کسی ایسی مجلس کی اکثریت سے جو مسلمان نہ ہو، ہم اپنی مرضی سے منظور نہ کریں گے اور اس اصول کی خاطر لڑنا ہر طرح ہمارا حق ہے۔

مسلمانوں کے مذہبی نظام کی ضرورت: لیکن ایک سوال نہایت اہم ہے کہ موجودہ محکومی میں بلکہ خوش آئند عہد سوراج میں مسلمانوں کے مذہبی اصلاحات اور مسلمانوں کے ملکی و زمانی مصالح کی حفاظت کے لیے مکروہ و مباح و مستحسن امور میں یا ان امور میں جن میں اسلام نے تعزیر یا وضع قانون یا فیصلہ کا حکم امام اور امیر کو دیا ہے، تعزیر و منع قانون کی صورت کیا ہو سکتی ہے، لوگ جہاں سوراج کے لیے لڑ رہے ہیں، مسلمانوں خصوصاً سیاسی علما اور عام سیاسین کو اس پر غور کرنا اور اس کے لیے راہ نکالنا نہایت ضروری ہے، جب تک اس کی راہ نہ نکلے گی، مسلمانوں کا قومی و مذہبی نظام اس ملک میں نہ محفوظ ہے اور نہ قابل ترقی، یہ

کیوں نہ ہو کہ آج مسلمان جہاں نہرو رپورٹ اور سوراج میں متعدد دفعات کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کا یہ مطالبہ بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص و مذہبی اور شخصی قوانین کی حفاظت و ترقی، اصلاح اور استحکام کے لیے ان کا مستقل نظام منظور کیا جائے اور اس کے لیے ایک قابل عمل تجویز کا خاکہ بنا کر پیش کیا جائے۔

جمعیۃ العلما کے خطبہ صدارت میں میں نے اس خطرہ کی طرف متوجہ کیا تھا کہ:

ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آئندہ ہندوستان کی جو شکل و صورت بھی ہو بہر حال یہاں کی حکومت اسلامی نہ ہوگی، بہتر سے بہتر جو صورت خیال میں آسکتی ہے وہ ایک متحدہ جمہوریت کی ہے، اس لیے بہر حال مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ اپنے قومی و مذہبی ضروریات کے آپ کفیل ہوں اور یہی ضرورت بعینہٖ آج بھی ہے، مسلمانوں کی اسلامی و مذہبی تعلیم، ان کے مدرسے، ان کی مسجدیں، ان کے اوقاف، ان کے نکاح، طلاق و وراثت کے قوانین و مسائل خاص محکموں کے محتاج ہیں اور آئندہ رہیں گے، علی ہذا القیاس، اسی کے ماتحت نکاح، طلاق و وراثت کے محکمے ہوں، دارالافتا ہو جہاں جدید ضروریات کے متعلق فتوے صادر ہوں۔

مسلمان ڈرتے کیوں ہیں، وہ اپنا نظام نامہ خود بنا کر اس وقت کیوں پیش نہیں کرتے، جمعیۃ العلما اس طرف کیوں قدم نہیں بڑھاتی اور اس کے قبول اور منظوری کے لیے پوری کوشش اور جدوجہد کیوں نہیں کرتی اور اس کے لیے مسلمان پبلک کو آمادہ کیوں نہیں کرتی، آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی اگر جائز ہے تو وہ موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی تو مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔

یہ وقت صرف ہنگامی شور و غل کا نہیں، اصول پر زور دینے کا ہے، ہماری حالت اس دائم المرض بیمار کی ہے جس کو دورہ کی بیماری ہے کہ جب دورہ پڑتا ہے تو ہائے ہو سب

کچھ ہے اور جب اس میں تخفیف ہوئی تو پھر اپنی صحت سے تغافل ہے، کیا ایسا بیمار اچھا ہوسکتا ہے؟

عرب و ہند کے تعلقات پر خطبات: ہندوستان کے مؤرخین عموماً اور انگریز مؤرخین خاص طور سے مسلمانوں کو محض حملہ آور ثابت کرنے کے لیے ہندوستان سے ان کے تعلقات کا آغاز فتح سندھ بلکہ محمود غزنوی کے حملے اور پنجاب میں غزنوی حکومت کے قیام سے کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے عربوں کے تجارتی تعلقات ظہور اسلام سے بھی بہت پہلے قائم ہو چکے تھے اور ظہور اسلام کے بعد اور ہندوستان میں ان کی حکومت کے باقاعدہ قیام سے پہلے دونوں کے درمیان علمی اور مذہبی تعلقات قائم ہو چکے تھے اور جنوبی ہند میں جہاں مسلمانوں کی حکومت بہت بعد میں قائم ہوئی مسلمانوں کی بستیاں آباد ہو چکی تھیں اور وہاں کے حکمراں ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے، سید صاحب نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر مارچ ۱۹۲۹ء میں ''عرب و ہند کے تعلقات'' پر کئی خطبے دیے، ان میں دونوں کے قدیم تعلقات کو بڑی تفصیل سے دکھایا، ان کو ہندوستان اکیڈمی نے بعد میں ''عرب و ہند کے تعلقات'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا، یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح، تجارتی تعلقات، علمی تعلقات، مذہبی تعلقات، ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے، یہ کتاب مصنف کی وسعت معلومات اور تلاش و تحقیق کا نمونہ ہے اور اس میں عرب و ہند کے تعلقات کے ایسے ایسے گوشے بے نقاب کیے گئے ہیں جو اب تک نگاہوں سے مخفی تھے، اس نے اہل علم کے لیے تلاش و تحقیق کی ایک نئی راہ کھول دی اور بہتوں نے اس پر لکھا لیکن اس پر کوئی خاص اضافہ نہ ہوسکا، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ سید صاحب کے ایک ہم وطن سعید الحق دیسنوی مرحوم نے کیا تھا، جو بالاقساط اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا اور عرصہ ہوا پاکستان میں کتابی شکل میں چھپ گیا ہے۔

سنت پر بحث: نیاز فتح پوری اپنے دور کے آزاد خیال ترقی پسندوں کے سرخیل تھے اور اکثر ایسے مضامین لکھتے رہتے تھے جن میں اسلام کا صریح انکار یا اس کی مخالفت تو نہیں ہوتی لیکن وحی، قرآن مجید اور حدیث وسنت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں اور ان کی صحت مشکوک ہو جاتی تھی، ۲۹ء کے نگار کے پرچوں میں حدیث وسنت پر دو مضمون لکھے جن میں یہ دکھایا تھا کہ اسلامی احکام کا اصل مآخذ قرآن مجید ہے اور حدیثوں میں ایسے بہت سے احکام ملتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں، اس لیے وہ ناقابل قبول ہیں، حدیثوں کی بے اعتباری کی دوسری دلیل یہ دی تھی کہ حدیث وسنت ایک چیز ہے اور سنت کا لفظ یہودیوں کے ''مسناۃ'' سے ماخوذ ہے جو ان کی مذہبی روایات کے مجموعہ کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد مرتب کیا گیا تھا، اسی کی نقل میں مسلمانوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد حدیثوں کے مجموعے مرتب کیے اور اس کا نام سنت رکھا، سید صاحب نے اگست ۲۹ء اور جولائی ۳۰ء میں اس کا نہایت مدلل جواب دیا[1] اور نیاز کے مضمون کا تارو پود بکھیر دیا، اس مضمون میں بڑی تفصیل سے دکھایا ہے کہ حدیثوں کے کلی احکام قرآن مجید میں موجود ہیں، صحیح حدیثیں اسی سے ماخوذ ہیں اور سنت کو یہودیوں کے ''مسناۃ'' سے کوئی تعلق نہیں، وہ عربی کا مستقل لفظ اور حدیث کی ایک مستقل اصطلاح ہے اور عقلی ونقلی ہر پہلو سے ثابت کیا ہے کہ حدیثوں سے زیادہ مستند مجموعہ کسی قوم میں موجود نہیں ہے اور اس کے مانے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔

ڈاکٹر ٹرٹین کی کتاب پر تبصرہ: مسلم یونیورسٹی کے ایک انگریز پروفیسر ڈاکٹر ٹرٹین نے ایک کتاب ''خلافت اور اس کی غیر مسلم رعایا'' کے نام سے لکھی تھی، اس کتاب کا مقصد اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ خلافت کا غیر مساویانہ اور نامنصفانہ سلوک دکھایا گیا تھا، سید صاحب نے اس پر تنقید اور اس کا جواب دینے کے بجائے

[1] نیاز نے اس کا جواب لکھا، اس جواب کا جواب سید صاحب نے معارف جولائی ۳۰ء میں دیا۔

یہ دل چسپ اور حقیقت آمیز تبصرہ کیا:

اس کتاب پر مستقل ریویو تو کبھی لکھا جائے گا لیکن اس وقت صرف اس قدر عرض ہے کہ اگر رومی مسیحی شہنشاہی کے عہد میں غیر مسیحی فرقوں کے حقوق کی تاریخ لکھی جائے تو کیا وہ اس سے زیادہ لطف آمیز ہوگی اور اب جب زمانہ کا نقطہ نظر بدل گیا ہے اور مذہبی تعصب کی جگہ قومی اور وطنی عصبیت نے لے لی ہے، اگر انگلستان یا فرانس کے ماتحت غیر انگریز اور غیر فرنچ رعایا کے حقوق اور برتاؤ کی تاریخ مرتب کی جائے تو اس سے زیادہ ہیبت ناک نہ ہوگی اور مسیحی روس کی شہنشاہی میں مسلم رعایا کے حقوق کی تاریخ کیسی افسوس ناک ہوگی۔

عربوں کی جہاز رانی پر خطبات: مارچ ۱۹۳۰ء میں بمبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی فرمائش پر انجمن اسلام ہال بمبئی میں عربوں کی جہاز رانی پر چار لکچر دیے، ان کے عنوانات یہ تھے:

۱- زمانہ جاہلیت اور اسلام میں عربوں کی جہاز رانی، ان کی زبان میں بحری الفاظ کی کثرت، اشعار عرب اور قرآن پاک میں بحری سفروں کے حوالے۔

۲- عربوں کی دنیا کے سمندروں سے واقفیت اور ان کے بحری سفروں کی انتہائی منزلیں اور بعض بحری انکشافات۔

۳- عربوں کے لیے سامان وآلات جہاز رانی۔

۴- عربوں کی بحر محیط کو عبور کرنے کی کوششیں اور امریکہ تک پہنچنے کے امکانات۔

مسلمان مؤرخوں کو ایک مفید مشورہ: اسی زمانہ میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے ہندوستانی کی تاریخ پر ایک نصابی کتاب لکھی تھی، جس پر مسلمانوں کو سخت اعتراض تھا، سید صاحب نے اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے مسلمان مؤرخوں کو ایک بڑا قیمتی مشورہ دیا ہے، جسے ہر مسلمان مؤرخ کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

''اخباروں میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب کی انگریزی نصابی کتاب ''تاریخ ہند'' پر موافق ومخالف مضامین شائع ہو رہے ہیں، اعتراض یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب

میں پیغمبر اسلام علیہ السلام، شریعت اسلام اور شاہان اسلام کی تحقیر کی ہے، ہم نے اب تک اصل کتاب نہیں دیکھی لیکن اس کے متنازع فیہ فقرے پڑھے ہیں، ہمیں ان پر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب مسلمان بن کر نہیں لکھی ہے، بلکہ ان انگریز مصنفین کے طرز و اسلوب کی پیروی میں لکھی ہے جن کی کتابیں آج تک اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی رہی ہیں اور ہم نے اپنے بچوں اور لڑکوں کو صبر و سکون کے ساتھ ان کو پڑھتے سنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے اصل شکایت اگر ہے تو یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ ہند کے انگریز مؤرخوں کے بجائے ہندو مؤرخوں کی پیروی کیوں نہیں کی، جو اپنے دھندلے تاریخی خاکہ کو اپنی کتاب کے ہر نئے ایڈیشن میں زیادہ رنگین بنا کر اور ابھار کر دکھا رہے ہیں اور اپنی تاریخ کو باوقار اور پرفخر بنانے میں نہیں شرماتے، پھر ہم کیوں اپنی کم زوری پر آپ شرماتے ہیں لیکن اگر ڈاکٹر صاحب میرے اعتراض کا یہ جواب دیں کہ اگر میں ایسا کرتا تو کیا سرکاری یونیورسٹیوں کی منصفانہ نگاہ رکھنے والی مجالس منتخبہ میری کتاب کو قبول کر سکتیں تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔"

(معارف، دسمبر ۱۹۳۰ء)

علمی کانفرنسوں میں شرکت: دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس اور ہسٹاریکل ریکارڈس سوسائٹی کے اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوئے، ان دونوں میں سید صاحب نے شرکت فرمائی، اورینٹل کانفرنس میں "خیام" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، اس کے عربی و فارسی کے سیکشن کی رکنیت کے لیے جن مسلمان فضلا کا انتخاب ہوا تھا ان میں ایک سید صاحب بھی تھے، رکارڈس سوسائٹی کے اجلاس میں مسلمان بہت کم شریک ہوئے تھے، اس کی کمی کے نقصان پر سید صاحب نے معارف میں مسلمانوں کو ان الفاظ میں توجہ دلائی:

"ہمارے مسلمان پروفیسروں اور مؤرخوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس مجلس کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا قالب ڈھالا جا رہا ہے، حیف ہے اگر مسلمان اس کی صورت گری سے غافل رہے، ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب تاریخ اپنی شکل بدل چکی ہوگی اور مفروضات

واقعات بن چکے ہوں گے۔'' (شذرات معارف دسمبر ۱۹۳۰ء)

اس زمانہ سے لے کر اس وقت تک ہندو مؤرخین نے جو تاریخیں لکھی ہیں ان سے اس پیشین گوئی کی لفظ بہ لفظ تصدیق ہوتی ہے۔

نجات اخروی کے لیے ایمان ضروری ہے یا حسن عمل کافی ہے: بعض مغرب زدہ معلمین کے دماغوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ نجات اخروی کے لیے ایمان ضروری ہے یا حسن عمل کافی ہے، سید صاحب نے معارف میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ دل نشین جواب دیا:

''ہر قسم کی کامیابی صرف دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کرنا اور دوسرے ان طے شدہ اصولوں کے مطابق سختی سے عمل کرنا، ان کو عام محاورہ میں اصول و عمل کہو یا مذہب کی زبان میں ایمان و عمل، بات ایک ہی ہوئی، سوال یہ ہے کہ پہلے اصول پھر عمل یا پہلے عمل پھر اصول، ظاہر ہے کہ فلسفیانہ حیثیت سے یہی جواب ملے گا کہ پہلے اصول پھر عمل، پہلے آئیڈیا پھر پریکٹس، پہلے پروگرام پھر اس کی پابندی، یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ پہلے پابندی پھر پروگرام، پہلے پریکٹس پھر آئیڈیا، پہلے عمل پھر اصول، اسی طرح یہ کہنا کہ پہلے عمل پھر ایمان کس قدر حماقت ہے۔

کسی سمجھ دار انسان سے کوئی کام نتیجہ سمجھے بوجھے بغیر صادر نہیں ہو سکتا، وہی نتیجہ اس کی غرض و غایت ہوتی ہے، اخلاق محض کا تصور غرض و غایت اور نتیجہ کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، اخلاق کا کمال اعمال میں نہیں، بلکہ اس کی غرض و غایت کی بلندی اور ذاتی خواہشوں، دکھاوے اور نمائش اور طلب معاوضہ سے انتہائی پاکی میں ہے، انسان کے اعمال کا پست و ذلیل جذبات اور نفسانی ہوا و ہوس سے پاک ہونا اخلاق کی بلندی اور طہارت کے لیے ضروری ہے، انسان کا کام صرف اسی قدر نہیں کہ کسی غریب آدمی کو چند پیسے دے دے، بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ کرنے والے کو اس سے مقصود اپنی نام وری، نمائش، معاوضہ فریب اور اس غریب کو ممنون

احسان بنانا نہ ہو بلکہ صرف اخلاص قلب ہو، ان قلبی جذبات اور دل کے رجحانات کی اصلاح و پاکی سوا اس کے ممکن نہیں ہے کہ ایک دانائے رموز اور عالم الاسرار ہستی کا یقین کیا جائے جو دلوں کی ایک ایک رگ کی جنبش اور ایک ایک ریشہ کی حرکت کو دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے، اس لیے خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل اور حسن خلق کا تصور ممکن ہی نہیں کہ اعضا و جوارح سے اعمال کی درستی سراسر قلب کے اعمال کی درستی پر موقوف ہے۔

آج جب کہ مسلمانوں کو عملاً کام کرنا ہے صرف باتیں بنانا نہیں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسن خلق اس پر عمل کرنا چاہیے بلکہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ نجات اخروی کا ذریعہ محض ایمان ہے یا محض حسن عمل، صرف حسن عمل ہی صحیح ہمارے داعی اسی کا نمونہ بن کر دکھائیں، اسی کی اہمیت نمایاں کر کے بتائیں، وہ کبھی اس کی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کس قدر ضروری ہے، لے دے کر یہ دعوت ہے کہ نماز پانچ وقت کی ہے یا تین وقت کی، تین ہی وقت کی صحیح مگر ان تین وقتوں میں پڑھی تو جائیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایجابی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں، غازی سلطان صلاح الدین سلطان محمد فاتح اور سلطان سلیمان اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے نہ اپنی سلطنت کھو بیٹھے اور نہ اس عہد کے ملاحدہ، ترک صلوٰۃ اور عدم ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا گوشہ بھی حاصل کر سکے، اگر ملک ہی حاصل کرنا ترقی ہے۔

اصل یہ ہے کہ آج کل جہاں یورپ کی ہر چیز میں نقالی ہے، مذہب اور اصلاح مذہب میں بھی نقالی ہے، یورپ کے ریفارمیشن کی تعریف پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لیوتھر بننے کا خیال ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام اور مسیحیت میں اشتراک کیا ہے جس کے لیے اسلام کو لیوتھر کی ضرورت پیش آئے، عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد عیسائیت چھوڑ کر سلطنت پائی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا سلطنت بھی چھوٹ گئی، کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے سامنے ہے، غلط اوہام و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب

نہیں، اسلام (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں مجسم ہو کر نظر آیا اور جس کی تصویر اب بھی اوراق میں محفوظ ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلام وہ نہیں ہے۔ جس کی تصویر آپ اپنے واہمہ سے کھینچ کر دکھائیں۔''

اسلام اور اسلامی تاریخ سے متعلق غیر مسلموں کی غلط بیانیوں کی تصحیح کا صحیح طریقہ: پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ اسلام کے نصاب میں یورپین مصنّفین کی بعض ایسی کتابیں داخل ہوئیں جو مسلمانوں کے لیے بڑی دل آزار تھیں، اس کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا، سید صاحب نے بھی اس کی مخالفت میں آواز بلند کی اور اس کے ساتھ اس کی اصلاح کا صحیح علمی طریقہ بتایا، معارف جولائی ۱۹۳۱ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

ابھی پنجاب کے اخبارات میں ایک نئے فتنہ کی اطلاع شائع ہوئی ہے، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں مسٹر خدا بخش کی ترجمہ کی ہوئی جرمن فاضل ڈاکٹر وائل کی کتاب ''تاریخ اقوام اسلامیہ'' (ہسٹری آف اسلامک پیپلز) اور انگریز مستشرق ڈاکٹر نکلسن کی ''تاریخ ادبیات عرب'' (لٹریری ہسٹری آف عربیا) ایم، اے اور بی، اے کے نصاب میں داخل کی گئی ہیں، ان دونوں کتابوں میں اسلام، عقائد اسلام اور داعی اسلام علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی نسبت گم راہ کن اوہام، نظریات اور فحش الزامات ہیں جن کا سننا بھی ایک مسلمان گوارا نہیں کر سکتا اور کس قدر افسوس کی بات ہے کہ خود مسلمان ان کتابوں کے ترجمے کرتے ہیں اور خود مسلمان ہی ان کو کورس میں داخل کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کا بڑا کام انجام دیا:

زنادانی براد کرد ہمدم کارمن ضائع　　عجب تر آں کہ برمن منت بسیار ہم دارد

لیکن غور کے قابل اصلی سوال یہ ہے کہ پچاس برس کی جدید تعلیم میں کیا ہماری قوم نے کوئی ایک بھی ایسا مؤرخ تاریخ اسلام کا مصنف یا فاضل پیدا نہیں ہوا جو اپنی تاریخ اسلام کا آپ مصنف ہوتا، سید امیر علی مرحوم کی استثنائی مثال کو چھوڑ کر کوئی ایک نظیر بھی پیش

کی جاسکتی ہے جس کا قلم تاریخ اسلام کے لیے مدافعانہ کارفرما ہو اور اس کی انگریزی ادبیت اس لائق ہو کہ اس کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر یونیورسٹی کے نصاب کے معیار کے مطابق ہو، یہ کام جدید لائق تعلیم یافتہ اصحاب کا تھا کہ وہ اس فرض کو انجام دیتے اور مسلمان طالب علموں کے دل و دماغ کی نشو ونما اور تربیت کے سر و سامان بہم پہنچاتے، اب اگر ایسا نہیں کیا گیا اور نہیں کیا جاسکتا تو اسلامی تاریخ کا شعبہ قائم کر کے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے نوجوان مسلمانوں کی اسلامی روح کو قتل کیوں کرتے ہو۔

مسلمانوں کی اس علمی بے بضاعتی کا نتیجہ ہے کہ عربی کا کورس مقرر کیا جائے تو اس میں بیروت کے کیتھولک پادریوں کی کتابیں پڑھائی جائیں، اسلامی تمدن کا درس دینا ہو تو مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کی ان کتابوں کو پڑھاؤ جن کو مارگولیوتھ کے قلم نے انگریزی میں منتقل کیا ہے، عربی ادب کی تاریخ پڑھانی ہو تو نکلسن کی تاریخ ادبیات عرب درس میں داخل کرو، اگر فرق اسلامی کی تاریخ جاننی ہو تو وان کریمر کے مضامین کا مطالعہ کرو، جن کو ایک مسلمان نے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے، اگر اقوام اسلامی کی تاریخ کی تعلیم مقصود ہو تو ڈاکٹر وائل کی کتاب ان کے ہاتھوں میں دو اور انتہا یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ادب عربی سکھانا ہو تو عربی انجیل پڑھوائی جائے[1]، ہماری اس تلخ نوائی سے ہمارے دوستوں کی بزم عیش تو مکدر نہیں ہو رہی ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

اصل مرض یہ ہے کہ ہمارے دلوں سے خود ہمارے علما، مصنفین اور مورخین کی قدر و منزلت گر گئی ہے، آج ہم کو مصنف ''فلسفہ و مذہب'' کی طرح قرآن کی کسی آیت اور رسول کی کسی حدیث کی صحت کا یقین اس وقت تک نہیں آتا جب تک اس کی تائید میں کسی

---

[1] یہ ڈاکٹر ٹرٹین کے زمانہ کا ذکر ہے، اس کے بعد انجیل عربی ادب کے نصاب سے نکال دی گئی اور اس کے بجائے قرآن مجید داخل کر دیا گیا تھا۔

گولڈزیہر، کسی انگریز ڈاکٹر اور کسی ڈاکٹر ٹائلر کا قول نظر سے نہ گزرے، یہی حال آج اسلام کی تاریخ وتمدن کا بھی ہے کہ جب تک وہ نولڈیک، زخاؤ، ڈوزی نکلسن اور مارگولیتھ کے قلم سے نہ نکلیں مسلم نہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ دشمنوں کے گھر سے زہر کے بجائے نوشدارو ملنے کی توقع کرنا کس قدر بے سود ہے، پروفیسر محمد شفیع وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے بھی اس سلسلہ میں سنجیدہ مضامین لکھے، جن میں اسی مصنف کی طرف اشارہ تھا، مسلمانوں کے احتجاج اور ارکان یونیورسٹی کی کوشش سے یہ کتابیں نصاب سے خارج کردی گئیں، اگست کے شذرات میں پھر اسی حقیقت کا اعادہ کیا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے نصاب تاریخ اسلام والی کتاب کے متعلق ہمارے اسلامی اخبارات نے جو تحریک اٹھائی تھی اور جس میں معارف نے بھی حصہ لیا تھا، مولوی محمد شفیع صاحب وائس پرنسپل اورینٹل کالج اور بعض دوسرے مسلمان ارکان یونیورسٹی کی بروقت کوشش سے اس میں کامیابی ہوئی اور وہ کتاب نصاب سے خارج کردی گئی، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے دین وملت اور علوم وفنون کو اغیار کے دست تصرف سے بچانے کے لیے اسی قسم کے احساس غیرت اور مستحسن کوشش سے کام لیں تاکہ خوددار اقوام میں ان کا شمار ہوسکے۔

اس تحریک کے سلسلہ میں مولوی محمد شفیع صاحب ممدوح الصدر کے قلم سے انقلاب میں دو تحریریں شائع ہوئیں اور دونوں متین، سنجیدہ اور پرمغز تھیں اور اسی حقیقت کو منکشف کرتی تھیں، جن پر سے معارف نے اپنے پچھلی شذرات میں پردہ اٹھانا چاہا تھا، ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے انگریزی داں فضلا اور اکابر اہل قلم غیروں کا بھروسہ چھوڑ کر خود قلم اٹھائیں، بلند سے بلند معیار کے مطابق اپنی تاریخ کو ترتیب دیں اور اس کو اپنے طالب علموں کے ہاتھوں میں دیں، ورنہ محض شوروغل اور جوش وخروش سے اس مرض کا ازالہ نہ ہوسکے گا۔

مسلمانوں کے احتجاج پر کتابیں تو نصاب سے نکال دی گئیں مگر ان کی جگہ رکھنے

کے لیے کوئی مناسب کتاب نہیں مل سکی، اس لیے سرے سے اسلامی تاریخ ہی شعبہ تاریخ سے خارج کر دی گئی، اس پر بھی مسلمانوں نے احتجاج کیا، حضرت سید صاحب نے لکھا:

> ''ہر قوم کی تاریخ اس قوم کی روح ہوتی ہے، کسی قوم کے تعلیمی جسم سے اس کی روح کو سلب کر لینا کہاں کا انصاف ہے، مگر ضرورت اس کی ہے کہ خود مسلمان فضلا اپنی تاریخ کی طرف آپ متوجہ ہوں اور اپنا سرمایہ خود اپنے ہاتھ سے جمع کریں، بغیر اس کے یہ مسئلہ ''بلائے صحبت لیلیٰ وفرقت لیلیٰ'' کی مثال ہوگا، تاریخ اسلام رکھی جائے مگر کتابیں وہ ہوں جو ہمدردی کے بجائے عداوت کے رنگ میں لکھی گئی ہیں، تو اس کا قبول کرنا بھی مشکل اور اگر اسے ڈر سے سرے سے تاریخ اسلام ہی حذف کر دی جائے تو بھی ناقابل قبول ہے، اس بنا پر مسلمانوں پر دو کام فرض ہیں، اول یہ کہ یونیورسٹی اس ضروری مضمون کو داخل نصاب کرے، دوسرے یہ کہ مسلمان اس کے لیے مناسب کتابیں بہم پہنچائیں یا ایسے لائق اساتذہ رکھوائیں جو تعلیم و تدریس کے ساتھ تالیف کا فرض بھی انجام دیں۔'' (معارف جولائی ۱۹۳۶ء)

سیرت نبوی ﷺ کے متعلق مسلمانوں کو ایک صحیح مشورہ: آج کل بعض پر جوش مسلمانوں نے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں کہ جس کسی نے سرور کائنات علیہ السلام کے خلاف گستاخی کی، اپنی جان پر کھیل کر ان کی جان لے لی، اس طریقہ سے ممکن ہے کہ ہم مخالفوں کو مرعوب کر لیں لیکن اس کے دلوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے نہ بھر سکیں گے بلکہ شاید آپ کے دشمنوں ہی کی تعداد میں اپنے فعل سے اضافہ کریں، اس کا علاج تو یہ ہے کہ ہم سیرت مبارکہ ہر زبان اور ہر خط میں بہتر سے بہتر اور ارزاں سے ارزاں اس قدر عام کر دیں کہ وہ ہر جگہ پھیل جائے اور ہر ساز سے وہی ایک آواز نکلے، خدا کا شکر ہے کہ سیرت کمیٹی پٹی لاہور اس کام کو انجام دے رہی ہے، اس کو اور کامیاب بنانے کی ضرورت ہے۔

فتنہ نگار اور اس کا جواب: اس زمانہ میں مسلمان متجددین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی جس کا کام ہی اسلام اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنا اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو بگاڑنا

تھا، اس کے سرغنہ نیاز فتح پوری تھے اور نگار میں اسلامی عقائد و مسلمات اور علما کی تنقید پر مستقل مضامین نکلتے رہتے تھے[1]، سید صاحب نے شذرات میں اس کا جواب دینے کے علاوہ ان مسائل پر اگست ۱۹۳۱ء کے معارف میں اصولی حیثیت سے ایک مضمون لکھا جس کی افادیت ہمیشہ قائم رہے گی، اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

کسی قوم و تمدن و مذہب کے مناظر اور وکیل کی سب سے تاسف انگیز حالت وہ ہوتی ہے جب اس کا دل اپنے حریف کے مقابلہ میں مرعوب ہو جاتا اور وہ اس کے نزدیک حسن و قبح کا معیار بن جاتا ہے، جو اس کا حریف اس کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، اس وقت یہ پورس کا شکست خوردہ ہاتھی پیچھے ہٹ کر خود اپنے سپاہیوں کی صفوں کو درہم برہم کرنے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے مذہب، تمدن اور قومیت میں جو چیزیں بھی ایسی ہوں جو اس کے حریف کے معیار سے قابل اعتراض ہوں ان کو توڑ پھوڑ ڈالے اور کم از کم یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ باتیں سرے سے ہمارے مذہب، تمدن اور قومیت میں ہیں ہی نہیں اور ان کتابوں کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دینا چاہتا ہے، جن میں ایسی باتیں ہیں اور ان لوگوں کی آبروریزی پر اتر آتا ہے جن کے سامنے حسن و قبح کا معیار نہ ہو، جو اس نے اپنے حریف سے مرعوب ہو کر اختیار کیا ہے، غرض وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو خود اس کے حریف کو کرنا چاہیے، جو اب اپنی شاطرانہ کامیابی پر مسرور ہوتا اور اپنے حریف کو تحسین و آفرین سے مزید جرأت دلاتا ہے۔

---

[1] اس زمانہ میں نیاز صاحب نے خدا، رسول، وحی، قرآن مجید اور احادیث نبویؐ وغیرہ کے متعلق دل آزار مضامین لکھے اور اپنے ہم مشربوں سے لکھوا کر نگار میں شائع کیے، جس سے مسلمانوں میں سخت بے زاری پیدا ہوئی اور پورے مسلم پریس نے اس کے خلاف احتجاج کیا، معارف نے بھی اس کے خلاف آواز بلند کی اور علمی حیثیت سے بھی ان کے جوابات دیے، یہ مضامین نیاز صاحب کے طبع زاد نہیں تھے بلکہ زیادہ تر مستشرقین کے خیالات کا سرقہ تھے، آخر میں نیاز صاحب کو توبہ نامہ شائع کرنا پڑا، اس کی پوری روداد معارف میں موجود ہے، ہم نے طوالت کے خیال سے اس کو قلم انداز کر دیا۔

یاد ہوگا کہ جب ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور نے اپنا کام شروع کیا تو مسلمانوں کو ان سے کتنا اختلاف تھا، یہاں تک کہ سرسید نے ان کے جواب کے لیے لندن کا سفر اختیار کیا مگر حریف رفتہ رفتہ اپنا کرتا رہا، یہاں تک کہ آج وہی نظریے اور وہی معیار جن کے لیے ہم لڑ رہے تھے، تعلیم وتربیت کی خرابی، علم کی قلت اور مذہبی علوم میں عدم تبحر کے سبب سے ہمارے نزدیک مسلّم ہو گئے اور اب ہر وہ شے جو اس معیار پر نہیں کوشش کرتے ہیں کہ اس کو بے اصل ثابت کریں اور یہ سب کچھ جیسا کہ ہمارے دوستوں کا دعویٰ ہے اسلام اور پیغمبر اسلام کی محبت میں کیا جاتا ہے۔

ایمان کا انکار، خدا کا انکار، نماز پنج گانہ کا انکار، صیام ماہ رمضان کا انکار، زکوٰۃ شرعی کا انکار، حج کا انکار، قربانی کا انکار، قیامت کا انکار، جزا وسزائے اخروی کا انکار، جنت ودوزخ کا انکار، معراج کا انکار، احکام رسالت کا انکار، عدالت صحابہ کا انکار، پوری تفاسیر کا انکار، پوری فقہ وقانون شریعت کا انکار اور تمام ضعیف وصحیح احادیث کا انکار، تمام مجتہدین ائمہ کے اجتہادات کا انکار، پوچھیے کہ یہ سب کام کاہے کے لیے ہے تو جواب ملے گا کہ سب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مذہب کی محبت میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں رہ کیا گیا جس کے بچانے کے لیے اتنی چیزوں کا انکار ہو رہا ہے۔

کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ آج امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ابن ماجہ، طبری، حاکم، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک تو ان لوگوں میں شمار کیے جائیں جن قرآن سے واقفیت نہ تھی، ان کا ایمان اور اسلام تو سراسر منافقانہ تھا (نعوذ باللہ) اور مسلمان کون ہیں، تمام انگریز اور پورے اہل یورپ، آج ان اماموں اور مجتہدوں کے بنائے ہوئے اصول حدیث اور معیار حدیث غلط ہیں اور صحیح ہیں تو وہ جو سر ولیم میور، گولڈزیہر وامثالہم نے بنا کر پیش کیے ہیں۔

پرانے علمائے یہود ونصاریٰ کی روایتیں سب اسرائیلیات ہیں جن سے ان کے

نزدیک اسلام کا سارا دفتر بھرا ہوا ہے، اس لیے وہ نا قابل قبول ہیں لیکن آج کل کے علمائے یہود و نصاریٰ کے تمام اقوال سر آنکھوں پر اس لیے کہ وہ مذہبی حریف کا جامہ پہن کر نہیں بلکہ علم وفن کی تحقیق کا جامہ پہن کر آئے ہیں۔

اب تک یہ خیالات جو مدت سے ہمارے بعض نوجوانوں کے دلوں میں آہستہ آہستہ غیر مسلم اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت کے اثر سے سرایت کر رہے تھے، بند بند تھے، مگر ترکی کے سیاسی و مذہبی انقلاب نے ان کی ہمتیں بڑھا دی ہیں اور اب وہ مولویوں اور ملاؤں کی عیب جوئی اور توہین وتحقیر کے بہانہ سے خود مذہب اسلام کی بیخ و بنیاد ہلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اس سے وہ مولویوں اور ملاؤں کے دست تصرف سے قوم کو نجات دلا رہے ہیں، مولویوں اور ملاؤں پر لعنت بھیجیے اور تیرہ سو برس کے اسلامی سرمایہ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی حفاظت کیجیے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ مذہب اور مذہبی علوم سے تو یکسر بے گانگی ہو اور قرآن وتفسیر وحدیث وفقہ، تاریخ ورجال پر دست ستم دراز ہو رہا ہے اور طوطی صفت استاد مغرب سے جو سیکھا ہے رنگ بدل بدل کر اس پر ہم کو ایمان لانے کو کہا جائے۔

ترکی کو چال باز نومسلم عیسائیوں اور یہودیوں سے سیاسی اور جنگی معرکوں میں جو شکستیں ہوئیں وہ اہل تاریخ سے مخفی نہیں، اب مذہب کی باری ہے، سنا ہے کہ ایک رومی کیتھولک پادری وہاں مسلمان ہوا اور اپنا نام پروفیسر عبد العہد داؤد رکھا اور ترقی کر کے شیخ الاسلام کے سرکاتب کا درجہ حاصل کرلیا، وہ متعدد زبانیں جانتا ہے، عربی سے بھی آگاہ ہے، وہ ان تمام تحقیقات کا مخرج اول ہے جو آج کل بعض مدعیوں کے قلم سے مترجمانہ نکل رہی ہیں اور ان کے سامنے ہم کو سرافگندہ ہونے کو کہا جا رہا ہے اور جس کا مقصد اسلام کو عیسائیت کے قالب میں ڈھال دینا ہے جس میں نہ نماز ہے نہ روزہ ہے نہ باقاعدہ زکوۃ ہے اور جس میں شریعت اور قانون شرعی کو لعنت سمجھا جاتا ہے اور علی الاعلان کہا جاتا ہے کہ کاش ہماری

نماز بھی عیسائیوں کی طرح ہوتی، یہی وہ آوازیں ہیں جن کو سن کر عیسائی مشنری اپنی کامیابی پر خوش ہو رہے ہیں اور پادری زویمر اور ان کا رسالہ اسلامک ورلڈ اس سے عجیب عجیب پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ حساس دل مسلمان اس کی طرف توجہ کریں اور اس کو آریوں اور مسلمانوں یا عیسائیوں اور مسلمانوں اور ملحدوں اور مومنوں کا معمولی مناظرہ نہ سمجھیں بلکہ اس کی تہہ میں ایک ایسی سازش پوشیدہ ہے جس سے زیادہ خطرناک سازش اسلام کے خلاف آج تک نہیں ہوئی:

آن کس کہ بجلگی ترا تکیہ بہ دست　　　چوں چشم خرد باز کن دشمنت اوست

حریفانہ جذبات کی تشفی کے لیے مذہب کو آلہ کار بنانا درحقیقت ایک طرح کی مذہبی توہین ہے، خالص دینی غیرت محض حریفانہ جذبات کی بنا پر متحرک نہیں ہوتی، نہ مجنونانہ جوش کی صورت میں اس کا ظہور ہوتا ہے، صحیح مذہبی حمیت یہ ہے کہ خلوص، للہیت اور سنجیدگی و استقلال کے ساتھ ان اسباب کو دفع کرنے کی پیہم سعی کی جائے، جس سے ملت حقہ کے دامن پر کوئی دھبہ آتا ہو اور تمام جائز ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے دین متین کا علم اقتدار دنیا میں بلند ہو سکے اور اس مبارک کوشش میں اپنے پرائے اور ماوشما کا سوال سامنے نہ آئے، اگر کسی گوشہ سے کوئی ایسی آواز اٹھے جو مسلمات مذہبی میں رخنہ اندازی کرنے والی ہے تو ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ بقدر استعداد اس کی بے حقیقتی آشکارا کریں اور پوری قوت مگر انتہائی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ دنیا پر یہ روشن کر دیں کہ اس بانگ بلند کا مخرج طبل تہی ہے، اس کی پروانہ ہونی چاہیے کہ یہ آواز ایک مدعی اسلام کے حلقہ سے اٹھی ہے یا باہر سے آئی ہے۔

صلاح الدین خدا بخش کا ایک قابل اعتراض مضمون: ابھی اوپر کی سطروں کی سیاہی خشک بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ شملہ اور پٹنہ کے احباب نے صلاح الدین خدا بخش

صاحب کے ایک مضمون کی اطلاع دی، جو اسٹیٹس مین کی قریب کی اشاعتوں میں شائع ہوا ہے، جس میں اسلام میں مصوری، موسیقی اور شراب کے متعلق مباحث لکھے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں میں ان کے زمانہ عروج وترقی میں ان چیزوں کو کس قدر فروغ ہوا اور ان میں اس کا رواج پھیلا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام نے جہاں فطرت انسانی کے خلاف احکام دیے ہیں وہاں بالکل ناکام رہا، کیا یہ الفاظ کسی مسلمان کی قلم سے نکل سکتے ہیں، اگر یہ طرز استدلال صحیح ہے تو وہ کون سی برائی ہے جس کی اصلاح کا وعظ اسلام نے کہا ہے اور مسلمانوں نے آج تک اس کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس طرح تو پورا اسلام بلکہ ہر مذہب ناکام ٹھہرے گا، خواہ وہ احکام فطرت کے موافق ہوں یا مخالف، خود یہ سلسلہ مضمون اس کی شہادت ہے، آخر میں اس فاضل مصنف سے صرف ایک سوال ہے کہ کیا شراب پینا فطرت ہے اور امریکہ نے اس کی مخالفت کر کے فطرت سے جنگ کی ہے، ایک اور نازک سوال یہ ہے کہ فطرت کی حقیقت کیا ہے اور کیا آپ نے اس عقدہ مشکل کو حل کر لیا ہے۔

اس مضمون کے خلاف عام مسلمانوں نے بھی احتجاج کیا، اس لیے مضمون نگار کو معذرت نامہ لکھنا پڑا، جو مسلم آؤٹ لک میں شائع ہوا، جس میں معذرت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہری عقیدت کا اظہار اور اسلام پر مستشرقانہ اعتراضات کی بے حقیقتی کا اعتراف تھا، اسی کے ساتھ مضمون نگار نے یہ بھی لکھا کہ انہوں نے خود اپنی تصانیف میں ان الزامات کا جواب دیا ہے، یہ اتفاق ہے کہ اس معذرت نامہ کی اشاعت کے بعد ہی مضمون نگار کا انتقال ہو گیا، حضرت سید صاحب نے تعزیتی نوٹ میں لکھا کہ:

> ''کس کو خبر تھی کہ ان کے یہ معذرت نامہ حقیقت میں اس کی پوری عمر کا آخری توبہ نامہ ثابت ہوگا لیکن حسن خاتمہ کی توفیق دینے والے کی حکمتوں اور مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے:
>
> بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

تاریخ ہند کی تجویز اور اس کا خاکہ: ہندو مسلم اختلاف کے بہت سے سیاسی اور تاریخی

اسباب ہیں، ان میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی خاطر ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ایسی تاریخیں لکھیں جن میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے واقعات جمع کیے بلکہ مسلمانوں کے مظالم کے فرضی قصے لکھے جن کو پڑھنے کے بعد دونوں میں اشتعال پیدا ہوا اور ان میں کبھی اتحاد نہ ہو سکے، یہی کتابیں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوئیں، کسی قوم میں بھی ناعاقبت اندیش اور تنگ دل لوگوں کی کمی نہیں، انگریزوں کی تقلید میں بہت سے تنگ نظر ہندوؤں نے بھی اسی قسم کی زہریلی کتابیں لکھیں، اس طرح یہ زہر نوجوان تعلیم یافتہ نسلوں میں برابر سرایت کرتا گیا اور اس کے نتائج اسی زمانہ میں نکلنا شروع ہو گئے تھے اور اب تو بالکل کھل کر سامنے آ گئے ہیں، سید صاحب نے اس کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور اس مسئلہ پر برابر لکھتے اور ایسی تاریخ کی تالیف پر توجہ دلاتے رہتے تھے جن سے ہندو مسلمانوں میں نفرت وعداوت کے بجائے الفت ومحبت پیدا ہو، اس سلسلہ میں انہوں نے اگست ۳۲ء میں پھر لکھا:

سرکاری مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم کا اضافہ بظاہر علم کے اضافہ کے لیے ہے، مگر درحقیقت جیسا کہ معارف میں بارہا کہا گیا ہے کہ یہ اقوام ہند کے قدیم اختلافات اور نزاعات کے اضافہ کے لیے کیا گیا ہے، حالاں کہ ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے، آج اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کیے اور عالم گیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کیے، سوراج کی منزل میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا، کیا ہمارے ہم وطن اس نکتہ کو سمجھیں گے۔

معارف میں باربار یہ دکھایا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ کر ایسی ہی باتیں جمع کی جاتی ہیں، جن سے ان دونوں قوموں کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو اور ان کا اتفاق آئندہ بڑھ کر محال ہو جائے، حالاں کہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے دونوں قوموں کے درمیان اختلاط

ومحبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدردانی کے شائق مصنف وکتب فروش اپنی ذاتی عارضی کام یابی کے مقابلہ میں ملکی وقومی بھلائی کی قیمت کی پرواہ نہیں کرتے۔

ایک اور مصیبت افسانوں، ناولوں، تھیٹروں، اور تماش گاہوں کی ہے، جن میں قومی رفعت وبلندی کے اظہار کے لیے ایسی کہانیاں اور ایسے تماشے لکھے اور دکھائے جاتے ہیں جن کو لوگ قومی فخر وغرور کے نشہ میں آکر پسند کریں اور بکثرت ان کے خریدار اور تماشائی ہاتھ آئیں، یہ خودغرض نہیں جانتے کہ ان کی اس عارضی کام یابی میں ملک کی کتنی دائمی ناکامی ہے۔

ان بیماریوں کا علاج ایک طرف حکومت کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف پبلک کے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسی کتابوں اور ایسے تماشوں کی حوصلہ افزائی سے باز رہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ ملک اور قوم کے دوسرے ہوا خواہوں کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ پروفیسر شیخ عبدالقادر صاحب دکن کالج پونہ نے سید صاحب کی تحریر کا خیر مقدم کیا اور ہندوستان کی صحیح تاریخ کی تدوین اور تاریخی اغلاط کی تصحیح کے لیے ایک مجلس کے قیام کی تجویز پیش کی، ان کے خط کا ضروری حصہ یہ ہے:

''مگر اس کا علاج کیا ہے، اس علت مزمنہ کی باقاعدہ تشخیص کی جائے اور اس کے بعد ، ہرا بلکہ تہرا علاج شروع کر دیا جائے، یعنی یونانی، ڈاکٹری اور بیدک، مسلمانوں کی مسخ شدہ تاریخ کو اصل شکل میں پیش کیا جائے، اگر ایک شخص اس اہم کام کا متکفل نہیں ہوسکتا تو ایک جماعت واحدہ (مشتمله على الاشخاص المختلفه فى القابلية ولكن المتحده فى المقصد والنظر) قرار دی جائے طبی اصول کے مطابق مشورہ کیا جائے، کیا پورے ہندوستان میں ایسے اشخاص نہیں مل سکتے جو اس ضروری اور اہم کام کو پورا کرنے کے لیے بذریعہ خط وکتابت اور مراسلت (بتوسط معارف) اکٹھا ہو کر مسلمانان ہند کی صحیح اور اصلی تاریخ کما حقہ معاصرین ومتاخرین کے لیے درست

کریں، مئے کہن سے نئی بوتلیں بھریں، شراب طہور کو جدید کاسوں میں (کان مزاجہا کافوراً) اونڈیلیں۔

غرض آپ کی خدمت فیض درجت میں یہ عرض ہے کہ آپ ایک اسکیم مرتب کریں، اس کے قواعد وضوابط متعین کریں، تاریخی چھان بین تحقیق وتفتیش کے لیے ایک لائق جماعت قائم کریں، اس کی ممبری اور رکنیت کی شرائط مقرر کریں، مضمون کے علاحدہ علاحدہ حصے کر کے ان کی تقسیم ''جو شخص کہ جس کام کے قابل نظر آیا'' کے مطابق کر کے کار کو روبراہ کریں اور پبلک سے اپیل کریں کہ سخنے، درمے، قلمے امداد فرمائیں، معارف میں ایک باب ''اصلاح تاریخ'' کا کھول دیں اور اسی میں کام کے متعلق تمام کارروائی صفحوں کی قید سے شائع کریں، مولانا مرحوم (مولانا شبلیؒ) کی روح خوش ہوگی اور غیب سے مدد ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم دے گا اور عمل خیر کرنے والوں کو گووہ ذرہ برابر کیوں نہ ہوں اس کا بدلہ ضرور عطا فرمائے گا:

من نگویم کہ ایں مکن آں کن مصلحت بیں و کار آساں کن

سید صاحب نے اس تجویز پر معارف میں مفصل لکھا، اس کا ضروری حصہ یہ ہے:

''ہمارے فاضل دوست نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ صرف بیماری کا شکوہ نہیں بلکہ بیماری کا علاج کرنا ہے اور اس کے لیے ایک مجلس تاریخ کی تجویز پیش کی، ہم بڑی خوشی کے ساتھ ان کی اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں، ان کو یاد ہوگا کہ آج سے چوبیس برس پیش تر بھی ہم نے حضرت الاستاذ مرحوم کے حسب ہدایت ندوۃ العلما کے زیر سایہ ایک مجلس ''تصحیح اغلاط تاریخی'' کا کام کئی سال تک انجام دیا ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ ہندوستان کے اکابر علم اور مشاہیر فن اس میں شرکت کریں اور کم از کم ان کی باہمی امداد سے ایک صحیح تاریخ مرتب کی جائے لیکن اس سے بھی زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ آیا صرف اردو میں کسی ایسی کتاب کا لکھا جانا مقصد کے حصول کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی ایک محقق تاریخ لکھنا آج مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے، دارالمصنفین اپنے مقدور بھر اس کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے لیکن

ضرورت ہے کہ دوسرے دردمند اہل علم بھی ہمارے کاموں میں حصہ لیں اوراپنی سعی وتحقیق سے ممنون فرمائیں، ہمارے نزدیک یہ مناسب ہے کہ تاریخ ہند کے مختلف حصے کردیے جائیں اورایک ایک حصہ ایک ایک ایسے شخص کو دے دیا جائے جس نے اس دور تاریخی پر کچھ تلاش وجستجو کی ہے اوراگر سرمایہ اجازت دے تو ان کو ان کے کاموں کا مالی معاوضہ بھی دیا جائے۔

اس وقت ان تمام لوگوں کے نام ذہن میں نہیں ہیں، اس لیے صرف اپنی یادداشت سے اس بزم تاریخ ہند کے متعلق حسب ذیل اشخاص کے نام یاد آتے ہیں:

۱-پروفیسر شیخ عبدالقادر، دکن کالج پونہ، ۲-پروفیسر محمد حبیب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۳-پروفیسر ہارون خاں شروانی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۴-پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اسماعیل کالج ممبئی، ۵-مولانا سید ابوظفر ندوی مؤلف تاریخ گجرات احمدآباد، ۶-ڈاکٹر محمد ناظم محکمہ آثار قدیمہ دکن، مصنف تاریخ محمود، ۷-پروفیسر عبدالقادر، اسلامیہ کالج لاہور، ۸-حکیم شمس اللہ قادری، حیدرآباد دکن، ۹-مولوی سید ہاشمی، مؤلف تاریخ ہند دارالترجمہ حیدرآباد دکن، ۱۰-مولوی سید مقبول احمد صاحب، مؤلف حیات جلیل الہ آباد، ۱۱-مولوی اکبرشاہ خاں صاحب نجیب آبادی، مؤلف آئینۂ حقیقت، ۱۲-مولوی سید ریاست علی ندوی۔

یہ نام محض سرسری یاد سے لکھے گئے ہیں، ضرورت یہ ہے کہ لوگ اس ضرورت کو سمجھیں اوراس کی امداد کے لیے دامے وقلمے تیار ہوجائیں، اس کی تالیف کے مصارف کا تخمینہ کم از کم پانچ ہزار ہے تاکہ صاحب تصنیف کو اس کا معاوضہ بھی دیا جاسکے اوراسی قدر روپیہ ان جلدوں کی چھپائی پر صرف ہوگا، گو دارالمصنفین اپنی حیثیت کے مطابق اس بوجھ کو جہاں تک ہوسکے گا اٹھائے گا لیکن اگر کوئی صاحب دل رئیس اس بار کو اٹھا کر تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام روشن کرنا چاہتا ہے تو بہتر ہے کہ اس سلسلہ تالیف کو اس کے نام منسوب کردیا جائے۔'' (معارف نومبر ۱۹۳۲ء)

اس کے بعد جنوری ۳۳ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہم نے تاریخ ہند کی نسبت پچھلے دو پرچوں میں جو تجویز پیش کی تھی بحمداللہ کہ اس نے

بڑی ہر دل عزیزی حاصل کی اور اکثر صاحبوں نے اس کی ضرورت کا اعتراف کیا، اکثر اردو اور بعض انگریزی اخبارات میں اس کا خیر مقدم کیا گیا، طلبہ میں خصوصیت کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا گیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تجویز کتنی ضروری اور اہم تھی اور عجب اتفاق یہ کہ پنجاب کونسل میں نواب احمد یار خاں دولتانہ نے اسی قسم کی تجویز پیش کی تھی، جو افسوس ہے کہ منظور نہ ہو سکی، اس مجوزہ تاریخ ہند کی نسبت پورا خاکہ ہم آئندہ پیش کریں گے جس میں جلدوں کی تعداد، مباحث کا تعین اور مصنّفین کے نام لکھے جائیں گے۔''

سید صاحب نے تاریخ ہند کی تجویز کے سلسلہ میں بعض ہندو مصنّفین کی غلط بیانیوں کی طرف اشارہ کیا تھا، جس کی تفصیل ہم نے قلم انداز کر دی تھی، اس کو بعض ہندوؤں نے ناپسند کیا، چنانچہ پنڈت منوہر لال زتشی[1] پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ نے سید صاحب کو خط لکھا اور بعض خیالات سے اختلاف ظاہر کیا، سید صاحب نے دسمبر ۳۲ء کے معارف میں ان کا خط نقل کر کے اس کا مفصل جواب دیا، جواب بہت طویل ہے اور شذرات میں اپنے خیالات کی حسب ذیل مختصر وضاحت کی:

''افسوس ہے کہ ہمارے بعض ہندو دوستوں کو ہماری گذشتہ تحریر ''بزم تاریخ ہند'' کے بعض فقروں یا اشاروں سے بدگمانی پیدا ہوئی، ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم ہندوستان کی ایسی تاریخ لکھیں جس میں یہاں کے مسلمان بادشاہوں کو معصوم و بے گناہ ثابت کریں بلکہ یہ مقصود ہے کہ ایسی تاریخ لکھیں اور ایسے طرز میں لکھیں جس سے ہندو مسلمان میں منافرت پیدا ہونے کے بجائے یکجہتی اور اتحاد پیدا ہو، تاریخ کچا مواد ہے، اس سے بنانے والا جو چاہے بنا سکتا ہے، چنانچہ انگریزوں کے بعد جب سے ہندو مؤرخوں نے کتابیں لکھنی شروع کی ہیں انہوں نے ہندو دور کو جس آب و رنگ سے لکھنا شروع کیا ہے اس کو پڑھ کر ہر ہندو طالب علم میں اپنے بزرگوں کی اچھی تقلید

---

[1] پنڈت جی کشمیری پنڈتوں کی طرح ہندو مسلم مشترک تہذیب کی پیداوار لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی کا نمونہ، اسلامی تہذیب و روایات کے واقف کار اور اپنے دور کے نامور ادیب تھے۔

کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ساتھ ہی چھوت چھات اور بودھ، جینی، ویدک اور آریہ دھرم کے درمیان اتحاد کا خیال بڑھتا ہے اور اس میں متحدہ ہندو قومی اسپرٹ پیدا کی جاتی ہے، کیا اتنی اصلاحوں کے بعد ہمارے ہندو مؤرخ اتنی اصلاح نہیں کر سکتے کہ واقعات کو اس رنگ میں لکھیں جس سے ہندو مسلم خلیج کا پاٹ بڑھنے کے بجائے گھٹتا جائے۔

مثال کے طور پر ہم یہاں ایک واقعہ لکھتے ہیں، ڈاکٹر ایشوری پرشاد محمود غزنوی کے حملہ ہند کے سلسلہ میں جہاد کا لفظ بول کر اس پر حاشیہ لکھتے ہیں:

''اہل اسلام کا خیال تھا کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ کافروں یعنی اسلام نہ ماننے والوں سے لڑائی کر کے یا تو ان کو دائرہ اسلام میں شامل کر لیں یا تلوار کے گھاٹ اتار دے، اس لڑائی کو جہاد کہتے ہیں۔'' (اسٹوڈنٹس ہسٹری، ص ۱۲۸)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق بجائے خود کہاں تک درست ہے اس کو الگ رکھیے، جس وقت یہ کتاب اسکول کے کسی درجہ میں پڑھائی جاتی ہوگی تو دونوں فرقوں کے لڑکوں کے جذبات پر اس تشریح کا کیا اثر پڑتا ہوگا اور مسلمان لڑکے یا تو شرم سے عرق عرق ہو جاتے ہوں گے یا غصہ میں آ کر کتاب اور مدرس کتاب سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں گے، کیا اگر ہم اپنے ہندو مصنفوں کو اس طریقۂ تالیف کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کے ساتھ بدگمانی کرتے ہیں۔

بزم تاریخ ہند کی کارگزاری کی مزید تفصیل آئندہ اپنے موقع پر آئے گی۔

سیرۃ النبیؐ حصہ چہارم کی اشاعت: ۱۹۳۲ء میں سیرۃ النبیؐ کی چوتھی جلد جو منصب نبوت پر ہے، شائع ہوئی، اس کے مقدمہ میں منصب نبوت کی حقیقت، اس کے لوازم و خصائص پر بحث ہے، پھر قبل از اسلام دنیا کے متمدن ممالک خصوصاً عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے، اس کے بعد نبوت محمدی نے پوری دنیا اور عرب میں جو عظیم الشان اصلاحی کام انجام دیے اس کا اجمالی ذکر ہے، پھر اسلامی عقائد کی تفصیل بیان کی گئی

ہے، اس جلد کی اشاعت سے سید صاحب کی علمی عظمت کے ساتھ دارالمصنفین کی شہرت میں بھی بڑا اضافہ ہوا۔

ندوہ سے عربی رسالہ ''الضیاء'' کا اجرا: پوری عرب دنیا کی زبان عربی ہے، اس کے علاوہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں عربی جاننے والے ضرور موجود ہیں، اس طرح ان کی بین الملی زبان عربی ہے اور وہی ان میں ربط و تعلق کا ذریعہ ہو سکتی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کئی کروڑ ہے اور وہ ہمیشہ سے عربی زبان اور دینی کا تعلیم کا بھی ایک بڑا مرکز رہا ہے، اس کے باوجود ان میں اور دنیائے اسلام میں ربط و تعلق کا کوئی تحریری ذریعہ نہ تھا، اس ضرورت کے پیش نظر ندوہ کے چند طلبہ نے جن میں عربی ادب وانشا کا ذوق تھا محرم ۱۳۵۱ھ مطابق جولائی ۱۹۳۲ء میں حضرت سید صاحبؒ کے زیر نگرانی عربی کا ایک ماہانہ رسالہ الضیاء جاری کیا، حضرت سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آج یورپ کو اتحاد عالم کے خواب کی تعبیر کے لیے اس کی ضرورت پیش آئی ہے کہ وہ ایک عالم گیر زبان پیدا کرے، جس کا نام اسپرنٹو رکھا گیا ہے لیکن اسلام نے اپنے عالم گیر اتحاد کے لیے اس مسئلہ کو پہلے ہی حل کر دیا ہے، اس کے پیغمبر اور اس کے کتاب کی زبان آج چالیس کروڑ نفوس[1] کے لیے اسپرنٹو ہے، جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں اس زبان کا کوئی نہ کوئی جاننے والا موجود ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ سے جہاں چند ہزار بھی اس زبان کے جاننے والے ہیں، اس زبان میں ان کے اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ پورے ہندوستان میں جہاں آٹھ کروڑ اس زبان کے عاشق صادق اور کم از کم چند لاکھ اس کے جاننے اور سمجھنے والے موجود ہیں اور ایک لاکھ سے زیادہ اس کے طالب علم ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں اس کی درس گاہیں ہیں، اس زبان کا کوئی رسالہ موجود نہیں۔

اسی ضرورت کو محسوس کر کے ہمارے چند عزیزان دارالعلوم ندوۃ العلما نے یہ قصد کیا

---

[1] اب یہ تعداد بڑھ کر ستر کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔

ہے کہ لکھنؤ سے الضیاء نامی ایک ماہوار رسالہ جاری کریں، جسنے نگراں کاروں میں ایک میرا نام بھی ہے، پہلا رسالہ مرتب ہو چکا ہے، محرم ۱۳۵۱ھ سے اس کا آغاز ہوگا، قیمت چھ روپے سالانہ ہوگی، پتہ، مولوی مسعود عالم ندوی، اڈیٹر الضیاء شبلی دارالاقامہ، بادشاہ باغ لکھنؤ۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے قدردان اس کی قدر کریں گے اور نہ صرف اس کو خرید کر بلکہ زر اعانت سے بھی اس کی امداد کریں گے، اس وقت چند دوستوں کے پچاس پچاس روپے کے چندوں سے یہ کام شروع ہو رہا ہے، اگر باہر سے کچھ لوگ اس کی ابتدائی مشکلات کے لیے پچاس پچاس روپے یک مشت چندوں سے اس کی اعانت فرمائیں تو بڑا کام ہو، ایسے احباب اس رسالہ کے دائمی سرپرست اور ہمیشہ خریدار رہیں گے۔'' (معارف مئی ۱۹۳۲ء)

یہ رسالہ محرم ۱۳۵۱ھ میں نکل گیا، اس کی عربی معیاری تھی، اس لیے عرب ملکوں میں بہت پسند کیا گیا اور عربی رسائل نے اس پر بہت عمدہ ریویو لکھے، ندوہ کی آواز سے عرب ملک نا آشنا نہیں تھے، علامہ رشید رضا کی ندوہ میں آمد کے زمانہ سے مصر وغیرہ میں اس کا پورا تعارف ہو چکا تھا، پھر حضرت سید صاحبؒ کی شخصیت نے اس کا نام اور بلند کیا لیکن ندوہ اور عربی ملکوں کے درمیان ربط و تعلق کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں استقلال واستحکام نہ تھا، الضیاء کے اجرا سے یہ کمی پوری ہوگئی اور الضیاء کے مضمون نگاروں کے ذریعہ جن میں سب سے نمایاں شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی تھی، اسلامی ملکوں سے ندوہ کے تعلقات کی پوری تجدید ہوگئی اور بعد میں مولانا ابوالحسن علی کی شخصیت نے عرب ملکوں میں ندوہ کا نام اتنا بلند کیا کہ وہاں کے طلبہ حصول تعلیم کے لیے دارالعلوم آنے لگے، چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت (۱۹۶۹ء) ندوہ میں نہ صرف اسلامی بلکہ خالص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی علوم اور اورینٹل کالج کی اصلاح: ہندوستان کی پرانی یونیورسٹیوں میں پنجاب یونیورسٹی یونیورسٹی کا مشرقی علوم کا شعبہ اور اس کا اورینٹل کالج

بہت اہم تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی بعض خامیوں کے باوجود اس نے عربی و فارسی زبان اور اس کے علوم کی بڑی خدمت انجام دی تھی اور اس کے بڑے بڑے فاضل پیدا کیے، جنھوں نے درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور تحقیق و تنقید ہر میدان میں بڑے کارنامے انجام دیے لیکن زمانہ کے حالات اور ضروریات کے مطابق اس شعبہ میں بھی اصلاح و ترمیم کی ضرورت تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے مسائل پر غور اور اس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس نے شعبہ مشرقی کے مسائل کی بھی تحقیقات کی، سید صاحب نے اس کی اصلاح و ترمیم کے متعلق حسب ذیل مشورہ دیا:

''پنجاب یونیورسٹی کی مجلس تحقیقات نے دوسرے صیغوں کے ضمن میں مشرقی علوم اور اورینٹل کالج لاہور کے مسائل پر کچھ غور کیا ہے، اس کے متعلق مختلف افواہیں اخبارات میں پڑھنے میں آ رہی ہیں، گو آج کل کے کمیشنوں کی اصطلاح میں اصلاح اور تخریب کے معنوں میں بہت کم فرق ہے، تاہم ضرورت ہے کہ پنجاب کے اہل علم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر متحدہ یکجہتی سے کام لیں اور علوم مشرقی کی تعلیم میں وہ جدید مناسب اصلاحیں جاری کرائیں جن سے وہ موجودہ ضروریات کا ساتھ دے سکے، طرز تعلیم، طریقہ تعلیم، نصاب تعلیم یہ سب باتیں بحث و اعتنا کے قابل ہیں اور اشخاص اور جماعتوں کے بجائے متحدہ قوم کی طرف سے اس کا لائحہ عمل پیش ہونا چاہیے اور اس کے پیچھے پنجاب کے اسلامی اخبارات کی پوری طاقت ہو، ورنہ ڈر ہے کہ اختلاف، جماعت داری اور فرقہ پروری سے فائدہ کے بجائے نقصان نہ پہنچ جائے۔''

انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی میں ہندوستانی زبان پر خطبہ: پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کی فرمائش پر مارچ ۱۹۳۳ء میں انجمن اردوئے معلیٰ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں مرحوم کے زیر صدارت ''ہندستان میں ہندوستانی'' پر ایک مبسوط خطبہ پڑھا، جس میں اردو زبان سے متعلق بہت سے اصلاحی مشورے دیے گئے تھے، اس کی اہم بحثیں یہ تھیں، قومیت کی تکوین میں زبان کا

حصہ اور مسلم یونیورسٹی کی تعلیم کی زبان، اس خطبہ میں ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ اردو ایک نئی اصطلاح ہے جس کی عمر سو ڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور اس میں وطنی اور قومی جذبہ کی کوئی جھلک نہیں ہے اور اس سے تمام ملک میں اس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے، اس لیے آئندہ سے اس کو اردو کے بجائے ہندوستانی کہا جائے جو ان تمام چیزوں پر حاوی ہے اور یہ حقیقت بھی ظاہر کی کہ اردو کا نام ہندوستانی انگریزوں کا بخشا ہوا نہیں ہے، بلکہ ان کے آنے سے مدتوں پہلے دسویں صدی سے یہ نام تاریخوں میں ملتا ہے، یہ خطبہ اس زمانہ میں علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا اور بعد میں نقوش سلیمانی میں شامل کیا گیا۔

آفتاب ہوسٹل اور طبیہ کالج علی گڑھ میں تقریر: اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کا آفتاب ہوسٹل نیا نیا تعمیر ہوا تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یونیورسٹی کے دوسرے ہاسٹلوں کی پرتکلف زندگی کے مقابلہ میں آفتاب ہوسٹل کی زندگی بہت سادہ تھی اور اس کی ہر چیز میں کفایت شعاری ملحوظ رکھی گئی تھی، اس سفر میں آفتاب ہوسٹل کے منتظمین کی درخواست پر آفتاب ہوسٹل کے قیام کے مقصد کی مناسب سے سادگی اور کفایت شعاری پر کی زندگی پر تقریر فرمائی اور طلبہ کو سادگی کے ساتھ جدوجہد اور جفاکشی کی تلقین کی جس کی مسلمان طلبہ میں بڑی کمی تھی اور جس کی بنا پر وہ زندگی کے معرکہ میں ناکام رہتے ہیں اور یہ بھی واضح کیا کہ جدید علوم کے طلبہ کی زندگی تمام تر دوسروں کی نقالی ہے، اسی لیے ان میں قومی روح نہیں پیدا ہوتی۔

دوسری تقریر طبیہ کالج میں ہوئی، اس میں اسلامی طب کی تاریخ بیان کی اور طلبہ کو دیسی طب کے حصول کی ترغیب دی اور اس کی ضرورت ان الفاظ میں واضح کی کہ ہندوستان کی صحت عامہ کا دارومدار ولایتی طب پر نہیں ہے جو طب کے ساتھ تجارت بھی ہے، بلکہ دیسی طب پر ہے جس کی دوائیں ملک میں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے طبیہ کالج کے طلبہ طبیب بننے کی کوشش کریں، ڈاکٹر بننے کی کوشش نہ کریں۔ (معارف مارچ ۱۹۳۳ء)

جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیمی خطبہ: جامعہ ملیہ دہلی کے کارکنوں کی فرمائش پر اپریل ۱۹۳۳ء

میں جامعہ میں ''مسلمانوں کی آئندہ تعلیم'' کے عنوان سے ایک بسیط خطبہ دیا، جس میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور اس کے تمام پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اس کا پورا لائحہ عمل اس میں پیش کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ خطبہ آج بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ پورا خطبہ معارف ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۳ء کے دو نمبروں میں چھپ گیا ہے، مگر اتنا طویل ہے کہ اس کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے، مئی ۱۹۳۳ء کے شذرات میں خود سید صاحب نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں دے دیا ہے:

''۱۱ر اپریل ۱۹۳۳ء کو جامعہ ملیہ دہلی میں معارف کے ایڈیٹر نے ''مسلمانوں کی آئندہ تعلیم'' پر ایک بسیط مقالہ پڑھا جس میں سب سے پہلے اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زندگی کا مقصد کیا ہے اور پھر یہ کہا گیا کہ ہماری آئندہ تعلیم گذشتہ کی طرح بے مقصد نہ ہونی چاہیے اور درس گاہوں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ بے مقصد افرادِ قوم کے بجائے با مقصد افراد پیدا کریں، اس مقصد کی روح زندگی کے ہر شعبہ کی ذمہ دار ہوگی، اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی گذشتہ با مقصد تعلیم کے نتائج دکھائے گئے، بعد ازیں یہ کہا گیا کہ درس گاہوں کا دوسرا فرض قومی و مذہبی اخلاق اور کیرکٹر کی تعمیر ہے، جو قوم اپنے قومی اخلاق و کیرکٹر سے محروم رہے گی وہ باعزت زندگی سے بھی محروم رہے گی، پھر یہ ثابت کیا گیا کہ یونیورسٹیوں کی جس اعلیٰ تعلیم کی طرف ہم جا رہے ہیں، وہ ہماری شکم سیری کے سامان سے اب تمام تر عاجز ہیں، اعلیٰ تعلیم کی طلب صرف علم کی خاطر ہونی چاہیے، بقیہ عام تعلیم صرف شکم سیری کی تدبیروں کے لیے چاہیے، درمیان میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ موجودہ سرکاری تعلیم حکومت کے نقطہ نظر سے دی جا رہی ہے، قومی نقطہ نظر سے یہ تعلیم سراسر خالی اور دین وملت کی پُر حرارت روح سے تمام تر تہی مایہ ہے، یہ بھی کہا گیا کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ذریعہ جو ابتدائی دیہی اور شہری تعلیم دی جا رہی ہے، مسلمانوں کی تعلیم غیر مشترک اور علاحدہ نظام کے ماتحت ہونی چاہیے اور مقرر کی نگاہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کی خاطر غیر مخلوط انتخاب سے زیادہ غیر مخلوط ابتدائی تعلیم کے مطالبہ کی ضرورت ہے، آخر میں

ہندوستان کی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا تھا۔'' (معارف، مئی ۱۹۳۳ء)

ادارہ معارف اسلامیہ لاہور: اپریل ۳۳ء میں ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس میں **ایک فاضلانہ خطبہ**: میں شرکت فرمائی اور ''لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور قلعہ بنایا'' کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ پڑھا، جس میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے بڑی تلاش و جستجو کے بعد مرتب کی گئی تھی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نادر العصر استاذ احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات اور اس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کی معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے، استاد احمد ہندسہ، ہیئت، ریاضیات کا بڑا عالم تھا، اس تحقیقات سے وہ تمام افواہیں جو تاج کے معماروں کے متعلق مشہور تھیں، بے سروپا ہوگئیں، اس مضمون میں بعد میں اور اضافے بھی ہوتے رہے اور وہ اہل علم میں بڑا مقبول ہوا اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہسٹاریکل ریسرچ جرنل میں شائع ہوا، یہ مضمون مقالات سلیمان جلد اول میں بھی آ گیا ہے۔

اردو کی تاریخ پر ایک مقالہ: اسی زمانہ میں ناگری پرچارنی سبھا کی فرمائش پر اردو کی پیدائش کی تاریخ پر ایک محققانہ مقالہ لکھا جو جولائی ۱۹۳۲ء کے معارف میں شائع ہوا۔

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان: برلن کے عجائب خانہ میں ہندوستان کے ایک اصطرلابی ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ایک کرہ تھا، جس پر اس کا نام، تاریخ اور مقام کندہ تھا، اس کے سوا اس کا اور کچھ حال معلوم نہ تھا، جرمنی کے ایک فاضل ڈاکٹر فان کلیو برکو مزید حالات کی جستجو تھی، انہوں نے سید صاحب کو خط لکھا اور حسب ذیل سوالات کیے، ضیاء الدین کوئی مشہور منجم تھا؟ اس کا وطن کہاں تھا؟ زمانہ کیا تھا؟ اس نے برلن کے کرہ کے علاوہ اور بھی کرے بنائے تھے؟ اس کا ہیئت کے مشہور قدرداں اور سرپرست راجہ جے سنگھ سوائی سے

کچھ تعلق تھا؟ سید صاحب نے ان سوالوں کا مفصل جواب دیا، یہ سوالات اور ان کے جوابات ''لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان'' کے عنوان سے اگست ۱۹۳۳ء کے معارف میں شائع ہوئے۔

بڑودہ کا سفر: بڑودہ کے احباب اور قدردانوں کے اصرار پر جلسہ سیرت میں تقریر کرنے کے لیے جولائی ۱۹۳۳ء میں بڑودہ کا سفر کیا، اس سفر میں بھڑوچ، راندیر، سورت، انکلیشور اور ڈابھیل کی بھی سیاحت کی، اس کی پوری روداد اگست ۱۹۳۳ء کے معارف میں لکھی جو بڑے مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس لیے اس کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

اس دفعہ احباب کے اصرار پر جلسہ سیرت کے موقع پر بڑودہ جانا پڑا، ۲/جولائی کی شام کو نکل کر لکھنؤ اور دلی میں بارہ بارہ گھنٹہ ٹھہر کر ۵/جولائی کی رات کو ۸/بجے بڑودہ کے دارالریاست پہنچا، اسٹیشن پر ریاست کے نمائندہ مسٹر کلکر اور دوسرے مسلمان احباب نے خیر مقدم کیا، ریاست کے مہمان خانہ میں ٹھہرنے کی جگہ ملی، دوسرے دن ہزا کسلنسی دیوان بہادر کے زیر صدارت بڑودہ کالج کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد ہوا، میں نے اور دوسرے مسلمان ہندو اور مراٹھا مقرروں نے اپنے اپنے انداز میں سیرت نبویؐ کے موضوع پر تھوڑی تھوڑی تقریریں کیں، تیسرے دن شہر کی جامع مسجد میں بعد نماز میری ایک اور تقریر ہوئی۔

ریاست بڑودہ کی آبادی ۲۴/لاکھ ہے جس میں پانچواں حصہ مسلمانوں کا ہے، خود شہر کی ایک لاکھ کی آبادی میں بیس ہزار مسلمان ہیں، تاہم آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ یہاں ایک بھی خاص مسلمانوں کا اسکول نہیں، مجھے بتایا گیا کہ یہاں کے ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ ہے، جس سے اس وقت گیارہ سولڑکے کامیاب ہو چکے ہیں مگر ان میں مسلمان صرف آٹھ دس تھے، ان میں بھی تین ریاست کے باہر کے تھے، یہی سبب ہے کہ بیس فیصدی اسلامی آبادی ہونے کے باوجود ریاست کی ملازمت اور مناصب اور عہدوں پر مسلمانوں کا نام ونشان نہیں ہے، مسلمان اپنی غفلت کا الزام ریاست پر ڈالتے ہیں کہ وہ ان

کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتیں، ہم کو بڑودہ کے بیدار مغز مہاراجہ کے ساتھ جو حسن ظن ہے اس کی بنا پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ خود ریاست کی بے توجہی سے وہاں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ریاست بڑودہ کی تعمیر میں مسلمان امیروں اور سپاہیوں کی تلواروں کو بھی دخل ہے۔

اگر لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جا سکتا ہے تو بڑودہ کو کتب خانوں اور مدرسوں کا ملک کہا جا سکتا ہے، ریاست کے پورے طول وعرض میں متحرک کتب خانوں، مکتبوں اور مدرسوں کا جال پھیلا ہوا اور گجراتی کی ابتدائی تعلیم ہندو مسلمان سب کے لیے جبری ہے، شہر میں ایک عام کتب خانہ ہے، ایک متحرک کتب خانوں کا مرکزی کتب خانہ ہے، یہاں کے کتب خانوں کی عمارت ترتیب اور تقسیم سب امریکی نظام پر ہیں اور حق یہ ہے کہ آج تک یہاں سے بہتر طریق پر کوئی کتب خانہ نظر نہیں آیا، سب سے بڑے کتب خانہ کی الماریاں منزل بہ منزل لوہے کے چھڑوں اور تختوں سے بنائی گئی ہیں اور ہر منزل کی چھت دبیز شیشے کی ہے تا کہ نیچے کی منزل میں بھی روشنی پہنچ سکے اور کتب خانہ آتش زنی سے محفوظ رہے، اس وقت ریاست کے مرکزی کتب خانہ کے ماتحت ۴۵ ر بڑے اور ۸۰۰ کے قریب چھوٹے کتب خانے ہیں اور ہر سال تقریباً چار لاکھ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔

بڑودہ سے بھڑوچ، وہاں سے راندیر اور راندیر سے سورت وہاں سے انکلیشور، انکلیشور سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے سورت ہو کر دہلی اور لکھنؤ کے راستہ سے ۱۶ ر جولائی کو اعظم گڑھ واپسی ہوئی، ہر جگہ ایک دو تقریریں کرنی پڑیں، بھڑوچ دریائے نربدا کے کنارے وہ مقام ہے جہاں عبد الملک کے زمانہ میں بحر عرب کی راہ سے نربدا میں داخل ہو کر مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ پہنچا تھا، اس کے ساحل پر پہنچ کر تاریخ کا وہ مرقع آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا اور بے اختیار چند مصرعے موزوں ہو گئے۔

راندیر گجرات کے دین دار تاجروں کا مرکزی وطن ہے، یہاں کی مسجدوں کی شان

وشکوہ دیکھ کر ان سند باد بحری و بری تاجروں کے قصے یاد آ گئے جن کا الف لیلیٰ میں ذکر ہے، ۱۸ر مسجدیں ہیں اور اکثر مسجدیں شروع سے آخر تک سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی موزوں ترکیب سے بنائی گئی ہیں، جامع مسجد، مسجد قوت الاسلام اور مسجد چنار واڑ بہترین مسجدیں ہیں اور اپنی صفائی ستھرائی میں ہندوستان بھر میں بے نظیر معلوم ہوئیں، پانچ ہزار کی اسلامی آبادی ہے، مگر اس کے اندر بہتر میونسپلٹی، بہترین سڑکیں اور ہر جگہ سڑک پر برقی روشنی کا انتظام ہے، مسجدیں برقی پنکھوں سے راحت رساں اور برقی روشنیوں سے منور ہیں، ان ظاہری سامانوں کے ساتھ باطنی حیثیت سے بھی یہ مسجدیں آباد نظر آئیں، نوجوان مسلمانوں کی ایک خاص مجلس ہے، جس کے ارکان باہمت ہیں، محفل اسلام ایک مجلس ہے جس نے اردو، عربی، انگریزی اور گجراتی کا اچھا خاصہ کتب خانہ جمع کیا ہے، ایک گوشہ میں ایک پرانا مزار بھی ہے، جو حسب دستور ایک گنبد کے نیچے چادروں اور غلافوں سے لپٹا ہوا مزاروں کے جھرمٹ میں ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کسی تابعی یا تبع تابعی کا ہے، بھڑوچ، سورت اور راندیر میں ایسی مسجدیں نظر آئیں جن کی تاریخ کی بنا پانچویں صدی بتائی جاتی ہے اور کہیں دروازوں پر لکھ بھی دی گئی ہے، راندیر میں ایک مدرسہ محمدیہ بھی موجود ہے جس میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی بھی سکھائی جاتی ہے۔

ڈابھیل سورت سے ایک دو اسٹیشن بعد ایک گاؤں ہے، جہاں کے دو تاجر مل کر اسی ستارہ کو جو دیوبند کے نظام شمسی سے ٹوٹا تھا، اٹھا لائے ہیں، ہر قسم کی عمارتیں، مسجد، کتب خانہ، مہمان خانہ، دار الحدیث، دار الطلبہ، غرض ہر چیز ان ہی تاجروں کی فیاضی سے بے منت غیرے چھ برس کے عرصہ میں بن کر تیار ہو گئی ہے، صرف مدرسہ کی خاطر بجلی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا ادریس صاحب اور دوسرے فاضل علما درس میں مصروف ہیں اور تین سو کے قریب طالب علم ہندوستان اور بیرون ہند کے زیر تعلیم ہیں، گجراتی اور اردو کے مکتب الگ الگ ہیں، جائے وقوع گاؤں

سے باہر میدان میں ہے، خوش فضا منظر، سکون کا مقام اور اسٹیشن سے جس کا نام مرولی ہے، پانچ میل دور ہے، گجرات کے خاص طالب علم بھی یہاں آرہے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ انشاءاللہ چند سال میں گجرات کا دارالعلوم بن جائے گا۔

اس دور دراز کے ہر مقام میں جو پایہ تخت دہلی سے سیکڑوں میل دور ہے، دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہماری پچھلی اسلامی حکومت کے دھندلے نشان اب بھی در و دیوار سے نمایاں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کے وہ پچھلے خاندان آباد ہیں جن کو سلاطین دہلی نے جاگیریں دے کر ہر جگہ بسایا تھا اور تعلیم و تدریس یا قضا یا ہدایت ورہ نمائی کی غرض سے جابجا آباد کیا تھا، وہ اب تک اسی طرح آباد ہیں، ان میں سے ہر خاندان میں قلمی کتب خانوں کا سرمایہ، پرانے تمدن کی یادگاریں ہیں اور وہ آبادی میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، ہر شہر اور قصبہ میں قاضیوں اور عالموں کے خاندان آباد ہیں، جو اب تک اپنی حیثیت کو سنبھالے ہوئے ہیں لیکن تا کے، ضرورت ہے کہ یہ لوگ اپنے ماحول کی ضرورتوں کو سمجھیں اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کریں ورنہ:

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

خیام کی اشاعت: دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں سید صاحب نے ایک مقالہ خیام پر پڑھا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، یہ مقالہ اہل علم میں اس قدر پسند کیا گیا کہ اس میں رباعیات کے مباحث کو بڑھا کر ایک مستقل کتاب بنادی، یہ کتاب اکتوبر ۳۳ء میں شائع ہوئی، خیام سید صاحب کی اہم کتابوں میں ہے، اس میں پہلی مرتبہ خیام کو ایک شاعر اور رند شاہد باز کے بجائے ایک فاضل، حکیم اور فلسفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس کی رباعیات کی فاضلانہ تحقیق کی گئی ہے اور خیام کی زندگی سے متعلق بعض واقعات اور اس کے سنین کی تصحیح کی گئی ہے، ہندوستان کے علمی حلقہ کے علاوہ ایران و افغانستان میں اس کتاب کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، ڈاکٹر اقبال نے اس کو پڑھ کر سید صاحب کو لکھا کہ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی

عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے توسیعی لکچر کی صدارت: ڈاکٹر انصاری مرحوم نے دنیائے اسلام کی کسی مشہور شخصیت کو بلا کر جامعہ ملیہ میں ان کے خطبات کا سلسلہ شروع کیا تھا، ۱۹۳۳ء میں غازی رؤف پاشا نے خطبات دیے تھے اور فروری ۳۴ء میں ڈاکٹر بہجت وہبی کو خطبات کے لیے دعوت دی، وہ نسلاً عرب اور مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی اولاد سے تھے، ان کے اسلاف ترکی میں متوطن ہو گئے تھے، انہوں نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی اور یورپ کی کسی یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی تھی، ایک زمانہ میں مصر کے میڈیکل کالج میں استاد رہ چکے تھے، پھر یورپ میں سکونت اختیار کر لی تھی، ۱۹۲۰ء میں جب سید صاحب وفد خلافت میں یورپ گئے تھے تو ڈاکٹر بہجت بے سے سوئٹزرلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی، وہ اسلام کا سچا درد رکھتے تھے، انہوں نے جامعہ ملیہ میں مسلمانوں کے عروج وزوال پر چار جلسوں میں آٹھ خطبے دیے، دو خطبوں کی صدارت سید صاحب نے فرمائی تھی، مارچ ۳۴ء کے معارف میں ان خطبوں پر مفصل تبصرہ ہے۔

افغانستان کا علمی و تعلیمی سفر: اکتوبر ۱۹۳۳ء میں حکومت افغانستان نے اپنے ملک کے علمی و تعلیمی مسائل پر غور و مشورہ کے لیے سر اقبال، سر راس مسعود اور سید صاحب کو افغانستان آنے کی دعوت دی، یہ کام ان کے خاص ذوق اور دلچسپی کا تھا، اس تقریب سے افغانستان کی سیاحت کا بھی موقع ملتا تھا، اس لیے دعوت قبول کر لی اور اکتوبر کے آخری ہفتہ میں افغانستان کا سفر کیا، یہاں ہفتہ عشرہ قیام رہا، اس مختصر مدت میں آپ نے کابل، غزنین، قندھار وغیرہ افغانستان کے بڑے بڑے شہروں کو دیکھا، ان کے آثار و مشاہد اور علمی و تعلیمی اور صنعتی اداروں کا معائنہ کیا، یہاں کے علما، فضلا اور ارکان و عمائد سے ملے اور افغانستان کے ہر پہلو کا بغور مشاہدہ کیا اور واپسی میں معارف کے دس بارہ نمبروں میں اس سفر کی مفصل روداد لکھی جو عرصہ ہوا حیدرآباد سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوگئی ہے، یہ سفرنامہ اس دور کے

افغانستان کا آئینہ ہے، ہم اس کے جستہ جستہ حالات یہاں نقل کرتے ہیں۔

نادر شاہ بادشاہ افغانستان سے ملاقات: سرور خاں گویا (افغانستان کے مشہور شاعر اور انجمن ادبی کابل کے سکریٹری) مجھے اپنے ساتھ قصر دل کشا لے گئے، یہ قصر ایک زمانہ سے شاہان افغانستان کا محل اقامت ہے، یہ مقام شہر کابل کا بہترین حصہ ہے، بلند عمارتیں، موجودہ طرز کی عالی شان دوکانیں، سڑک صاف اور وسیع، اسی کے قرب و جوار میں وزارت خانے اور اکثر اعلیٰ سرکاری دفاتر ہیں، تھوڑی دیر کے بعد قصر دل کشا آ گیا، اول وسیع باغ ہے، اس کے بعض گوشوں میں مختلف شاہی ضرورتوں کی عمارتیں ہیں، ان کے طے کرنے کے بعد قصر دل کشا کی اصلی عمارت آئی، اس کے صدر دروازے پر سنتریوں کے پہرے لگے ہوئے تھے، موٹر سے اترتے ہیں ایک سائبان میں آدمی داخل ہوتا ہے، یہ سائبان نہایت وسیع اور چھت نہایت بلند ہے، دروازہ کے اوپر بلندی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کتبہ خوش خط بہت جلی، سیاہ حرفوں میں لکھا ہوا ہے، اندر داخل ہوتے وقت تو اس پر نظر نہیں پڑتی، کیوں کہ ادھر پشت ہوتی ہے، لیکن ادھر سے واپس ہوتے وقت فوراً اس پر نظر پہنچ جاتی ہے، اس مقام پر اس کلمہ کو پڑھ کر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، میری نظر بھی واپسی ہی کے وقت اس پر پڑی۔

سائبان سے گزر کر ایک وسیع زینہ ملا، زینہ ختم ہونے پر سہ طرفہ سائبان اور ان سائبانوں کے بعد مختلف کمرے دکھائی دیے، جو اکثر بند تھے، پوری عمارت نہایت وسیع، بلند، شان دار اور روشن ہے اور زیب و زینت کی ظاہری فخامت سے بری ہے، بایں ہمہ سادگی، مجھے اس میں بڑی جلالت نظر آئی اور احمد شاہ درانی سے لے کر امیر عبدالرحمٰن خاں کی تاریخ سامنے آ گئی، حالاں کہ یہ محل قدیم نہیں بہت بعد کی تعمیر ہے تاہم آج بھی اس کے تخت کا جلوہ یہیں نظر آتا ہے۔

زینہ کے خاتمہ پر تشریفاتی موجود تھے، انہوں نے خیر مقدم کیا، اس کے بعد

سائبان کے اوپر ہو کر ایک کمرے میں لے گئے، وہاں ایک گول میز کے گرد چند کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک پر میں بیٹھ گیا، اس کمرے سے متصل ایک دوسرا کمرہ نظر آرہا تھا، جس کا دروازہ بند تھا، چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور مجھے اس کے اندر جانے کو کہا گیا، میں نے اندر قدم رکھا، دیکھا اس کمرے کی کھڑکیاں کسی کشادہ منظر کی طرف کھلتی ہیں، اور شاہ مغفور (نادر شاہ شہیدؒ) ادھر متوجہ ہیں مگر میرے داخلہ کے ساتھ ہی وہ میری طرف پھر گئے، وہی چھریرا جسم، بدن پر سوٹ، سر پر افغانی ٹوپی اور لبوں پہ ہلکا تبسم، دیکھنے کے ساتھ السلام علیکم فرمایا اور خوش اخلاقی سے جھک کر مصافحہ کیا اور ایک مستطیل میز کے طول میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور عرض کی ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے مجھ سے اشارہ فرمایا۔

سب سے اول سفر میں میری تاخیر کے اسباب دریافت کیے، میں نے عرض کیا کہ اولاً میری زندگی کی تاریخ اس قدر صاف نہیں کہ مجھے حدود ہند سے جلد نکلنے میں آسانی ہو، دوم میری اقامت ایک چھوٹے سے مقام اعظم گڑھ میں ہے، اس لیے صوبہ کے مرکزی شہروں سے دوری بھی پاسپورٹ کی تاخیر کا باعث ہوئی، باتیں کرنے میں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس وقت میں اس شخص سے باتیں کر رہا ہوں جو ایک کروڑ نفوس پر حکم راں ہے، بلکہ پوری طرح مساوات اور حسن خلق کا منظر سامنے تھا، کمرے میں میرے اور شاہ مغفور کے سوا کوئی دوسرا متنفس نہ تھا، اس لیے طرفین کو اظہار مطالب میں کوئی باک نہ تھا، ملاقات کوئی آدھ گھنٹہ تک رہی اور اس عرصہ میں صرف تین موضوعوں پر گفتگو رہی۔

سب سے پہلے تو میں نے ایک سلسلہ تقریر میں کہا کہ میں جس وقت پشاور سے روانہ ہو رہا تھا تو یہ سن کر کہ میں شاہ معظم کی دعوت پر کابل جا رہا ہوں میرے ارد گرد کچھ لوگ کھڑے ہو گئے، جن میں ایک آفریدی پٹھان بھی تھا، اس نے پشتو میں مجھ سے کچھ کہا، جس کو میں نہیں سمجھ سکا، میرے دوستوں نے اس کا ترجمہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مختصر مخلصانہ پیغام ہے، جس کو وہ میرے ذریعہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے، جس کا تعلق

سرحدات کی افغانی طرز سیاست سے تھا، پھر اس بارہ میں میرا جو اسلامی فرض تھا، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس کو بطریق احسن انجام دیا اور اعلیٰ حضرت نے اس کو پوری توجہ سے سنا اور اس کے متعلق اپنے خیالات بہت مختصر لیکن نہایت مشرح طریق سے ظاہر فرمائے، میں نے اپنی گفتگو میں سرحد کے آزاد علاقوں کو افغانستان کی چہار دیواری قرار دیا، فرمایا کہ جس کو اس چہار دیواری کے اندر ہی رہنا ہے، وہ کیوں کر گوارہ کر سکتا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے کھسکے۔

گفتگو کا دوسرا اہم اور طویل موضوع مسئلہ تعلیم تھا، میں نے اس کے متعلق اپنے مفصل خیالات عرض کیے اور بتایا کہ افغانستان کے لیے کس قسم کی تعلیم موزوں ہے، خصوصیت کے ساتھ میں یہاں کی عربی و مذہبی تعلیم کے اصول واسلوب پر بحث کی اور یہ بتایا کہ موجودہ عربی و مذہبی تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے اور جب تک اس قسم کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب جاری نہ ہوگا، علما میں موجودہ فضا کے اندر سیاسی واجتماعی اصلاحات کی طرف میلان اور نوجوان افغانوں میں شیفتگی و پابندی کا احساس پیدا نہیں ہو سکتا، اعلیٰ حضرت مرحوم دیر تک میرے خیالات توجہ سے سنتے رہے اور ان کی تحسین فرمائی اور ان کی صورت ظاہر کی اور دریافت فرمایا کہ کیا اس طرز پر ہندوستان میں کوئی مذہبی درس گاہ قائم ہے، میں نے ندوۃ العلما کا نام لیا اور اس کے کچھ حالات بیان کیے اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس بیان سے خوش اور مسرور ہیں۔

اس تعلق سے انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے عام حالات خصوصاً سیاسی حالات دریافت کیے، میں نے اس وقت مسلمانوں میں جو سیاسی افتراقات اور اختلافات ہیں ان کو افسوس کے ساتھ بیان کیا، پھر انہوں نے ہندو مسلم تعلقات کی نسبت دریافت کیا، اس کی جو موجودہ صورت حال مجھے معلوم تھی وہ عرض کی، اعلیٰ حضرت مرحوم خود بھی ہندوستان کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے، یہاں کے اخبارات اور خاص خاص رسالے شاہی

دارالتحریر میں آتے ہیں اور ان کی نظر سے گزرتے ہیں، چنانچہ میں نے کسی بات پر معارف کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ میں اس کو ہمیشہ پڑھتا ہوں۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ آپ ہندوستان جا کر میرے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچا دیجیے کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق کی ضرورت ہے اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کے بجائے ایک دوسرے کے حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے، پھر فرمایا کہ میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کروں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں جس میں قدیم اسلامی اور جدید تمدن کے محاسن یک جا ہوں اور پھر فرمایا کہ میں دین و ملت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں، پھر فرمایا کہ میرے بھائیوں سے کہہ دیجیے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی تعدادی، اقتصادی اور تعلیمی استعداد اس کے لیے پہلے سے تیار کر لیں۔

اعلیٰ حضرت چوں کہ تعلیم دہرہ دون میں پائی ہے، اس لیے اردو بہت اچھی بولتے ہیں، ہم دونوں نے گفتگو کا آغاز فارسی میں کیا تھا لیکن بہت جلد اردو میں شروع ہوگئی جو آخر تک قائم رہی۔

چلتے وقت پھر کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور کلمات رخصت ادا کیے جن کا میں نے مناسب جواب دیا، مرحوم نہایت شیریں اخلاق، منکسر المزاج، پرمحبت اور رقیق القلب تھے، ان کی آنکھیں مولانا محمد علی مرحوم کی طرح اشک باری کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

وزیر جنگ کے یہاں چائے کی دعوت اور تعلیمی مسائل پر گفتگو: اسی دن افغانستان کے وزیر جنگ سردار شاہ محمود خاں کے یہاں چائے کی دعوت تھی، ان کے سامنے بھی مذہبی تعلیم کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے، لکھتے ہیں:

”آج ۴ بجے شام کو سردار شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے یہاں چائے کی دعوت

تھی، قصر دل کشا سے سید ھے سردار موصوف کے یہاں روانگی ہوئی، سرور خاں گویا ساتھ تھے، سردار موصوف کا دولت خانہ اس سے قریب ہی تھا، قصر دل کشا سے نکل کر وزارت خانہ والی سڑک کو عبور کر کے سردار موصوف کا دولت خانہ آ گیا۔'' (اس کے بعد مکان کی تفصیل ہے۔)

اب تمام مہمان آ چکے تھے، وزیر موصوف سب کو لے کر دوسرے کمرے میں گئے، وہاں ایک لمبی میز پھولوں اور پھلوں سے بھری تھی مختلف رنگوں اور قسموں کے انگوروں کی بہار تھی، یورپین ذوق کی مٹھائیاں اور کیک بسکٹ وغیرہ تھے، جن کی نسبت میرا خیال ہے کہ کابل ہی کے بنے ہوئے تھے، پھر شائستہ لباس میں شائستہ اخلاق خادم چائے کشتیاں لے کر آئے اور چائے پی گئی، مہمانوں میں سردار ہاشم خاں صدر اعظم اور دوسرے وزرا و اعیان موجود تھے۔

چائے سے فراغت کے بعد گفتگوؤں کا سلسلہ شروع ہوا، میری میز پر سردار ہاشم خاں، میر عطا محمد رئیس اعیان اور مولانا فضل احمد صاحب نائب عدلیہ (اب وہ وزیر عدلیہ ہو گئے ہیں) تھے، اس مناسب اجتماع کے موقع پر میں نے کابل میں مذہبی عربی تعلیم کے اصلاحات کی اسکیم کو پوری تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھا اور آخر میں عرض کیا کہ افغانستان ایک ایسی درس گاہ کے بغیر اصلاحات کے مسئلہ میں تا قیامت کام یاب نہیں ہو سکتا، صدر اعظم نے بے حد توجہ کے ساتھ ان خیالات کو سنا اور آخر میں فرمایا کہ کیا آپ ہم کو اس میں مدد دے سکتے ہیں، میں نے عرض کیا اپنی پوری طاقت اور استطاعت اس راہ میں صرف کر سکتا ہوں، بقیہ دو حضرات سر اقبال اور راس مسعود نے بھی پوری تائید کی، اب مغرب کا وقت آ گیا تھا، کچھ لوگ رخصت ہو گئے، کچھ لوگ دوسرے کمرے میں نماز مغرب کے لیے چلے گئے اور یہ بھی کہہ دوں کہ کچھ لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے رہ گئے۔

انجمن ادبی کابل میں ارکان وفد کا عشائیہ: اسی دن شب کو کابل میں مشہور علمی ادارے انجمن ادبی کابل نے ارکان وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا، جس میں کابل کے تمام نام ور ادبا، شعرا اور اصحاب علم و قلم جمع ہوئے، یہ اس سفر کی سب سے زیادہ پر لطف تقریب تھی، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ہز ایکسلنسی سردار شاہ محمود خاں وزیر حرب کے یہاں سلسلہ گفتگو اتنا دراز ہوگیا کہ شام کے سات بج گئے اور شام کے ساڑھے سات بجے کابل کی انجمن ادبی نے جس کو یہاں کی رائل اکیڈمی کہیے، نوارد ہندی مہمانوں کے اعزاز میں دعوت شب (ڈنر) کا انتظام کیا تھا، چنانچہ ہم لوگ یہاں سے سیدھے کابل ہوٹل روانہ ہوئے، جہاں اس ڈنر کا اہتمام تھا، کابل ہوٹل کی عمارت اچھی خاصی پختہ اور بلند ہے، اور اس میں متعدد وسیع کمرے اور ہال ہیں، ہم لوگ پہلے بغلی کمرے میں بیٹھائے گئے، اس کمرے میں ہر طرف مہمانوں کے لیے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، اکثر مہمان جو زیادہ تر انجمن ادبی کابل کے ارکان تھے، پہلے ہی سے آچکے تھے، کچھ لوگ بعد کو آئے۔

یہ انجمن ادبی موجودہ حکومت کی تاسیسات میں سے ہے، ملک کے اکثر اہل علم و اصحاب قلم اور تعلیم یافتہ نوجوان اس کے ارکان ہیں، شہزادہ احمد علی خاں درانی جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ اور دارالتحریر شاہی (سکریٹریٹ) کے ایک معزز منصب دار ہیں، اس کے سکریٹری ہیں، اس انجمن کی رکنیت ایک شاہی اعزاز ہے، اس کے ہر رکن کو سلطنت کی طرف سے علمی وظیفہ ملتا ہے، تاکہ وہ علم و فن اور شعر و سخن کی خدمت آزادی اور خوش دلی کے ساتھ انجام دے سکے، یہاں تک کہ سرکاری ملازمین بھی جب اس انجمن کی رکنیت سے سرفراز ہوتے ہیں تو ان کی تنخواہ کے علاوہ وظیفہ کی رقم الگ ملتی ہے، ارکان میں بوڑھے بھی ہیں جوان بھی، قدیم عالم بھی ہیں اور جدید تعلیم یافتہ بھی، محلوق اللحیہ بھی ہیں اور صاحب ریش دراز بھی، شاعر بھی ہیں اور نثر نویس بھی، عربی داں مضمون نگار بھی ہیں اور انگریزی، فرنچ اور جرمن زبانوں کے مترجم بھی، اس انجمن کا ماہانہ رسالہ کابل ہر مہینہ بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا ہے، سب مہمانوں کے آنے کے بعد انجمن کے صدر نشین نے کھڑے ہوکر فارسی میں خیر مقدم کا ایڈریس پڑھ کر سنایا[1] اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر قاری عبداللہ خاں صاحب کی حسب ذیل نظم خیر مقدم کے عنوان سے پڑھ کر سنائی گئی:

---

[1] یہ ایڈریس طویل ہے، اس لیے اس کو نقل نہیں کیا گیا، معارف میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ (معارف فروری ۱۹۳۴ء)

عزیزاں ز ہندوستاں آمدند — در افغانستاں مہماں آمدند
در آناں یکے دکتر اقبال ہند — سخن پرور و واقف از حال ہند
ادیب سخن گستر نکتہ سنج — کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج
چمن گردۂ طرز رنگین اوست — شکر پارۂ حرف شیریں اوست
کلامش چو اوج بلندی گرفت — سخن رتبہ ارجمندی گرفت
زند طعنہ آہنگ او برق را — کہ خواہاں نہضت شرق را
تویں شیوۂ را بہ سبک کہن — در آمیخت از قدرت علم و فن
چوں اندر سخن جادۂ نو گزید — پیامے ز مشرق بہ مغرب رسید
سخن را در آمیخت چوں با علوم — ازو زندہ شد طرز مولائے روم
چوں فکرش پے فیلسوفی گرفت — طراز سخن طرز صوفی گرفت
نوایش ہم آہنگ با نفخ صور — کہ افسردگاں را در آورد بشور
چوں بلبل بآہنگ کہسار ما — ز ہند آمد ایں طوطی خوش نوا
دگر آنکہ او نام در سید است — گزیں نخبہ آل سر سید است
ہنر مند سر راس مسعود نام — کز و مکتب ہند دارد نظام
روان ہنر مندی و جان علم — علی گڑھ بروزد دبستان علم
بعالم گراں آوازہ یافت — ز جہد وی ایں قدر و اندازہ یافت
رئیس دبستاں دراں مرز و بوم — شناسائے قابل بطرز علوم
سیوم سید ما کہ از ندوہ است — ز دانش بہ ہندوستاں قدوہ است
ز فیض و مشن تازہ شد جان علم — در اقلیم دانش سلیمان علم
چہ کلکش بمعنی طرا زندہ شد — خیالات شبلی از زندہ شد
چہ در شاہ راہ حقائق شتافت — "معارف" ازو رونق تازہ یافت

مضامین او جملہ محکم بود نگارش بکلکش مسلم بود
دگر مرد دانائے ہادی حسن پروفیسرے واقف از علم و فن
بانگلیسی و فرس عالم بود زبان دری را معلم بود
ادیب سخن پرور فارسی سخنہائے او گوہر فارسی
بلفظ دری چوں تکلم کند ز شوقش شکر دست و پا گم کند
سخنہایش دل کش بیانش ملیح چوں ایرانیاں لہجہ او فصیح
ز بہر سیاست دریں بوم دیر کشیدند از ہند رخت سفر
زرہ ایں عزیزاں رسیدند خوش بکابل کنوں آرمیدند خوش
ورود مشاہیر ہندی نژاد بود رابطہ افزائے حب و وداد
ازیں آمد دل چو گل گل شگفت بصد خرمی خیر مقدم بگفت
غنیمت بود دیدن دوستاں چو در فصل گل جلوہ بوستاں
مسلماں ز ہر جا بہم دوست بہ چو بادام توام بیک پوست بہ
بہمسایہ ہمسایہ گردا رسد برش بہرۂ دین و دنیا رسد
کہ از دید دا دید زاید دواد ز ہم نگسلد رشتہ اتحاد
دل صاف احباب خرم بود چو در بین ہم رشتہ محکم بود

خوش است اے عزیزاں ز ہم پرس و جوئے
کہ آید مگر آب رفتہ ز جوئے[1]

اس نظم کے بعد مہمانوں کی جانب سے پروفیسر ہادی حسن نے ایرانی فارسی میں تقریر کی، اس کے بعد سر راس مسعود، سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال نے فرداً فرداً جوابی تقریریں کیں، یہ تقریریں معارف میں چھپ چکی ہیں اور طویل ہیں اس لیے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

[1] معارف فروری ۱۹۳۴ء، ص ۸۹، ۹۰۔

کابل کے اسکولوں اور مدرسوں کا معائنہ: کابل کے دوران قیام میں ارکان وفد نے وہاں کے تعلیمی اداروں اور سید صاحب نے عربی مدارس اوران کے طریقہ تعلیم کا خاص طور سے معائنہ کیا اوراس کے متعلق مفید مشورے دیے، یہاں کا آرٹس اسکول بہت ترقی یافتہ تھا، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''افغانستان میں مکتب کا لفظ مدرسہ یا اسکول کے معنوں میں بولا جاتا ہے، مزار بابر سے نکل کر ہم سب سے پہلے مکتبہ صنائع نفیسہ میں پہنچے، صنائع نفیسہ کے معنی فنون لطیفہ یا فائن آرٹس سمجھئے، اس مدرسہ کو شاہ امان اللہ خاں نے قائم کیا تھا، پتھر کی اچھی خاصی دومنزلہ عمارت ہے، سامنے لڑکوں کے کھیلنے کا میدان ہے، یہ میدان احاطہ سے گھرا ہوا ہے اور احاطہ پھاٹک سے بند ہے، موٹر جیسے ہی پھاٹک پر آ کر رکا، بعض اساتذہ نے جو میدان میں کھڑے تھے اور مدیر مکتب غلام محمد خاں صاحب نے پرتپاک استقبال کیا اور ایک ایک کلاس میں لے جا کر پورے اسکول کی سیر کرائی، اس وقت اس میں پانچ سولڑکے زیر تعلیم تھے اور فنون لطیفہ میں نقاشی، نجاری، قالین بافی، رنگ ریزی، اور مصوری وغیرہ کے مختلف کلاس زیر تعلیم تھے، نقاشی جس کو وہاں رحامی کہتے ہیں اس کے معلم ایک ہندوستانی تھے، قالین بافی کے اعلیٰ استاد ایرانی تھے اور نجاری کے اعلیٰ کلاس میں ایک جرمن تعلیم دے رہا تھا، میں نے ہر کلاس میں جا کر لڑکوں کے کاموں کو دیکھا، میں نے لکھنؤ کا سرکاری آرٹس اسکول دیکھا ہے، مجھے یہاں کے صنائع نفیسہ کا کام وہاں سے بہتر نظر آیا۔

صنائع نفیسہ کے اکثر کلاسوں کو دیکھ کر باہر نکلا تو میدان میں اس عظیم الشان اضافے کو دکھایا گیا جو موجودہ حکومت اس مدرسہ کی عمارتوں میں کر رہی ہے، یہ عمارات زیر تعمیر معلوم ہوتی تھیں، جب کبھی وہ مکمل ہو جائیں گی تو اس مدرسہ کی ظاہری حیثیت بھی بہت بلند ہو جائے گی اور مدرسہ بہت وسیع ہو جائے گا۔

اب میں نے یہاں کے عربی مدرسے کو دیکھنے کی خواہش کی، جس کا نام دارالعلوم ہے، یہ مدرسہ پرانے شہر کے اندر ایک گلی میں واقع ہے، سڑک کی ایک گلی میں پہنچ کر موٹر رک گیا،

یہاں سے اتر کر گلی میں قدم رکھا، تھوڑی دور چل کر ایک بڑے مکان کے اونچے دروازے کے اوپر دارالعلوم عربی کا بورڈ نظر آیا، اندر سے عمارت خاصی بڑی تھی، دو منزلہ عمارت ہے، دونوں منزلوں میں مدرسہ کی جماعتیں مصروف درس تھیں، رئیس مدرسہ کا نام قاری عبدالرسول خاں ہے، مدرسین میں اکثر افغانی علما تھے، جنہوں نے ہندوستان میں تعلیم پائی ہے، وہ فارسی زبان میں تقریر کر رہے تھے، طلبہ کے سروں پر سفید افغانی گول پگڑیاں اور جسم پر گرم یا روئی دار لبادے تھے اور ادب سے بیٹھے ہوئے استاد کی تقریر سن رہے تھے۔"

اس کے بعد طرز تعلیم کی تفصیل ہے، آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"مدرسہ کے نصاب جاری کا نقشہ دیکھا، وہی کتابیں تھیں جو ہندوستان کے قدیم عربی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، طلبہ میں دو باتیں عجیب معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ ان میں کوئی طالب علم بھی پچیس تیس سال سے کم عمر کا نہ تھا، سب کے اچھی خاصی بڑی داڑھیاں تھیں، دوسرے یہ کہ ان طالب علموں میں تیزی اور ذہانت کا کوئی ثبوت نہیں ملا، ہمارے یہاں کے عربی مدرسوں میں اگر کوئی باہر کا آدمی آجائے تو جید طالب علم اپنی ذہانت اور تیزی کی نمائش کے لیے استاد سے سوالات، اعتراضات اور جوابات کی بڑی قوت دکھاتے ہیں، افغان عربی طلبا کی یہ سرد طبعی حقیقت میں ان کی دماغی قوت کی کم زوری کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ طریقہ تعلیم کی کم زوری اور طرز تربیت کی خرابی کا نتیجہ ہے، ورنہ وہی افغان جب نئے علوم پڑھتے ہیں تو ان کی فطری ذہانت اور تیزی آخر پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

ضرورت ہے کہ اس مدرسہ کے نصاب تعلیم میں اصلاح کی جائے، ان کے نصاب میں نئے علوم کو داخل کیا جائے اور ضرورت کے مطابق ان طلبہ کو رہنے سہنے کے طور طریق میں صفائی اور بلندی کا خیال رکھا جائے، وہاں کے علما کے طبقہ کو ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یا تو وہ شیشہ ہیں کہ ذرا ہاتھ لگایا اور ٹوٹا یا بارود ہیں کہ ان میں بے احتیاطی سے ذرا بھی گرمی پہنچی تو بھک سے اڑ جائے گا اور زلزلہ پیدا کر دے گا، یہ خطرہ ایک حد تک صحیح بھی ہے لیکن اگر افغانستان کو زندہ رہنا ہے تو اس خطرہ

سے ایک مرتبہ دوچار ہونا پڑے گا، اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ طریقہ تعلیم، نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے اور ایسے علما پیدا کیے جائیں جو نئی تعلیم کے نوجوانوں کی رہ بری کرسکیں اور مفید اصلاحات کی پیش رفت میں مدد دے سکیں، علمائے افغانستان نے گذشتہ دور ہائے حکومت میں بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ آج وہی کام پھر وہ انجام نہ دے سکیں، نظم و اصلاح، دین و دانش اور علم وفن کے آج کتنے کام ہیں جو ان کی نگاہ التفات کے منتظر ہیں۔

اس عربی مدرسہ دارالعلوم کے علاوہ یہاں جدید تعلیم کی بھی چند درس گاہیں ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں، مکتب حبیبیہ، مکتب نجات، مکتب استقلال، مکتب دارالمعلمین، مکتب غازی، مکتب صنائع نفیسہ، مکتب زراعت، مکتب طبی، دارالحفاظ، یتیم خانہ نادری، مکتب دواسازی، مکتب حربیہ، مکتب قبائل، یہ تو بڑے بڑے مدرسے ہیں، ان کے علاوہ شہر میں تین ابتدائی مدرسے بھی ہیں۔

افغانستان میں مکتب کا لفظ ہائی اسکول یا کالج کے لیے بولا جاتا ہے، ہمارے ہندوستانی ناظرین ان مکتبوں سے اپنے یہاں کے بچوں کے مکتب نہ سمجھیں۔

ان مکاتب میں سب سے بڑا مکتب حبیبیہ ہے، جو امیر حبیب اللہ خاں کی یادگار ہے، ان ہی کے زمانہ میں بنا تھا، یہاں پہلے بھی اور اب بھی زیادہ ہندوستانی مسلمان معلم اور مدرس ہیں، انگریزی تعلیم ہوتی ہے، مکتب حربیہ یعنی فوجی کالج بھی یہاں پہلے سے ہے، امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں ایک فرانسیسی اور دوسرے جرمن زبان کے لیے دو اسکول قائم کیے تھے جن میں ایک کا نام امانیہ اور دوسرے کا امانی رکھا تھا، مگر اب جرمن کالج کا نام مکتب نجات اور فرانسیسی کالج کا نام مکتب استقلال ہے، مکتب دارالمعلمین میں استاد تیار ہوتے ہیں، مکتب صنائع نفیسہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، مکتب زراعت کاشت کاری اور باغ بانی کی تعلیم کے لیے ہے، کابل اور پغمان کے بیچ میں اس کی عمارت ہے، مکتب طبی نادر شاہ کے عہد کی یادگار ہے اور یہ دارالامان میں واقع ہے اور جس دارالفنون کابل یعنی کابل یونیورسٹی کا تخیل شاہ مرحوم کا تھا، اس کی بنیاد اولیں کے طور پر اسی طبی کالج کا شعبہ قائم کیا گیا تھا، جو کھل گیا ہے اور اس کا کام عمدگی سے جاری ہے، اسی کے ساتھ دواسازی کا

بھی ایک اسکول ہے، تاکہ دوائیں خود افغانستان میں تیار ہوسکیں۔

دارالحفاظ میں صرف حفظ قرآن کے لیے لڑکے جاتے ہیں اور حافظ بنتے ہیں، یتیم خانہ خاص نادر خاں مرحوم کا قائم کیا ہوا ہے، اس میں شہر کے یتیم بچے رہتے اور پڑھتے ہیں اور مکتب صنائع میں صنعت وحرفت سیکھتے ہیں، مکتب حربیہ جس میں فوجی تعلیم ہوتی ہے، بہت بڑے پیانہ پر قائم ہے، ترک، اطالوی، جاپانی اور جرمن استاد ہیں، نادر خاں نے اپنے زمانہ میں مکتب قبائل کے نام سے ایک اور جنگی اسکول قائم کیا تھا، اس میں سرحد کے بڑے بڑے سرداران قبائل کے بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، سرور خاں گویا نے مجھے بتایا کہ اس میں اس وقت تین سو بچے زیر تعلیم ہیں۔

مکتب نجات اور مکتب استقلال جن کے پہلے نام امانیہ اور امانی ہیں جرمن اور فرنچ تعلیم کے لیے مخصوص ہیں، استقلال سے مقصود انگریزوں اور افغانوں کی آخری جنگ کے بعد افغانستان کی خود مختاری ہے اور نجات سے مراد بچہ سقہ کا فتنہ فرو ہونا ہے، ان دونوں مدرسوں کے یہ جدید نام افغانستان کے دو گذشتہ اہم واقعات کی یادگار ہیں، ملک افغانستان میں اب تک کوئی متحدہ نظام تعلیم جاری نہیں ہے، حبیبیہ اور نجات اور استقلال تین طرزوں کی تین مستقل یادگاریں ہیں، جن میں اول میں انگریزی، دوم میں جرمن اور سوم میں فرنچ ذریعہ تعلیم ہے اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ انگلستان، فرانس اور جرمنی ان تین ملکوں میں سے جس ملک میں جن فنون کی تعلیم بہتر ہوتی ہے، ان کے لیے یہاں انگریزی یا فرنچ یا جرمن کی تعلیم افغان بچوں کو دلا کر ان فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کو انگلستان، فرانس اور جرمنی بھیجا جائے گا، گویا یہی ان تینوں ملکوں کی ابتدائی تعلیم کے اسکول ہیں اور ان کی تکمیل کی اصلی درس گاہیں انگلستان یا فرانس یا جرمنی میں ہیں۔

اس نظام تعلیم نے ملک میں بے حد ابتری پیدا کردی ہے، ایک ایک افغان بچہ کی تعلیم اور یورپ کی آمد ورفت اور وہاں کے قیام اور تعلیم پر جو صرف آتا ہے اس سے افغانستان میں ایک چھوٹا سا اسکول چل سکتا ہے، علاوہ ازیں اس سے ملک کے مستقل غیر ملکی زبانیں، غیر ملکی معاشرتیں، غیر ملکی سیاستیں اور غیر ملکی ذہنیتیں جڑ پکڑ رہی ہیں، جس کا نقصان افغانستان کو آج نہیں

توکل اسی طرح معلوم ہوگا جس طرح ٹرکی کو گذشتہ جنگ عظیم میں معلوم ہوگیا تھا، یہی وہ خیالات ہیں جن کی بنا پر شاہ نادر خاں مرحوم کو خود کابل میں ایک افغان یونیورسٹی (دارالفنون کابل) کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔

پریس، اخبارات و رسائل: اس کے بعد پریس، اخبارات اور رسائل کا حال لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ افغانستان میں حکومت کی جانب سے مطبع عمومی کے نام سے جدید ترین سامانوں سے آراستہ ایک اعلیٰ درجہ کا پریس ہے، جس میں ہر قسم کی بہترین طباعت ہوتی ہے، اس کے علاوہ بعض چھوٹے پریس بھی ہیں۔

اس زمانہ میں وہاں سے حسب ذیل اخبارات نکلتے تھے، ۱- اصلاح، یہ سرکاری اور افغانستان کا سب سے اچھا اخبار ہے، اس کے ایڈیٹر برہان الدین کشکی ہیں، ۲- انیس، یہ قومی ہفتہ وار اخبار ہے، اس کے ایڈیٹر محمد امین خاں خوگیانی ہیں، یہ دونوں اخبار کابل سے نکلتے ہیں، ۳- اتفاق اسلام، یہ ہرات سے نکلتا ہے، اس کے ایڈیٹر محمد عثمان الحسنی ہیں، ۴- بیدار، مزار شریف سے نکلتا ہے، اڈیٹر کا نام مجاہد ہے، ۵- طلوع افغان، قندھار سے نکلتا ہے، اڈیٹر عبدالحیٔ خاں ہیں۔

بہار اور اڑیسہ کے سرکاری مدارس کے نصاب کی ترتیب: جون ۱۹۳۴ء میں سید عبدالعزیز صاحب وزیر تعلیم صوبہ بہار واڑیسہ کی دعوت پر یہاں کے عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب کے لیے رانچی کا سفر کیا، اس کمیٹی کے ایک رکن مولانا سید مناظر احسن گیلانی بھی تھے، دونوں نے مل کر نیا نصاب مرتب کیا۔ (معارف ۱۹۳۴ء)

باب ششم

۱۹۳۴ء-۱۹۴۷ء

تاریخ ہند کا خاکہ: ہندوستان کے اسلامی عہد کی ایک مستند تاریخ کی تدوین کی تحریک کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اس کام کے لیے اہل علم اور اصحاب ثروت سے امداد کی درخواست بھی کی گئی تھی، سب سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس کا جواب دیا اور ایک سال کے لیے پچاس روپے ماہ وار مقرر کیے، مولوی محمد حسین خاں رٹائرڈ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل گورنمنٹ آف انڈیا نے پانچ سو روپے دینے کا وعدہ کیا، دارالمصنفین نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کام کا آغاز کر دیا تھا، سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۴ء میں اس کا مختصر خاکہ معارف میں پیش کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین اسلام کی بادشاہی اور حکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی اور یہاں جو تمدن پیدا کیا، ان سب کی ایک مفصل اور مکمل اسلامی تاریخ کی ضرورت، تاریخی، علمی، قومی اور سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، ارباب نظر کی نگاہیں اس کے لیے برابر دارالمصنفین پر پڑ رہی ہیں، دارالمصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لیے پہلوتہی کی کہ اس کے لیے گراں قدر

مصارف کی ضرورت ہے، جس کے لیے اس کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں، اس کام کے لیے اس کو جو ضرورت درپیش ہے، اس کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے:

۱- تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخوں کی فراہمی، اس کی نقل اور ہو سکے تو اس کی خریداری۔

۲- تاریخ کی جو مطبوعہ کتابیں ہمارے پاس نہیں ہیں ان کو حاصل کرنا۔

۳- یورپین زبانوں میں قدیم یورپین سیاحوں نے مغلوں کے عہد کے جو احوال لکھے ہیں یا آج کل انگریزی میں ہندوستان کی جو قابل ذکر تاریخیں لکھی ہیں، ان کو خرید کر یا ہدیۃً حاصل کرنا۔

۴- مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے اپنے عہد کے جو تاریخی مواد فراہم کیے ہیں، ان کو جمع کرنا۔

۵- مختلف کتب خانوں میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق جو نادر قلمی کتابیں موجود ہیں، سفر کر کے ان کا مطالعہ اور ان سے مواد فراہم کرنا۔

۶- کتابوں کی ترتیب و تدوین کے لیے چند لائق اشخاص کے خدمات مناسب معاوضہ پر حاصل کرنا۔

۷- تیار شدہ کتابوں کو چھاپ کر شائع کرنا۔

خیال ہے کہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کو پندرہ حصوں میں تقسیم کیا جائے:

حصہ اوّل	:	آغاز اسلام سے غزنویوں کی پیدائش تک
حصہ دوم	:	غزنویوں کا عہد
حصہ سوم	:	غوریوں سے لے کر حکومت غلامان تک
حصہ چہارم	:	خلجی و تغلق خاندان
حصہ پنجم	:	از آمد تیمور تا خاندان لودھی

حصہ ششم : بابر سے خاندان سوری تک

حصہ ہفتم : ہمایوں باردوم سے جہاں گیر تک

حصہ ہشتم : شاہ جہاں سے عالم گیر تک

حصہ نہم : بہادر شاہ اوّل سے بہادر شاہ ثانی تک

حصہ دہم : بہمنیہ و عادل شاہیہ وغیرہ سلاطین دکن

حصہ یازدہم : گجرات و مالوہ و خاندیس

حصہ دوازدہم : کشمیر و ملتان و سندھ

حصہ سیزدہم : جون پور، بنگال و دیگر متفرقات،

حصہ چہاردہم : اسلامی ہند کا آخری دور نظامت، حیدر آباد، مرشد آباد، عظیم آباد، اودھ، روہیل کھنڈ، بیدر، ارکاٹ

حصہ پانزدہم : ہندوستان میں اسلامی تمدن کی تاریخ

اس کام کے لیے سردست سترہ ہزار روپے کی اپیل کی اور اس خاکہ کو اردو کے تمام اخبارات نے شائع کیا اور اس کی تائید میں نوٹ لکھے، اہل قلم میں ڈاکٹر محمد ناظم، مصنف تاریخ محمود غزنوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مرتب رقعات عالم گیر، پروفیسر محمد ابراہیم، عثمانیہ کالج اورنگ آباد، سید الطاف علی صاحب بریلوی، مصنف حیات حافظ رحمت خاں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض فضلا نے اپنے خدمات پیش کیے لیکن ارباب کرم کی جانب سے کوئی عملی ہمت افزائی نہیں ہوئی، خواجہ حسن نظامی صاحب نے بالاقساط ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا، گو اس تجویز کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا لیکن یہ کام اجتماعی اشتراک و تعاون سے آگے نہ بڑھ سکا، دارالمصنفین کے ذرائع نے جہاں تک اجازت دی، اس نے اس کام کو جاری رکھا، بعض ناگریز اسباب کی بناپر کام مجوزہ خاکہ کے مطابق تو انجام نہ پاسکا لیکن دارالمصنفین نے تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر دو درجن سے زیادہ کتابیں

شائع کیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے مجوزہ زنانہ کالج کے خاکہ کی ترتیب: انجمن حمایت اسلام لاہور جس نے مسلمانوں کے لیے متعدد علمی و تعلیمی ادارے قائم کیے تھے، اپنی طلائی جوبلی کے موقع پر جو ۳۵ء میں ہونے والی تھی، ایک زنانہ کالج قائم کرنا چاہتی تھی، اس کا خاکہ بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی، اس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، چنانچہ اس کی دعوت پر ۳۵ء میں لاہور کا سفر کیا اور ڈاکٹر اقبال کے مشورہ سے اس کا خاکہ بنا کر پیش کیا، اس سفر میں لدھیانہ، سہارن پور اور دیو بند کا بھی سفر کیا اور وہاں کے علمی اور تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کو ملاحظہ فرمایا۔ (معارف، فروری ۱۹۳۵ء)

اردو اور ہندی کا مسئلہ: اردو اور ہندی کی نزاع برابر قائم تھی، اس مسئلہ پر سید صاحب مستقل لکھتے رہتے تھے، جون ۱۹۳۵ء کے معارف کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''اس وقت ملک کی دو زبانیں ہندی اور ہندوستانی (اردو) ملک کی عمومی زبان بننے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کر رہی ہیں، جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے حامیوں کی انتھک کوششوں کی ممنون ہے، ایک زبان جو صرف چند مذہبی کتابوں میں محدود تھی، انگریز دوراندیشوں کی قوت فکر سے کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں سب سے پہلی دفعہ ہندوستانی کے بالمقابل رکھ کر ملک کی دوسری زبان کی حیثیت سے باہم حریف پہلوانوں کی شکل میں نظر آنے لگی، پھر صوبہائے متحدہ کے انگریز حاکموں اور ہندو کارکنوں کی کوششوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ وہی زبان جس کے جاننے والے اور پڑھنے والے اس صوبہ کے باہر نہ تھے، وہ اب پورے ملک کی زبان بننے کا دعویٰ کر رہی ہے، اس کی اشاعت کی مرکزی انجمن ہے، صوبہ صوبہ میں اس کی شاخیں ہیں، اہل دولت اس کی مدد کر رہے ہیں اور اہل قلم اس کو پھیلا رہے ہیں، اب ایک طرف وہ کشمیر دوسری طرف راج پوتانہ تیسری طرف بڑودہ گجرات اور چوتھی طرف مدراس میں اپنے قدم جما رہی ہے اور ہندو ریاستیں اس کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔

اس کے مقابل ہندوستانی (اردو) کے لیے اس کے حامی کچھ نہیں کر رہے ہیں، نہ اس کی تبلیغی انجمنیں ہیں، نہ اس کی اشاعت کے لیے صوبہ میں شاخیں ہیں، نہ اس مقصد پر کسی صوبہ میں ایک پیسہ کوئی خرچ کر رہا ہے اور نہ حیدرآباد دکن کے سوا کوئی اسلامی ریاست کچھ کر رہی ہے، نہ ان صوبوں میں جن کی وہ مادری زبان نہیں ہے، اس کے سکھانے اور پڑھانے کے لیے اعزازی یا تنخواہ یاب معلم ہندی کی طرح دورے کر رہے ہیں، تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہونے کے سبب سے ہندوستان کے ہر صوبہ میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی پھیلتی جا رہی ہے، جو اس کی زندگی کی ضامن اور اس کی یقینی کامیابی کی کفیل ہے۔

ہندی نہ تو اندور کی زبان ہے، نہ کشمیر کی، نہ بڑودہ کی نہ گوالیار کی نہ مدراس کی، یہ ایک خاص صوبہ کی شاعری کی قدیم زبان تھی، جس کو پورے ملک کی عام زبان بنانے کے لیے ایڑی سے چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے اور اب دیہاتی اور تحصیلی مکتبوں اور اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک میں اس کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس طرح ملک میں دو مختلف زبانیں پیدا کر کے آئندہ کے لیے ہندوستان میں دو قومیں بنائی جا رہی ہیں، جن میں باہم ملنے جلنے، سمجھنے بوجھنے اور بولنے چالنے کا بھی وہ موقع باقی نہ رہے گا جو آج اس وقت بھی باقی ہے اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں جو بیج بویا گیا تھا، اب وہ پورا توانا درخت بن جانے والا ہے۔

اگست ۳۵ء کے شذرات میں اردو زبان کے نام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی اس عالم گیر اور وسیع زبان کا غلط نام ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ لوگ مذہبی اصطلاح کی طرح اس کو پکڑے ہوئے ہیں، حالاں کہ اس لفظ کے اندر اس زبان کی پیدائش کی بالکل غلط تاریخ پوشیدہ ہے، عموماً ہر زبان کا نام اس زبان کے ملک یا قوم کی ہم نامی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے ہندوستان کی اس عام مشترک زبان کا صحیح نام ہندوستانی ہو سکتا ہے اور یہ وہ نام ہے جو کم از کم تین چار سو برس سے اس زبان کا نام رکھا گیا، اس زبان کا ابتدائی نام ہندی یا ہندوستانی تھا، ہمارے ہم وطنوں نے ہندی کو اپنی ایک خاص زبان اور رسم الخط کے معنوں میں لے کر ایسا

مشہور کر دیا کہ یہ نام اس کے لیے خاص ہو گیا، اب دوسرا نام ہندوستانی باقی ہے، اگر اردو کو چھوڑ کر اس کے اصلی اور قدیم نام کو زباں زد اور عام نہ کیا گیا تو

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر　　　مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

بھوپال اور حیدر آباد کا سفر: ریاست حیدر آباد نے اسلامی فقہ کے قانون، قتل وقصاص کی ترتیب وتدوین کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی، اس کے ممبر سید صاحب بھی تھے، اس کام کے سلسلہ میں جولائی ۱۹۳۵ء میں حیدر آباد کا سفر کیا، جاتے وقت راستہ میں دو چار دن کے لیے بھوپال ٹھہرے اور نواب حمید اللہ خاں سے ملاقات اور مختلف اصلاحی مسائل پر گفتگو ہوئی، نواب صاحب نے دارالمصنّفین کے حالات بھی پوچھے، سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے سلسلہ میں شروع سے ریاست بھوپال سے دوسو ماہ وار کی امداد ملتی تھی، مگر چند سال سے اس رقم میں تخفیف کر کے نوّے روپے کر دیے گئے تھے، نواب صاحب نے دارالمصنّفین کے حالات اور ضروریات کو سن کر پوری سابق امداد جاری فرمادی۔

بھوپال سے حیدر آباد کا سفر ہوا، قیام حیدر آباد کے دوران میں یہاں کے ارکان و عمائد نے بڑی پذیرائی کی، مہاراجہ کشن پرشاد نے خلعت عطا کیا، شہریارِ دکن میر عثمان علی خاں نے شرف باریابی بخشا اور خاصہ کے خوان سے نوازا، حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں متعدد تقریریں ہوئیں، اس کی مختصر روداد دسمبر ۱۹۳۵ء کے معارف میں شائع ہوئی ہے۔

عربوں کی جہاز رانی کی اشاعت: اوپر گزر چکا ہے کہ مارچ ۱۹۳۱ء میں سید صاحب نے بمبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی فرمائش پر عربوں کی جہاز رانی پر چار لکچر دیے تھے، ۳۵ء میں ان کو بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نے کتابی شکل میں شائع کیا، اس کا انگریزی ترجمہ بھی اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا۔

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کی اشاعت: نومبر ۳۵ء میں سیرۃ النبیؐ کا پانچواں حصہ شائع ہوا، اس کا موضوع اسلامی عبادات کی توضیح وتشریح ہے، اس میں پہلے عبادات کی حقیقت اور اسلام

میں اس کی قسمیں بیان کی گئی ہیں، پھر اس کے فرائض خمسہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد پر علاحدہ علاحدہ مفصل بحث ہے، پھر قلبی عبادات میں تقویٰ، اخلاص، توکل اور صبر وشکر کی تشریح کی گئی ہے اور ان سب کے احکام ومصالح بیان کیے گئے ہیں۔

علالت: اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پلوریسی کے سخت مرض میں مبتلا ہو گئے، کئی مہینہ میں صحت یاب ہوئے، ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا، تین مہینہ دہرہ دون میں قیام رہا، پورے چھ مہینہ کے بعد کام کے قابل ہو سکے، اپنی علالت کی روداد اپریل ۳۶ء میں قلم بند فرمائی ہے:

''خدا کا شکر ہے کہ پانچ مہینوں کے بعد قلم نے کاغذ کی سطح پر قدم رکھا، اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی تو کوئی حد نہیں ہے، وہ جیتوں کو مارتا اور مرتوں کو جلاتا ہے، اس نے اپنے اس حقیر بندے کو موت کے بستر سے جلا کر کھڑا کر دیا تو تعجب کی کیا بات ہے، اب یہ دعا ہے کہ اس کو زندگی کے چند انفاس کی جو نئی مہلت ملی ہے اس میں اس قادر مطلق کی خوشنودی کا کوئی ایسا کام اس سے انجام پائے کہ اس کی مغفرت کا سہارا اور آخرت کا توشہ ہو۔

میری اثنائے علالت میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے سیکڑوں بزرگوں اور دوستوں اور عزیزوں نے ہمدری اور طلب خیریت کے لیے جو تار اور خط بھیجے اور ہزاروں مسلمانوں نے مسجدوں اور مجلسوں میں مجھ گنہ گار کی صحت کی جو دعائیں مانگیں ان کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے دل اپنی بارگاہ میں دعا والتجا کے لیے کھول دیے اور بندگی کی زبان حال نے کہا:

از بر کنار تیر دعا کردہ ام رواں　　　باشد کزیں میانہ یکے کار گر شود

بحمد اللہ وہ کارگر ہوئی، ایڈیٹر بھائیوں نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں میری علالت وصحت پر اپنے جن مخلصانہ جذبات کا اظہار فرمایا ہے، وہ میرے استحقاق سے زیادہ تھے، ان کے کرم اور قلم کا ممنون ہوں۔

بیماری تو جا چکی ہے مگر دل ودماغ کی قوت وتوانائی ابھی واپس نہیں آئی ہے، اسی لیے

دوستوں کے علمی استفساروں اور خطوں کے جواب اور فرمائشوں کی تعمیل سے معذوری ہے، اپریل کے شروع میں دہرہ دون کا قصد ہے اور غالباً گرمیوں کے مہینے وہیں بسر ہوں، جولائی سے امید ہے کہ کام کرنے کی صلاحیت پوری طرح پیدا ہو، اسی اثنا میں التماس ہے کہ خطوط اور استفسارات کے بوجھ سے مجھ ناتواں کو ہلکا رکھا جائے، خصوصاً فتووں کے جواب سے تو مجھ کو بالکل معذور سمجھا جائے۔''

مندر شکن عالم گیر کی مہنت نوازی: عالم گیر کی بت شکنی کے افسانوں کو اس قدر اچھالا گیا کہ ان میں اس کی مندر نوازی کے واقعات جن کی شہادتیں اب تک موجود ہیں بالکل دب کر رہ گئیں، اس قسم کے ایک واقعہ پر سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آج ہندو بھائیوں کی سیاسی اور تاریخی دنیا میں عالم گیر سے بڑھ کر کوئی بادشاہ برا نہیں، مگر دیکھو کہ آج کتنے ہندو مندر ایسے ہیں جو اس بت خانہ شکن بادشاہ کی فیاضی کی بدولت آباد ہیں، ابھی اخباروں میں یہ تازہ خبر ہے کہ بسمت نگر پربھنی (دکن) کے ایک بڑے مندر کے مہنت کے پاس عالم گیر کی دی ہوئی ایک قیمتی پگڑی تھی، جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے اور جس کی مالیت کا اندازہ پندرہ ہزار تھا، یہ پگڑی سال میں ایک مرتبہ درشن کے لیے یاترا کے موقع پر مندر میں ایک مرصع تخت پر رکھ دی جاتی تھی، یہ پگڑی کئی مہینہ ہوئے چوری ہوگئی، اب پولیس نے اپنی تحقیقات سے چوروں کا پتہ چلا لیا ہے، پگڑی کے ساتھ بادشاہ کی دی ہوئی سندیں بھی ہیں۔

واقعہ اپنی نوعیت کا معمولی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جو یورپ کے سیاسی تعلیمی پروپگنڈے سے متاثر نہیں ہیں اور جو انگریزی تعلیم کی خاص ذہنیت سے پاک ہیں، ان کی نظر میں شاہ عالم گیر کیسا تھا، اب نہ تو عالم گیر نہ عالم گیری، آج اس کے لیے آپس میں لڑنے سے کچھ حاصل نہیں، اب جو عالم گیر ہندو مسلمان دونوں پر مسلط ہے، اس کی طرف نظریں متوجہ ہونی چاہئیں، پرانے زمانہ میں اگر کوئی مندر ڈھایا گیا تو تاریخ کے سینما میں اس کا منظر آج تک دکھایا جارہا ہے، مگر آج شہید گنج پر شہید گنج شہید ہوتے جارہے ہیں مگر کسی کو خبر تک نہیں ہوتی:

خرقہ پوشاں ہمگی پست گذشتند و گذشت　　　قصہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

ہندی اتھوا ہندوستانی: ہندی کے پرجوش حامیوں نے ہندی کو ملک کی عام اور مشترک زبان بنانے کے لیے ایک مجلس قائم کی تھی، جون ۱۹۳۶ء میں ناگ پور میں اس کا اجلاس ہوا، جس میں ہندو اہل قلم اور اہل سیاست دونوں شریک ہوئے، اس میں ہندی کی ایک نئی تشریح کی گئی اور اس کے لیے ہندی ''اتھوا ہندوستانی'' کی اصطلاح وضع کی گئی اور طے پایا کہ ہندوستان کی مشترک زبان یہی ہندی اتھوا ہندوستانی ہے، اس طرح ہندوستانی کی آڑ میں اردو کو ختم کرنے کا سامان کیا گیا، سید صاحب کی دوربین نگاہ نے اس پیش آنے والی چال کو بہت پہلے سے سمجھ لیا تھا اور انہوں نے اس کی مستقل تحریک شروع کردی تھی کہ اردو کا اصلی، صحیح اور پرانا نام ہندوستانی ہے، اس لیے اس کو اسی نام سے پکارا جائے، ہندی اتھوا ہندوستانی نے اس حقیقت کو بالکل ظاہر کردیا، اس لیے اردو کے تمام حامیوں نے اس کی مخالفت کی، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے بھی جو اجلاس میں شریک تھے، اس کی پرزور مخالفت کی، سید صاحب نے معارف جولائی ۱۹۳۶ء کے شذرات میں لکھا کہ:

''آج تک اس زبان کے جس کو غلطی سے اردو کہا جاتا ہے، دو نام تھے، ایک ہندی دوسرا ہندوستانی، پہلا نام تو مدت ہوئی کہ ناگری خط میں لکھی جانے والی بھاشا کا مشہور کیا گیا اور اس کو یہ شہرت دی گئی کہ امتیاز کرنے کے لیے دوسری زبان کا نام اردو رکھنا پڑا اور کبھی کبھی اس کو ہندوستانی بھی کہا جانے لگا اور خیال تھا کہ آہستہ آہستہ یہ نام پھیل کر اردو کے غلط نام کو مٹا دے گا، مگر ہندو مدبر یہ جانتے ہیں کہ نام میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اردو ہندوستانی بن کر ملک کی عام زبان ہونے کی سیکڑوں دلیلوں کی ایک دلیل ہوگی، اس لیے ناگ پور میں ہندی یا ہندوستانی کی عجیب وغریب تشریح سے ایک ہی حملہ میں دونوں پر قبضہ جما لیا گیا۔

ہم نے ہندی کے حامیوں کی اس چال کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا اور آج سے چند سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مقالہ کے ضمن میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم اپنی اس زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کے نام سے یاد کریں، اس تحریک پر عمل بھی شروع کردیا گیا تھا، گو بعض

ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن غور سے دیکھیے کہ ہندو اہل نظر ہماری اس تحریک پر کتنے چوکنے ہوئے، ان کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ وہ اپنی بھاشا کے لیے ہندی کے ساتھ ہندوستانی کا لقب بھی فوراً اختیار کرلیں۔

مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو نے جو اس کانفرنس میں شریک تھے، اس کانفرنس کی روداد پر اخباروں میں بہت اچھا تبصرہ کیا ہے، درحقیقت بات وہی ہے، جو پروفیسر مجیب جامعہ ملیہ دہلی نے خط بنام گاندھی جی میں لکھی ہے کہ ہندوستان کی عام زبان بننے والی زبان کا معیار رواج ہو نہ کہ ہندی لغت،، یہی بات ہم نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایک یادگاری مجموعہ مضامین میں لکھی تھی۔

ہندی کے حامی اس بات کے درپے ہیں کہ چند سو سال پہلے ہندی کے چند شاعروں نے جس زبان میں شاعری کی، اس کو ملک کی علمی، ادبی اور عام زبان قرار دیں، انصاف یہ ہے کہ آج پشاور سے لے کر کلکتہ جو زبان عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے وہی ملک کی عام زبان قرار دی جائے، مگر ہندی کے حامی ایک بات طے کر چکے ہیں، اب دیکھنا ہے کہ ہندوستانی (اردو) کے حامی کیا طے کرتے ہیں۔

ایک نکتہ ہندوستان کے مسلمانوں کے قابل غور ہے، اس ملک کے ہندوؤں میں خواہ وہ اپنے سیاسی مسلکوں میں کس قدر مختلف ہوں ایک بات قطعی طور سے طے کرلی ہے، وہ یہ کہ ان کا قومی نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو تہذیب و تمدن کا کلچر اور ادب، بلکہ حکومت تک کو دوبارہ قائم کیا جائے اور ہندوستان کو بجا طور پر ''ہندو استھان'' بنایا جائے، اس مقصد پر آریہ سماج اور ستاتن دھرمی، مہاسبھائی اور کانگریسی، جی حضوری اور آزاد ملازم سرکار اور غیر ملازم سب متفق ہیں اور قوم کا ہر فرد اور ہر رکن اپنے اپنے راستہ سے اس منزل مقصود کی طرف برابر بڑھتا چلا جارہا ہے، سوال یہ ہے کہ اس مقابلہ میں مسلمانوں کا قومی نصب العین کیا ہے اور وہ اس کے لیے کیا کررہے ہیں۔''

آل انڈیا اردو کانفرنس علی گڑھ میں شرکت: ناگ پور کے اجلاس کی کارروائی کے

بعد اردو والوں کو بھی ہوش آیا، مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو نے اردو کے تحفظ اور ترقی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ۲۴، ۲۵ / اکتوبر کو علی گڑھ میں ایک آل انڈیا اردو کانفرنس کی، راجہ صاحب محمود آباد اس کے صدر اور ڈاکٹر ضیاالدین[1] صدر استقبالیہ تھے، اس کانفرنس میں بنگال، بہار، مدراس، پنجاب اور صوبہ متحدہ کے بہت سے اہل ادب اور اہل الرائے شریک تھے، سید صاحب نے بھی اس کانفرنس میں شرکت فرمائی تھی اور اس کی روداد نومبر ۳۶ء کے معارف میں تحریر کی ہے:

''اس کانفرنس کے دو اجلاس ہوئے، پہلے اجلاس کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے کی تھی اور دوسرے کی نواب مہدی یار جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے، اس اجلاس میں حسب ذیل تجویزیں پاس ہوئیں، انجمن ترقی اردو کا مرکز دلی کو قرار دیا جائے، ہندوستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں میں اس کی شاخیں اور ان کے ماتحت ذیلی انجمنیں قائم کی جائیں، اس کی کوشش کی جائے کہ ہر صوبہ کے دفتروں اور سرکاری درس گاہوں میں ہندوستانی کو وہ حیثیت دی جائے جس کی وہ مستحق ہے، دلی میں ہندوستانی کا ایک مکمل اشاعت خانہ قائم کیا جائے، انجمن کی تین کمیٹیاں بنائی گئیں، ایک اصلاح زبان، خط اور رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے، دوسری ادبی انجمن کی تصانیف، تالیف اور تراجم رائے اور مشورے کے لیے، تیسری انجمن کے مطبع اور دارالاشاعت کے متعلق تجاویز پیش کرنے کے لیے۔''

یہ کانفرنس ہر حیثیت سے کامیاب رہی، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی گویا پہلی کانفرنس تھی، نہ اس میں پر جوش تقریریں ہوئیں، نہ ہنگامہ آرا تجویزیں پیش ہوئیں، نہ مجوزین اور موید ین کے ناموں کی نمائش ہوئی نہ تجویزوں کی مخالفت اور ترمیم کا شور بلند ہوا، سکون اور اطمینان خاطر کے ساتھ چند کام کرنے والے جمع ہوئے اور اتحاد و

[1] ڈاکٹر ضیاالدین صاحب اس زمانہ میں بیمار تھے، اس لیے ان کی طرف سے خطبہ استقبالیہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے پڑھا۔

اتفاق واتحاد کے ساتھ سب نے مل کر کچھ تجویزیں پیش اور منظور کیں اور آئندہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کا تہیہ کیا۔

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت اس کی نمائندہ حیثیت تھی، شاید یہ پہلا موقع ہو جب سیاسیات کے پرشور تماشوں کے بغیر کچھ سوچنے اور کام کرنے والے لوگ ملک کے مختلف حصوں سے اکٹھا ہوئے اور ان کی ایسی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی جس کو دیکھ کر ماننا پڑا کہ اہل ملک میں اپنی زبان کی ترقی وتحفظ کا خیال پہلے سے بہت زیادہ ہے، ہمارے لیے یہ بھی تسکین کا باعث تھا کہ جلسہ میں ہندوستانی زبان کے ہندو اہل قلم اور اہل ادب بھی شریک تھے۔

فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت: یہودیوں کی کوشش اور انگریزوں کی تائید وحمایت سے فلسطین کا ایک نقشہ قرار پایا تھا، جس میں عربوں کو فلسطین میں ان کے حقوق سے محروم کر کے یہودیوں کو ہمیشہ کے لیے ان پر مسلط کردیا گیا تھا، اس سے قدرتاً پوری دنیائے اسلام میں برہمی تھی، ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑا جوش وخروش تھا، اس کے احتجاج کے لیے...... مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا شوکت علی مرحوم نے نومبر ۳۶ء میں دلی میں ایک کانفرنس کی اور سید صاحب کو باصرار اس کا صدر بنایا، آپ نے اس کانفرنس میں ایسا فاضلانہ خطبہ پڑھا جو پوری عرب دنیا میں بہت پسند کیا گیا اور مصر وشام کے اخبارات نے اس کا عربی ترجمہ چھاپا، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی امین الحسینی نے خاص طور سے بذریعہ تار اس کا شکریہ ادا کیا۔

سید سلیمان کی قرآنی غلطیاں: سید صاحب کے بعض مخالفین کی سازش سے دلی کے ایک صاحب نے سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں سید صاحب کی تصانیف سے اپنے گمان میں ان کی گیارہ غلطیاں دکھائی تھیں اور یہ الزام لگایا تھا کہ ان غلطیوں سے الحاد کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، اس رسالہ پر مولانا اشرف علی تھانویؒ اور بعض دوسرے علما سے تقریظیں لکھوائی تھیں، فلسطین کانفرنس کے موقع پر یہ رسالہ سید صاحب کو دیا گیا، انہوں نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں اس کا جواب دیا، اس سے کوہ

کندن وکاہ برآوردن کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، اس لیے اس کو نقل کیا جاتا ہے:

''اتنی کاوشوں کے بعد جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ میرے گیارہ اغلاط میں سے دو تو چھاپے کی غلطیاں ہیں جن میں سے ایک کا اعلان حافظ اسلم صاحب جیراج پوری کی تنقید کے جواب میں دو سال ہوئے اسی معارف میں کیا جا چکا ہے کہ میں نے قط کا ترجمہ چھٹی نہیں چٹھی کیا ہے، اور دوسری یہ کہ ''عربوں کی جہاز رانی'' میں ایک کے بجائے ہر ایک پڑھا جائے، جیسا کہ نفس آیت کے ترجمہ میں ہے، ارض القرآن میں دو اور خطبات میں جس ایک اہم غلطی پر صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں وہ معترض کی قلت تدبر کا نتیجہ ہیں، باقی چھ غلطیاں یہ ہیں کہ مباحث برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں میں نے اقوال مفسرین سے الگ ان آیتوں کے محمل سمجھے ہیں یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں وہ برزخ پر چسپاں کی ہیں اور جو پل صراط کے موقع پر لکھی جانی چاہیے تھی، وہ بہشت کے موقع پر لکھ دی ہے، اگر اقوال مفسرین سے اتنا اختلاف بھی الحاد ہے تو مفتی کو تنہا سید سلیمان کے ہی نہیں بڑے بڑے علما کے الحاد کا فتویٰ دینا ہوگا۔

مسئلہ عدم خلود نار پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بنا پر اگر یہ ہنگامہ ہے تو پہلے یہ ہنگامہ حسب روایت مفسرین بعض مشاہیر صحابہؓ، بعض تابعینؒ اور مفسرین خصوصیت کے ساتھ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے خلاف برپا کرنا چاہیے، حافظ ابن قیمؒ نے حادی الارواح اور شفاالعلیل میں پچیس دلیلیں اس پر قائم کی ہیں اور ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اہل سنت کے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، سید سلیمان کا اس کے سوا اور کوئی قصور نہیں کہ اس نے حافظ ابن قیمؒ کے خیالات کی ترجمانی اردو میں کر دی ہے، جن لوگوں کو اس مسلک سے اختلاف ہے ان کو سید سلیمان کے بجائے بعض صحابہؓ، بعض تابعینؒ، بعض مفسرینؒ اور ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے خلاف زور آزمائی کرنی چاہیے۔

بہرحال یہ تو غالب کے مقطع کی ''سخن گسترانہ'' باتیں تھیں، اب میں رسالہ کے اصلی اور نقلی دونوں مصنفوں کو اگر وہ نیک نیت ہیں تو بشارت اور اگر اس سے محروم ہیں تو یہ پرمسرت پیام سناتا ہوں کہ ان قرآنی غلطیوں کی تصحیح کئی سال پہلے دوسرے ایڈیشن میں کر دی گئی ہیں اور کچھ کی اب

کردی گئی اور مسئلہ نار میں جمہور کا مسلک صاحب رسالہ سے زیادہ مدلل، اس میں پہلے ہی اضافہ کر دیا گیا ہے، واستغفراللہ من کل ذنب وسوء عقیدۃ فی الدین[1]۔

ایران میں ''خیام'' کی قدردانی: سید صاحب کی تصنیف ''خیام'' اس پایہ کی ہے کہ یورپ اور ایران دونوں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور ایران کے فضلا نے اس کے فارسی ترجمہ کی فرمائش کی ہے، اس کا ذکر معارف جنوری ۳۷ء کے شذرات میں فرمایا ہے:

''خاک سار کی کتاب ''خیام'' کی قدر یورپ کے مستشرقین اور ایران کے ادیبوں دونوں نے کی اور فرمائش کی گئی کہ اس کا فارسی ترجمہ شائع کیا جائے، اس کے لیے تقاضہ تو ایک سال سے تھا، مگر دوبارہ نظر ثانی اور ترمیم واضافہ کے خیال سے ابھی اس کی تعمیل نہیں کی گئی، گذشتہ رمضان کی فرصت اس ''بادہ خوار'' کے سوانح پر نظر ثانی کی نذر ہوئی جس نے سرخوش ہوکر کہا تھا:

ماہ رمضاں برفت و شوال آمد ہنگام نشاط و عیش و قوال آمد

تصحیح اور اضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جارہا ہے، امید ہے کہ جلد اس کا ترجمہ بلخ اور شاپور تک پہنچ جائے جن کو صاحب سوانح اپنے قافلہ عمر کا گذرگاہ سمجھتا تھا[2]۔''

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت: ۱۹۳۶ء کے آخری اور ۱۹۳۷ء کے ابتدائی مہینوں میں لکھنؤ میں ایک آل انڈیا نمائش ہوئی تھی، جس کا سلسلہ کئی مہینہ تک جاری رہا تھا، نمائش کی اہمیت کی بنا پر ہندوستانی اکیڈمی نے نمائش میں اپنا جلسہ منعقد کیا تھا، اس کے شعبہ اردو یا اردو کانفرنس کی صدارت سید صاحب نے فرمائی اور ایک پرمغز خطبہ پڑھا جس میں اجلاس لکھنؤ کی مناسبت سے لکھنؤ کے علمی وادبی اور لسانی خدمات کا پورا جائزہ لیا اور اردو کی توسیع وترقی اور اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لیے بڑے مفید مشورے

---

[1] مصنف قرآنی غلطیاں نے معارف کی اس تحریر پر ازالہ حیثیت عرفی کے دعویٰ کا نوٹس دے دیا تھا، سید صاحب کی جانب سے بھی اسی قسم کا نوٹس دیا جانے والا تھا اور معاملہ بہت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا مگر کچھ بااثر لوگوں نے درمیان میں معاملہ ختم کرادیا۔ [2] یہ ترجمہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔

دیے[1]، مگر اسی کے ساتھ دونوں زبانوں کے ادیبوں سے آپس کی بیگانگی کا یہ شکوہ بھی تھا کہ:

ہندی کے اور اردو کے آسان لکھے اور بولے جانے پر سر تیج بہادر سپرو اور صدر اردو کانفرنس (یعنی خود سید صاحب) اور بہت سے مقرروں نے زور دیا لیکن ہر ایک کی تقریر کا توڑ اس پر تھا کہ جب تک ہندو مسلمانوں کے دل نہیں ملیں گے زبان ایک نہیں ہوسکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ دل کیوں کر ملیں، پالیٹکس میں ان کی علاحدگی تو کھلی ہوئی ہے لیکن انتہا یہ ہے کہ جس ادبی کانفرنس کے ذریعہ ہم ان کو ایک کرنا چاہتے ہیں اس میں بھی دونوں مل کر نہیں بیٹھتے، اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب یہاں جمع تھے، مگر دونوں دو خیموں میں تھے، ایک نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، ایک دوسرے کی سننا اور سمجھنا تو بعد کی چیز ہے، کیا یہ حد درجہ افسوس ناک نہیں۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی: مارچ ۳۷ء کے آخری ہفتہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی ہوئی، اس **کے شعبہ علوم وفنون اسلامی کی صدارت:** سلسلہ میں کانفرنس کے مختلف شعبوں کے الگ الگ اجلاس مختلف اہل علم کی صدارت میں ہوئے، شعبہ علوم وفنون اسلامی کی صدارت سید صاحب نے فرمائی، اس میں انہوں نے جو فاضلانہ خطبہ پڑھا، وہ اسلامی علوم وفنون کے عروج وزوال کی تاریخ پر ایک جامع تبصرہ ہے، اس کے تمام اہم پہلوؤں پر مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے اور اسلامی علوم کی خدمت میں دوسرے اسلامی ملکوں کے ساتھ ہندوستان کا حصہ بھی دکھایا ہے اور اس وقت یورپ اور اسلامی ملکوں میں جو کام ہو رہا ہے، اس کا بھی ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں بہت سے مفید علمی معلومات آگئے ہیں اور اس خطبہ سے اسلامی علوم وفنون کی مختصر اجمالی تاریخ سامنے آجاتی ہے[2]۔

خطبہ صدارت کے علاوہ شعبہ علوم وفنون اسلامی میں "عرب وامریکہ"[3] کے عنوان

---

[1] یہ خطبہ فروری ۱۹۳۷ء کے معارف میں شائع ہوا تھا۔ [2] یہ خطبہ جون اور جولائی ۱۹۳۷ء کے معارف اور نقوش سلیمانی میں چھپ چکا ہے۔ [3] یہ مضمون بھی معارف میں چھپ چکا ہے۔

سے ایک محققانہ مقالہ پڑھا جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کولمبس سے بہت پہلے عرب جہاز راں امریکہ پہنچ چکے تھے، شعبہ اردو میں ہماری زبان کا نام کے عنوان سے ایک تقریر کی جس میں پورے دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کی عام مشترک زبان کا موزوں نام ہندوستانی ہے، جو اس کے پرانے ناموں سے ایک نام ہے، یہ تقریر رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی تھی۔

اپریل ۱۹۳۷ء کے معارف میں جوبلی کی روداد میں بہت سی مفید باتیں ہیں اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"مارچ کا آخری ہفتہ ہماری تعلیمی کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا تھا، ۲۶ر سے لے کر ۲۹ر تک دن رات کانفرنس کے کئی کئی شعبوں کے اجلاس ہوتے رہے، اس میں سے شعبہ تعلیم ابتدائی، شعبہ تعلیم ثانوی، شعبہ تعلیم اعلیٰ، شبینہ مدارس اسلامیہ، شعبہ علوم وفنون اسلامی، شعبہ اردو، شعبہ اقتصادیات کے الگ الگ جلسے الگ الگ صدرنشینوں کے زیر صدارت مختلف تاریخوں میں ہوئے، جہاں تک عالمانہ مقالوں، فاضلانہ خطبوں کا تعلق ہے کانفرنس کا یہ اجلاس بے حد کامیاب رہا، اگر اہل کانفرنس ان مقالوں اور خطبوں کا ایک مجموعہ جلد از جلد شائع کرسکیں تو قوم کے ہاتھوں میں وہ ایک آئینہ دے دیں گے جس سے اس کو اپنے چہرے کا ہر خط وخال نمایاں نظر آجائے گا، کانفرنس کی سب سے پہلی اور سب سے اہم تجویز مسلم یونیورسٹی میں ایک صنعتی کالج کے قیام کی تھی، جس کے لیے قوم سے تیس لاکھ کا مطالبہ کیا گیا، مگر مجوز صاحب کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ نہ وہ یہ صنعتی کالج قائم کرنا چاہتے ہیں اور نہ سنجیدہ طور سے انہوں نے اس کو پیش کیا، بلکہ مقصود یا تو چندہ تھا یا قوم کے مطالبہ دفع الوقتی، اس لیے یہ تجویز سنادی گئی، اس کے عملی طریقوں اور شکلوں پر گفتگو نہیں ہوئی۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے بدیر رواج پانے اور نئی تعلیم میں پیچھے رہ جانے کا حقیقی سبب مدتوں تک یہ بتایا جارہا ہے کہ علمائے کرام نے اس کی سخت مخالفت کی تھی لیکن چند سال کے بعد جب مسلمان صنعتی تعلیم میں پیچھے رہ جائیں گے تو معلوم نہیں اس کا الزام کس کے سر دھرا جائے گا،

کیوں کہ علمائے کرام نے صنعتی تعلیم کے کسی شعبہ کو ابھی تک حرام نہیں قرار دیا ہے، بااین ہمہ سرکاری منصب کے خواہش مندوں کی جماعت میں ابھی تک ادھر توجہ نہیں کی جارہی ہے۔

زمانہ روز بروز یہ ثابت کررہا ہے کہ کسی قوم کی ترقی کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس میں کتنے جج، کتنے ڈپٹی کلکٹر، کسی انسپکٹر اور کتنے وکیل ہیں، یہ غلاموں کی ذہنیت تھی اور ہے کہ ہم غلام آپس میں اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم میں سے کتنوں کو بادشاہ کی طرف سے زریں طوق، زریں کمر اور زریں تمغے ملے ہیں، ترقی کا معیار یہ ہے کہ ہم میں کتنے عالم، کتنے محقق، کتنے مجاہد اور کتنے کارفرما پیدا ہوئے ہیں، ہم میں زندگی کی کتنی طاقت پیدا ہوئی ہے اور ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں کتنی چہل پہل اور عملی رونق آئی ہے۔

کانفرنس نے اس سلسلہ میں ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے پچھلے پچاس سال کے تعلیمی کاروبار اور آگے کے کاروبار پر اہل فکر سے مبسوط و مدلل مضمون لکھوائے ہیں، ان میں سے بعض بعض مضمون اچھے ہیں اور اس قابل ہیں کہ اس روشنی میں آگے کا پروگرام طے کرسکیں۔

ہم کو مسلمانوں کی زندگی کی ہر روش میں یہ نظر آرہا ہے کہ ان میں اور ان کے رہنماؤں میں زمانہ کے اثرات کا بعد بڑھتا جاتا ہے، قوم کے نوجوان کہیں اور جارہے ہیں اور ان کے بوڑھے رہنما کہیں اور جانا چاہتے ہیں، دونوں کے ذوق، میلان اور منزل مقصود کے تخیل میں اتنا فرق پیدا ہوگیا ہے کہ دونوں کا ہم سفر رہنا سخت مشکل بلکہ محال ہوتا جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ نوجوان اپنے اکثر رہنماؤں کے ساتھ عقیدت اور ان کی اطاعت چھوڑ رہے ہیں اور رہنما اپنی قوت کھو رہے ہیں، اب موقع ہے کہ روشن ضمیر آگے بڑھیں اور نوجوانوں کی رہنمائی کا صحیح فرض انجام دیں۔“

اسلامیہ اسکول اٹاوہ کا معائنہ: بہت دنوں سے دل چاہتا تھا کہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ کو جس کی تعریف اکثر کانوں سے سنا کرتے تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھیں، علی گڑھ سے واپسی میں ۳ر مارچ کو اٹاوہ اترے، اسکول کو دیکھا، اس کے تینوں بورڈنگ دیکھے، اس کا کتب خانہ اور تاریخی نمائش خانہ دیکھا، وہاں کے استادوں سے ملنا ہوا، لڑکوں کا رہنا سہنا

دیکھا، خوشی ہوئی کہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا، مولوی بشیر الدین صاحب جیسے انتھک کام کے دھنی اور مولوی سید الطاف حسین صاحب جیسے نیک سادہ اور محنتی ہیڈ ماسٹر اگر ہمارے دو چار اسلامی ملکوں کو بھی مل جاتے تو ہمارے تعلیمی درماندگی بہت کچھ کم ہو جاتی۔

راجندر عبد الحق پیکٹ: ہندوستان کی آئندہ مشترک زبان کے بارہ میں اردو اور ہندی والوں میں جو نزاع چلی آرہی تھی، اس پر غور اور اس کے حل کے لیے اگست ۱۹۳۷ء میں پٹنہ میں انجمن ترقی اردو بہار کا ایک جلسہ ہوا، اس میں انجمن ترقی اردو، مسلم یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جامع ملیہ اور ہندی کی بعض انجمنوں کے نمائندے شریک ہوئے، دارالمصنفین کی طرف سے سید صاحب نے شرکت فرمائی، اس جلسہ میں اردو اور ہندی والوں کے درمیان ہندوستانی پر سمجھوتہ ہوا جو راجندر (بابو راجندر پرشاد صدر ساہتیہ سمیلن) عبد الحق (مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو) پیکٹ کے نام سے موسوم ہے، اس سمجھوتہ کا متن یہ ہے:

''ہمیں اتفاق ہے کہ ہندوستانی زبان ہندوستان کی مشترک زبان ہونی چاہیے اور اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیے اور دونوں رسم الخط تمام سرکاری اور تعلیمی مقاصد کے لیے تسلیم کر لینے چاہیے، ہندوستانی سے مراد ہماری وہ زبان ہے جس میں زیادہ سے زیادہ الفاظ اس زبان کے لیے جائیں جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی ہے، اس زبان میں الفاظ کا انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ ان کا عام بول چال میں کس طرح رواج ہے، ہماری یہ بھی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بحیثیت ادبی زبان کے پوری پوری ترقی کا موقع دینا چاہیے، ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ ہندی اور اردو کے ادیبوں کے اعانت سے ہندوستانی زبان کے بنیادی الفاظ کا ایک لغت تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس قسم کے لغات کی تدوین کے لیے عملی تجاویز اختیار کرنے اور دوسرے اہم مسائل مثلاً اصطلاحات علمیہ کے انتخاب کے لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی نمائندہ کمیٹی بنائی جائے جس میں اردو اور ہندی دونوں کے با اثر رکن شریک ہوں اور جو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قابل ہوں اور اس

طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں زیادہ خوش گواری پیدا ہو جائے۔

کانگریس ہائی کمانڈ نے بھی اس معاہدہ کی تصدیق کر دی اور متفقہ طور سے ہندوستانی ہندوستان کی مشترک زبان قرار پائی۔"

ہندوستانی یا آسان اردو لکھنے کی ترغیب: اس زمانہ میں ڈاکٹر تارا چند سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی کی حمایت میں انگریزی میں محققانہ مضامین لکھے، جس میں اردو اور ہندی کے بارہ میں فریقین کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، صوبہ متحدہ کی اسمبلی میں بھی اس مسئلہ پر تقریریں ہوئیں، سید صاحب شروع سے ہندوستانی یعنی آسان اردو کی حمایت میں تھے، اس کے لیے فضا سازگار دیکھ کر اردو کے اصحاب قلم کو مشورہ دیا کہ:

"ہماری زبان کے نومشق اخبار نویسوں اور مضمون نگاروں میں اپنی قابلیت کی دھاک بٹھانے کے لیے عربی اور فارسی کے موٹے موٹے لفظوں کا شوق ترقی پر ہے۔

ان میں بعض بعض تو ایسے ہیں جو ان لفظوں کے صحیح معنی بھی نہیں جانتے، آپ سن کر ہنسیں گے کہ دلی کے ایک عربی کے عالم ایڈیٹر نے ایک زندہ انسان کی حد سے بڑھ کر تعریف کرتے کرتے فقید الشرق لکھ دیا اور یہ سمجھے کہ مبالغہ کی حد کر دی اور شاید معنی یہ سمجھے کہ مشرق کی زمین میں اس کی مثال نہیں، مگر اس غریب کو معلوم نہیں کہ یہ کسی زندہ کی تعریف میں نہیں بلکہ مردہ کی تعریف میں استعمال کیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو مشرق کے ہاتھ سے جاتا رہا، کئی سال ہوئے کہ دو عربی کے عالم ایڈیٹروں میں "جالیہ" لفظ کے ہندوستانی ترجمہ پر دو دو باتیں اخبار میں پڑھی تھیں، حالاں کہ ان دونوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کے نئے معنی نو آباد کے ہیں، یعنی جو لوگ اپنا اصلی وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسیں۔

ابھی حال کے اخباروں میں مصر کے شاہ فاروق کی ملکہ فریدہ خانم کے بے پردہ نکلنے کا ذکر آ رہا تھا، اس خبر کی سرخی یہ لکھی جاتی رہی کہ ملکہ فریدہ نقاب بردوش رہیں گی، نقاب برداشتہ شاید

آج فارسی میں بھی نہ بولتے ہوں، کیا اس کو ہم اپنی زبان میں یوں نہیں کہہ سکتے کہ ملکہ فریدہ پردہ نہیں کریں گی یا فریدہ بے نقاب رہیں گی۔

عربی اخباروں کے ذریعہ نئی باتوں کے لیے نئے عربی لفظ بڑی آسانی سے ہم اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ اپنے دماغ پر اپنی زبان کے لیے نئے لفظ بنانے کے لیے زور ڈالنا نہیں چاہتے، آج کل فلسطین کے لگاؤ سے انتداب فلسطین بے تکلف ہمارے اخبار لکھ رہے ہیں، مگر ان کو کیا معلوم کہ ہندو تو ہندو اچھے خاصے مسلمان بھی اس لفظ کے معنی نہیں جانتے، ہمارے یہاں سید جالب مرحوم نے حکم برداری کا لفظ اس کے لیے چلایا تھا اور وہ چل نکلا تھا کہ انتداب نے آ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

آج ہماری زبان کا بناؤ بگاڑ ہمارے اہل قلم اور ان میں بھی سب سے زیادہ ہمارے اخباروں کے ایڈیٹروں کے ہاتھوں میں ہے، وہ اپنے روزانہ اور ہفتہ وار لٹریچر کے ذریعہ بہتوں کو بنا یا بگاڑ سکتے ہیں، وہ زبان کی مملکت کے بادشاہ ہیں، ان کے بننے سے سب بن سکتے ہیں اور ان کے بگڑنے سے سب بگڑ سکتے ہیں، یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد کسی پر اعتراض نہیں ہے بلکہ ایک عام غلط رجحان کے خلاف دوستوں کو یاددہانی ہے۔

ہمارے اخبار نویسوں کا ایک عام رجحان یہ ہے کہ جب وہ انشا پردازی کا زور اور کسی مقصد کی اہمیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو موٹے موٹے لفظوں کی ہیئت اور بڑی بڑی ترکیبوں کی عظمت سے ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ انشا پردازی کا کمال ان میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے مطلب کو خوب صورتی کے ساتھ کتنے وسیع رقبہ تک پہنچا اور کتنی بڑی تعداد کو سمجھا سکتے ہیں، ہمارے اخباروں کی سرخیاں اکثر ایسی ہوتی ہیں جن کے معنی قاموس اور برہان قاطع دیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتے، مندوبین، زعیم بطلِ حریت، قہرمان سیاست، سیاس، صحافی، معدنی، زغال، حزب العمال کو کتنے اردو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اخبار نویسوں کی زبان کا بہترین نمونہ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور مسلم گزٹ لکھنؤ) اور سید جالب دہلوی مرحوم (ایڈیٹر ہمدم لکھنؤ) کی

تحریریں ہیں، ان لوگوں نے بہت سے نئے لفظ بنائے اور چلائے، نمائندہ کا لفظ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کا چلایا ہوا ہے، اور وہ چل گیا، کھرا سکہ وہی ہے جو بازار میں چل جائے، کھوٹے سکوں سے کسی خزانہ کی دولت نہیں بڑھ سکتی۔

مقصد یہ ہے کہ اگر ہمارے اخباروں کو اپنے سیاسی و اصلاحی خیالات عوام تک پہنچانا ہے اور معمولی حرف پہچاننے والوں کو بھی اخبار پڑھنے کی عادت ڈلوانا ہے تو ضروری ہے کہ وہ سطح سے نیچے اتریں اور قابلیت کے اظہار سے زیادہ فائدہ کا خیال رکھیں۔" (معارف اکتوبر ۱۹۳۷ء)

اسی زمانہ میں "ہماری زبان بیسویں صدی میں" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ لکھا، جس میں انیسویں صدی کے آخر بیسویں صدی کے ربع اول تقریباً نصف صدی کی اردو کی ترقی کی اجمالی سرگذشت تحریر کی گئی ہے، یہ مقالہ نومبر دسمبر ۳۷ء کے معارف کے دو نمبروں میں شائع ہوا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان مؤرخین کی ایک غلطی اور اس کی تلافی کی صورت: دارالمصنفین میں تاریخ ہند کا کام شروع ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں جو پہلو نگاہ کے سامنے آتے تھے، ان کو معارف میں لکھتے رہتے تھے، ہندوستان کی پرانی تاریخوں کی ایک خامی کی تلافی اور اصلاح کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تاریخ مختلف زبانوں میں تاریخ دانوں نے جو لکھی وہ حقیقت میں مسلمانوں کی نہیں بلکہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ ہے، یہی سبب ہے کہ اس تاریخ سے مسلمانوں کے علوم و فنون اور تمدن و معاشرت کے حالات کا پتہ چلانا نہایت ہی مشکل ہے، اہل علم اور اہل کمال کے سوانح بہت ہی کم لکھے گئے ہیں، اس لیے اس ملک کے مسلمانوں کی علمی اور تمدنی تاریخ کی ترتیب اور بھی مشکل ہے، ہماری تاریخ کی اس روشنی میں وہی ذرے چمک سکے جو بادشاہوں کے دامن دولت سے لپٹے رہے۔

اسی طرح ہماری تاریخ کے کچھ اور اوراق بھی ہیں جو پرانی عمارتوں اور قبروں پر نقش

ہیں لیکن اب جب کہ ہماری بڑی بڑی عمارتیں پرانی ہو کر زمین کے برابر ہو رہی ہیں، ان کے پتھر اور نقش کے کتبے جو ہماری تاریخ کے ورق ہیں ایک ایک کر کے کھوتے چلے جاتے ہیں اور ہم کو احساس تک نہیں ہو رہا ہے، دوسری قومیں آج زمین کے طبقوں کو الٹ الٹ کر اپنے بزرگوں کی نشانیاں نکال رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ان نشانیوں کو بھی بچا کر نہیں رکھ سکتے، جو ابھی تک خدا کے فضل سے زمین کے نیچے دفن نہیں ہو گئی ہیں۔

سندھ میں عربوں کی تین سو برس تک حکومت رہی لیکن کیا عجیب بات ہے کہ اس زمانہ (۹۲ھ تا ۴۰۰ھ) تک کی ایک یادگار کا بھی پتہ ہم کو نہیں لگ سکا، اسی لیے اس زمانہ کی تاریخ کے کھوئے ہوئے ورق اب کسی طرح نہیں ملتے، حالاں کہ اسی سرزمین کے طبقوں کو کھود کر ہمارا محکمہ آثار قدیمہ مسیح سے سیکڑوں برس پہلے کی تہذیب کا پتہ لگا رہا ہے، سندھ کا گزیٹر اس بارہ میں ہر صوبہ کے گزیٹر سے زیادہ ناقص ہے۔

دار المصنّفین میں تاریخ ہند کی پہلی جلد سندھ کی تاریخ لکھوائی گئی، اس کے لیے بہت چاہا کہ محکمہ آثار کی کوششوں سے اگر کچھ پرانے معلومات مل جائیں تو تاریخ کے یہ سادہ ورق بھر دیے جائیں مگر ہم کو اس میں ذرا کامیابی نہیں ہوئی، ضرورت ہے کہ آثار قدیمہ کا محکمہ ادھر توجہ کرے اور اب بھی عربی اور فارسی کی جو یادگاریں اور تاریخی کتبوں کے جو پتھر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں ان کو تلف ہونے سے بچایا جائے اور ان کے کتبوں کے فوٹو محفوظ کیے جائیں اور ان کے مضامین کو حل کر کے چھاپا جائے۔

اس سلسلہ میں لاہور کے معارف اسلامیہ کا ادارہ جو کچھ کر رہا ہے وہ ہماری قدر کا مستحق ہے، اس کے لائق صدر پرنسپل محمد شفیع صاحب نے خود تکلیف اٹھا کر سندھ کی بعض بعض پرانی آبادیوں اور ویران کھنڈروں کو جا کر دیکھا اور جہاں تک بن سکا، ان کے کتبوں کے چربے اتارے اور ان کے فوٹو اورینٹل کالج کے رسالے میں چھاپے، مولوی عبداللہ صاحب چغتائی کو ادارہ نے اخراجات دے کر مغربی ہند بھیجا، وہ وہاں سے سو سے زیادہ ایسے کتبوں کے چربے اتار کر لائے جو اب تک چھپے نہیں تھے، ان سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے تاریخی خزانہ کے کتنے جواہر ابھی تک ہمارے التفات

کے منتظر ہیں۔" (معارف نومبر ۱۹۳۷ء)

جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت: وانمباڑی علاقہ مدراس کے قریب عمرآباد میں سیٹھ عمر مرحوم کا ایک مدرسہ دارالسلام ندوہ کے طرز پر قائم کیا گیا ہے، اس کا نصاب اور طرز تعلیم سب ندوہ کا مثنی ہے، اس کے اساتذہ میں حنفی، اہل حدیث ہر مسلک کے علما ہیں جو مل جل کر کام کرتے ہیں، اس مدرسہ کی یہ خصوصیت اب بھی قائم ہے، نومبر ۳۷ء میں منتظمین مدرسہ نے حضرت سید صاحب کو مدرسہ کے جلسہ تقسیم اسناد کا صدر بنایا، اس جلسہ میں مدراس کے علاوہ پنجاب، یو، پی وغیرہ کے بھی علما موجود تھے، اس میں سید صاحب نے مختصر لیکن بڑا جامع خطبہ دیا، جو دینی تعلیم کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کا ترجمان تھا، اس لیے اس کے کچھ اہم حصے نقل کیے جاتے ہیں، آپ نے جامعہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

خطبہ: عزیزو! بظاہر آپ کے طلب علم کا زمانہ ختم ہوگیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے طلب علم کا زمانہ اب شروع ہو رہا ہے، اس سے پہلے جو سال بھی آپ نے علم کی تحصیل میں صرف کیے، اس کا منشا اپنے اندر علم کی استعداد پیدا کرنا اور تحقیق کا سامان فراہم کرنا تھا، آج آپ کو جو سند دی جارہی ہے وہ اس بات کی نہیں ہے کہ آپ کا علم درجہ کمال کو پہنچ گیا جس میں اضافہ کی گنجائش نہیں بلکہ اس بات کی ہے کہ آئندہ حصول کمال اور تحقیق کے معدات آپ میں پیدا ہو گئے ہیں جن سے اگر آپ کام لیں تو منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم میں اتنی پستی آگئی ہے کہ طالب علمی میں جو کچھ پڑھ لیتے ہیں اس کو منتہی جانتے ہیں، ایک سچے عالم کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر طالب علم ہی رہتا ہے، اس کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نئی چیز کی واقفیت اور کسی نیکی کی خدمت میں بسر ہونا چاہیے، مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم میں سے اکثر طالب علمی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد علم کی ہر کتاب بیچ کر رکھ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ علم کی طلب کی ہر کوشش ختم ہوگئی، آج یہ حال ہے کہ آمد ورفت کی

سہولت اور چھاپے کی آسانی نے ہمارے اسلاف کے دفینوں کو کھود کھود کر برسر بازار لگا دیا ہے، ہر روز ہمارے بزرگوں کی کوئی نہ کوئی قلمی کتاب سامنے آتی ہے اور مشرق و مغرب کے مشتاق اس کو ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں لیکن جو گروہ اس تحفہ کا سب سے زیادہ مستحق ہوسکتا تھا وہی اپنے تغافل اور سست کاری سے اعراض برت رہا ہے۔

ہمارے درس کا یہ حال ہو رہا ہے کہ متون کی شروح اور حاشیے اور پھر ان سے متعلق شروح و تعلیقات میں وقت کا بڑا حصہ برباد ہو رہا ہے، علوم دین جو مقصود بالذات تھے، پیچھے ہو رہے ہیں، فلسفہ یونان جو ہمارے بزرگوں نے دین کی خدمت کے لیے بضرورت زمانہ سیکھا تھا، وہ ہم میں سے کتنوں کا مقصود بن گیا ہے اور اصل کتاب و سنت کی تعلیم کا ذوق کم ہو گیا ہے، علوم عقلیہ کی تعلیم کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ علوم دین کی خدمت میں کام آئے، نہ یہ کہ وہ اصل مقصد قرار پائے، زمانہ سابق میں ان علوم عقلیہ کو ہم نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اس زمانہ کے لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح چھا گئے تھے کہ ان کے واسطے کے بغیر علوم دین کی خدمت نہیں ہوسکتی تھی، اب جب زمانہ کا ماحول بدل گیا، یونانی علوم کی تحقیقات تقویم پارینہ بن گئیں اور لوگوں کے ذہنوں سے ان کا تسلط جاتا رہا تو ان علوم کے ذریعہ سے اس زمانہ میں علوم دین کی خدمت کا خیال بے سود ہے، اب جو علوم عقلیہ عوام کے ذہنوں پر چھائے ہیں اور جس قسم کے دلائل کی قوت کے آگے وہ سر جھکاتے ہیں، ان ہی کو اس زمانہ میں علوم دین کی خدمت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے، ہم کو خوشی ہے کہ آپ نے ایسی درس گاہ میں تعلیم پائی ہے جس کی نظر سے یہ نکتہ چھپا نہیں اور کچھ نہ کچھ اس راہ میں آپ نے قدم اٹھایا ہے، امید ہے کہ آئندہ اور بھی ضروری علوم اس میں داخل ہوں گے اور خود آپ بھی کوشش کریں گے کہ نئے علوم کی کتابوں کو جو آپ کی زبان میں بہت حد تک چھپ چکی ہیں، مطالعہ کریں تاکہ نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کو آپ سدھار سکیں اور دین کی سچائیوں کو ان کی عقل کے مطابق سمجھا کر ان کی تسلی کرسکیں۔

عزیزو! آج زمانہ کے خیالات اور دنیا کے واقعات میں اس تیزی کے ساتھ تبدیلی ہو رہی ہے کہ ان کے جانے اور سمجھے بغیر آپ مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے، دنیا میں سیاسی اور اقتصادی خیالات ایسے چھائے ہوئے ہیں اور انقلاب کی گھڑیاں اس طرح پے در پے آ رہی ہیں اور گزر رہی ہیں کہ ایک عالم دین کے لیے جس کو مسلمانوں کا خدمت گزار ہونا ہے، ان کو سمجھنا اور ان کے حل کی تدبیر سوچنا ضروری ہے، صرف اعراض اور تغافل سے ان دقتوں کو آپ حل نہیں کر سکتے، صرف آپ کے توجہ نہ کرنے سے نہ دنیا اپنے قاعدہ کو بدل سکتی ہے اور نہ زمانہ اپنے رخ کو پلٹ دے سکتا ہے، مشکلات کا مقابلہ کرنا اور موجودہ جد و جہد میں مناسب حصہ لینا اور ملک وقوم کی زندگی میں مسلمانوں کے مناسب مقام حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک عالم دین کا فرض ہے۔

اسلام وہ مذہب ہے کہ جس دن وہ دین بنا اسی دن وہ سیاست بھی تھا، اس کا منبر، اس کا تخت، اس کی مسجد، اس کی عدالت، اس کی توحید نمرودوں، فرعونوں، قیصروں اور کسراؤں کی شہنشاہیوں کے مٹانے کا پیغام تھی، صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کی پوری زندگیاں ان مرقعوں سے بھری ہوئی ہیں اور وہی اسلام کی سچی تصویریں ہیں اور جب تک علما علما رہے وہی ان کا اسوہ تھا، آج جب ہم پھر نئے سرے سے اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں اور پچھلی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم اسی نقش قدم پر چلیں جو ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

آج کل ہمارے علما کا کام صرف پڑھنا پڑھانا، مسئلہ بتانا اور فتویٰ لکھنا سمجھا جاتا ہے لیکن اب وقت ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے پچھلے سبق کو پھر دہرائیں اور دیکھیں کہ ان کا کام صرف علم ونظر تک محدود نہیں بلکہ سعی وعمل اور جد وجہد اور علمی خدمت بھی ان کے منصب کا بہت بڑا فرض ہے، ہر آبادی میں جہاں وہ رہیں وہ ان کی سعی وخدمت سے آباد رہے، وہاں کے جاہلوں کو پڑھانا، وہاں کے نادانوں کو سمجھانا، وہاں کے غریبوں کی مدد کرنا، وہاں

کی ضرورتوں کو پورا کرنا، وہاں کے امیروں کو حق کا پیغام سنانا، وہاں کے معذوروں کی خدمت کرنا، وہاں کے بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنا، ان کو دنیا کی ضرورتوں سے باخبر کرنا، ضرورت کے ہر موقع پر آگے بڑھنا اور اپنے علم و عمل کی ہر کوشش سے ان کو فائدہ پہنچانا ایک عالم دین کے فرائض ہیں۔

یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کو اپنے دین کی باتوں سے واقفیت کے لیے بہت بڑے علم و فضل کی ضرورت نہیں، عقیدہ اور عبادات اور دوسری مذہبی نیکیوں کے لیے دین کا معمولی علم کافی ہے، یعنی مسلمان کو بجائے خود بڑا عالم ہونا ضروری نہیں لیکن اس سے ایک منٹ کے لیے بھی پہلوتہی نہیں کی جا سکتی کہ ان کو اپنی دینی و دنیاوی بھلائی کے لیے ہر وقت عمل کے واسطے کمربستہ ہونا ضروری ہے، آج دنیا لڑائی کا میدان ہے، جو بھی سستی سے اپنی جگہ کھڑا رہے گا وہ گر جائے گا، اسی لیے علمی قوت سے زیادہ آج عملی قوت کی سرگرمی کی ضرورت ہے، علم خیر و شر کی تمیز بتانے کے لیے ضروری ہے لیکن محض خیر و شر کی تمیز سے آپ کامیاب نہیں ہو سکتے، جب تک جو خیر ہے اس کی طلب اور جو شر ہے اس سے پرہیز آپ کا شیوہ نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں میں دنیا کی بہتات تھی، دولت کی کثرت تھی، تجارت کا فروغ تھا، حکومت اور سلطنت ان کے ہاتھوں میں تھی، اس وقت کے علما نے اپنی حکمت ربانی سے یہ صحیح سمجھا کہ مسلمانوں کا دولت میں انہماک کسب زر میں زیادہ مشغولیت اور حکومت و سلطنت میں استغراق ان کے دین کے لیے مضر ہے، اس لیے اس وقت انہوں نے ترک دنیا اور زہد و قناعت کا برمحل وعظ فرمایا لیکن اب جب کہ حالت پلٹ گئی ہے، فقر و فاقہ چھایا ہے، مفلسی ان کے لیے فتنہ کا سامان ہے، دولت ان سے جا چکی ہے، تجارت ان سے رخصت ہو چکی ہے اور سلطنت و حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے واعظ اور ہمارے عالم اپنی تقریروں کا رخ پھیریں اور اپنے مواعظ کا موضوع سخن بدلیں تاکہ مسلمانوں میں زندگی کی روح پیدا ہو اور ان میں زمانہ کے مقابلہ کا حوصلہ آئے اور اپنی محنت اور سعی و

جاں فشانی سے اپنے لیے دنیا میں وہ پوزیشن حاصل کریں جو دنیا کے آخری مذہب کے پیرووں کا حق ہے۔

علمائے عزیز! اب وقت نہیں رہا کہ آپ حجروں میں آرام کریں، خلوتوں میں وقت گزاریں اور اپنی کوششوں کو صرف اپنی ہی نجات تک محدود رکھیں، ضرورت ہے کہ میدان میں نکلیں اور مسلمانوں کی سپہ داری اور سپہ سالاری کا فرض انجام دیں اور اپنے صحیح علم اور صحیح عمل سے ان کی رہ بری کریں، یہ رہ بری صرف چند فقہی مسائل تک محدود نہ رہے بلکہ علم و عمل کی ہر راہ میں آپ ان کے لیے چراغ ثابت ہوں، اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ آپ اپنے ذاتی تزکیہ اور روحانی صفائی کو غیر ضروری سمجھیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے کو بھی بنائیے اور دوسرے کو بھی بنانے کی کوشش کیجیے، ورنہ ظاہر ہے کہ جو خود نہیں بنا وہ اوروں کو کیا بنائے گا اور جو آپ نہیں دیکھ رہا ہے وہ دوسروں کو کیا راہ دکھائے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے علما کو اخلاق میں مقدور بھر اپنے نبی کریمؐ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کا نمونہ بننا چاہیے، ان میں ایثار ہو، ان میں مالی قناعت ہو، ان میں امیروں اور دولت مندوں کی خوشامد اور چاپلوسی سے احتراز ہو، ان کو بلند نظر، بلند ہمت، حق گو اور حق کے اظہار میں بے باک ہونا چاہیے۔

آج ان میں ایسے علما کی بھی ضرورت ہے جو دوسری قوموں کی زبانوں کو پڑھیں اور ان تک حق کا پیغام پہنچائیں، ہمارے علما اگر یورپ کی زبانیں جانتے تو آج یورپ میں اور دوسرے عیسائی ملکوں میں اسلام کی اشاعت کا کتنا فرض انجام دیتے، اسی ہفتہ ہمارے پاس جاپان سے ایک ہمدرد مسلمان کا خط آیا ہے، جس میں اس نے جاپان بلوانے کے لیے چند ایسے مسلمان علما کے نام دریافت کیے ہیں جو وہاں جا کر اسلام کا وعظ کہہ سکیں اور اسلام پر کتابیں لکھ کر جاپانیوں کے سامنے پیش کر سکیں لیکن افسوس آتا ہے جب اپنی جماعت کی اس بے بسی و بے کسی پر نظر پڑتی ہے کہ ہم اپنے اہل مذہب کے لیے سب کچھ جاننے کے

باوجود دوسرے اہل مذاہب کے لیے کچھ نہیں جانتے، بلکہ ان جزیروں اور دورافتادہ اسلامی آبادیوں کے لیے جو اسلامی مرکزوں سے دور ہیں ہمارے علما نے نہ اب تک کچھ کیا اور نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جاوا، سماترا، بورنیو اور مڈگاسکر سے فلیپائن تک اور جنوبی مشرقی اور مغربی افریقہ کے مختلف ٹکڑوں میں نائیجیریا کے صحراؤں میں عیسائی مشنری اور فرق باطلہ کے بعض مبلغ منڈلا رہے ہیں لیکن افسوس کہ دین حق کا کوئی منادی ان تک پہنچنے کے لیے بے تاب اور سرگرم عمل نہیں۔ (یہ پورا خطبہ جنوری ۱۹۳۸ء کے معارف میں چھپا ہے۔)

مدراس کے قیام کے دوران میں مدراس یونیورسٹی کے شعبہ تحقیقات علمی کا معائنہ فرمایا، اس کا ذکر نومبر ۳۷ء کے شذرات میں ہے۔

حیدرآباد کا سفر اور نظام حیدرآباد سے ملاقات اور سید صاحب کا وظیفہ: مدراس سے واپسی میں احباب سے ملنے کے لیے حیدرآباد ٹھہر گئے، نظام سے کئی مرتبہ ملاقات ہوچکی تھی، اس لیے اس مرتبہ اس کا خیال نہیں تھا لیکن اخبارات سے نظام کو آپ کی آمد کی خبر مل گئی تھی، انہوں نے پہلے خاصہ کا خوان بھیج کر عزت افزائی فرمائی، اس کے بعد خود سے شرف ملاقات بخشا اور ایک گھنٹہ سے زیادہ مختلف مذہبی و دینی مسائل پر گفتگو رہی، اسی دن شام کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے سید صاحب کے اعزاز میں پارٹی دی، جس میں حیدرآباد کے بہت سے ارکان و عمائد شریک تھے، سید صاحب نے دارالمصنّفین کی اہمیت پر تقریر کی، نواب مہدی یار جنگ نے جوابی تقریر میں دارالمصنّفین کے خدمات کی تحسین فرمائی، مہاراجہ کشن پرشاد نے خلعت سے نوازا، نومبر ۳۷ء میں اس سفر سے واپسی میں نظام کے دست و قلم کا لکھا ہوا فرمان ملا، جس میں دارالمصنّفین کی تین سو ماہانہ امداد میں سو[1] ماہانہ کے اضافہ اور سیرت کی

[1] یہ فرمان مجمل تھا، اس لیے سید صاحب کو پہلے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ یہ سو ماہ وار سیرت کی امداد میں اضافہ ہے، بعد میں نواب ہوشیار جنگ (ہوش بلگرامی) مرحوم کے خط اور شعبہ متعلقہ کی صراحت سے یہ معلوم ہوا کہ یہ سید صاحب کا ذاتی وظیفہ ہے، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۲ پر)

تکمیل کے بعد مزید صلہ کی خوش خبری تھی، اس کی پوری روداد نومبر ۳۷ء کے معارف میں مرقوم ہے اور نظام کا یہ فرمان دارالمصنفین میں محفوظ ہے۔

ابتدائی جبری تعلیم کی اسکیم اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ: ۳۷ء میں جب پہلی مرتبہ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو انہوں نے دوسری اصلاحات کے ساتھ تعلیمی اصلاح کی جانب بھی قدم اٹھایا اور سات برس کے بچوں کی تعلیم لازمی قرار دی گئی، گاندھی جی نے اس کا نصاب جو ''واردھا'' اسکیم کے نام سے موسوم تھا، ایک کمیٹی کے ذریعہ مرتب کرایا، جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ تھے، سی پی کی حکومت نے ودیا مندر اسکیم کے نام سے علاحدہ ایک نصاب مرتب کیا، یہ دونوں نصاب نہ صرف مذہبی تعلیم سے خالی تھے بلکہ اس میں بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض تھیں۔

انگریزوں کا بنایا ہوا نصاب بھی مذہبی تعلیم سے خالی تھا اور پرائمری تعلیم تو ان کے زمانہ میں بھی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اس میں بھی خامیاں تھیں لیکن اس زمانہ میں تعلیم جبری نہ تھی اور ہر لڑکے کے لیے سرکاری اسکول میں پڑھنا لازمی نہ تھا اور مسلمان بچے اپنے گھروں پر یا اسلامی مکتبوں میں ابتدائی تعلیم حاصل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۱) نے جس چیز پر اپنی خوشی ظاہر فرمائی ہے اس پر مجھے بھی خوشی اسی معنی کر کے ہے کہ جی گوشہ گیری اور قناعت کو چاہتا تھا اور ہنگامے سے نفور تھا مگر اس کے لیے کوئی دنیاوی صورت نظر نہ آتی تھی اور اپنی حاجت کسی کے سامنے پیش کرتے شرم آتی تھی، ہمارے احباب دکن کئی سال سے اس فکر میں تھے مگر ان کو کوئی راہ نہیں ملتی تھی، سو یہ مشکل اس طرح حل ہوئی کہ خداوند پاک نے میری شرم بھی رکھ لی اور کسی کا زیر بار ہونا بھی نہیں پڑا اور دل کی تمنا بھی پوری ہوئی، آپ تو سمجھ گئے ہوں گے کہ مرحوم مہدی (مہدی الافادی) کی زبان میں ایک کافر ادب بلگرامی کی ہوش مندی (نواب ہوشیار جنگ ہوشیار بلگرامی) ہے، ایسے باوفا لوگ کہاں ملتے ہیں۔'' (مکتوبات سلیمانی، جلد دوم)

کر سکتے تھے اور کرتے تھے، جبری تعلیم سے یہ سہولت ختم ہو جاتی تھی اور مسلمان بچے بھی سرکاری اسکول میں پڑھنے پر مجبور تھے، اس لیے مسلمانوں میں عام طور سے واردھا اسکیم یا دویا مندر اسکیم کو ناپسند کیا گیا اور اس زمانہ میں یہ مسئلہ اچھا خاصہ موضوع بحث بن گیا لیکن سرکاری تعلیم سے صرف نظر کرنے میں بھی مسلمانوں کا بڑا نقصان تھا، اس لیے یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا تھا،......سید صاحب نے اس پر مسلسل شذرات لکھے، اپریل ۳۸ء کے معارف کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''آج کل نئی وزارتیں (کانگریسی) اپنے اپنے صوبہ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے بنا رہی ہیں، جو خاکہ بنے گا وہ عمل میں بھی آئے گا، اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی، واردھا اسکیم اور سی پی کی ودیا مندر اسکیم کی تجویز سب کے سامنے آچکی ہے، حکومتوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھیں، یہ بات تو اب بھی ہے یعنی سرکاری ادارے مذہبی تعلیم سے خالی ہیں مگر چوں کہ پہلے تعلیم جبری نہ تھی اور نہ ساتویں برس سے سرکاری تعلیم میں جٹ جانا سب پر قانون کی رو سے واجب تھا، اس لیے مسلمان بچے گھروں پر ابتدائی تعلیم حاصل کر کے سرکاری مدرسوں میں جا سکتے تھے اور جاتے تھے، مگر اس جبری تعلیم اور مقررہ عمر میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے، اس لیے یہ معاملہ ہمارے لیے بے حد قابل غور ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ ملک کی دوسری قومیں جو ناخواندگی کے عیب کو مٹا ڈالنے کے لیے کوشاں ہیں وہ آپ کا انتظار کیے بغیر چل کھڑی ہوں گی اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے اور ان کے درمیان فیصدی خواندگی کا جو فرق ہو جائے گا وہ پھر مٹائے نہ مٹے گا، اس لیے اس وقت مسلمان مذہبی تعلیم کو جبری تعلیم سے رہائی پانے کا بہانہ نہ بنائیں، بلکہ ایک عزم والی قوم کی طرح آئیں اور مذہبی و ملکی دونوں فرضوں کو ایک ساتھ ادا کریں، ان میں سو فیصدی آدمی مذہبی تعلیم اور خواندگی دونوں حاصل کر کے دکھا دیں، یہ عزم کے سامنے مشکل نہیں۔

اگر حکومتیں مذہبی تعلیم کے بارے سبک دوشی چاہیں تو کیا مسلمانوں کا یہ فرض ساقط ہو

جائے گا، اس وقت ضرورت اس کی ہوگی کہ مسلمان کسی ادارے کے ماتحت ابتدائی مذہبی تعلیم کا جال پورے ملک میں پھیلا دیں، اس کے لیے سرمایہ ہو، کتابیں تیار کی جائیں، چھاپی جائیں، اردو خط اور قرآن پاک کی مشکلوں کو عملاً حل کیا جائے، اس کے لیے ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے ماہر مل کر بیٹھیں اور کوئی نظام تعلیم بنائیں اور اس پر عمل کی راہیں نکالیں[1]۔

ایک بات اس موقع پر صاف کہہ دینی ہے کہ ہندو بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمان بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت ہے، ہندویت ایک سلبی حقیقت ہے اور اسلام ایجابی، اگر ہندو اپنی نسبت کچھ بھی نہ جانے تب بھی ہندو رہے گا لیکن اگر مسلمان اپنی نسبت کچھ نہ جانے تو وہ مسلمان نہیں رہے گا، اس لیے مذہبی تعلیم کا فقدان ہندویت میں خلل انداز نہیں لیکن مسلمان ہونے میں خلل انداز ہوگا، حتی کہ چند نسلوں کے بعد (خاکم بدہن) مسلمان نام کا مسلمان بھی باقی نہ رہے گا، اس لیے

ع گر کردن است چارہ مجنوں کنوں کنید

جولائی ۳۸ء کے شذرات میں پھر تحریر فرماتے ہیں:

''ابتدائی تعلیم کی جو اسکیم واردھا اسکیم کے نام سے مشہور ہے اور جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ترتیب دیا ہے، اس پر غور کرنے کے لیے شملہ میں ایک آخری کمیٹی بیٹھی تھی، اس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اعتراضوں کا جواب دیا جو اس اسکیم پر کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک فقرہ یہ بھی کہا کہ:

اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی گنجائش پوری رکھی گئی ہے جس کا انتظام نہایت غور سے طے کیا گیا ہے کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ ہو اور ہر فرقہ اپنی ضروریات کے مطابق اس کا انتظام کرے۔

[1] آزادی کے بعد اس کے لیے دو تنظیمیں قائم ہوئیں، دینی تعلیمی بورڈ جمعیۃ العلما نے قائم کیا اور دینی تعلیمی کونسل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قاضی محمد عدیل عباسی ایڈوکیٹ (بستی) اور ان کے رفقا نے دینی تعلیمی کونسل نے بڑا مفید کام انجام دیا اور اتر پردیش کے گاؤں گاؤں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی، مکتب قائم کردیے جو بڑی خوبی سے چل رہے ہیں۔

ہم کو اس اسکیم کے بانیوں کی اس کشادہ دلی سے بڑی خوشی ہوئی لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اسکول کے اوقات علاوہ جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی اہمیت تعلیم میں کیا رہ جاتی ہے، پھر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس خارج از اوقات تعلیم کے مصارف کا بار کون اٹھائے گا، آخر اس دنیا میں دین کا یہ اچھوت پن کب تک قائم رہے گا۔"

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت اور تیاری پر معارف میں جو شذرہ لکھا گیا تھا، اکثر صوبوں نے اس کی سچائی کو تسلیم کیا، اس سلسلہ میں سی پی کے ایک دردمند مسلمان کے خط کا اقتباس دیا جاتا ہے:

"یہاں کسی یونیورسٹی میں مسلمانوں کا پتہ نہیں، صوبہ بھر میں اردو کا ایک پروفیسر ہے اور ایک ہائی اسکول، حالاں کہ اس صوبہ میں آٹھ نو لاکھ مسلمان بستے ہیں، یونیورسٹی کی مہر میں ناگ دیوتا بطور شان علم کے استعمال کیا گیا ہے، بی اے کے کورس میں اعثم کوفی کی تاریخ کا اردو ترجمہ جو کہ سیفی پریس دہلی سے شائع ہوا ہے، لازمی نصاب کے طور پر دکھایا گیا ہے، ودیا مندر جبری تعلیم کی ایک اسکیم ہے مگر اس میں اردو کا کوئی انتظام نہیں، اب مسلمان یا ہندی اور مراٹھی پڑھیں گے یا جبری تعلیم کے قانون کی خلاف ورزی میں قابل تعزیر قرار پائیں گے۔"

اوپر اس دردمند مسلمان نے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ غور کرنا ہے کہ اس میں کس کا کتنا قصور ہے، جب تک مسلمان اپنے عمل سے یہ نہ ثابت کر دیں کہ ہندوستان اور ہندوستان کی چیزیں صرف ہندوؤں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بھی ہیں، اس وقت ہم کو اپنے ہم وطنوں کی چیرہ دستی کی شکایت نہیں کرنی چاہیے، مسلمانوں کو اس وقت جوش عمل، استحکام وقوت اور عزم صادق کی ضرورت ہے، مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی صحیح پوزیشن کو قائم کرنے کے لیے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لیے قطعاً محال ہے، ورنہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد قومیت کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہا جاتا ہے کہ سرکاری تعلیم اور سیاسی معاملات میں

مذہب کو دخل نہیں، آمنا وصدقنا مگر پھر یہ کیا ہے کہ سیاسی و تعلیمی شعاروں میں ہندو مذہبی تخیل کی الوہیت کا ترانہ گایا جاتا ہے اور اس کے نشان بنائے جاتے ہیں، اب یا تو یہ کہہ دیا جائے کہ سراسر ہندو مذہبی تخیل تم کو زبردستی قبول کرنا پڑے گا یا مشترکہ و متحدہ ہندوستان اپنے آپ ملکی شعار بنائے گا اور ملکی ترانے گائے گا۔

اب تک دو ہی قسم کے مسلمان سمجھے جاتے ہیں، ایک وہ جو اپنے دین وملت سے کٹ کر کانگریس میں مدغم ہوگئے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو مسلمانوں کے وہمی حقوق وفرضی امتیازات کا خواب دیکھتے ہیں لیکن بھولنا نہ چاہیے کہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جو اپنی دعاؤں میں ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنه کہہ کر دونوں کی بھلائیوں کا طلب گار ہے، ملکی آزادی کی پوری جدوجہد کے ساتھ اس کو اپنے دین وملت کے ساتھ بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبت ہے اور اسی کی خاطر وہ ہر کام کرتا ہے، اگر واقعی آزادی کے طلب گار مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں تو ان کو اٹھ کر اپنا خاکہ اسی طرح پیش کرنا چاہیے جس طرح کانگریسی وزارتیں کر رہی ہیں اور جیسے یہ آزاد حکومتیں اپنی سیاسی تجویزوں کو عمل میں لا رہی ہیں، آزاد مذہبی مسلمانوں کو بھی اپنے خاکہ کو مسلمانوں کے لیے عمل میں لانے کی کوشش کریں، بلکہ کیا اچھا ہو کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں دارالقضا اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں اور ان کو عمل میں لائیں، تا کہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔

معارف اگست ۱۹۳۸ء کے شذرات میں پھر تحریر فرماتے ہیں:

''بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ اس سے بچپن ہی میں ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کمانے کا ڈھنگ آجائے، بلکہ اس لیے ہے کہ اس عمر کی تعلیم کا نقش ان کی زندگی میں ہمیشہ قائم رہ جائے گا، مسلمانوں کی اسی عمر میں ان کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا عملاً اپنے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہے، جس جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظر انداز ہوگا اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو اس

کا مقصد یہ ہے مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں یا یہ ہے کہ مسلمان آئندہ عملاً مسلمان نہ رہیں۔

اصل مشکل کا حل صرف اختلاف اور شور و غوغا نہیں ہے، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ معاملہ پر غور کرنا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ پورے ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی ایک اسکیم مرتب کرنا اور اس پر عمل کرنا یہ یاد رہے کہ اگر ہم اس نیم آزاد حکومت سے اپنی اسکیم نہ منوا سکے تو پھر پوری آزاد حکومت سے منوانے کی طاقت ہم میں کہاں سے آئے گی، جو کچھ کرنا ہے سفر کی پہلی ہی منزل میں کرنا چاہیے تا کہ آئندہ غلط روایت کی دلیل نہ پیدا ہونے پائے۔"

یہ پیشین گوئی آج کیسی لفظ بہ لفظ صادق آرہی ہے۔

صوبہ متحدہ کی پہلی کانگریسی حکومت اور عبدالحق راجندر پیکٹ کی مخالفت: ابھی عبدالحق راجندر پیکٹ کی سیاہی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کانگریسی حکومت نے اس کو فراموش کر دیا، اگست ۳۷ء میں یہ پیکٹ ہوا تھا، اس کے چند مہینوں کے بعد پہلی مرتبہ صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں تو اترپردیش کے وزیر تعلیم سمپورنانند جی نے ناگرنی پرچارنی سبھا بنارس کے ایک جلسہ میں ہندی کے "لینگوا فرینکا" ہونے کا اعلان کیا اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں اعلانیہ اس کی ترویج شروع کر دی، سید صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی ملی جلی زبان کا نام ہندوستانی رکھا گیا جس کو کانگریس نے بار بار دیش کی عام زبان کے نام سے پکارا اور جس کی یہ تعریف کی گئی کہ جو شمالی ہندوستان میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جو عربی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے پاک ہے، راجندر عبدالحق معاہدہ میں یہی لفظ ہیں، گاندھی جی نے یہی کہا، جواہر لال جی نے یہی بتایا اور ہم کو اطمینان ہو گیا کہ کانگریس کے ہائی کمان کے حکم کے آگے اب کسی کانگریسی گورنمنٹ کو سرتابی کی جرأت نہ ہوگی، ڈاکٹر کھرے کی نظیر بھی سامنے تھی۔

مگر معلوم ہوا کہ واردھا کے پایۂ تخت سے ناگ پور جتنا قریب ہے لکھنؤ اس سے

بہت دور ہے، اس لیے ہائی کمان کی سرتابی کی جو سزا ناگ پور میں مل سکتی ہے وہ لکھنؤ میں نہیں مل سکتی، یو پی گورنمنٹ کے عہدہ دار اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے افسر ہندوستانی کے بجائے اعلانیہ ہندی کے رواج پر تلے ہوئے ہیں، خصوصیت کے ساتھ آنریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم کے رویہ سے سخت شکایت ہے کہ وہ صاف صاف کانگریس کے حکم کو توڑ رہے ہیں اور اپنی پبلک تقریروں میں وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان جیسے وفادار کو نہ کہنا چاہیے۔

اس وقت ہمارے سامنے ہمارے وزیر تعلیم کی وہ تقریر ہے جو بنارس میں انہوں نے ۱۹/اگست ۱۹۳۸ء کی شام کو ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی جس میں یہ ارشاد ہوا:

"ہندی نہ صرف شمالی ہند کی زبان ہے بلکہ وہ ہندوستان کی لینگوا فرینکا ہے، یہ ایسی ہونی چاہیے جس کو آسانی سے نہ صرف بنگال اور گجرات کے لوگ بول اور سمجھ سکیں بلکہ وہ بھی جو دکنی ہند میں رہتے ہیں، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندی جس کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے ہمارے دکنی بھائی بھی آسانی سے سیکھ سکیں یہ ضروری ہے کہ ہم بہت کافی بڑی تعداد میں سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں۔"

اب یو پی کانگریس کی زبان ہفتہ وار ہندوستان کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"مدراس کی کانگریسی وزارت نے یہ طے کرلیا ہے کہ مدراس میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان کی ابتدائی تعلیم لازمی کردی جائے گی کیوں کہ اس وقت یہی ایک زبان ہے جو سنسکرت اور عربی و فارسی کے بھاری لفظوں سے خالی ہے، تمام شمالی ہند اور دکن میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اردو ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔"

سمپورنانند جی نے سنسکرتی ہندی کو ملک کی عام زبان بنانے کی آواز اٹھائی تھی، الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جھا نے بھی لے میں لے ملائی اور گوالیار میں اسی قسم کی ایک تقریر کی جس پر سید صاحب نے یہ دل چسپ تبصرہ کیا:

"الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جھا نے ۲۰/ستمبر ۳۹ء کو مہاراجہ گوالیار کی

موجودگی میں ایک مجلس میں اس پر تقریر فرمائی ہے کہ سنسکرتی ہندی ہی ہندوستان کی عمومی زبان بن سکتی ہے اور اس پرانی دلیل کو دوبارہ دہرایا ہے، ہمارے نزدیک لائق پروفیسر نے یہ تقریر آنکھ بند کر کے ارشاد فرمائی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمان جو نظری اور تھیوری کے طور پر نہیں بلکہ عملاً اردو کو ہندوستانی بنا چکے ہیں، ہندوستان میں موجود نہیں، پھر انہوں نے دکن اور مدراس کی طرف تو دیکھا مگر بلوچستان، سرحد، کشمیر اور پنجاب کی طرف غور نہیں فرمایا، کیا ان کی زبانیں ہندوستان کی عمومی زبان میں کوئی حصہ نہیں رکھتیں۔

اور سنسکرت کے ساتھ مدراس کا نام لے کر تو غضب ہی کیا ہے، مدراس بلکہ دکن اور میسور تک کا پورا علاقہ ڈراویڈی قوموں اور زبانوں کا مسکن ہے جو آریہ قوم اور سنسکرت زبان سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں، ان ملکوں میں ہندی کے خلاف جو تحریک چل رہی ہے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ہندوستان کے یہ پرانے اور اصلی باشندے یہ نہیں چاہتے کہ سنسکرتی ہندی کو اپنی زبان بنا کر آریہ ہندو کا طوق اپنے گلے میں ڈالیں اور اپنے کو ہندوستان سے فنا کر دیں اور ہندوستانی اردو سے ان کو یہ ڈر نہیں ہے[1]۔"

اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت ریڈر پروفیسر سکسینہ کا ایک تازہ مضمون اس محدود اور تنگ ذہنیت کا نمونہ ہے، اردو تو اردو ہندوستانی تک سے ان کو اس لیے اختلاف ہے کہ آسان اردو کے معنی میں ہے اور اسی لیے سرکار بہار کی ہندوستانی کمیٹی کی ممبری سے انہوں نے استعفا دے دیا ہے اور اپنا استعفا اخباروں میں چھپوایا ہے، موصوف اپنے پیشہ اور خدمت کے لحاظ سے بے شبہ سنسکرت کے عالم ہیں مگر سنسکرت کے ان عالموں کے اس ایثار، صلح پسندی اور رواداری سے کچھ سبق نہیں مل سکتا جو اپنے اپنے رتبہ سے نیچے اتر کر ہندوستانی کی خدمت کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں، اسی قسم کی محدود اور تنگ ذہنیتیں ہر دور میں ہندوستان کی بربادی کا سبب ہوئی ہیں اور آگے بھی ہوں گی اور حقیقت یہی ہے جیسا کہ سر تیج بہادر نے اپنی کشمیر کی بہادرانہ تقریر میں کہا ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مادری زبان ہے جو بزرگوں کی ہزار سالہ محنت و محبت کی یادگار ہے، جو لوگ اس زبان کو

---

[1] اس کی تصدیق لفظ بہ لفظ ہو رہی ہے۔

مٹانا چاہتے ہیں وہ اس ہزار سالہ محبت ومحنت کو بابرد کرنا چاہتے ہیں۔'' (معارف اکتوبر ۳۹ء)

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی اشاعت: نومبر ۱۹۳۸ء میں سیرۃ النبیؐ کا چھٹا حصہ شائع ہوا، اس کا موضوع اسلام کی اخلاقی تعلیمات ہیں، اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اور اسلامی فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات، فضائل ورذائل اخلاق اور اسلامی آداب واخلاق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ کتنا بلند ہے۔

اہل علم نے اس حصہ کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اس پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا جو ۱۹۴۰ء کے معارف کے کئی نمبروں میں شائع ہوا، حضرت سید صاحب اس تبصرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''پچھلے پرچہ میں سیرۃ النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی چھٹی جلد پر جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے، ایک ذمہ دار صاحب قلم کے قلم سے جو تبصرہ بصیرت افروز ہو رہا ہے وہ خاکسار مؤلف کی پوری چوتھائی صدی کی خدمت کا ایسا معاوضہ ہے، جس کے لیے وہ سراپا سپاس گزار ہے، یہ تبصرہ بجائے خود اس تاریک زمانہ میں جس کو روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے فکر وعمل کے لیے چراغ راہ ہے، ضرورت ہے کہ اہل نظر اس کو بار بار پڑھیں اور اس تہ تک پہنچیں۔

خاکسار مؤلف کی بڑی خواہش تھی کہ علوم اسلامیہ اور اخبار محمدیہ کے ماہرین میں سے کوئی صاحب ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ غور فرماتے کہ مؤلف جس راستہ پر چل رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک اس میں اصلاح کی گنجائش ہے، مؤلف کی دیرینہ خواہش کی یہ پہلی تکمیل ہے، صاحب تبصرہ نے اپنے لطیف ونازک طرز تحریر میں مؤلف کو جن گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ پہلے سے بھی نظر میں تھے اور اب اور زیادہ ان شاء اللہ قابل توجہ رہیں گے۔

زمانہ کے دست شاطر نے ہمارے علما کے سامنے اب بالکل نئی بساط بچھائی ہے، نئے خیالات اور نئے مسائل کی نئی مشکلات ہمارے سامنے ہیں، ضرورت تو یہ تھی کہ اہل فکر اور عاقبت

ہیں علما آپس میں مل کر ان مشکلات کا حل سوچتے اور ان کی راہیں کھولتے لیکن جب اس وقت یہ صورت نہیں تو شخصی طور سے جس سے جو کچھ ہوسکتا ہے اس کو کرتا رہے، سیرت نبویؐ کی جلدیں ان ہی حالات و خیالات کو سامنے رکھ کر ترتیب پا رہی ہیں، السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

چھٹی جلد کے بعد ساتویں جلد کا مرحلہ ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اس جلد کا موضوع معاملات ہوگا، معاملات سے مقصود اسلام کے وہ مسائل ہیں جن کی حیثیت قانون کی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز خود سلطنت اور آداب سلطنت ہیں، پھر اسلام کے ہر قسم کے قوانین، معاشرتی، تمدنی، اجتماعی، اقتصادی تشریح کا کام ہے، یہ ہمارے مباحث کا نیا راستہ ہوگا اور اسی لیے اس کے طے کرنے کی مشکلیں بھی نظر کے سامنے ہیں۔''

مصر میں سیرت نبویؐ کے عربی ترجمہ کا منصوبہ: ہمارے ناظرین کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مصری یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر عبدالوہاب عزام نے جو فارسی اور اردو کے استاد ہیں، سیرۃ النبیؐ کے عربی ترجمہ کی اجازت ہم سے چاہی ہے، جس کو ہم نے خوشی سے منظور کرلیا، موصوف نے اس سلسلہ میں جو خط لکھا ہے اس کی چند سطریں یہ ہیں:

''میں نے آپ کی سیرت نبویہ کا ترکی ترجمہ پڑھا تو اس کو میں نے اس لائق پایا کہ خود قرآن پاک کی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے، اس لیے میں نے اور چند ہندوستانی بھائیوں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہم عربی میں اس کا ترجمہ کریں۔''

اس ضروری کام کے لیے خود میرا ارادہ تھا کہ مصر جا کر ان مجلدات کا عربی میں ترجمہ کروں مگر نظر یہ آتا ہے کہ یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہے گی، اس لیے اس خیال کی تکمیل کا اس سے بہتر موقع نہیں آسکتا، خدا اس کو انجام تک پہنچائے[1]۔

---

[1] کئی سال ہوئے مولوی محمد اسماعیل ندوی مدراسی نے جو مصر کی کسی درس گاہ میں استاد ہیں، کسی عربی ادارہ کی طرف سے سیرت کے عربی ترجمہ کی اجازت مانگی تھی اور اس کا ترجمہ وہ خود کرنے والے تھے، اس سلسلہ میں ان سے کچھ دنوں تک خط و کتابت بھی رہی لیکن پھر اس کے بعد کچھ حال نہ معلوم ہوسکا۔

انگریزی ترجمہ کا ارادہ: سیرت کے انگریزی ترجمہ کا خیال بھی مدتوں سے ہے اور کئی صاحبوں نے اس کی اجازت مانگی اور دی گئی، مگر پورا کسی نے نہیں کیا، اسی اثنا میں خود اپنے یہاں اس کام کو شروع کیا گیا مگر کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ یہ کام رک گیا، اب لاہور کے ایک ممتاز صاحب دل وصاحب قلم خواجہ عبدالوحید سکریٹری اسلامک ریسرچ سوسائٹی نے ہمت کی اور اس کے دیباچہ کا انگریزی ترجمہ خدام الدین کے انگریزی پرچے اسلام میں شائع کیا اور اب وہ ہمت کر رہے ہیں کہ پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کریں، خدا کرے کہ یہ کام بھی تکمیل کو پہنچے[1]۔ (معارف ماہ فروری ۱۹۴۰ء)

نقوش سلیمانی کی اشاعت: سید صاحب نے اردو زبان وادب اور اس کی تاریخ سے متعلق جو مضامین لکھے تھے اور اردو کی مجالس میں جو خطبے پڑھے تھے، ۳۹ء کے آخر میں ''نقوش سلیمانی'' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع کیا، یہ اردو زبان کی پوری تاریخ اور گذشتہ چوتھائی صدی میں اردو سے متعلق جو مسائل پیش آئے ان کی پوری سرگذشت ہے، یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں داخل کی گئی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے شعبہ اردو کی صدارت: دسمبر ۳۹ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس نواب کمال یار جنگ بہادر جاگیردار حیدر آباد کی صدارت میں کلکتہ میں ہوا، اس کے اردو شعبہ کی صدارت سید صاحب نے فرمائی اور ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا۔

اردو کو جو مسائل اور مشکلات اس وقت درپیش ہیں اور اس کے حامیوں اور مخالفوں میں جو اختلافات اس وقت ہیں کم وبیش وہی اس وقت بھی تھے، سید صاحب نے

---

[1] پاکستان میں کئی اصحاب نے سیرت کے انگریزی ترجمہ کی اجازت چاہی جو دے دی گئی، ایک وکیل صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہ گیا ایک انگریز کی مدد سے پہلی جلد کا ترجمہ شروع بھی کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے خط وکتابت بھی کی لیکن پھر اس کا انجام نہیں معلوم ہوا۔

اس خطبہ میں ان سب پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی اور اردو کے مخالفوں کی جانب سے اردو پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کی پوری تردید کی اور ان کا مدلل جواب دیا ہے اور علمی، لسانی، تاریخی ہر حیثیت سے اردو کی اہمیت واضح کی ہے، یہ خطبہ صدارت فروری ۴۰ء کے معارف میں چھپا ہے۔

اردو کے بارے میں بنگالی مسلمانوں کے جذبات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس سال کانفرنس کے اردو شعبہ کے اجلاس میں بنگال کے مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا خوش گوار ذہنی انقلاب محسوس ہوا یعنی وہ اردو کو بحیثیت ایک ہندوستانی زبان کے ماننے اور بنگال میں اس کے پھیلانے کے خواہش مند نظر آتے تھے اور ان کو محسوس ہوتا تھا کہ صرف زبان کی بیگانگی نے ان کو باقی اسلامی ہندوستان سے ایک طرح سے منقطع کر دیا ہے، اس لیے انہوں نے خود ہی اس کی تحریک کی کہ وہ بنگالی زبان کو بھی سندھی، ملیالم اور پشتو کی طرح عربی خط میں لکھیں اور اس کی سند میں انہوں نے سو برس پہلے کی ایک ضخیم منظوم بنگالی کتاب شہادت نامہ پیش کی، جو بنگلہ زبان اور عربی خط میں تھی۔"

مدح صحابہؓ اور تبرا ایجی ٹیشن: شیعہ سنیوں میں بعض اختلافات ہمیشہ سے چلے آرہے تھے، ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے شیعہ سنیوں میں اس اختلاف نے بڑی بدنما صورت اختیار کر لی، ایک طرف سنیوں نے مدح صحابہ کے جلوس کی بدعت شروع کی، دوسری طرف شیعوں نے اس کے جواب میں تبرا ایجی ٹیشن یعنی سنیوں کے واجب الاحترام بزرگوں پر اعلانیہ دشنام طرازی کا سلسلہ شروع کیا، جس سے دونوں کو نقصان پہنچ رہا تھا، حضرت سید صاحب نے دونوں کی غلطیوں کو واضح کیا اور یہ مفید مشورے دیے:

"لکھنؤ میں شیعہ سنی بحث نے جو خطرناک صورت پیدا کی ہے اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے، لکھنؤ شیعہ اصحاب کی راجدھانی تھی، وہاں صدیوں سے اعلانیہ مدح صحابہ جرم تھی اور یہ جرم وراثۃً حکومت برطانیہ کے عہد تک ممنوع ہوتا چلا آیا، سنیوں نے غالباً ۱۹۰۵ء میں اس کے

خلاف احتجاج شروع کیا اور آخر ۳۴ء، ۳۵ برس کی جدوجہد کے بعد اب کام یاب ہوئے اور ان کو اتنا حق ملا کہ سال میں ایک دن وہ اعلانیہ مدح صحابہ کر سکیں، گو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی برسر بازار رسم مدح خوانی اور اس کے سڑکوں اور بازاروں میں جلوس نکالنا بدعات میں ایک نئی بدعت کا اضافہ ہے تاہم ہم اس لیے اس کی مخالفت نہیں کرتے کہ پچھلی شیعہ حکومت کے ایک ناجائز اور ظالمانہ سرکاری حکم کا منسوخ ہونا شیعہ سنی اتحاد کی راہ کے عوائق وموانع کو کم کرنا ہے، کیوں کہ اباحت پر قدغن لگا کر اس کو فقہا کی نظر میں واجب العمل بنادیا گیا تھا۔

شیعہ اصحاب نے اس کے جواب میں تبرا کی دل آزار تحریک جاری کر رکھی ہے اور اس کی اتنی عظمت بڑھائی ہے کہ اس کو کلام الٰہی کا ہم پایہ بنادیا ہے یعنی وہ تبرا نہیں کہتے بلکہ تبرا شریف کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے جواز کے استدلال ان آیتوں سے ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت فرمائی ہے لیکن شاید سارے احکام الٰہی میں یہی ایک حکم ہے (اگر یہ حکم ہے) جس پر سادات بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پہلے سلاطین بنی امیہ نے عمل کیا اور شیعوں میں سلاطین آل بویہ نے اپنے عہد میں ان کی تقلید کی، کیا عجیب بات ہے کہ آج محبان اہل بیت کرام کو سنت اہل بیت کی پیروی پر نہیں بلکہ دشمنان اہل بیت کی پیروی پر اصرار ہے، کیا اچھا ہو کہ دونوں گروہ اپنی اپنی بدعتوں سے از خود احتراز کریں اور ہر قسم کے ایسے جلسوں اور جلوسوں کو یک قلم موقوف کردیں، جن کی اصل شریعت محمدیہ میں نہیں کہ یہ اختلاف فی الدین نہیں اختلاف فی البدعات ہے۔"

مگر ان بدعتوں کا سلسلہ مہینوں جاری رہا، اس لیے نومبر ۱۹۳۹ء کے شذرات میں پھر تحریر فرمایا:

"لکھنؤ میں شیعہ سنی اختلاف جس نوبت پر پہنچ گیا، شاید یہ وہی مقام ہے جہاں پہنچ کر عارف روم نے ارشاد فرمایا ہے:

نور حق کے بر تو گردد منجلی ❊ اے گرفتار بوبکر و علی

اگر حقیقت میں سنیوں کو شیعوں کے اس فعل سے اسی قدر تکلیف ہے تو ان کو پہلا فرض یہ

ہے کہ وہ محرم کی ان تمام بدعات سیئہ سے جو اسلام کی رسوائی کا باعث ہیں یک قلم الگ ہو جائیں، ورنہ یہ کیا کہ شیعوں سے نفرت کرنا اور شیعیت کے مراسم خود ادا کرنا جو بالاتفاق اہل سنت ناجائز و ناروا ہیں اور متعدد بار اس کے فتاوے شائع ہو چکے ہیں، اس کے بجائے عوام کی دل چسپی اور فائدہ کے لیے ان تمام اکھاڑوں اور فوجی کرتبوں کی نمائش کو جس کا موقع محرم کو قرار دیا گیا ہے، عیدین کے موقع پر رواج دینا چاہیے جو عین سنت اور صحابہ کرام کے مسلک کے مطابق ہے اور جس کا اصطلاحی نام تقلیس ہے، عہد اول میں یہ تقلیس عیدین کے موقع پر کی جاتی تھی جس میں صحابہ کرام شریک ہوتے تھے اور خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کرام دیکھتے تھے[1] اور خوش ہوتے تھے۔"

دکن کا سفر اور اس کے علمی اور تعلیمی اداروں میں تقریریں: جنوری ۱۹۴۰ء میں حیدر آباد، پونہ اور بمبئی کا سفر کیا، حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ، نظامیہ طبیہ کالج، ادارہ ادبیات اردو اور مدرسہ نظامیہ کو ملاحظہ فرمایا اور مدرسہ کے ناظم مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی مفتی عدالت عالیہ حیدر آباد اور نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات کی فرمائش پر مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے علوم اسلامیہ اور عربی نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم پر تقریر فرمائی۔

پونہ میں اردو ٹریننگ کالج میں مسلمانوں کے تحفظ پر خطاب فرمایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کے دشمن اسلام کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو کر ہی رہے ہیں، خود مسلمان بھی اپنے ہاتھوں اپنا کلچر تباہ کر رہے ہیں، پونہ کے قیام کے دوران میں ہندوؤں کے مشہور اداروں بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ اور بھارت اتہاس سنشودھک منڈل کو ملاحظہ فرمایا۔

بمبئی میں اسماعیل کالج اندھیری کے طلبہ کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں جن قوموں نے بھی ترقی کی ہے اس کی قوت پرواز کے دو ہی بازو تھے، ایمان و

---

[1] اس اختلاف کا سلسلہ اب تک برابر قائم ہے، شیعہ اور سنی دونوں کا سنجیدہ اور سمجھ دار طبقہ برابر اس کو ختم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے لیکن دونوں جماعتوں کے خود غرض اشخاص کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوتی، اس کا خمیازہ بھگتنے کے بعد شاید آئندہ سمجھ میں آئے۔

عمل، جب تک ہمارے نوجوانوں میں یہ دونوں چیزیں پیدا نہ ہوں گی وہ ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے، اسی کالج میں دوسری تقریر اردو کی تاریخ پر ہوئی جس میں تفصیل کی ساتھ اردو کی جائے پیدائش، سندھ، پنجاب اور گجرات میں اردو کی تاریخ اور اس کی خدمات پر تبصرہ فرمایا، تیسری تقریر انجم اسلام بمبئی کی انجمن ترقی اردو میں اردو زبان کی وسعت اور عالم گیری پر ہوئی۔

اس سفر کی مفصل روداد معارف مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی ہے۔

پشاور اور بھاول پور کے تعلیمی سفر: مارچ ۱۹۴۰ء میں پشاور اور بھاول پور کا تعلیمی سفر کیا، اس کی تقریب یہ تھی کہ اسلامیہ کالج پشاور میں یہ تجویز تھی کہ بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کی عربی دینیات اور طب کی تعلیم کے لیے کالج کے ماتحت ایک شعبہ کھولا جائے، اس کے نصاب کی ترتیب کے لیے سید صاحب کو دعوت دی گئی، اسی زمانہ میں نظام حیدر آباد کے عطیہ سے کالج کے بورڈنگ کی ایک نئی عمارت تعمیر ہوئی تھی اور سر اکبر حیدری اس کا افتتاح کرنے والے تھے، اس میں بھی شرکت ہوجاتی۔

بھاول پور میں انگریزی تعلیم کے لیے ایک کالج صادق ایجرٹن کالج اور عربی دینیات کی تعلیم کے لیے ایک عربی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا، اس کے نصاب کی اصلاح وترمیم کے لیے بھاول پور کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین محمد عرصہ سے سید صاحب کو بلا رہے تھے، اسی زمانہ میں ایک تقریب یہ پیدا ہوگئی کہ صادق ایجرٹن کالج کے منتظمین نے سید صاحب کو جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ دینے کی دعوت دی۔

یہ سب کام ایک سفر میں ہوجاتے تھے، اس لیے سید صاحب نے شروع مارچ میں پشاور کا سفر کیا، ۸/مارچ کو پشاور پہنچے، مولوی نورالحق ندوی پشاوری ناظم شعبہ دینیات اسلامیہ کالج پشاور کے یہاں قیام ہوا، تین دن قیام رہا، اس دوران میں دینیات اور طب کے نصاب کی ترتیب کا کام انجام دیا، ۹/کو کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے سامنے اسلامیہ کالجوں کی خصوصیات پر تقریر فرمائی، اس کے بعد کالج کے میدان میں علم لہرایا اور اس کی

مناسبت سے ایک مختصر تقریر فرمائی، ۱۱ر کو پھر اساتذہ اور طلبہ کو خطاب فرمایا، جس میں تلقین کی کہ مسلمانوں کی اکثریت کے ان صوبوں میں کالج کے مسلمان طلبہ کو ایمان و عمل کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے کہ پورے ہندوستان کے مسلمان اس کی تقلید کریں۔

۱۱ر کی شب کو پشاور سے چل کر ۱۲ر کی صبح کو لاہور پہنچے، خواجہ عبدالوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے یہاں قیام ہوا، خواجہ صاحب نے سید صاحب کے اعزاز میں عبداللہ چغتائی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا داؤد غزنوی وغیرہ لاہور کے اصحاب علم کو کھانے پر بلایا، ان سے علمی اور قومی مسائل پر تبادلہ خیالات ہوا، شام کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے چائے کی دعوت کی، اس میں بھی لاہور کے بہت سے اصحاب علم مدعو تھے، ان سے علمی و ادبی مسائل پر گفتگو کی، رات کا کھانا پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے یہاں ہوا، کھانے کے بعد شعر و سخن کی مجلس ہوئی۔

۱۳ر کی صبح کو بھاول پور کے لیے روانگی ہوئی، اسی دن شام کو بھاول پور پہنچے، سرکاری مہمان خانہ عباس منزل میں قیام ہوا، ۱۴ر کو بھاول پور کے وزیر مال مسٹر اینڈرسن کی صدارت میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، سید صاحب نے خطبہ پڑھا اور مسٹر اینڈرسن نے سندیں تقسیم کیں، خطبہ کا یہ فقرہ بہت پسند کیا گیا کہ تعلیم کا مقصد انسان کو بتانا نہیں بلکہ انسان بنانا ہے، دوسرے دن اس ہال میں خصائص اسلامی پر تقریر ہوئی اور جمعہ کو جامع مسجد میں فضائل نبوی پر وعظ ہوا، ۲۳ر کو لکھنؤ ہوتے ہوئے واپسی ہوئی، اس سفر کی تفصیل روداد مئی ۴۰ء کے معارف میں چھپی ہے۔

نیاز فتح پوری کا ایک نیا فتنہ اور اس کا جواب: اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے احتجاج پر نیاز فتح پوری نے اپنے ملحدانہ خیالات سے توبہ کر لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ سے نگار میں مذہب کے خلاف تحریریں شائع نہ کریں گے لیکن چند ہی برسوں کے بعد انہوں نے توبہ توڑ دی اور پھر اس کا سلسلہ شروع کر دیا اور ایک استفسار کے جواب میں کلام

مجید کے الہامی ہونے سے انکار کردیا اور نگار کے کئی نمبروں میں اس کی مخالفت وموافقت اور اعتراضات وجوابات کا سلسلہ چلتا رہا، نیاز صاحب نے کئی مضامین لکھے، ان کے خیالات کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''میں کلام مجید کو نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کلام جانتا ہوں...... اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہوں گے جو ایک انسان یا رسول کے دل ودماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں وہ نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کردیتا ہے...... کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اس کے کلام مجید میں درج ہونے سے اس کو صحیح کہا جاسکتا ہے، عہد نبویؐ میں اس قسم کی روایتیں توریت وانجیل کے حوالہ سے یہود ونصاریٰ کی طرف سے عام طور سے بیان کی جاتی تھیں اور چوں کہ توریت اور انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا، اس لیے رسول اللہؐ نے بھی اس کو اعتبار وبصیرت کے لیے بیان کردیا، اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط[1]۔''

ان ہفوات سے مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوگیا اور ان کے تمام فرقوں نے بلا اختلاف اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور ان خیالات کی تردید میں مضامین لکھے، حضرت سید صاحب نے اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۴۰ء کے معارف کے تین نمبروں میں اس کا مدلل جواب دیا اور آخر میں حسب ذیل بنیادی باتوں پر یہ بحث ختم فرمادی۔

''قوموں کی زندگی کی اصل روح چند حقیقتوں پر یقین ہے، یہ یقین جس شدت واستحکام کے ساتھ ہوگا اسی قدر اس قوم کی زندگی کی روح تازہ، زندہ، تابندہ، پایندہ اور سرگرم عمل ہوگی، یہی ایک روح جب متعدد افراد انسانی میں جلوہ گر ہوتو وہ کل مل کر ایک حقیقی جماعت کی شکل پیدا کرتی ہے اور جب ایسے افراد کی تعداد قابل لحاظ حد تک پہنچ جاتی ہے تو ایک بڑی قوم یا بڑی ملت کا وجود ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان چند حقیقتوں پر یقین اتصال کا وہ نقطہ اور اجتماع کا وہ مرکز بن جاتا ہے جس پر

---

[1] یہ ٹکڑے ان کے مضامین سے ماخوذ ہیں، معارف میں سید صاحب نے ان کو جمع کردیا ہے۔

آ کر اس قوم وملت کے کاروبار کے سارے دائرے ختم ہوتے ہیں، جس حد ان حقیقتوں کا یقین ان افراد میں پایا جائے گا اسی قدر ان افراد کی اجتماعی طاقت اور متحدہ قوت ناقابل شکست ہوگی۔

زوال پذیر قوم میں یقین کی یہی گرہ کھل جاتی ہے، وہ یقین جس نسبت سے زائل یا سست پڑنے لگتا ہے اسی نسبت سے اس کے افراد کی اجتماعی اور مرکزی طاقت کم زور ہونے لگتی ہے، یہاں تک وہ مٹتے مٹتے بالکل مٹ جاتی ہے اور وہ قوم فنا ہو جاتی ہے، قوموں کی ترقی اور تنزل کا یہی راز ہے، اسی اصول کے مطابق ازل سے ابد تک قومیں بنتی اور بگڑتی اور جیتی اور مرتی ہیں، جب کوئی قوم بڑھے گی تو اسی اصول سے...... اور مرے گی تو اسی اصول کے مطابق، یہ سنت الٰہی ہے اور اس سنت میں کبھی فرق نہ پیدا ہوگا، شرع کی اصطلاح میں چند حقیقتوں پر اس مستحکم یقین کا نام ایمان ہے اور علم اجتماع میں اسی کو جامعیت اور عصبیت کہتے ہیں۔

خالق فطرت نے تو ازل سے ان حقیقتوں کو جن کا یقین قوموں کی زندگی کی روح ہوتا ہے، اسی طرح متعین کر دیا ہے جس طرح آغاز خلقت میں دنیا کے جسمانی اور مادی قوانین کو جن پر اس دنیا کی بنیاد ڈالی گئی ہے، متعین فرما دیا ہے، انبیاء علیہم السلام شروع سے آخر تک جب بھی اس دنیا میں آئے، ان ہی حقیقتوں کی دعوت دی اور ان ہی پر کامل یقین کا مطالبہ کیا، جن میں سے ایک تمام آسمانی کتابوں کو صادق اور خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ماننا ہے۔

ہماری آج سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ ہم سے ہمارے یقین کی یہ دولت چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے، ہماری سعادتوں اور ہدایتوں کے سب سے قیمتی خزانے کا نام قرآن پاک ہے، جس پر بہ اختلاف فرق، تمام مسلمانوں کا اتفاق تام اور اجتماع عام تھا اور ہے کہ یہ انسانی اوہام و خیالات اور خیالی قصص و حکایات سے بلند تر خدا کی طرف سے آئی ہوئی صداقت کا نام ہے اور اسی لیے وہ ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرا ہے، اس لیے ہر وہ ہاتھ جو اس کی عصمت کو داغ دار بنانے کی کوشش کرے گا، اس کا کاٹ ڈالنا ہمارا فرض ہے۔'' (معارف نومبر ۱۹۴۰ء)

رحمت عالم کی تالیف واشاعت: اسی سال ایک مختصر سیرت آسان زبان میں لکھی، جو

بہت مقبول ہوئی اور ہندی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

اسلام کے سیاسی نظام کی تدوین: اسلام کا اپنا مستقل سیاسی واقتصادی نظام ہے، عربی میں اس پر ائمہ اسلام کی متعدد کتابیں موجود ہیں لیکن اردو میں متفرق مضامین کے سوا کوئی مستقل کتاب نہیں تھی، پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں جب اسلام نظام کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلم لیگ کی تحریک اور نواب اسماعیل خاں کی کوشش سے علما اور اہل علم نے اس نظام کی کتابی تدوین کی طرف توجہ کی اور ۱۹۴۱ء کے شروع میں نواب صاحب چھتاری کی امداد سے ان کی صدارت میں اس کام کے لیے ایک کمیٹی قائم ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے ارکان اور مولانا سید سلیمان ندوی اس کے کنوینر مقرر ہوئے، جنوری ۴۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلما میں اس کا پہلا جلسہ ہوا، اس میں طے پایا کہ مستند علما اور جدید تعلیم یافتہ اہل علم کے مشورہ اور معاونت سے اسلامی سیاست واقتصادیات پر ایک کتاب تالیف کی جائے اور سیاسی نظام کی تدوین کا کام مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی استاد دار العلوم ندوۃ العلما کے سپرد کیا گیا، انہوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی، اس کی نقلیں تمام ارکان کے پاس بھیجی گئیں، سید صاحب نے اس کی نظر ثانی اور جابجا ترمیم فرمائی، مگر ارکان کی بے توجہی اور سید صاحب کی مشغولیت کی وجہ سے پھر کمیٹی کا کوئی جلسہ نہ ہو سکا اور سید صاحب کا ترمیم کردہ نسخہ برسوں پڑا رہا، مگر بظاہر گم ہو گیا تھا، ایک عرصہ کے بعد حسن اتفاق سے دار المصنّفین کے کاغذات اور مسودوں کے انبار میں راقم کو مل گیا اور تالیف کے پندرہ سولہ برس کے بعد ۱۹۵۷ء میں اس کی اشاعت کی نوبت آسکی، اس وقت تک اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی تھیں مگر تالیف کے وقت اردو میں یہ پہلی کتاب تھی[1]۔

---

[1] اس کمیٹی کا ذکر معارف کے مختلف پرچوں میں ہے۔

بہار کے مسلمانوں کا قتل عام: ۱۹۴۱ء کے وسط میں بہار شریف اور اس کے آس پاس کے دیہاتوں میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اسی زمانہ میں سید صاحب اسی کے قریب اپنے وطن دیسنہ میں تشریف رکھتے تھے، اس لیے اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور معارف میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''سالانہ دستور کے مطابق ان دنوں وطن (بہار) میں قیام ہے، شہر بہار اور اس کے اطراف کے دیہاتوں میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے ظالمانہ حملوں کی اطلاعیں اخباروں کے ذریعہ عام ہو چکی ہیں، ان میں ۲۷ مسلمان جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی داخل ہیں شہید اور سو سے زیادہ زخمی کیے گئے، سات آٹھ مسجدوں کو نقصان پہنچایا گیا، چند قبریں توڑی گئیں اور بہت سے مکانوں میں آگ لگائی گئی، اس وقت بہار کی عدالت میں مقدمے پیش ہیں، یورپین اور عیسائی مجسٹریٹ کرسیوں پر ہیں، ملزم حاضر کیے جا رہے ہیں اور گواہوں سے ان کی شناخت کرائی جا رہی ہے، مگر ایک بلوائے عام کے ملزموں اور مجرموں کی شناخت جس قدر مشکل ہے، وہ ظاہر ہے اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ بھی چھپا نہیں ہے۔

اس واقعہ نے متعدد نتیجے نگاہوں کے سامنے کر دیے ہیں، ایک یہ ہے کہ ان سارے ہنگاموں میں مسلمانوں نے کسی ہندو پر از خود حملہ نہیں کیا بلکہ ان کی حیثیت ہر جگہ اور ہر حالت میں مدافعانہ رہی، دوسری بات یہ ہے کہ جہاں چند مسلمانوں نے بھی جرأت اور ہمت سے کام لیا اور حملہ آوروں کا شجاعانہ مقابلہ کیا خدا کی موعودہ نصرت ان کے پاس پہنچی اور انہوں نے دشمنوں کے منھ پھیر دیے لیکن جہاں کہیں انہوں نے بھاگ کر چھپنے کی کوشش کی وہیں مارے گئے اور اپنی سزا کو پہنچے۔

اس واقعہ نے ان دیہاتوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کم ہے، سراسیمگی پھیلا دی ہے اور وہ اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور ہٹنے کی کوشش میں ہیں اور مسلمانوں کی بعض انجمنیں بھی چاہتی ہیں کہ ایسے دیہاتوں سے مسلمانوں کو نکال کر محفوظ مقامات میں جہاں مسلمان زیادہ آباد ہیں وہیں آباد کر دیں، یہ صورت اچھی ہے اور آئندہ کے لیے حفاظت کی تدبیروں میں سے ایک تدبیر بھی ہے۔

مگر میری نظر ایک اور واقعہ پر ہے، مسلمانوں کا اس ملک میں قیام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد صرف ان کی ذاتی قوت بازو پر موقوف ہے۔

مسلمانوں کی ہر آبادی اسلام کا ایک مورچہ ہے، کسی مورچہ کو بے لڑے بھڑے دشمن کے حوالہ کر دینا آئین جنگ نہیں، جس طرح مسلمانوں نے اس ملک کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون سے حاصل کیا ویسے ہی اس کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون سے بچانا ہے، دیکھیے کہ انگریزوں کو اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے کتنی جانی اور مالی قربانیاں کرنی پڑ رہی ہیں مگر وہ قدم پیچھے نہیں ہٹاتے، مسلمان بھی کبھی اپنی سلطنت کا یہی حق ادا کرتے تھے لیکن جس دن سے ان پر بزدلی چھائی اور شخصی زندگی کی اہمیت ان کی اجتماعی اہمیت پر غالب آ گئی، ہندوستان کے ہر معرکہ میں وہ پیچھے ہٹ گئے، اب پھر ان کو اپنی اجتماعی زندگی کا ثبوت دینا ہے اور ہر حال میں اسلام کے ہر مورچہ کو بچانا ہے اور دنیا پر یہ ثابت کر دینا ہے کہ ان کو اس ملک میں زندہ رہنے کا حق ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور سمجھوتے پر بار بار میرے قلم نے مضامین لکھے ہیں اور اب بھی اس ضرورت کا قائل ہوں مگر گڑگڑا کر دشمنوں سے زندہ رہنے کی التجا کرنے سے مردانہ وار مرجانا بہتر سمجھتا ہوں، کیوں کہ مردانہ وار مرجانا بھی زندگی سے کم نہیں:

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بہر حال ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان بڑی اقلیت میں ہیں، مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کی تدبیروں سے غفلت برتنا نہیں چاہیے مگر اس بات کو پوری طرح باور کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی نامردگی اور مرعوبیت میں نہیں بلکہ شجاعانہ مدافعت اور اسلام کی برتر قوت پر یقین میں ہے، کوئی قوم دشمنوں کے مارنے سے نہیں مرتی، بلکہ اپنی اخلاقی اور ایمانی موت سے مرتی ہے، ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کو ان کے اخلاقی اور ایمانی قوت سے بچائیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت وقت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور اسی ذمہ داری کے زیر سایہ وہ اپنی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں، کوئی سلطنت نہیں بلکہ خود قوم اپنی

زندگی کی ذمہ دار ہے، اور قوم کے نوجوانوں پر جو ملت کے سپاہی ہیں، قوم کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے، مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری قوت کا سرچشمہ ہماری ایمانی قوت کا خزانہ ہے، اس خزانہ کی حفاظت آہنی تیغ وخنجر کے بجائے اسلام کی حقانیت کی تلوار اور ایمان باللہ کے خنجر سے ہوسکتی ہے۔"

(شذرات معارف، جولائی ۱۹۴۱ء)

ہندوستان میں کاشت کاروں کے حقوق کا مسئلہ: اسلام نے نظام آراضی کے متعلق جو قوانین بنائے ہیں وہ اسلامی حکومتوں کے لیے ہیں، غیر اسلامی حکومتوں اور ملکوں کے قوانین سے مختلف ہیں، ان میں ہندوستان بھی ہے، بلکہ یہاں مختلف صوبوں کا نظام آراضی اور ان کے قوانین مختلف ہیں، اس کے علاوہ سوشلزم اور کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیے تھے، ان میں ایک بڑا مسئلہ کاشت کاروں کے حقوق کا بھی تھا، قدیم فقہا کو اس قسم کے مسائل سے سابقہ نہیں پڑا تھا، اس لیے فقہ کی کتابوں میں ان کے متعلق احکام ومسائل نہیں ہیں اور ہر دور کے مسائل میں اس دور کے علما نے قیاس واجتہاد سے کام لیا ہے، مسلمانوں کے لیے نظام آراضی کے قوانین کی حیثیت بھی مذہبی ہے، اس لیے مذہبی نقطۂ نظر سے ان کا حل ضروری تھا، سب سے پہلے سید صاحب نے علما کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اکتوبر ۱۹۴۱ء میں لکھا کہ:

زمین دار اور کاشت کار اور سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ شاید دنیا کی ساری لڑائیوں سے زیادہ پرانی ہے، دنیا میں بیسیوں مذہب اور تمدن کے اصول بنے اور بگڑے اور سب نے بقدر ضرورت اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی مگر اصلاح کے مختصر دور کے بعد وہ مشکل پھر بعینہٖ قائم رہی، ایک زمانہ تھا جب زمین دار اور سرمایہ دار برسر عروج تھے اور وہ جو چاہتے تھے، کرتے تھے لیکن مشینوں اور کارخانوں کی کثرت اور سرمایہ داری کے عجیب عجیب ہتکنڈوں نے مزدوروں اور کسانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہوں۔

یہودی قوم نے نبوت وسلطنت کی خدائی نعمتوں سے محرومی کے بعد سے جب اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب اور لعنت کی مستحق ٹھہری اس وقت سے دنیا کی ہر آفت اور گم راہی کی رہنمائی کا فرض اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، دنیا کے عظیم الشان مذاہب یہاں تک کہ عیسویت اور اسلام میں نئے نئے فتنوں کی پیدائش کی خدمت ان ہی نے انجام دی، ایک فرانسیسی نے بائیس برس ہوئے کہا تھا کہ یورپ میں جو فتنہ اٹھتا ہے، خوب غور سے دیکھیے تو اس کے اندر کسی نہ کسی یہودی کا ہاتھ ملے گا۔

اس وقت یورپ اور امریکہ کے سب سے بڑے دولت مند مہاجن اور سرمایہ دار یہودی ہیں، دوسری طرف عوام کی رہبری کا منصب حاصل کرنے کے لیے اور اپنی قوم کے سوا دوسروں کی سرمایہ داری کی لعنت سے بچانے کے لیے بھی ان ہی کا ہاتھ بلند ہوا، کارل مارکس یہودی کی کتاب اس نئی شریعت کا صحیفہ ہے، اس کا انقلاب ان ہی کے ہاتھوں عمل میں آیا اور ملک کی اکثریت پر ان ہی کی اکثریت نے قبضہ جمایا۔

بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی اور عجب نہیں ان چند سطروں کی خاطر مجھے صفحوں کی سخت تنقید برداشت کرنا پڑے، سوال یہ ہے کہ آیا اسلام جو دین ودنیا دونوں کی برکتیں لے کر آیا اور جس کا نظام ہر قسم کے نظامات سے بہتر اور مکمل ہے، وہ اس باب میں کیا کہتا ہے، اس سلسلہ میں پہلے ایک خاص مسئلہ سے بحث ہے، جس کی اہمیت ہندوستان میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور بڑھتی جائے گی، یعنی کسانوں اور کاشت کاروں کے حقوق عام متداول کتب فقہ میں یہ مسائل پوری تفصیل سے نہیں ملتے، جستہ جستہ علما کے اشارات واجتہادات ہیں اور ایک شخص کا تنہا شریعت کے کسی ایسے مسئلہ پر جس میں اجتہاد واختلاف کا دروازہ کھلا ہو، ذمہ داری کے ساتھ لکھنا مشکل ہے اور لکھا بھی جائے تو اس کا قبول عام حاصل کرنا اور بھی مشکل ہے، اس کی مثال یہی ہے کہ ہر فریق اپنے دلائل سے پورے سکون اور ہمدردی کے ساتھ دیانۃً دوسرے کو مطلع کرے تا کہ مسئلہ کا ہر پہلو روشن ہو کر صورت مسئلہ منقح ہو جائے

اور مسلمانوں کے عمل اور کاروبار کے لیے راستہ کھلے۔

اتفاق وقت سے چھ مہینہ ہوئے کلکتہ سے ایک استفتا موصول ہوا جس پر بعض علما کے جوابات تحریر تھے، اس سلسلہ میں خیال ہوا کہ اس کہ اس استفتے کو بنیاد بنا کر تحقیق کا دروازہ کھولا جائے اور علمائے کاملین سے استصواب کیا جائے اور درخواست کی جائے وہ اس کے متعلق وہ پوری دیانت و متانت سے تحریر فرمائیں، اس فتویٰ مولانا مفتی کفایت اللہ کی تحریر بہت مختصر ہے، مجھے معلوم ہے کہ بعض علمائے دیوبند و تھانہ بھون نے بھی اس میں وہی رائے ظاہر کی ہے جو جناب مفتی صاحب نے ظاہر کی ہے، مگر ضرورت ہے کہ اس پر مفصل دلائل پیش کیے جائیں، میں نے جناب مفتی صاحب دام فضلہٗ نے زبانی بھی اور تحریراً بھی عرض کیا ہے کہ وہ فرصت کا وقت نکال کر اس اہم مسئلہ پر توجہ فرمائیں کہ آئندہ مسلمانوں کی معاشی زندگی کا تعلق اس سے اور بھی روز بروز بڑھتا جائے گا اور کاشت کاروں کے حقوق اور بھی وسعت پائیں گے، یہ بات ذہن میں رہے کہ دائمی استمراری بندوبست صرف بنگال، بہار اور یوپی کے دو تین مشرقی اضلاع میں ہے، مدراس میں آراضی براہ راست حکومت کی ملک ہے، جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے۔[1]

اس تحریک پر مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی مونگیری نائب ناظم امارت شرعیہ بہار نے کاشت کاروں کے حقوق پر شریعت اسلام اور موجودہ ہندوستان میں کاشت کاروں کے حقوق کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون لکھا جو مئی اور جون ۱۹۴۲ء کے معارف میں شائع ہوا، اس کے علاوہ دوسرے اہل علم نے بھی مضامین لکھے۔

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کو ہندی اکیڈمی بنانے کی کوشش: ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا قیام اردو اور ہندی دونوں کی خدمت کے لیے عمل میں آیا تھا، جو ہندی نوازوں کی

[1] ہندوستان کی آزادی اور زمین داری کے خاتمہ کے بعد یہ قصہ ہی ختم ہو گیا کہ

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

نگاہوں میں برابر کھٹکتا رہا، پہلی کانگریسی حکومت کے زمانہ میں جب اس کو ہندی کو اتر پردیش کی زبان بنانے کا موقع ملا تو اس نے ہندوستانی اکیڈمی کو بھی ہندی اکیڈمی بنانے کی کوشش کی لیکن کانگریس کی یہ حکومت عارضی تھی، اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی، تاہم اس بہانہ سے بھی کہ ہندوستانی اکیڈمی سے اردو اور ہندی کے بجائے ہندوستانی کی خدمت کا کس طرح کام لیا جاسکتا ہے، ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرادی، اس تحقیقات کے چکر میں اکیڈمی کئی سال تک پھنسی رہی، بالآخر ۴۲ء میں گورنر اتر پردیش نے تحقیقاتی کمیٹی کی بعض تجویزوں سے اتفاق اور اکثر تجویزوں سے اختلاف کیا اور اکیڈمی کو بدستور اردو اور ہندی کی اکیڈمی برقرار رکھا، حضرت سید صاحب خود ہندوستانی کے پرزور حامی اور اس کے مبلغ تھے لیکن ہندوستانی کے پردہ میں اردو کی مخالفت ان کو گوارا نہ تھی، چنانچہ گورنر کے فیصلہ پر لکھتے ہیں:

"ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد جو کئی سال سے حکومت کی تحقیقاتی قید و بند میں گرفتار تھی، اخبارات سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ اب وہ گورنر صاحب کے حکم سے آزاد کر دی گئی ہے، ہزاکسلنسی نے تحقیقاتی کمیٹی کی ایک دو باتوں سے اتفاق اور اس کے اکثر فیصلوں سے بجا اختلاف کیا ہے، ہزاکسلنسی کی یہ ادب نوازی اس وقت جب دنیا خون میں نہا رہی ہے اور دوبارہ اس کی امداد کا اجرا جب ہر حکومت جو کچھ اس کے خزانہ میں ہے جنگ کی قربان گاہ پر چڑھا رہی ہے حد تعریف کے قابل ہے۔

اگر یہ بات جو ہمارے بہت سے ہم وطنوں پر گراں گزرے گی، صفائی سے کہہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے بہت سے ہم وطن سے جو ہندی کو صوبہ کی زبان بنانے کے لیے سالہا سال سے بے قرار ہیں، ہر اس کوشش کو جس سے اردو کے بقا اور قیام میں مدد ملے، حد درجہ ناپسند کرتے ہیں، اس لیے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ہمیشہ ان کی نگاہوں میں کھٹکتی رہی کہ وہ ہندی کے ساتھ اس کے برابر ہی برابر اردو کو کیوں جگہ دیتی ہے اور اس کی بقا و قیام میں کیوں کوشش کرتی ہے۔

کانگریس گورنمنٹ کے عہد حکومت میں وزیر تعلیم اور اسپیکر جس طرح کھلم کھلا اور

بالاعلان ہندی کی اشاعت اور امداد کا کام انجام دیتے رہے وہ کچھ چھپی بات نہیں، ان ہی کے اشارہ سے ہندوستانی اکیڈمی پر اس نام سے تحقیقات کا پہرہ بیٹھا دیا کہ اس کے ذریعہ سے اردو اور ہندی زبانوں کے بجائے ایک ہندوستانی کا کام کس طرح لیا جاسکتا ہے، حالاں کہ اس کے بنانے کی یہ غرض کبھی نہ تھی، بلکہ حریفانہ جھگڑوں سے الگ رہ کر دونوں زبانوں کی برابر کی خدمت تھی۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاک سار نے مخالفتوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پرزور حمایت کی، اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک رہے اور اس کی صورت یہ تھی کہ ہمارے اردو اور ہندی کے اہل قلم چند اصول پر مل کر ایک ہو جاتے اور دونوں کوشش کرتے کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں اور لفظوں کی پڑتال کا طریقہ یہ ہوتا کہ وہ لفظ قبول کیے جاتے جو چلن میں ہیں، اس کے لیے نہ قاموس کے ورق کھولے جاتے اور نہ شبد ساگر سے دیکھ دیکھ کر بولے اور لکھے جاتے لیکن افسوس کہ میری یہ تحریک عام طور سے کام یاب نہ ہوسکی، اس کا سبب صرف ایک تھا کہ ہمارے سیاسی ہندی کے حامی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ ہندی یعنی سنسکرتی ہندی کو اس صوبہ کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا کر چھوڑیں گے، اس خیال کے حامی اگر صوبہ کی تعلیمی وزارت، مجلس قانون ساز کی صدارت اور ہماری سب سے پرانی تعلیم گاہ (یونیورسٹی) کی وائس چانسلری کی کرسیوں پر ہوں تو نتیجہ کے متعلق فیصلہ مشکل نہیں۔

ہندی کے بعض حامیوں کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں پیدا ہوئی اور صرف ان لوگوں کی زبان رہی جو درباروں سے تعلق رکھتے تھے، باقی سارے ملک کی زبان ہمیشہ ہندی ہی رہی، افسوس ہے کہ یہ نظریہ ایک بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ علمی اور تاریخی مسئلوں میں بھی تنگ نظری حقیقت کو کس طرح بدلنے پر مجبور کرتی ہے، اردو کی ہزار سالہ تاریخ اب سامنے آگئی ہے، اس کو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ زبان عوام، جھونپڑوں، بیوپاریوں کی دوکانوں، لشکریوں کے خیموں اور فقیروں کی خانقاہوں سے نکل کر بادشاہوں کے درباروں تک پہنچی ہے، دربار سے بازار تک پہنچی اور

یہی واقعہ اردو کی ملکی ضرورت کے راز کو فاش کر رہا ہے[۱]۔ (معارف شذرات جولائی ۱۹۴۲ء)

سید صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف، اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری: سر شاہ سلیمان خود صاحب علم اور اہل علم کے بڑے قدر شناس تھے، انہوں نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانہ میں سید صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف میں ان کی خدمت میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرنے کی تجویز منظور کرالی تھی، اس پر ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر ضیاالدین صاحب کی وائس چانسلری کے زمانہ میں عمل ہو سکا اور فروری ۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی سید صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عبد الحق صاحب کی خدمت میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی، مگر اس وقت سید صاحب اس منزل سے گزر چکے تھے، وہ خود فرماتے تھے کہ جو زمانہ اس کی طلب کا تھا اس وقت نہیں ملی اور اب اس کی طلب باقی نہیں رہی، اس لیے اپنے نام کے ساتھ کبھی ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کیا۔

عیسائی اور یہودی مصنفین کی ایک خطرناک طریقہ پر تنبیہ: عیسائی اور یہودی مصنفین حالات اور ضرورت کے لحاظ سے ہر زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ خطرناک طریقہ ان کے مسائل پر غیر جانب دارانہ علمی بحث و نظر کا ہے، اس میں وہ ایسا زہر بھر دیتے ہیں جو کھلے ہوئے حملوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، اس پر فریب طریقہ کی جانب سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عیسائی اور یہودی مصنفین نے اسلام اور اسلامی مسائل پر اظہار رائے کا جو طریقہ بظاہر ناطرف دارانہ علمی طرز بیان کا اختیار کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ اپنے مقصد کے لحاظ

---

[۱] ہندوستانی اکیڈمی کا پرانا نام اگرچہ اب بھی قائم ہے اور اس کے ممبروں میں نام کے لیے کچھ اردو کے خدام بھی ہیں لیکن اب وہ عملاً ہندی اکیڈمی بن چکی ہے، اردو کا نام تو الگ رہا اس کے جلسوں میں جو تقریریں ہوتی ہیں وہ اردو والوں کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔

سے عام مناظرانہ طریقوں سے زیادہ زہرناک ہے، اس کا کاٹا بچ نہیں سکتا، یہ آہستہ آہستہ سرایت کرنے والا زہر ہے، جو بظاہر علم وادب کی تاریخ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، جو نامعلوم طریق سے اچھے اچھے مسلمانوں کو متاثر کر لیتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہونے پاتا کہ یہ زہر کہاں چھپا تھا:

ع قند میں زہر ملا تھا مجھے معلوم نہ تھا

مخالفانہ پروپگنڈے کا یہ طرز اب اس قدر عام ہو رہا ہے کہ سیاست سے نکل کر یہ مذہب میں بھی داخل ہو رہا ہے اور دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کی وسعت میں دشمن تو دشمن دوست بھی داخل ہو رہے ہیں اور پھر اس پر خوش ہیں کہ ہم نے مذہب وملت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے:

ز نادانی براد کرد، ہمدم کار من ضائع عجب تر ایں کہ برمن منت بسیار ہم دارد

گذشتہ اپریل ۴۲ء میں شہر بوسٹن میں امریکن اورینٹل سوسائٹی کی صد سالہ یادگار منائی گئی، اس میں بہت سے دل چسپ مقالے پڑھے گئے، ان ہی میں ایک مقالہ میں عباسی داعیوں کے اصول تبلیغ (پروپگنڈے) کی تشریح کی گئی، جن سے کام لے کر عباسی داعیوں نے بنی امیہ کا تختہ الٹنے میں کامیابی حاصل کی، پھر ان اصول کا پروپگنڈے کے جدید ترین اصول سے موازنہ کیا گیا اور مسلمانوں کی ان جدید تحریکات پر جو ہندوستان، مصر اور شام میں اس وقت چل رہی ہیں نظر ڈالی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اسلامی ملکوں میں کوئی اسلامی تحریک جاری ہی نہیں ہے، جو ہے وہ اسلامی تحریک نہیں بلکہ مسلمانوں کی تحریک ہے یعنی مسلمان نام قوم کو دوبارہ سیاست وسلطنت کی دنیا میں کیوں کر برتری حاصل ہو اور اس کی صورت یہ ہو رہی ہے کہ جن کو مفکرین اسلام کہا جاتا ہے وہ دنیا کی موجود برسرعروج قوموں کی ایک ایک خصوصیت کو لے کر دیکھتے ہیں کہ شاید یہ خصوصیات ان کے اقبال کی حقیقی علت تو نہیں، پھر ان ہی چیزوں کی تحریک مسلمانوں میں کرتے ہیں، قومیت، وطنیت، اقتصادیت، عسکریت، تنظیمیت، لادینیت، بے پردگی، بے حیائی، اخلاقی و مذہبی آزادی وغیرہ یورپین قوموں کے خصائص کو لے کر ان کے عروج کا راز دریافت کرتے ہیں اور اسی راز سے مسلمانوں کو آشنا کر کے اس پر اپنی اسلامی تحریک کی بنیادیں ڈال رہے ہیں حالاں کہ

ع مایۂ طینت آدم زخمیر دگر ست

صحیح اسلامی تحریک اور اس کا طریقہ: اصلی اسلامی تحریک وہ ہے جو اسلام کے صحیفہ ربانی اور ارشادات نبویؐ پر مبنی ہو، جس میں وہ اصول یک جا کیے گئے ہوں جن پر تیرہ سو برس پہلے مسلمانوں کی تعمیر کی گئی تھی، تیرہ سو برس پہلے بھی جب رسول اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرب میں اسلام کی دعوت پیش کی، اس وقت ایران وروم کی بڑی بڑی قومیں موجود تھیں، جن میں وطنیت بھی تھی، قومیت بھی تھی، تعلیم بھی تھی، سلطنت بھی تھی، عسکریت بھی تھی اور ان کے نام کا دبدبہ بھی عربوں پر چھایا ہوا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان ترقی یافتہ دولت مند قوموں کی خصوصیات کی نقل اتارنے کی دعوت نہیں دی اور نہ ان کو کسریٰ کے اصولوں کی تعلیم دی اور نہ قیصریت کے اصولوں سے باخبر کیا، بلکہ دنیا کی تمام قوموں سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے اصول کو سب کے سامنے پیش کیا جن کو بہ دل قبول اور ان پر عمل سے ان کو وہ سب کچھ ملا جس میں دین ودنیا کی بہتری تھی، ان کو آسمان کی بادشاہت کی دعوت دی گئی تو زمین کی بادشاہی بھی ان کو مل گئی، اب بھی آسمان کی بادشاہی کی طلب سے زمین کی بادشاہی مل سکتی ہے اور آسمان کی بادشاہی کا دروازہ ہم پر کیوں کر کھل سکتا ہے، صرف دو کنجیوں سے، ایمان کامل اور عمل صالح، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و	خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور
عملوا الصلحت لیستخلفنّھم فی	نیک کام کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں
الارض کما استخلف الذین من قبلھم	حکومت بخشے گا جیسے ان سے پہلوں کو اس نے بخشا
(نور-۵۵)	تھا۔ (معارف اپریل ۱۹۴۳ء)

تبلیغی جماعت کے متعلق تاثر اور اس کے اجتماع میں تقریر: اس زمانہ میں تبلیغی جماعت کا کام شروع ہو چکا تھا لیکن اس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کاندھلوی سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور تبلیغی جماعت کے کاموں کی نوعیت سے بھی ان کو پوری

واقفیت نہیں تھی، جولائی ۱۹۴۳ء میں مولانا محمد الیاسؒ سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی اور ان سے ان کے طریقہ دعوت پر گفتگو کی اور اس کو سمجھا اور اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود اس کے اجتماع میں شریک ہو کر تقریریں کیں، اس کی پوری روداد معارف میں قلم بند فرمائی ہے، اس کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے:

''۱۱ر جولائی کی دوپہر کو تھانہ بھون اسٹیشن پر حسن اتفاق سے حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بستی نظام الدین دہلی میں تبلیغ دین کی دعوت کا کام پندرہ سولہ برس سے شروع کر رکھا اور جن کے فیض اثر سے میوات کے علاقہ میں جہاں تیس چالیس لاکھ نو مسلموں کی آبادی ہے، انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے، حضرت ممدوح کے نام اور کام سے تو پہلے سے آشنا تھا، ہمارے مدرسہ دار العلوم ندوۃ العلما کے بعض مدرسین اور طلبہ ان کی خدمت میں حاضر، ان کی صحبت سے مستفید اور ان کے تبلیغی کاموں میں شریک ہوتے رہے لیکن خاک سار ابھی تک ذاتی طور سے ان کی ملاقات سے محروم اور ان کے کاموں کی نوعیت اور حقیقت سے لاعلم تھا، تھوڑی دیر اسٹیشن پر اور پھر تھانہ بھون سے کاندھلہ تک ریل پر گھنٹہ دو گھنٹہ ان کا ساتھ رہا اور ان کی دعوت کے مقصد اور طریق کو سمجھتا رہا، بحمد اللہ کہ انہوں نے اتنی دیر میں جو کچھ فرمایا، وہ دل میں ایسا پوری طرح اتر گیا کہ موصوف کے ارشاد پر ان کے ایک جلسہ میں جو دہلی حبش خاں کے پھاٹک میں ۱۲ر جولائی کی شب کو ہوا تھا، خاک سار نے دعوت کے مقاصد پر تقریر کی۔

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ شَيْئًا هَيَّأَ أَسْبَابَهُ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کا سامان بھی پیدا کر دیتے ہیں، ندوہ کے بعض حضرات مدرسین اور ان میں سے خصوصیت کے ساتھ برادر عزیز و محبوب مولانا ابو الحسن علی سلمہ اللہ تعالیٰ ورفع شانہٗ (حضرت مولانا سید عبد الحئی صاحبؒ سابق ناظم ندوۃ العلما کے چھوٹے صاحب زادے) جن سے ہماری بڑی توقعات قائم ہیں، مولانا کاندھلوی کے اوصاف جمیل اور ان کی دعوت کے مقاصد و مہمات کے گرویدہ تھے اور مجھ سے بار بار ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اور ان کو لکھنؤ لانے کے باب میں مجھ سے مشورہ چاہا کرتے تھے لیکن

چوں کہ ابھی اس کا مقررہ وقت نہیں آیا تھا اس لیے یہ کام مشورہ سے آگے نہیں بڑھا لیکن عین اس وقت جہاں ان سے تھانہ بھون اور دہلی میں میری ملاقات ہوئی، ان کے لکھنؤ کے سفر کا پروگرام تیار ہو گیا اور مولانا ابوالحسن علی اور ان کے رفقا کی دعوت پر مولانا نے مع رفقا اور مبلغین کے لکھنؤ کا عزم کر لیا، چنانچہ جولائی کے تیسری ہفتہ سے چوتھے ہفتہ تک یہ حضرات آتے رہے اور یہ دارالعلوم ندوۃ العلما کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں سب نے ایک عشرہ قیام کیا، مبلغین کا بڑا حصہ مدرسہ کی مسجد میں مقیم رہا اور یہ کہیے کہ گویا ایک ہفتہ عشرہ دارالعلوم نے وہ روحانی منظر دیکھا جو اس کے سیکڑوں تزک و احتشام والے زرق برق تماشوں سے بالکل الگ تھا، یہ فقرا کا مجمع تھا اور صلحا و اتقیا کی جماعت تھی، جس کے سامنے رضائے الٰہی کے حصول کے سوا دنیا کا کوئی مقصد نہ تھا، جو تھا اسی راہ سے تھا اور جو چاہا جاتا تھا وہ اسی نسبت سے۔

ان بزرگوں کو دیکھا جن کے سینوں میں ہندوستان میں اسلام کے احیا اور مسلمانوں کی اصلاح کی دھن تھی، ان کی نمازوں میں، ان کی دعاؤں میں، ان کے تہجد میں، ان کی شب بیداریوں میں، ان کے ذکر و شغل میں رضائے الٰہی کی طلب کا نور جھلکتا تھا، ان کی کوششوں کا محور خدا کی خوش نودی کی خاطر مسلمانوں میں دین توحید کی صحیح تعلیم و تلقین، کلمہ مبارکہ کی تصحیح، نماز پنج گانہ کی تبلیغ اور داعیوں اور مبلغوں کی جماعت بنا بنا کر اطراف و دیار میں مجاہدانہ سرفروشی کے ساتھ مہاجرت کا صحیح جذبہ تھا، میں نے اس دعوت کو جہاں تک سمجھا ہے، اس کی تعبیر یوں کی کہ نام کے مسلمانوں میں حقیقی اسلام کی از سر نو تبلیغ ان ہی اصولوں پر ہو سکتی ہے جن اصولوں پر جناب سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، ایک اور مقرر نے اس کو چلتے پھرتے مدرسہ و چلتی پھرتی خانقاہ سے تعبیر کیا ہے۔'' (معارف ستمبر ۱۹۴۳ء)

سید صاحب نے ندوہ کی اجتماع میں تقریر فرمائی، پھر اس کے ساتھ کان پور تشریف لے گئے اور وہاں بھی تقریر فرمائی۔

حیاتِ شبلی کی اشاعت: مولانا شبلی کی زندگی میں بعض لوگوں نے ان کی سوانح عمری لکھنی

چاہی تھی جس کی انہوں نے اجازت نہیں دی اور اس کام کے لیے بھی ان کی نظر اپنے لائق جانشین ہی پر پڑی تھی، چنانچہ ایک خط میں ان کو لکھا تھا کہ:

''جب تم دنیا کے دوسرے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا۔''

سید صاحب نے استاد کی بعض یادگاریں مکاتیب شبلی، مقالات شبلی شائع کی، مگر دوسری مصروفیات کی وجہ سے سوانح عمری کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر استاد کی وصیت ہمیشہ پیش نظر رہی، اس لیے جب سیرت نبویؐ کی تالیف سے ایک حد تک فرصت ملی تو حیات شبلی کی تالیف شروع کی اور دوڈھائی سال کی جانکاہ محنت کے بعد اس کو مکمل کیا اور وہ فروری ۴۴ء میں شائع ہوئی، مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع تھی اور ان کے کام کے بڑے گوناگوں ہیں، اس لیے ان کی سوانح عمری تنہا ایک شخص کی سرگذشت نہیں بلکہ ان کے عہد کے مسلمانوں کی پوری مذہبی، علمی، ادبی وتعلیمی اور قومی و سیاسی تاریخ ہے اور یہی ان کی آخری تصنیف بھی ہے۔

جنوبی ہند کا سفر اور دو صدارتیں: ۱۹۴۴ء کا بڑا حصہ صحت کی خرابی میں گزرا، اسی سنہ کے آخر میں ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۴۴ء کے شعبہ تاریخ ازمنۂ وسطیٰ ہند اور جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی کے اجلاس منعقدہ فروری ۴۵ء کی صدارت پیش کی گئی۔

ہندو مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان کی تاریخ میں جو زہر بھرا تھا اس کی تصحیح و اصلاح ہندوستان کے بہی خواہ مؤرخین کے ہمیشہ پیش نظر رہی، سید صاحب کا تو یہ خاص موضوع تھا، وہ خود بھی اس پر لکھتے رہتے تھے اور دوسرے مؤرخین کو بھی توجہ دلاتے تھے، ہسٹاریکل کانگریس میں اس مسئلہ کو پیش اور اس پر اظہار خیال کرنے کا بہت اچھا موقع تھا، اس لیے صحت کی خرابی کے باوجود صدارت قبول کر لی اور آخر دسمبر ۴۴ء میں مدراس کا سفر کیا اور کانگریس کے اجلاس میں ایک فاضلانہ خطبہ صدارت پڑھا جس میں ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کا ہر پہلو سے ناقدانہ جائزہ لیا اور علمی و تاریخی دونوں نقطہ نظر

سے بہت بیش قیمت مشورے دیے، جس کو اہل علم نے بہت پسند کیا، یہ خطبہ صدارت اپریل ۱۹۴۵ء کے معارف میں چھپا ہے۔

اس سفر میں مختلف مقامات پر مذہبی تقریریں بھی ہوئیں، ویل ویشارم میں ملت محمدیہ کی حقیقت پر اور دارالسلام عمرآباد میں عبدیت پر تقریر فرمائی۔

مدراس سے بمبئی کا سفر کیا اور جمعیۃ العلما صوبہ بمبئی کے اجلاس کی صدارت فرمائی، اس کا خطبہ صدارت خالص دینی تھا، اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر کی روشنی میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا اور دین پر عمل کی تلقین فرمائی، یہ خطبہ صدارت مئی ۱۹۴۵ء کے معارف میں چھپ گیا ہے۔

اسی سفر میں انجمن اسلام بمبئی میں اردو زبان پر صابو صدیق ہال میں ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت پر اور ایک دوسرے اجتماع میں توبہ وانابت پر تقریریں ہوئیں۔

بمبئی سے حیدرآباد کا سفر کیا، اس کا مقصد ندوۃ العلما کے لیے حصول امداد تھا، اس لیے زیادہ وقت اسی میں گزرا اور اس میں کامیابی بھی ہوئی۔

حیدرآباد میں گاندھی جی کا خط ملا، انہوں نے قومی زبان کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا تھا، اس لیے حیدرآباد سے واپسی میں واردھا ٹھہرے اور قومی زبان کے مسئلہ پر اپنے خیالات پیش کیے جس کا خلاصہ سید صاحب کے الفاظ میں یہ تھا:

> ''میں نے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیا اور یہ عرض کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہیے جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے، اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی مذہبی وتمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا مآخذ عربی وفارسی وترکی ہونے میں کوئی چارہ نہیں اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی وتمدنی خصوصیات کے لیے ہونی چاہیے، اس کے بعد عرض کیا گیا کہ زبان کے لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیے، اب اس

وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگلش کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے وہ ہماری زبان کا صحیح لفظ ہے۔"

(اس سفر کی پوری روداد معارف اپریل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی ہے۔)

مشترکہ قومی زبان کے بارہ میں اس قسم کی تجویزیں عبدالحق راجندر پیکٹ میں بھی تھیں، اس میں یہ بھی تھا کہ یہ اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی لیکن یہ سب تجویزیں سیاست کے نذر ہو گئیں۔

نیاز فتح پوری کا ایک نیا شگوفہ اور اس کا جواب: نیاز فتح پوری نے غیر مسلموں اور آزاد مشرب مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے الحاد و بے دینی کی تبلیغ کو ذریعہ بنایا تھا، اس سلسلہ میں وہ اسلام پر بھی تنقید کرتے رہتے تھے اور جب کوئی خطرہ محسوس کرتے تو توبہ کا اعلان کر دیتے تھے، کچھ دنوں کے بعد پھر پرانی روش پر آ جاتے، چنانچہ ۱۹۴۵ء میں پھر ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔

بیسویں صدی کے شروع میں یا اس سے کچھ پہلے ایک انگریز مشنری ڈاکٹر ٹسڈل نے "ینابیع الاسلام" کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی، جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ کلام مجید خدا کا کلام نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اور اسلام یہودی، عیسائی اور دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہے، اس کتاب کے انگریزی، عربی اور اردو ترجمے بھی شائع کیے تھے، اسی زمانہ میں مسلمان اہل علم نے اس کا جواب لکھا تھا، عربی میں "التطبیق بین الدیانة الوثنیة والمسحیة" کے نام سے مصر سے جواب شائع ہوا تھا، اردو میں پنجاب کے کسی صاحب نے جواب لکھا تھا، خواجہ کمال الدین مرحوم نے ینابیع المسیحیت کے نام سے اس کا الزامی جواب لکھا، پروفیسر نواب علی مرحوم کی قصص الحق اور صحف سماوی درحقیقت اسی کتاب کا جواب ہے، جس کا جواب عیسائیوں سے نہ ہو سکا۔

ٹسڈل کی کتاب کو دنیا بھول چکی تھی، اتفاق سے کہیں سے نیاز فتح پوری کے ہاتھ

آ گئی، انہوں نے بڑے زور و شور سے اس کو اچھالا اور ٹسڈل کی کتاب میں جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اپنی حاشیہ آرائی سے پورا کر دیا اور خود بھی اسلام کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے اور علما سے اس کا جواب مانگا، راقم سطور نے مارچ ۴۵ء کے معارف میں ٹسڈل کی کتاب کی حقیقت ظاہر کی۔

نیاز صاحب نے اس سلسلہ میں سید صاحب سے بھی خط و کتابت کی مگر ان کو کسی جواب سے تشفی نہیں ہوئی، سید صاحب نے نیاز صاحب کے خیالات اور خط و کتابت کے متعلق اگست ۱۹۴۵ء کے معارف میں لکھا:

''نگار کے ملحدانہ مضامین کچھ نئے نہیں ہیں، گو رنگ بدل کر وہ کتنے ہی اسلوب اختیار کرے اس کا مآخذ اصل کفر ہی ہے، ابھی اس کے مدیر میں اپنے مذہب کا خاکہ کھینچا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حساس قلب مصلح دل و دماغ اور حکیم فطرت انسان تھے، انہوں نے گرد و پیش کی قوموں سے بہت عمدہ باتیں سن کر اور ان کو اپنا کر اپنا شاعرانہ دیوان قرآن نام جمع کیا، اب اگر بقول ٹسڈل دوسری کتابوں سے کچھ لے کر اس میں شامل کر دیا گیا ہو تو اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات میں کوئی فرق نہیں آ سکتا ہے''، یہ ہے اس مضمون کا خلاصہ جس کا ماننے والا ظاہر ہے کہ کسی طرح مسلمان نہیں کہلایا جا سکتا اور جس کا مقصد یہ ہے کہ ٹسڈل کے ہفوات تمام تر صحیح ہیں اور نگار کے عقیدہ کے مطابق ہیں۔

مدیر نگار سے میں نے خط لکھ کر مطالبہ کیا اور اب بھی کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ٹسڈل کے نام سے وہ جس کتاب کا اشتہار بار بار دے رہا ہے وہ اس کے صحیح نام اور اس مطبع سے جس سے وہ چھپی ہے اور جو نسخہ اس کے پاس ہے اس کے سال و مقام طبع سے مطلع کرے یا وہ تھوڑی دیر کے لیے دفتر معارف میں بھیج دے تا کہ یہ معلوم ہو کہ جو ترجمہ اس نے شائع کیا ہے وہ ٹسڈل کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے بھی یا نہیں یا اسی پرانے ینابیع القرآن کا دوسرا ایڈیشن ہے، جس کو مدیر نگار کے جودت نگار قلم نے خود گھڑ کر تیار کیا ہے اور اس کے لیے ھل من مبارز کا نعرہ بار بار لگ رہا ہے۔

اعتراض کا یہ اچھا طریقہ ہے کہ آپ بایں ہمہ جہل و نادانی اپنے دفتر میں چودھری بن کر بیٹھیں اور علما سے جواب کا مطالبہ کریں اور جو جواب وہ دیں اس میں کسی کو ناقص اور کسی کو غیر تسلی بخش کہہ کر استہزا کریں، گویا حافظ نے یہ شعر اسی دن کے لیے کہا تھا:

نگار ما بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت　　　بہ یک نگاہ ادب آموز صد مدرس شد

اس طرح تو کسی سوال کا کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا، معترض کا کام کتنا آسان ہے کہ لوگ اس کو جوابات دیتے جائیں اور وہ سب سن کر آخیر میں کہہ دے کہ تسلی نہیں ہوئی، ایسے ہی لوگوں کے باب میں قرآن پاک کا یہ فتویٰ ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔

مدیر نگار نے اس اپنے اس مضمون میں اپنے اسلام کی حقیقت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ وہ مذہب ہے جس کو عرب کے مصلح اور حکیم نے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر بنایا ہے اور اپنے ان تجربات کے تاثرات کو قرآن پاک میں اپنے لفظوں میں ادا کیا ہے، خدا کا عقیدہ قیامت اور جنت و دوزخ کے عقائد برائے بیت ہیں، عبادات وغیرہ رسوم ہیں، اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار دیکھنا چاہیے اور وہی عین اسلام ہے لیکن کیا ایسے شخص کا کردار سراہنے کے قابل ہو سکتا ہے جو عمر بھی یہ جھوٹ بولتا رہا کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے اور فرشتوں کے ذریعہ خدا کا پیغام اس کے پاس آتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے وہ خدا کی بولی ہے، حالاں کہ وہ ساری اسی کی بنائی ہوئی ہے اور اس کی اپنی ایجاد ہے، مگر لوگوں کو سمجھانے اور منوانے کے لیے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے زیادہ شدید الزام کسی پاک ہستی پر اور کیا ہو سکتا ہے۔

مدیر نگار نے اپنے پیچ و خم سے جو بات کہی ہے وہ نئی نہیں ہے، ہر زمانہ کے زنادقہ یہی کہتے آئے ہیں کہ انبیا علیہ السلام نے عوام کی بھلائی کے لیے یہ جھوٹ گھڑ لیا ہے، گویا مذہب ایک دروغ مصلحت آمیز ہے، باطنی اسی خیالات کو تاویلات فاسدہ کے رنگ میں پیش کرتے ہیں، یہ زمانہ آزادی کا ہے اس لیے تاویل کے پیرایے کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے، بے پردہ وہ بات کہہ

دی گئی اور پھر اس پر اسلام کا دعویٰ:

ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ظاہر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مسلمانوں پر اس لحاظ سے واجب نہیں کہ آپ عرب کے حکیم یا انسانیت کے مصلح تھے، بلکہ اس لیے واجب ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں اور رسول اللہ کا تصور بغیر اس کے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے ممکن ہی نہیں ہے۔'' (معارف اگست ۴۵ء)

راندیر کا سفر: اگست ۴۵ء میں جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ امتحان کے لیے راندیر تشریف لے گئے اور جامعہ حسینیہ میں دینی اور دنیاوی علوم کی تحصیل میں جد و جہد کے عنوان سے ایک تقریر فرمائی، یہ تقریر طویل ہے، اس کے آخر میں اس تقریر کا لب ولباب یہ بیان فرمایا:

''اس تقریر کی بنا پر ہمارے ذمہ دو قسم کے علوم کی تعلیم ضروری ہے، ایک وہ جس سے امور معاش حاصل ہو اور دوسرے وہ جن سے علوم معاد کی راہ کھلے اور دونوں اگر احکام الٰہی کے تحت ہوں تو ہمارے لیے قرب و رضا کے حصول کے ذرائع ہیں، ہمارے یہ مدرسے اس زمانہ میں جب اسلام کی سلطنت تھی، دونوں علوم کے لیے کافی تھے، علما ہی ان علوم کو پڑھ کر سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچتے تھے یا تجارت کی دوکانوں پر بیٹھتے تھے اور دوسرے ذرائع معاش پیدا کرتے تھے، ساتھ ہی علوم دین کے سرچشمہ سے بھی سیراب ہوتے تھے مگر اب جب سے زمانہ بدل گیا ہے ہمارے یہ مدرسے زیادہ تر علوم معاد کی تعلیم کے لیے مخصوص ہوگئے ہیں اور علوم معاش کے لیے سرکاری انگریزی مدرسے کھولے گئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان معاشی مدرسوں کے طالب علم معاد کے علوم سے بے بہرہ رہتے ہیں اور عربی مدرسوں کے فارغ معاش کی طرف سے پریشان رہتے ہیں، یہی سبب ہے کہ عربی تعلیم شریف اور اونچے خاندانوں سے رخصت ہو رہی ہے اور اب ہمارے عربی مدرسے صرف غریبوں سے آباد ہیں، ضرورت ہے کہ ہمارے اہل فکر اس کے تدارک کا سامان کریں اور اس کی صورت یہی ہے کہ معاشی مدرسوں میں مذہبی تعلیم کا اور مذہبی تعلیم گاہوں میں ایسی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے جو رزق کی راہ بھی کھولے۔

ہمارے علوم معاد در حقیقت تفسیر و حدیث و فقہ اور کلام ہیں اور ان کے لیے بطور آلہ کے صرف ونحو و ادب ہیں، ان کے علاوہ یونانی عقلیات کا بڑا دفتر ہے، ضرورت ہے کہ علوم عالیہ یعنی صرف ونحو و ادب کی تعلیم میں سہولت کی راہ اختیار کی جائے اور سخت ومشکل وپیچیدہ کتابوں کی جگہ آسان، سہل اور واضح کتابیں رکھی جائیں اور علوم عقلیہ کے متعلق اب ہمارے علما کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ علوم ہمارے اسلاف نے صرف اس لیے اختیار کیے تھے کہ ان کے ذریعہ ابنائے زمانہ کے شکوک وشبہات دور کیے جائیں، اب نہ وہ لوگ رہے نہ ان کے شکوک رہے ہیں، اب ان کے شکوک وشبہات کے دروازے دوسرے علوم ہیں، اس لیے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے علما ان نئے علوم سے واقف ہوں اور ان کے ذریعہ اس زمانہ کے شکوک وشبہات کا ازالہ کریں۔

ہمارے زمانہ میں ہمارے مدارس میں دوسری سب سے بڑی یہ کمی ہوگئی ہے کہ ہمارے سلف صالحین کی مجالس تعلیم اگر یعلمھم اور یزکیھم یعنی تعلیم اور تزکیہ دونوں نبوی طریقوں کی جامع تھیں تو اب وہ صرف یعلمھم یعنی تعلیم کا مظہر ہو رہ گئی ہیں اور یزکیھم یعنی تزکیہ کا نور ہماری درس گاہوں سے مٹتا جاتا ہے، اب نبوی طریق مدرسوں اور خانقاہوں میں بٹ گیا ہے، مدرسے تزکیہ کے نور سے اور خانقاہیں تعلیم کی روشنی سے خالی ہیں، بڑی ضرورت اس کی ہے کہ ان دونوں خصوصیتوں کو پھر ایک چہاردیواری میں جمع کیا جائے، اس کے بغیر یہ عربی مدرسے مذہبی مدارس نہیں کہے جاسکتے اور نہ ان کے فارغین کے ذریعہ مسلمانوں کی ہدایت کا کام پورا ہوسکتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم میں بھی اس پہلو پر زور دیا جائے اور تربیت میں اس پر سختی سے عمل کیا جائے اور ایسے مدرسین کا انتخاب کیا جائے جو علم وعمل دونوں کے جامع ہوں اور خصوصیت کے ساتھ اہل دل کی صحبتوں اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق ان کے دل میں پیدا کیا جائے۔" (معارف ستمبر ۱۹۴۵ء)

بمبئی میں دینی درس گاہ کے قیام کی تحریک اور اس کا افتتاح: بمبئی میں یوں تو عربی کے بہت سے مدرسے تھے لیکن وہ سیٹھ صاحبان کی فیاضی اور ان کے نیک نیت بزرگوں کے اوقاف کی آمدنی سے چل رہے ہیں، مگر ان مدارس کی حیثیت ذاتی املاک کی تھی،

ان کا سارا انتظام ان ہی کی مرضی پر تھا، وہ اپنے مذاق اور رجحان کے مطابق جس طرح چاہتے تھے، ان کو چلاتے تھے اور ان کی منشا کے مطابق ان کا قالب بدلتا رہتا تھا، بمبئی جیسے شہر میں اس زمانہ میں عام مسلمانوں کا کوئی مدرسہ نہیں تھا جو غریب مسلمانوں کی مدد سے چلتا ہو اور ان کی رائے اور مشورے کو اس میں دخل ہو، اس لیے حضرت سید صاحب جمعیۃ العلما صوبہ بمبئی کے جلسہ کی صدارت کے موقع پر (فروری ۱۹۴۵ء) اپنے خطبہ صدارت میں بمبئی کے مسلمانوں کو ایک عام اور آزاد مدرسہ کے قیام کی طرف توجہ دلائی تھی، جس میں صحیح دینی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو اور جس کے ذریعہ بمبئی میں رد بدعات و قیام سنت اور دوسرے مذہبی کام انجام پاسکیں، اہل بمبئی نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس تجویز کا استقبال کیا اور اس کے چند ہی مہینوں کے بعد سفر راندیر کے موقع پر حضرت سید صاحب کے مبارک ہاتھوں سے اس کا سنگ بنیاد رکھوایا، سید صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں طلبہ کی مذہبی تربیت واخلاقی نگہداشت اور بمبئی جیسی تماشا گاہ کی دل چسپیوں سے الگ اور محفوظ رکھنے کی جانب خاص طور سے توجہ دلائی۔

شدید علالت: عمر کے تقاضے، کثرت کار اور مسلسل سفروں کی وجہ سے ادھر کئی سال سے سید صاحب کی صحت خراب رہنے لگی تھی لیکن عمر بھی کی عادت کا چھوڑنا مشکل تھا، پاس مروت سے قدر دانوں کے اصرار سے سفر کا سلسلہ بھی نہ روک سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راندیر کے سفر کی واپسی کے بعد سخت بیمار پڑ گئے اور حوالی قلب میں ریاحی درد کا اتنا سخت دورہ پڑا کہ بڑی نازک صورت پیدا ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے اس سے تو شفا دی مگر اطبا نے علمی کام اور سفر چھوڑ کر مکمل آرام کا مشورہ دیا، پہلے دارالعلوم ندوۃ العلما میں جس کے وہ برسوں سے معتمد تعلیم چلے آرہے تھے اور اس کے جملہ کاموں میں مشیر رہتے تھے، قیام کا ارادہ کیا، مگر وہاں بھی دماغی سکون ملنا مشکل تھا، اس لیے اس ارادہ پر عمل نہ ہوسکا، اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک ایسی صورت نکل آئی جس میں پورا ذہنی سکون تو نہیں مل سکتا تھا لیکن سفر اور محنت شاقہ سے نجات مل جاتی تھی۔

باب ہفتم

قیام بھوپال

۱۹۴۶ء--۱۹۵۰ء

ریاست بھوپال کو دین داری اور دینی تعلیم میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا، بھوپال کے مدار المہام منشی جمال الدین اور ان کے بعد نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ میں اس میں اور اضافہ ہوا، نواب صاحب خود نامور عالم اور علما اور اہل کمال کے بڑے قدر داں تھے، ان کی دین داری اور علما نوازی سے اس زمانہ میں بھوپال علما اور اہل کمال کا مرکز بن گیا تھا اور عرب تک کے علما کھینچ کر بھوپال میں جمع ہو گئے تھے، نواب صاحب نے دینی تعلیم کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا تھا، جس کے ماتحت بہت سے مدارس تھے لیکن ان کے بعد رفتہ رفتہ اس کی حالت بہت گر گئی تھی، نواب حمید اللہ خاں بڑے بیدار مغز حکمراں تھے، انہوں نے عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم کی طرف توجہ کی اور اس کام کے لیے ان کی نگاہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی اور انہوں نے سید صاحب کی صدارت میں علما کی ایک کمیٹی مقرر کی، اس نے ان مدارس کا نیا نصاب مرتب کیا اور اس کی اصلاح و تنظیم کے ضوابط بنائے، ان کو عمل میں لانے کے لیے امیر جامعہ کا عہدہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا، اس سے پہلے عہدہ افتا کی پیش کش بھی کر چکے تھے لیکن سید صاحب دار المصنفین کو چھوڑ کر کوئی

عہدہ قبول کرنا پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ وہ مختلف زمانوں میں مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے بڑے بڑے تعلیمی عہدوں سے انکار کر چکے تھے مگر نواب صاحب کا اصرار برابر جاری رہا۔

امیر جامعہ قاضی القضاۃ بھوپال: یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالمصنفین میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے (ان کی تفصیل آئندہ آئے گی) کہ سید صاحب کا سکون خاطر مفقود ہو گیا تھا جس کا تحمل اب ان کی عمر اور صحت نہیں کر سکتی تھی، اس لیے دارالمصنفین سے شدید قلبی لگاؤ کے باوجود یہاں کے قیام سے بددل ہو گئے تھے، آخر میں نواب صاحب کا اصرار سید صاحب کے انکار پر غالب آ گیا اور انہوں نے بڑی کشمکش کے بعد جون ۱۹۴۶ء میں اس شرط کے ساتھ قاضی القضاۃ ریاست اور امیر جامعہ کا عہدہ قبول کر لیا کہ دارالمصنّفین اور ندوہ سے ان کا تعلق بدستور قائم رہے گا اور وہ ان کی دیکھ بھال کے لیے وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے[1]۔

اس کی تفصیل خود سید صاحب نے ستمبر ۱۹۴۷ء کے معارف میں تحریر فرمائی ہے:

> ''آج کل خاک سار بھوپال میں ہے اور عجب نہیں کہ یہ اقامت کچھ دراز ہو، واقعہ یہ ہے کہ وسط ہند کے ظلمت کدہ میں یہی ایک اسلامی مرکز ہے، یہاں علم کی مشعل حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے خاندان سے مولانا عبدالحئی بڈھانوی کے صاحب زادے مولانا عبدالقیوم صاحب لائے تھے اور معرفت کا نور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خانوادے کے چشم و چراغ حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی جو حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی کے خلیفہ تھے، لائے اور بحمداللہ کہ یہ چراغ اب بھی روشن ہے، پھر منشی جمال الدین خاں مدارالمہام اور نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ میں عرب و ہند کے بہت سے علماو فضلا کا یہاں مجمع ہو گیا تھا جن کی یاد بھی اب فراموش ہو چکی ہے۔

---

[1] حضرت سید صاحب مہینوں ان دونوں عہدوں کو قبول کرنے کے بارے میں کشمکش میں مبتلا رہے، راقم سے بھی انہوں نے رائے پوچھی، میں نے عرض کیا کہ کسی ادارہ کے بانی کو اسے چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی یہ پہلی مثال ہوگی، فرمایا کہ یہ تو صحیح ہے مگر دارالمصنفین میں سکون کے ساتھ رہنے کی شکل کیا ہے، اس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

زمانہ کا جو انقلاب عہد انگریزی سے شروع ہوا اس کے اثرات آخر کار اسلامی ریاستوں میں بھی پہنچے اور انگریزی تعلیم کے سامنے علوم عربی و شرقی کا زوال دیکھتے دیکھتے آنکھوں کے سامنے ہوگیا، بھوپال جو کبھی علما و طلبا کا منزل مقصود تھا، نئی تعلیم کے فروغ نے اس کو بالکل مات کر دیا، یہاں تک کہ یہاں کے عربی مذہبی مدرسے تنزل کی انتہا کو پہنچ گئے اور وہ درس گاہیں جو کبھی علما و طلبا سے معمور تھیں، ویران ہوگئیں اور وہ شہر جو کبھی اپنے علمی کارناموں کے سبب سے شہرہ آفاق تھا، اپنے مرتبہ سے گر گیا۔

اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال کو سات آٹھ سے بھوپال کے اس انحطاط و تنزل کا احساس تھا، چنانچہ چھ سات برس پہلے انہوں نے چند علما اور اہل علم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس کی صدارت پر اس ہیچ مدان کو نامزد فرمایا تھا، اس مجلس نے ان مدارس کے لیے نیا نصاب بنایا اور ان کی اصلاح و تنظیم کے لیے کچھ اصول و ضوابط بنائے، دوسرے سال پھر یہ مجلس طلب ہوئی جس میں مقامی اور بیرونی اہل علم اس حقیر کی صدارت میں جمع ہوئے اور مدارس کے لیے فنون کی تعیین کی اور ہر فن کے مدرسین کی تعداد مقرر کی اور ان کی تنخواہ و مصارف کا پورا موازنہ (بجٹ) تیار کیا، یہ موازنہ اس سال کے مالی و انتظامی اداروں کی بحث و تمحیص اور فرماں روائے بھوپال کی پیشی سے منظور ہوا اور اس کے لیے چالیس ہزار کی رقم بجٹ میں رکھی گئی۔"

بھوپال جانے کے بعد راقم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

بھوپال برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ خیریت ہے، معارف کے شذرات جاتے ہیں، اب آپ لوگ خود شذرات لکھ کر مجھے بھیجیں، میں دو چار مہینہ دیکھتا رہوں گا پھر آپ لکھتے رہیں تا کہ ہر ماہ کی ذمہ داری میرے سر سے ہٹے۔

یہاں سرکاری مہمان خانے میں ہوں[1]، بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آئند

---

[1] اس وقت تک مستقل مکان کا انتظام نہیں ہوا تھا اور تنہا تھے، اس لیے سرکاری مہمان خانہ میں مقیم تھے۔

مستقبل ہے، مگر خدا جانتا ہے ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے، اے کاش کہ وہاں مجھ کو سکون میسر آتا اور خلاف مزاج حالات سے بچارہ سکتا[1]، وہاں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے:

حب الوطن از ملک سلیماں خوش تر　　خار وطن از سنبل و ریحاں خوش تر

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد　　می گفت گدا بودن کنعاں خوش تر

ایک ہزار تنخواہ، سواری کا الاؤنس اور پانچ سو ماہ وار سلسلہ دار التصنیف کے لیے اور تمام دفاتر شرعیہ اور تعلیمات شرقی کی عمارت، اس جاہ و اعزاز سے نہ دل میں فرحت ہے نہ قلب میں انشراح، استاد مرحوم نے آخر زندگی میں مولانا حمید الدین صاحب کے نام لکھا تھا:

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع　　بسے بادشاہی کنم در گدائی

بحمد اللہ تعالیٰ و بفضلہ طمع نفس سے خالی ہوں، مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے جن میں ایک دار التکمیل کا خیال ہے، جو مجھے یہاں لے آیا ہے، یہاں کے مدارس کی حالت اچھی نہیں ہے، روپیہ کی کمی نہیں مگر آدمیوں کی سخت کمی ہے، باہر سے چند آدمی شاید آ جائیں تو کچھ کام چلے۔

اب آپ لوگ دار المصنفین کو اپنی زندگی کا کام سمجھ کر استقلال کے ساتھ قائم رکھیں اور یہ سمجھیں کہ عن قریب یہ ذمہ داری آپ صاحبوں پر عائد ہوگی اور بزرگوں کی اس امانت کو آپ ہی لوگوں کو قائم رکھنا ہے، کبھی کبھی تو خط لکھتے رہیں، دیکھیے معارف کا پایہ گرنے نہ پائے اور بھرتی کے مضامین اس میں جگہ نہ پائیں، ایڈیٹر کو نظم ہو یا نثر اس کے ایک ایک حروف کو پڑھنا چاہیے، تصحیح، اصلاح سنگ اور کتابت ہر ایک کی نگرانی کرنی چاہیے، میرے لیے ...... شہر میں ایک بڑا مکان صاف ہو رہا ہے، خوش منظر ہے، مگر دل اپنے ویرانے کو چاہتا ہے۔"

اس خط سے دار المصنفین سے تعلق اور اس کی جدائی کے بارہ میں سید صاحب کے جذبات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی مضمون کا خط مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام بھی ہے[2]۔

---

[1] یہ اشارہ دار المصنفین کے حالات کی طرف ہے جس کی تفصیل ہجرت کے بیان میں آئے گی۔ [2] مکتوب سلیمانی، جلد دوم، ص ۱۷۹۔

راقم کو ۲۴؍جولائی ۴۶ء کے خط میں اپنے کاموں کی تفصیل لکھتے ہیں:

''۱۶؍جولائی کو میں نے دار القضا اور مدارس عربیہ کا چارج لے لیا، دار القضا میں زیادہ تر مقدمات نکاح و طلاق، خلع و تفریق اور ولایت اور کبھی کبھی قصاص کے ہوتے ہیں، مدارس کی حالت بہت خراب ہے، دین و مذہب کا تو نام نہیں، ادھر پوری توجہ کر رہا ہوں، رمضان میں یہاں بڑی رونق ہوتی ہے، محرم سونا گزرتا ہے اور بہت سی بدعات سے محفوظ ہے۔''

سید صاحب کا قیام بھوپال میں چار سال رہا، اس درمیان میں محکمۂ قضا کے کاموں کے علاوہ مدارس عربیہ کی از سرِ نو اصلاح و تنظیم کر کے اس کی کایا پلٹ دی، نواب صاحب بڑے احترام سے پیش آتے تھے۔

درس قرآن سید صاحب کا پرانا ذوق تھا، دار المصنفین میں بھی اس کا سلسلہ کبھی کبھی رہتا تھا، مگر مستقل نہ تھا، رمضان میں اس کا خاص اہتمام فرماتے تھے، کبھی کبھی ندوہ کے منتہی طلبہ بھی جو رمضان میں دار المصنفین چلے آتے تھے، شریک ہوتے تھے، اس درس سے سب سے زیادہ فائدہ مولانا محمد اویس نگرامی نے اٹھایا، جو اس وقت دار العلوم میں شیخ التفسیر ہیں۔

اس سلسلہ کو سید صاحب نے بھوپال میں بھی جاری رکھا، جس میں شائقین تفسیر شریک ہوتے تھے، آٹھویں دن جمعہ کو موتی مسجد میں وعظ و پند کی مجلس ہوتی تھی، جس میں شہر کے ارکان و عمائد شریک ہوتے تھے، سید صاحب کے مسترشد مولوی غلام محمد صاحب نے ان مذہبی و اصلاحی مجالس کی تفصیل تذکرہ سلیمان میں لکھی ہے، اس سے بھوپال کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بڑا اخلاقی و روحانی فیض پہنچا۔

بھوپال میں دار المصنفین کی فکر اور اس کے متعلق ہدایات: بھوپال میں سید صاحب کا قیام جون ۴۶ء سے جون ۵۰ء تک رہا، اس دوران میں دار المصنفین سے ان کا تعلق بدستور قائم رہا، وہ برابر تحریری ہدایتیں بھیجتے رہے اور کبھی کبھی خود بھی اس کے کاموں کی دیکھ بھال کے لیے تشریف لاتے تھے، سب سے پہلی بار اکتوبر ۴۶ء میں تشریف لائے، اس کا ذکر

معارف میں کیا تھا:

"خاکسار تین ماہ کے بعد دارالمصنفین کے کاموں کی دیکھ بھال اور معائنہ کے لیے حسب تحریر سابق آیا ہوا ہے اور ایک ہفتہ قیام کے بعد بھوپال واپس جائے گا، اس کے اظہار میں خوشی ہے کہ الحمدللہ توقع کے مطابق دارالمصنفین کے علمی اور انتظامی کام بدستور چل رہے ہیں، نئے رفقا مطالعہ اور تحقیق کے کاموں میں مصروف ہیں اور مراسلت کے ذریعہ اس حقیر سے اپنے لیے مشورے لیتے رہتے ہیں۔" (معارف اکتوبر ۱۹۴۶ء)

اس کے بعد برابر دو چار مہینوں کے بعد تشریف لاتے اور خط و کتابت کے ذریعہ ہدایت و رہنمائی فرماتے رہے اور اس کے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے تھے، ان خطوط کے بعض اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ کے بعض خطوط اوپر نقل کیے جا چکے ہیں اور یہ سب اس سے پہلے بھی معارف میں چھپ چکے ہیں۔

"آپ کا خط اور مضمون "فتح افغانستان"[1] پہنچ گیا، دیکھوں گا، الحمدللہ خیریت ہے، معارف اس مرتبہ اچھا لکھا گیا ہے، گو اغلاط ہیں، سرمد[2] کی عبارت شاید آپ نے درست کردی ہے، بہت اچھا کیا، البتہ اس نمبر میں صرف مقالات ہی مقالات ہیں، ریاست صاحب سے کہہ دیجیے کہ وہ استفسارات لکھا کریں کہ تنوع رہے۔"

"مولوی وحید احمد[3] صاحب کا خط آیا ہے، ان کے مطالعہ کی بھی رہبری کیجیے، میں بھی ان کے خط کا جواب لکھ رہا ہوں، ضرورت ہے کہ آپ تاریخ کے کوچہ سے باہر قدم نکالیں اور دوسرے فنون کی طرف توجہ کریں۔"

"افغانستان والے مضمون کا ترجمہ کرا کے آپ نے بھیجا، اچھا کیا[4]، کوئی رسید آئی ہو تو مطلع کیجیے گا، شذرات میں سیاسیات میں اگر لکھیں تو بہت محتاط لکھیے گا کیوں کہ ان سب کی نسبت

---

[1] فتح افغانستان کا مضمون آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس کی فرمائش پر راقم نے لکھا تھا۔ [2] سرمد سے مراد معارف کا ایک مضمون ہے۔ [3] وحید احمد ایک نئے رفیق تھے۔ [4] انگریزی ترجمہ۔

میری طرف ہوگی، ایک کتاب جاتی ہے، اس پر حوصلہ افزا ریویو کردیجیے۔" (نومبر ۴۶ء)

"لفافہ ملا، حالات معلوم ہوئے، میں نے بھی ایک لفافہ لکھا تھا، جس میں چند خطوط اور بھی تھے، معلوم نہیں وہ ملا یا نہیں، مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اس فتنہ میں آپ کا دامن پاک تھا، آپ سے یہی امید تھی اور دعا ہے کہ میری توقعات آپ سے اسی طرح پوری ہوتی رہیں[1]۔

آپ شاید وطن جانا چاہتے ہیں تو آپ جاسکتے ہیں، میرا ان دنوں آنا نہ ہوگا، اپنی خیریت وکیفیت مرض سے لکھنو جا کر اپنے معالج کو دکھا کر ضروری مطلع کیجیے گا، ورنہ تعلق خاطر رہے گا، آپ کی صحت کاملہ کے لیے میری دعا ہے۔" (دسمبر ۵۶ء)

"تاریخ اسلام جلد اول واپس جارہی ہے، آپ نے تصحیح نہیں کی، اس کی جلد تصحیح کرلیں، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ کتابوں کی تصحیحات پہلے سے تیار کرلیا کیجیے، عین وقت پر دشواری ہوتی ہے، مولوی ظفر احمد صاحب[2] کے دو مضمون جاتے ہیں، آپ ایک ایک کر کے دے دیجیے، ایک نظم امجد صاحب کی ہے۔

معارف کا جو پرچہ اس سے پہلے شائع ہوا تھا، وہ اچھا لکھا اور چھپا تھا، مگر یہ پرچہ تو پھر خراب لکھا اور چھپا ہے، آپ گذشتہ پرچہ کو سامنے رکھ کر مطالبہ کیجیے کہ ایسا لکھا اور چھاپا جائے۔

آپ کا مضمون افغانستان جاتا ہے، تذکرۃ الحفاظ ہی کی دوسری یا تیسری جلد میں ایک محدث کا نام ہے، جنہوں نے کابل میں اسلام کی اشاعت کی، آپ تذکرۃ الحفاظ نکال کر دیکھیے، ٹائٹل یا جلد کے خالی صفحوں پر اپنی عادت کے مطابق غالباً میں نے حوالہ نوٹ کردیا ہے، اس مضمون اور مولوی ابوظفر والے سندھ کے مضمون کو اسلم صاحب کو دے دیجیے کہ صاف کردیں، افسوس ہے کہ صباح الدین صاحب بیمار ہیں[3] کون اس کی انگریزی کرے، اسی بے چارہ کے بھروسہ پر ایسے ایسے

---

[1] معارف پریس میں اسٹرائک ہوئی تھی، جس میں ایک پرانے رفیق کا بھی ہاتھ تھا۔ [2] مولانا ظفر احمد عثمانی

[3] صباح الدین صاحب اس زمانہ میں سخت بیمار ہوگئے تھے اور رانچی سینا ٹوریم میں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۹ پر)

کاموں کو لے لیتا تھا۔

آپ کے لیے تاریخ یمینی مع شرح جوتقی کے نام سے مشہور ہے اور یمین الدولہ محمود غزنوی کی مقفی تاریخ ہے، ایک صاحب سے بیس روپے میں لے لی ہے۔'' (اپریل ۴۷ء)

غالباً مولوی مسعود علی صاحب وطن چلے گئے ہوں اور کئی ماہ کے لیے گئے ہوں، اس زمانہ میں نگرانی کا کام معلوم نہیں کس کے سپرد کر گئے، مولوی وحید احمد نے لکھا ہے کہ وہ آپ کے زیر نگرانی مطالعہ کا کام کر رہے ہیں، مولوی مسعود علی صاحب کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اور آپ بھی ان سے مطمئن ہیں، صورت حالات سے مطلع فرمائیں اور اپنی رائے لکھیں اور دارالمصنفین کے حالات سے گاہ گاہ مطلع کرتے رہیں۔ (۲۰/ اپریل ۱۹۴۷ء)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۸) زیر علاج تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا بخشی اور وہ اگست ۱۹۴۷ء میں صحت یاب ہو کر واپس آئے، ان کی واپسی کے بعد سید صاحب نے ان کی صحت یابی پر حسب ذیل خط لکھا:

''میں بہت خوش ہوں، تمہارا احاطہ دارالمصنفین میں خیرم مقدم کرتا ہوں، میرے ساتھ دارالمصنفین کے تمہارے احباب بھی بے چینی سے تمہارے منتظر تھے، بے شبہ تمہارے علاج میں بہت روپیہ خرچ ہوا لیکن:

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اللہ تعالیٰ تم کو صحت و عافیت کے ساتھ تا دیر دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے، اب تم سے اور برادرم شاہ معین الدین ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں، تم لوگوں کو دارالمصنفین کا چراغ ہر طرح روشن رکھنا ہے اور ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے سلسلہ کو بھی جاری رکھو، اللہ تبارک وتعالیٰ پورا فرمائیں۔''

اس تاریخ ہند کے سلسلہ میں صباح الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

''میں تو چراغ سحری ہوں، شاہ معین الدین صاحب دارالمصنفین کے دوسرے کاموں میں لگیں گے، اب تم کو ہی تاریخ ہند کے سلسلہ کو مکمل کر کے ان کے چھپوانے کا انتظام کرنا ہے۔''

"آپ کا لفافہ مع کاغذات ملا، گورنمنٹ آف انڈیا کا جواب تیار کیا جارہا ہے[1]، جس امر کے لیے آپ نے لکھا ہے، مجھے بھی اس سے اتفاق ہے[2]، بشرطے کہ صاحب موصوف منتظم اور باقاعدہ زندگی اختیار کرنے کی کوشش کریں، مولوی مسعود (مولوی مسعود علی صاحب) کو بھی میں لکھوں گا، دارالمصنفین کے احوال سے بے بھی مطلع کرتے رہیں۔" (۱۶/اپریل ۱۹۴۷ء)

"اس وقت ملک کے خونی مناظر سے دل خون ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، الحمد للہ کہ یہاں پر امن وامان ہے، دعا ہے کہ وہاں بھی ہو، حج کے راستے اس وقت تک بند ہیں، دلی جاسکتے ہیں اور نہ سہارن پور اور نہ کراچی اور ہمارے ٹکٹ کراچی سے ہیں، سید حسین کو بھی ابھی تک رخصت نہیں مل سکی، اس لیے ناامیدی بڑھتی جاتی ہے[3]۔"

اس زمانہ میں چند مضامین چھپے ہیں، ایک مقدمہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح کے جدید ایڈیشن پر، دوسرا مکتبہ دین و دانش پٹنہ سے اسلامی سیاسیات پر، تیسرا مضمون مولانا عمادی پر لکھا ہے، جس کو اڈیٹر کے نام بھیجوں گا، وفیات میں چھپے گا، ان دونوں مذکورہ مقدموں کو ان کتابوں سے لے کر معارف کے مقالات میں چھپوا دیجیے کہ یادگار رہے، خیال ہے کہ ملک کی بدامنی اور بے اطمینانی کا اثر دارالمصنفین پر ضرور پڑا ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو محفوظ رکھے۔" (۱۳/ستمبر ۴۷ء)

"مصروفیتوں اور اضمحلال طبع کے باعث جواب اور کام میں تاخیر ہوتی ہے، (۱) اس لفافہ کے ساتھ مجلس انتظامیہ کے فیصلوں کا نتیجہ مرسل ہے، رجسٹر کارروائی میں چسپاں کرا دیجیے، (۲) ترمیم شدہ دستور العمل کی کاپیاں مرسل ہیں، ان کو بحفاظت مع آرائے ارکان دفتر میں رکھوا دیجیے، (۳) اس

---

[1] حیدرآباد سے دارالمصنفین کو امداد ملتی تھی وہ آزادی کے بعد بند ہوگئی تھی اور اب اس کا تعلق حکومت ہند سے ہوگیا تھا، اس کے لیے خط و کتابت کی گئی تھی۔ [2] مولوی ابوالجلال صاحب دارالمصنفین کے پرانے رفیق جو بڑے وارستہ مزاج تھے، عرصہ سے دارالمصنفین سے الگ ہوگئے تھے، میں نے دوبارہ ان کو لینے کے لیے لکھا تھا، چنانچہ ان کا تقرر ہوگیا تھا۔ [3] سید صاحب حجاز وفود کے سلسلہ میں حج کر چکے تھے لیکن اب اپنے خرچ کے حج ادا کرنا چاہتے تھے، ان کے داماد سید حسین صاحب جو اس وقت سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ساتھ جانا چاہتے تھے۔

دستورالعمل کی کاپی اسی تقطیع پر لکھوا کر جلد اس کے پانچ سو نسخے چھپنے کے لیے دے دیجیے، جس کاپی کے ٹائٹل پر میں نے کچھ عبارت لکھی تھی، اس کے مطابق ٹائٹل لکھوایئے، (۴) افغانستان والا مضمون جلد سے جلد ٹائپ کرا کے ہسٹاریکل کانگریس الہ آباد یونیورسٹی ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں اس کے پروفیسر ڈاکٹر بشیشور پرشاد کے نام رجسٹرڈ بھجوا دیجیے، بے شبہ میں نے آپ کو غلط پتہ لکھ دیا تھا، جس کے باعث یہ صورت پیش آئی، فہرست اغلاط سیرت مولوی عبدالباری کو دے دیجیے۔'' (۱۷/ اپریل ۴۷ء)

''ڈاکٹر ناظر یار جنگ کا نام حیدرآباد سے نواب مہدی یار جنگ کی جگہ[1] رکھ دیجیے اور نئے ارکان کے نام پروفیسر نواب علی کی تحریک اور میری تائید سے پرانے ارکان کے نام بھیج کر منظوری جلد سے جلد لیجیے، اس کی عبارت الگ لکھتا ہوں۔

یہ انگریزی قواعد[2] بالکل ابتدائی ہیں اور اردو نسخہ بعد کا ہے، اب اس نسخہ کو انگریزی کراتا ہوں، مگر اس کی اجرت لگے گی، ترجمہ کے ٹائپ کی پھر اس کی چھپائی کی۔

قواعد کی کاپی جلد چھاپنے کو دے دیجیے، ارکان و عہدہ داران کی فہرست ابھی چھوڑ دیجیے اور مہربانی کر کے سب ارکان کے نام میرے پاس لکھ کر بھیجیے۔'' (۲/ مئی ۴۷ء)

''وحید احمد سے کہہ دیجیے کہ وہ الضیاء سے جغرافیہ والے مضمون کی تکمیل کر لیں[3]۔

مولوی ابوالجلال صاحب اعلام القرآن کے نام سے ایک کتاب شروع کریں، اللہ تعالیٰ و آدمؑ سے لے کر یا (ی) تک سب اعلام قرآن جمع کریں اور ان کی لغوی و تاریخی تحقیق کریں، سارے انبیا، ملائکہ، اصنام، کفار، صحابہ، مقامات، کتب غرض سب اعلام آ جائیں، تفصیل پھر لکھوں گا، اس وقت بہت مصروف ہوں۔'' (۲۸/ مئی ۱۹۴۷ء)

''تاریخ سندھ پر آپ دیباچہ لکھ کر بھیج دیں[4] اور کتاب کا ایک نسخہ بھی بھیج دیں اور واپسی

---

[1] دارالمصنفین کی رکنیت کے لیے۔ [2] دارالمصنفین کے قواعد۔ [3] مسلمان جغرافیہ دانوں پر سید صاحب کا ایک مضمون دارالعلوم ندوۃ العلما کے عربی رسالہ الضیاء میں نکلا تھا، اسی کا ذکر ہے۔ [4] مولانا ابوظفر صاحب ندوی کی تاریخ سندھ پر دیباچہ لکھنے کی ہدایت ہے۔

کے ٹکٹ بھی، مولوی ابوالجلال صاحب نے کام شروع کر دیا ہوگا، تفصیل لکھیے۔

میری روانگی حج کی تاریخ آغاز اکتوبر ہے، تین ماہ کی رخصت کی درخواست دے دی ہے، اکتوبر، نومبر، دسمبر، اس کے بعد اللہ جانتا ہے کیا ہوگا، مولوی عبدالسلام صاحب آج کل کس عالم میں ہیں۔'' (۱۰ر جولائی)

رمضان کے سبب خط نہ لکھ سکا، نقوش سلیمانی کے لیے دارالمصنّفین تو کوئی انتظام نہ کر سکا، اس لیے آپ کی جیسی تجویز ہے، مبارک علی صاحب کو اس کے چھپوانے کا انتظام دے دیا جائے، آپ مبارک علی کا پتہ لکھ کر بھیجیں، شذرات بھیجتا ہوں، آپ بھی جو کچھ لکھیں اس میں خیال رکھیں کہ تلخی نہ آنے پائے، گڑ سے مرے تو زہر کیوں دیجیے۔

ہندوستان پر ایک ناتمام مضمون اسلم صاحب کو دے کر آیا ہوں، اس کی پہلی سطر کے کچھ لفظ بدل کر مضمون مکمل کر کے معارف میں دے دیجیے اور کچھ تمہید لکھ دیجیے۔

عزیزی صباح الدین صاحب سے کہہ دیجیے کہ وہ خود مقدمہ لکھ کر بھیجیں، میں کاٹ چھانٹ کر بنالوں گا، اس وقت طبیعت محنت کو نہیں چاہتی۔'' (۱۶ر رمضان ۶۷ ۱۳ھ)

گاندھی جی کا ماتم دیکھا، آمد اور آورد کا فرق ہے اور سب ٹھیک ہے، بہتر ہے شذرات نہ بھیجیں، مقصود یہ ہے کہ لہجہ، خیالات، تعبیر ہر چیز میں اعتدال ملحوظ رہے، سیاست کا میدان آج کل تنگ ہے، ملک کا نقشہ بدل گیا ہے، اس لیے آپ کا قلم بہت محتاط رہے، تنقید میں اعتدال ہو، ابتذال نہ ہو۔'' (فروری ۱۹۴۸ء)

کل مولوی مسعود علی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ پریس میں کاغذ کی خرید کے سلسلہ میں کسی بے ضابطگی کی بنا پر کوئی امر پیش آیا ہے، میں معاملہ کی شکل پوری طرح سمجھ نہیں سکا، وہ چاہتے ہیں کہ میں آکر اس معاملہ کو سلجھاؤں، ظاہر ہے کہ یہ کام جس قدر رسوخ و اقتدار کو چاہتا ہے اور اس کے لیے جو حسن تدبیر چاہیے میں اس سے عاری ہوں، بہرحال اگر صورت حال سے مطلع کیا جاؤں تو بہتر ہے،[1]

---

[1] یاد نہیں آتا کہ یہ کون سا معاملہ تھا۔

اللہ تعالیٰ خیر فرمائے۔

میرا مقصد ایک ماہ اٹھارہ یوم کی رخصت پر وطن جانے کا ہے، بعض ذاتی معاملات جو انقلاب حال کا نتیجہ ہیں میرے اس سفر کے داعی ہیں، ممکن ہوا اور ضرورت ہوئی تو آتے جاتے ایک ایک روز کے لیے حاضری ہوسکتی ہے۔

ایک تحریر بھیجتا ہوں "سید حسین کی موت[1]" میں بعض غلطیوں کی تصحیح ہے، معارف میں دے دیں۔

آپ کا کارڈ ملا تھا، خیریت ہے، آپ نے معارف میں میری علالت کا تذکرہ کر دیا تو ایک کام اور بڑھ گیا یعنی دوستوں کی احوال پرسی کے خطوط کا جواب، آپ یحییٰ صاحب سے پوچھ کر لکھیں۔ ۱-معارف کی خریداری کی تعداد اس وقت کیا ہے؟ ۲-یکم جنوری سے مارچ تک کتابوں کی فروخت سے کتنی آمدنی ہوئی؟ ۳-پہلی تاریخ کو تنخواہوں کی تقسیم میں کوئی دقت تو نہیں پیش آتی؟ ۴-پاکستان میں اس عرصہ میں کتنی کتابیں گئیں؟ ۵-معلوم نہیں حیدرآباد کی امداد کھلی یا نہیں۔ (۶ رمئی ۴۹ء)

میری ذات میں یاس کا پہلو غالب رہتا ہے، اسی لیے آمدنی کا نقشہ منگوایا تھا، نقشہ کو دیکھا، اگر پورا سال اسی طرح گزر جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اطمینان بخش صورت پیدا ہوگی، کاغذ کے معاملہ کا حال سن کر تسکین ہوئی، اپیل[2] کا عملی نتیجہ کیا نکلا، بھوپال میں اب تک مذہبی صیغوں کو کسی تبدیلی کی اطلاع نہیں ملی، تاہم خوف ہر وقت ہے، بھوپال کے قیام سے اب کوئی دل چسپی نہیں رہی، مسلم یونیورسٹی اور ہم سایہ مملکت سے کئی تحریکیں ہوئیں مگر کچھ فیصلہ نہ کرسکا[3]، حیدرآباد کی امداد کے متعلق کوئی اطلاع ملے تو لکھیے گا، معارف کی لکھائی چھپائی نیز کتابوں کی چھپائی بھی گر رہی ہے،

---

[1] سید حسین سفیر حکومت ہند کی موت کے شذرات ہیں۔ [2] اس سے مراد غالباً معارف کی خریداری یا دارالمصنفین کی لائف ممبری کی اپیل ہے۔ [3] بھوپال کا معاملہ اب شبے ماند شبے دیگر نمی ماند کا تھا، اس لیے مسلم یونیورسٹی سے شعبہ عربی یا شعبہ مذہبی کی صدارت کی پیش کش ہوئی تھی، پاکستان کی حکومت نے بھی پاکستان آنے کی دعوت دی تھی۔

ادھر توجہ کی ضرورت ہے۔ (۲۱ر مئی ۴۹ء)

میرا ارادہ لکھنؤ یوپی عربی و فارسی نصاب کی کمیٹی[1] میں شرکت کا ہے، اس کی تاریخیں ۳-۴-۵ر جولائی ہیں، اگر آپ کو موقع تو آ کر مل لیں، ڈاکٹر صاحب کے پاس قیام ہوگا یا ندوہ میں، آپ کو ڈاکٹر صاحب[2] سے معلوم ہو جائے گا۔ (۲۴ر جون ۴۹ء)

آپ کا کارڈ ملا، آپ کی فرمائش کی تعمیل کر دی گئی، شذرات کی رجسٹری آج جاتی ہے، ایسا نہ ہو کہ عید الضحیٰ کی تعطیل کا عذر کر کے اس کو آئندہ کے لیے رکھ دیجیے، اگر ایسی صورت ہو تو پھر اس کو حذف ہی کر دیجیے، جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو آپ اور مولوی مسعود علی پڑھ لیں۔

الحمدللہ خیریت ہے، اکتوبر میں اورینٹل کانفرنس دربھنگہ اور ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور ہندوستانی کانفرنس لکھنؤ سے دعوت آئی ہے، دیکھیے کیا ہو۔

بزم تیموریہ پہنچی، خیر میاں صباح الدین صاحب بھی مصنفین کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ (۳۰ر ستمبر ۴۹ء)

یہاں کے سیاسی و انتظامی حالات موجودہ فضا میں نئی ترتیب و تنظیم کی شکل میں ظاہر ہونے والے ہیں، ابھی تک پردہ راز میں ہیں، ہفتہ عشرہ میں شاید کوئی صورت بنے، اتنا تو یقینی ہے کہ نواب صاحب نے مالوہ میں شمولیت سے انکار کر دیا، امید ہے کہ آپ کے شہر میں اب سکون ہوگا اور دار المصنفین میں بھی۔

آپ اپنے لیے تاریخ کے سوا کوئی دوسرا میدان ڈھونڈیے، اتنے دنوں میں آپ کا مذاق پختہ ہو چکا ہے، آپ ہی بتائیں کہ ادب، کلام، فلسفہ کون میدان پسند ہے یا عصریات میں کوئی چیز مرغوب خاطر ہو۔

---

[1] یہ کمیٹی مولانا ابوالکلام نے اصلاح نصاب کے لیے بنائی تھی، اس جلسہ میں مولانا ابوالکلام بھی شریک ہوئے، راقم بھی حسب طلب لکھنؤ گیا تھا اور کمیٹی کے جلسہ میں سید صاحب کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ [2] ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء۔

میں نے پوچھا تھا کہ اس وقت معارف کے خریدار کتنے ہیں، جواب نہیں آیا، آپ مطلع کریں کہ معارف کتنا چھپتا ہے اور اس کی کتنی اشاعت ہے اور کتنی خریداری ہے، یہ بھی مجھے معلوم نہیں کہ مطبع میں کیا کتابیں زیر طبع ہیں، رحمت عالم کے متعلق اسلامی ساہتیہ رام نگر کے پتہ سے قمرالدین صاحب کو لکھ دیا جائے کہ تبادلہ سے معذوری ہے، البتہ رحمت عالم کے نسخے پچاس فیصدی کمیشن پر ان کو دے دیے جائیں گے، یحیٰی صاحب سے کہہ دیجیے کہ ایک مختصر مضمون جاتا ہے، رسید سے مطلع کریں۔ (۲۴ر مارچ ۴۸ء)

کارڈ ملا، میرا دل تو چاہتا ہے کہ آپ لوگوں سے مل کر جاؤں[1] مگر متعلقین کا ساتھ ہوگا، اس لیے دقت محسوس کرتا ہوں، تاہم مایوس نہیں ہوں۔

اخبارات میں اپیل کی اشاعت اور تائیدی نوٹ مفید ہیں[2] مگر عملی نتیجہ ذاتی کوشش ہی سے نکل سکتا ہے، آپ کو خود بھی عملی قدم اٹھانا چاہیے، اس سے لوگوں سے تعلقات پیدا ہوں گے جو دارالمصنفین کے لیے مفید ہوگا۔

نجیب اشرف صاحب نے بمبئی سے بذریعہ بیمہ رجسٹری ایک کتاب قلمی اکبرنامہ دارالمصنفین میں بھیجی ہے، وہ پہنچی یا نہیں مطلع کیجیے، اگر پہنچی ہو تو داخل کتب خانہ کیجیے اور اس کی قیمت ایک سو روپے میرے حساب میں جمع کر دیجیے، میں نے مالک کو اپنی طرف سے ایک سو روپے ادا کر دیے ہیں۔ (۹ر جون ۴۹ء)

حج: اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں سفر حج کی پوری تیاری تھی لیکن بعض موانع کی بنا پر جس کی تفصیل گزر چکی ہے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور ۱۹۴۹ء میں اس کی نوبت آسکی، اگست ۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت تو سفر حج درپیش ہے اور دعا کرتا ہوں کہ موانع مرتفع ہوں اور امسال محرومی نہ رہے، اس سلسلہ میں جی چاہتا ہے کہ اپنے سارے رفقا سے جن کے ساتھ زندگی کا بڑا اور اہم حصہ بسر

---

[1] سفر حج پر [2] غالباً دارالمصنفین کی لائف ممبری کی اپیل مراد ہے۔

ہوا، اپنی تقصیرات کی معافی چاہوں اور یہ رسمی طور پر نہیں بلکہ واقعی طور پر، اس لیے آپ سے اور دیگر رفقا سے آپ کے ذریعہ یہ خواہش پیش کی ہے، میں اپنے دل سے بھی سب کو معاف کرتا ہوں۔

دارالمصنفین کے مستقبل کے متعلق آپ کو جو تشویش آج ہے وہ میرے سامنے اول روز سے ہے، اللہ تعالیٰ دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہمت اور استقلال بخشے، آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں، دوامی زندگی لے کر تو کوئی آیا نہیں ع آج وہ کل ہماری باری ہے، پھر کام تو آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے۔

میں سفر حج کے سوا کوئی اور کام اس وقت سامنے رکھنا نہیں چاہتا، ان شاء اللہ اس سے فراغت کے بعد اور چیزیں سامنے آئیں گی، مولوی عبد السلام صاحب سے بھی بعد سلام یہی درخواست (معافی) ہے، اگر وہ کرم کریں تو زہے لطف۔'' (۱۱؍اگست ۱۹۴۹ء)

اکتوبر ۴۹ء میں حج کے لیے روانہ ہوئے، مکہ میں رباط بھوپال میں قیام کا انتظام تھا لیکن سلطان عبد العزیز بن سعود نے اس کو پسند نہیں کیا اور اپنا خاص مہمان بنایا اور کئی مرتبہ دعوت کی، سید صاحب نے اس سفر کی کوئی روداد نہیں لکھی، صرف آپ کے بعض خطوط، پروفیسر عبد المنان بیدل کے ایک مضمون سے جنھوں نے اس سال حج کیا تھا اور تذکرۂ سلیمان سے جستہ جستہ حال معلوم ہوتا ہے، اس سفر میں آپ نے حتی الامکان دوسری مشغولیتوں سے پرہیز فرمایا اور سارا وقت عبادات، حج اور ذوق وشوق میں گزارا، خط لکھنا اور خطوط کا جواب دینا بھی بار گزرتا تھا، حج سے فراغت کے بعد سید عبد الحکیم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس وقت طبیعت کا یہ رنگ رہا کہ قلم چھونے کو جی نہیں چاہا، کہیں خط تک نہیں لکھا، کوئی روزنامچہ نہیں لکھا، غرض ایک صفحہ تحریری سامان اس سفر میں ہاتھ نہ آیا۔'' (مکتوب بنام سید عبد الحکیم صاحب)

پروفیسر عبد المنان بیدل لکھتے ہیں:

"کئی بار صحن حرم میں مشغول نماز یا محو دیدار کعبہ نظر آئے، وہ ایک بار کوہ صفا پر دعا مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا اور دیکھنے والوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ ایمان واحتساب کی جلوہ ریزیاں ان کی ہر نقل وحرکت میں ظاہر ہیں۔" (معارف سلیمان نمبر، صفحہ ۳۴۸)

"ایک دن حرم میں ذکر میں مشغول تھے، ہاتھ میں تسبیح تھی، ایک نجدی عالم نے جو آپ کی علمی عظمت سے واقف تھا، تعجب سے پوچھا کہ سنا ہے آپ کو تصوف سے بھی ذوق ہے، آپ نے اقرار کیا اور فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، نجدی عالم نے کہا، یہ تو بدعت ہے، سید صاحب نے اس کو قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے تصوف کی حقیقت سمجھائی، آخر میں اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر اس کا نام تصوف ہے تو اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔" (تذکرۂ سلیمان، صفحہ ۲۰۰)

مکہ معظمہ میں آپ پر جو احوال وکوائف طاری ہوئے انہوں نے عارفانہ نظم کی شکل اختیار کر لی، جو حسب ذیل ہے:

دیدہ ودل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں
جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

ان کے کرم کے میں نثار ان کی عطا کا کیا شمار
دے دیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں

حبش وتتار وہند وشام سرخ رخ وسیاہ فام
عشق نواز ہر مقام آئے ہیں سب حجاز میں

عرش کے بام تک کہاں وسعت دست انس وجاں
شان کرم ہوئی عیاں ہو کے نہاں مجاز میں

سنگ سیاہ در جو تھا، دست مصافحہ[1] بنا
اب نہ رہا وہ راز میں وہ جو چھپا تھا راز میں

روز مرا نیا مقام صبح کہیں کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام راہ خم و دراز میں

دل کو نصیب ہو گداز جاں کو عطا ہو سوز وساز
ہے یہ دعا بصد نیاز درگہ بے نیاز میں

دل جو ملا سیاہ کار آنکھ عطا ہو اشک بار
دھوئے جو دل کو بار بار خلوت خاص راز میں

مدینہ طیبہ میں یہ کوائف اور بڑھ گئے، پروفیسر عبدالمنان بیدل لکھتے ہیں:

"مدینہ منورہ میں ایک دن باب مجیدی کے قریب سید صاحب نظر آئے، السلام علیکم کہا،

---

[1] حدیث نبوی الحجر یمین اللہ یصافح بہا المؤمنون کی طرف اشارہ ہے۔

جواب ملا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس کے بعد مولانا آگے بڑھے، میں نے قریب جا کر عرض کیا، حضور نے اس دیرینہ نیاز مند کو پہچانا نہ ہوگا، فرمایا، دیکھ کر تو نہیں پہچانا تھا، آواز سن کر اب پہچان گیا، بھلا کیسے پہچانتا؟ آپ نے تو صورت ایسی بنائی ہے کہ آپ کا قریب ترین عزیز اور دوست بھی شاید ہی پہچانے، میں عرض کیا، حضور صرف صورت بدلی ہے، مسکرا کر فرمانے لگے، ان شاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی، اس جملہ کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے، کہنے لگے، بیدل صاحب! کیا عرض کروں، جلال و جبروت والے دربار میں تو بہت کچھ ملتا ہے مگر رافت ورحمت والے دربار میں سب سے بڑی چیز محبت ملتی ہے، آنا شرط ہے، آئے نہیں کہ ہدیہ محبت ملا نہیں، ہاں ایک بات اور عرض کردوں، کچھ ایسے لوگ بھی جن کو یہاں آئے بغیر بھی بہت کچھ دے دیا جاتا ہے، اللہ رے اس کی قسمت۔'' (معارف سلیمان نمبر، صفحہ ۳۴۶)

بارگاہ نبویؐ کی حاضری کے وقت یہ ہدیہ عقیدت پیش کیا:

آدم کے لیے فخر یہ عالی نسبی ہے
مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما جنت وفردوس
آرام گہہ پاک رسول عربیؐ ہے

آہستہ قدم نیچی نگہ پست صدا ہو
خوابیدہ یہاں روح رسول عربیؐ ہے

اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ
بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی
محبوب خدا ہے جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ میرے سینے میں مدت سے دبی ہے

یہ دعا قبول ہوئی، رات کو خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور وفور شوق میں اپنے کو قدم مبارک پر ڈال دیا، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لخت جگر کو شفقت سے اٹھالیا اور ایک دعا پڑھ کر سینہ پر دم کردی، آنکھ کھلی تو یہ

دعائیہ کلمات یاد تھے، آپ نے یہی دعا پڑھ کر اپنی اہلیہ پر دم کردی، اس کے بعد ذہن سے محو ہوگئی۔ (تذکرہ سلیمان، صفحہ ۲۱۲)

حج وزیارت سے فراغت کے بعد ایک خط سید عبدالحکیم صاحب کو مدینہ طیبہ سے لکھا تھا، اس سے حج کے بعد حالات پر روشنی پڑتی ہے:

''بحمد اللہ کہ سارا سفر بخیر وخوبی انجام پایا، جہاز اور تمام مقامات میں آرام ہی آرام رہا، حج وزیارت سے بحمد اللہ فراغت ہوگئی اور اب واپسی کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ ۱۰ر دسمبر کو یہاں سے یعنی جدہ سے روانگی ہوگی، ایک ہفتہ کے بعد مدینہ منورہ سے سفر ہوگا، میرا قیام مکہ میں دو ماہ اور مدینہ منورہ میں ایک ماہ رہا، مکان ایسا ملا ہے کہ حرم محترم کے منارے نظروں کے سامنے رہتے ہیں، ان سطروں کے لکھتے وقت بھی وہ سامنے ہیں۔

امسال بھی یہاں چار لاکھ کے قریب حاجی آئے، پندرہ ہزار ہندوستان کے اور چودہ ہزار پاکستان کے، دو ہزار مصر کے، اس کے بعد جاوا کے، ترک اس سال سالہا سال کے بعد آئے اور بہت آئے، چھ ہزار کے قریب تھے، اکثر ہوائی جہاز سے آئے تھے، ان کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، بہت دین دار، باادب اور عقیدت مند نظر آئے، فلپائن اور نائجیریا سے بھی حاجی آئے تھے۔

جدہ اور حجاز میں ظاہری ترقی کے بہت سے آثار نظر آئے، سڑکیں موٹروں، لاریوں اور بسوں سے بھری رہتی ہیں، امسال ہوائی جہاز سے بھی بکثرت آمد ورفت رہی، جدہ سے مدینہ منورہ بہت سے لوگ جہاز سے آئے، جدہ سے مدینہ ہوائی راستہ ایک گھنٹہ کی راہ ہے۔

دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوکر آپ کی طرف سے سلام پاک عرض کردیا تھا، اللہ تعالیٰ اس کے فیض سے آپ کو مالا مال فرمائے، اب ان شاء اللہ ایک ہفتہ بعد یہاں سے روانہ ہوکر وسط دسمبر میں جدہ سے کسی جہاز سے واپسی ہوگی۔'' (۲۷ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

حج سے واپسی اور بھوپال سے علاحدگی: ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو جدہ سے روانہ ہوئے، جہاز میں بخار میں مبتلا ہوگئے، بمبئی پہنچتے پہنچتے اتنا بیمار ہوگئے کہ سفر کے قابل نہیں رہ گئے،

اس لیے بمبئی میں اعظم گڑھ کے منشی عبدالعزیز صاحب انصاری کے یہاں قیام فرمایا، منشی جی نے بڑی عقیدت اور دل سوزی سے تیمارداری کی، طبیعت درست ہونے کے بعد جنوری ۵۰ء میں بھوپال تشریف لے گئے۔

بھوپال کا علمی گروہ: اس وقت بھوپال میں انقلاب ہو چکا تھا، ریاست ختم ہو کر انڈین یونین میں شامل ہو چکی تھی اور اس کا نظام بالکل بدل گیا، پرانے مذہبی محکمے کچھ ٹوٹ چکے تھے، کچھ توڑے جانے والے تھے، ریاست کے پرانے ملازمین الگ کر کے نئے ہندو ملازمین رکھے جا رہے تھے، ان حالات میں بھوپال میں سید صاحب کے قیام کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس لیے پہلے انہوں نے رخصت لی، اس کی تفصیل انہوں نے ۵/ مارچ ۴۹ء کے خط میں لکھی ہے، اس میں دارالمصنفین کے مستقبل کے متعلق بھی ان کا خیال ظاہر ہوتا ہے، اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"آپ کے خطوط ملے، جواب میں تاخیر ہوئی، قلب مضطرب، متعدد ہمہ گیر فیصلوں میں مصروف تھا، جن میں سے بحمداللہ ایک فیصلہ کر لیا گیا، یعنی یہ کہ بھوپال سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ۲۷/ فروری کو دو ماہ کی رخصت بلاتنخواہ کا کاغذ حکومت نے بھیج دیا، یہ تمہید ہے استعفے کی، یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہاں کے لوگ میرے قیام کے لیے بے حد مصر ہیں اور حق یہ ہے کہ بھوپال میں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک نے میرے استحقاق سے زیادہ میری قدردانی کی۔

اب میری ذاتی خانگی الجھنیں ہیں، ایک تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ بالفعل سید حسین کے پاس رہیں، اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ عاصم میاں کے پاس جائیں، دونوں مدد کے محتاج ہیں[1] مگر دوسری جگہ (پاکستان) جانا آسان نہیں ہے اور نہ ان کا آنا ہی آسان ہے، اس لیے دل پریشان ہے۔

دارالمصنفین کے متعلق اگرچہ مولوی مسعود علی صاحب حسن ظن رکھتے ہیں لیکن مجھے تو یہ

---

[1] سید صاحب کے داماد سید حسین صاحب ہندوستان میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور سید ابو عاصم کراچی میں وکالت کرتے تھے۔

نظر آتا ہے کہ عن قریب حیدرآباد اور بھوپال کی امدادیں بند ہو جائیں گی اور تجارت (یعنی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان) پر جو بندشیں ہیں ان سے عہدہ برآ نا مشکل ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دارالمصنفین ماہانہ مصارف میں غیر معمولی اضافہ سے چل نہیں سکتا، خدا کرے میرے یہ اوہام غلط ہوں، اس لیے میں بار بار آپ کے یہاں سے خریداری کی تعداد منگواتا ہوں۔

آپ نے کلکتہ نہ جانے کا جو عزم ظاہر کیا[1]، اس سے دل بہت خوش ہوا، حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو رہے ہوں خلفِ رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے اور اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی کہ بعد کے کام کے لیے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے اس ایثار کو قبول فرمائے اور آپ کی قناعت میں بیش از بیش برکت عنایت فرمائے، اگر کہیں اور بھی میں چلا گیا تو بھی آپ ہی کی مدد پیش نظر رہے گی۔

میں نے ۱۰ر تاریخ سے رخصت طلب کی ہے، امید نہیں کہ ۱۰ر تک اس کی کارروائی تکمیل پا سکے، اب اس کا انتظار کرنا ہوگا، ریاست بحیثیت ریاست کے باقی نہیں ہے بلکہ انڈین یونین کے ایک صوبہ کا جز بن گئی ہے، چیف کمشنر یہاں کا مالک ہے، وہ جو چاہے کرے، ایک ڈکٹیٹر کی شان ہے، میں نہیں جانتا کہ ہندوستان کے اور صوبوں کا کیا ہے مگر

ع قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

یہاں کچھ کتابیں جمع ہوگئی تھیں، کچھ خطوط و کاغذات تھے، کل ان کو پیک کرا دیا ہے، ان کو دارالمصنفین بھیجنا چاہتا ہوں، باقی کپڑے بستر برتن وغیرہ ہیں، ان کو تو ساتھ ہی لانا ہوگا۔

ہندوستان سے بدلی اور اس کے اسباب: اس خط کے علاوہ انہوں نے بھوپال سے

[1] ہمارے دوست مولانا سعید احمد اکبرآبادی جو اس زمانہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل تھے، راقم کو تاریخ اسلام کی لکچرر شپ پیش کش کی تھی، جس کی تنخواہ دارالمصنفین کی تنخواہ سے دونی سے بھی زیادہ تھی لیکن راقم اس کے قبول کرنے سے معذرت کردی۔

علاحدگی اور ہندوستان سے بددلی اور پاکستان جانے کے اسباب خود اپنے قلم سے لکھے تھے، جس کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے مکتوباتِ سلیمانی جلد دوم کے آخر میں شامل کر دیا ہے، اس لیے اس کو نقل کیا جاتا ہے:

''مدت سے میرے پاکستانی اعزہ واحباب کا تقاضا تھا کہ میں پاکستان جاؤں اور اس کے لیے تعلیمی اور مذہبی حلقوں سے مجھے دعوت دی جارہی تھی اور میں اس کو ٹالتا رہا، یہاں تک کہ گذشتہ دسمبر ۴۹ء میں جب میں حج کے سفر میں تھا ہندوستان کے اخبارات میں بے بنیاد خبریں میری پاکستان میں موجودگی کے متعلق شائع کیں، یہاں تک کہ میرے منصب اور عہدہ کی بھی تعیین کر دی گئی، جب میں واپس آ گیا تب بھی میں نے اخبارات میں اپنا کوئی تردیدی بیان شائع نہیں کیا۔

ہمارے دوستوں کو معلوم ہے کہ جولائی ۴۶ء سے میرا قیام بھوپال میں بحیثیت قاضی ریاست اور ڈائرکٹر تعلیمات علوم مشرقی تھا اور بحمد اللہ تعالیٰ فرماں روائے ریاست سے لے کر عام مسلمانوں بلکہ کانگریسی وزرا تک میرا احترام کرتے تھے، بالآخر جب ۴۹ء کے وسط میں ملکی وزارت کا خاتمہ ہوا اور انڈین یونین کے حکام کا براہ راست تقرر ہوا اور ایک سرپھرے آئی سی ایس کو کمشنر اور یوپی کے ایک ڈپٹی کلکٹر کو ڈپٹی کمشنر بنا دیا گیا اور ریاست کے محکموں کی شکست وریخت شروع ہوئی اور بحیثیت ریاست کے بھوپال کا وجود ختم کیا جانے لگا تو تعلیمات کے لائق اور قابل مسلمانوں کو مختلف حیثیتوں سے برخاست کیا گیا اور سیہور کے ایک معمولی ہیڈ ماسٹر کا چیف انسپکٹر کا عہدہ دے کر دو سو ماہوار پر مقرر کیا گیا اور مجھ کو عملاً اس کے ماتحت بنا دیا گیا جس کو بجا طور پر میں نے اپنی توہین سمجھا کیوں کہ میری حیثیت ایک ڈائرکٹر کی تھی اور میرے قائم مقام بھی میری رخصتوں کے موقع پر ڈائرکٹر ہی ہوتے رہے، میری تنخواہ اس سے پنج گنا زیادہ تھی، اس درمیان میں آئین ہند کے دفعہ ۲۰ کے مطابق شرقی مدارس کے علوم دینیہ کے مدرسین کی علاحدگی کے احکام نافذ کیے گئے، میرے خیال میں یہ احکام اس لیے غلط تھے کہ ان مدارس علوم دینیہ کی تعلیم بحیثیت دینی علوم کے نہیں دی جاتی تھی بلکہ عربی کے ہائر لٹریچر کے طور پر دی جاتی تھی، اور مجھے معلوم تھا کہ یوپی کی وزارت

تعلیم کے ماتحت اور وزیر ہند مولانا ابوالکلام کی صدارت میں مشرقی تعلیمات کا جو نصاب بنایا گیا تھا، اس میں یہ علوم اسی حیثیت سے داخل کیے گئے تھے اور وزیر تعلیم ہند کا ارادہ تھا کہ وہ اسی نصاب کو سارے ہندوستان کے مشرقی مدارس میں جاری کریں گے اور ان کی خواہش تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلما سرکاری مشرقی کالج میں تبدیل کر دیا جائے اور جس کمیٹی نے یہ نصاب بنایا تھا اس کا میں بھی ایک ممبر تھا، اس لیے میں نے کمشنر صاحب بھوپال کی خدمت میں اپنے یہ خیالات لکھ کر بھیج دیے اور مزید زبانی تشریح کے لیے ملاقات کی خواہش کی، مجھے ایک مہینہ سے زیادہ اس کے جواب کا انتظار کرنا پڑا، آخر میں یہ جواب دیا کہ آپ تواری صاحب ڈپٹی کمشنر سے ملیں، میں نے موصوف سے ملنے کی خواہش کی تو چند روز کے بعد وقت مقرر ہوا، جب میں وقت مقررہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ موصوف مصروف ہیں، چنانچہ ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد سرفرازی ہوئی، اور جب میں پیش ہوا تو اس بے رخی سے پذیرائی ہوئی کہ ایک معمولی افسر کے ساتھ بھی کوئی شریف انسان یہ طریقہ نہ برتتا، حالاں کہ موصوف کی تنخواہ مجھ سے کم تھی اور اس جگہ یہ معاملہ کیا گیا جہاں ریاست اور کانگریس کے وزرا نے ہمیشہ میرا احترام کیا، پھر باتیں ایسی فرعونیت کے ساتھ کی گئیں کہ دل پر چوٹ لگی اور فرمایا گیا کہ اس میں کچھ نہیں ہوسکتا، آپ کا کام حکم کی تعمیل ہے، میں نے وہیں پہلی بار دل میں عزم کر لیا کہ اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دوں گا، چنانچہ واپس آ کر میں نے تین ماہ کی رخصت کی درخواست دی، جو ایک ماہ میں منظور ہوئی اور عین اس وقت جب میں چلنے کو تیار تھا کسٹوڈین صاحب بھوپال کا نوٹس ملا کہ آپ نے چوں کہ کچھ روپے پاکستان بھیجے ہیں، اس لیے آپ پر مقدمہ چلایا جائے گا اور آپ کو انخلا کنندہ تصور کیا جائے گا اور اپنی مملوکات کی فہرست پیش کریں، یہ بارہ سو روپے نئے قانون کے اجرا سے پہلے بھوپال بینک کے ذریعہ اپنے داماد اور بھتیجے کو میں نے ان کی طلب پر بھیجے تھے، میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ کسی سرکاری مقدمہ میں ماخوذ ہوں، اس لیے اذیت محسوس کی، بہرحال دوستوں کے مشورہ سے ایک وکیل مقرر کر کے یوپی چلا گیا۔

ایک ماہ کے اندر وکیل نے مجھے مطلع کیا کہ پچھلے اجلاس میں آپ کو براہ راست حاضری

کا حکم ہوا ہے، اس لیے چلے آئیں، چنانچہ وقت مقررہ پر گرمی کے دنوں میں سفر کر کے بھوپال گیا اور کسٹوڈین افسر کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت خلاف معمول و خلاف توقع کسٹوڈین صاحب اخلاق سے پیش آئے اور فرمایا کہ گورنمنٹ آپ پر سے مقدمہ اٹھا لینے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے، یہ بالکل خلاف توقع بات تھی، بہر حال اجلاس سے باہر آیا، دوسرے دن اطلاع ملی کہ بالفعل یہ مقدمہ اٹھا لیا گیا ہے، اس درمیان میں کمشنر صاحب کی طرف سے ریاست کے مذہبی محکموں کی شکست کا اعلان ہوا اور قاضی کا منصب جو ریاست کا سب سے بڑا محکمہ تھا، بغیر کسی سابقہ نوٹس کے ایک منٹ میں ختم کر دیا گیا، اس وقت میرے لیے سوا اس کے چارہ کار نہ تھا کہ میں امیر جامعہ (ڈائرکٹر) کے عہدہ سے استعفیٰ دے دوں، چنانچہ میں نے استعفا دے دیا جو بخوشی تمام قبول کر لیا گیا اور میں یکم جون ۵۰ء کو بھوپال سے رخصت ہو گیا اور ہندوستان سے دل برداشتہ ہو گیا۔" (مکتوباتِ سلیمانی جلد دوم، صفحہ ۲۳۶ تا ۲۳۸)

پاکستان کی تحریک پر ایک نظر: ۱۹۴۰ء کے بعد کا زمانہ ہندوستان کا بڑا انقلابی دور تھا، اسی میں آزادی کی تحریک عروج کو پہنچی، مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلاف نے شدت اختیار کی، لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا، جس کا نتیجہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی شکل میں ظاہر ہوا، یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلاب میں سید صاحب جیسی شخصیت کا کیا طرز عمل رہا اور انہوں نے اس میں کیا رہنمائی فرمائی، اس سوال کے جواب کے لیے کسی قدر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آزادی کا علم سب سے پہلے مسلمانوں نے بلند کیا تھا، حضرت سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کی جماعت اس راہ کی پہلی مجاہد تھی، جس کو انگریزوں نے بڑی بے دردی سے ختم کیا، اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن مسلمان پیش پیش تھے اور اس کی قیادت ان ہی کے ہاتھوں میں تھی، اس لیے اسی میں ناکامی کا نتیجہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا

اور انگریزوں نے اس کا زیادہ انتقام ان ہی سے لیا، ان کو پست و پامال کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، نان کوآپریشن کی تحریک میں بھی مسلمان آگے آگے تھے اور پوری کانگریس پر چھائے ہوئے تھے اور ان ہی نے اس تحریک میں جان ڈالی تھی اور اس کے لیے انہوں نے بڑی قربانیاں کیں۔

لیکن ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، اس لیے آزاد ہندوستان میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ بڑا اہم تھا، وہ اپنی تعداد اور ملی خصوصیات کے لحاظ سے ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے تھے، انہوں نے ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی اور اس کو اپنا وطن بنالیا تھا اور یہاں ان کی بڑی شاندار تاریخ تھی، مگر جنگ آزادی کے ابتدائی زمانہ میں ہر ہندوستانی کا مقصد انگریزوں کی غلامی سے آزادی تھی، کانگریس اپنے اصولوں پر قائم تھی، اس کی نگاہ میں ہندو مسلمان برابر تھے، اس لیے مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ کھل کر سامنے نہیں آیا لیکن جب آزادی کی تحریک بڑھی تو جس قدر اس کی منزل قریب آتی گئی، اس مسئلہ کے حل کی ضرورت بڑھتی گئی، اس کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن ابھی اس کا کوئی حل نہ نکلا تھا کہ ہندو مسلم اختلافات اور فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ملک کی پوری فضا اس کے اثر سے مسموم ہوگئی، کانگریس بھی اس سے پاک نہ رہ سکی، اگرچہ اس وقت بھی اس کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ رفتہ رفتہ اس سے الگ ہوتے گئے اور ان کی شرکت برائے نام رہ گئی۔

آزاد ہندوستان میں حکومت کے نظام کا جو بہتر سے بہتر نقشہ ہوسکتا تھا وہ سیکولر جمہوریت تھی لیکن جمہوریت میں بھی عملاً اکثریت ہی کی حکومت ہوتی ہے، اس لیے جیسی ذہنیت کی اکثریت ہوگی اسی طرز کی حکومت بھی ہوگی، کانگریس میں جو آزادی کی نقیب اور ہندو مسلمانوں کی مشترک جماعت تھی، اس پر روز بہ روز فرقہ پروروں کا غلبہ ہوتا جاتا تھا، اس کے باہر تو اعلانیہ فرقہ ور جماعتیں قائم ہو چکی تھیں، جن کا مقصد ہندو حکومت کا قیام،

ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا احیا تھا اور وہ برسوں سے اسی کوشش میں لگی ہوئی تھیں، ان حالات میں مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ اور اہم ہوگیا تھا، اس کے ردعمل میں پاکستان کی تحریک شروع ہوئی، جس سے ہندو مسلم اختلافات نے اور شدت اختیار کرلی۔

درحقیقت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل اور پاکستان کے قیام کی صورت میں ہندوستانی مسلمانوں کی پوزیشن، دونوں کے مسائل بڑے اہم تھے اور صورت حال ایسی تھی کہ اس میں یہ فیصلہ مشکل تھا کہ ان کے لیے اس میں کون سی صورت مفید ہوگی، اس لیے خود مسلمانوں میں دو گروہ ہوگئے تھے، ایک ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا حامی اور دوسرا مخالف تھا، ان دونوں نے اپنے اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کی لیکن اکثریت کی تنگ دلی اور انگریزوں کی چال سے حامی فریق کو کامیابی حاصل ہوئی اور پاکستان قائم ہوگیا، اس کی سرگذشت معلوم و مشہور ہے، اس لیے اس کی تفصیل قلم انداز کی جاتی ہے۔

سید صاحب کا طرزِ عمل: سید صاحب پرانے قوم پرور تھے، ایک زمانہ تک وہ کانگریس میں عملاً شریک رہے، اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور کبھی کبھی کانگریس کے سالانہ جلسوں میں شریک بھی ہوتے تھے، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لیکن سیاسی میدان کے آدمی نہ تھے، ان کا ذوق خالص علمی تھا، سیاست کے الجھاؤ سے ان کے کاموں میں بڑا خلل پڑتا تھا اور خود کانگریس پرانی کانگریس نہ رہ گئی تھی، اس لیے وہ عملی سیاست سے بہت پہلے الگ ہو چکے تھے لیکن ان کی جیسی شخصیت مسلمانوں کے مسائل سے بے تعلق بھی نہیں رہ سکتی تھی، پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں صورت حال ایسی ہوگئی تھی کہ وہ بھی کسی واضح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے تھے، اگرچہ وہ اکثریت کی ذہنیت سے مایوس تھے لیکن ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی پوزیشن کا پورا احساس تھا، اس لیے وہ تقسیم کے حامی نہ تھے، اکثر نجی صحبتوں میں فرمایا کرتے تھے کہ ”اگر ہندوستان تقسیم ہوگیا تو یہاں کے مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا؟“

اس زمانہ میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت لیگ کے ساتھ لیکن جمعیۃ العلما اور

بعض دوسری جماعتیں اس کے خلاف بھی تھیں، جن میں بہت سے اکابر تھے اور ان دونوں میں بڑی کشمکش تھی، اس اختلاف میں کسی جماعت کے ساتھ عملی جدوجہد میں شرکت ایک علمی ادارے کے لیے مضر تھی، اس لیے سید صاحب نے دارالمصنفین کو اس سے بچائے رکھا، اور دسمبر ۱۹۴۵ء کے معارف میں تصریح کے ساتھ لکھا کہ:

"اس زمانہ میں جب الکشن (لیگ اور کانگریس کے مقابلہ کا الکشن) کا بازار گرم ہے، سیاسیات نے علمی اور تعلیمی اداروں کو بھی اپنے ساتھ الجھالیا ہے لیکن یہ صورت حال خود ان تعلیمی اور علمی اداروں کے لیے موزوں نہیں، یہ ادارے وہ کارخانے ہیں جن کے سپرد قوم کے دماغوں کی تیاری کا کام ہے، اگر گولہ بارود بنانے والے کارخانوں کے مزدور اور جنگی تربیت گاہوں کے معلم بھی فوج میں بھرتی ہو جائیں تو کیا ایسی قوم جو تقسیم عمل کے اصول سے اس طرح اعراض برت رہی ہے، کبھی لڑائی کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتی ہے، دارالمصنفین بھی ایک علمی ادارہ ہے اور اس ادارہ میں بھی طرز سیاست کے لحاظ سے لوگ مختلف الخیال ہیں لیکن ہمارے ارکان مجلس اس باب میں متحد ہیں کہ ادارہ کو سیاسیات کے الجھاؤ سے پاک رکھا جائے اور اس کو عملی سرگرمیوں کا بازیچہ نہ بنایا جائے۔"

اگرچہ سید صاحب اپنے علمی مشاغل اور صحت کی خرابی کی بنا پر پاکستان کی تحریک اور لیگ و کانگریس کے اختلافات شروع ہونے سے بہت پہلے عملی سیاست سے الگ ہو چکے تھے لیکن ہندوستان کی سیاست خصوصاً مسلمانوں کے معاملات و مسائل کے متعلق وقتاً فوقتاً اپنے خیالات معارف میں ظاہر کرتے رہتے تھے، مسلمانوں کے تصور آزادی کے بارہ میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا تصور آزادی: زمانہ کے واقعات جس تیزی سے بدل رہے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ مسلمان اس سے بے خبر نہیں، معالجوں کی رایوں میں اختلاف ہوسکتا ہے مگر مرض کی شدت اور نفس علاج کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں، قوم و ملت کے معالجوں کو دو حصوں

میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جو مسلمان قوم کی سیاسی تنظیم کر کے اس کو برسرعروج لانا چاہتے ہیں، دوسرے وہ نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان بنانا چاہتے ہیں اور پھر ان کو استخلاف فی الارض کا مستحق ٹھہراتے ہیں لیکن اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ اس پیام کے مبلغ اور رہبر پہلے خود کام کے مسلمان بنیں کہ

ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم دوسروں پر حکومت کریں ہم کو خود اپنے نفس کے اوپر آپ حکومت کرنا چاہیے، حق کے پیام پر غیر متزلزل ایمان، احکام الٰہی پر بے چوں وچرا عمل، حق کی راہ میں مجاہدانہ روح، ثبات قدم، عزم راسخ، حق کے لیے ایثار اور ذاتی خود غرضیوں کا استیصال، کیوں کہ دنیا کسی دعوت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتی جب تک داعیوں کے جان ومال کا پورا امتحان نہیں لے لیتی اور دعوت کے حرفوں کو خون کی روشنائی سے نہیں پڑھ لیتی، یہ خدا کے بنائے ہوئے اصول فطری ہیں جو کبھی نہ بدلے ہیں نہ بدلیں گے۔

ایک اور نکتہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اسلام اور مسلمان ایک نہیں دو چیزیں ہیں، مسلمان ایک قوم کا نام پڑ گیا ہے، جس کے اسلاف پیام اسلام کے حامل اور تعلیم اسلام کے عامل تھے، انہوں نے دنیا پر فتح پائی اور اپنی مفتوحہ دولت اپنے اخلاف کے سپرد کر دی، زمانہ کے مرور سے یہ اخلاف بھول گئے کہ یہ انعام ان کے اسلاف کو ان کے خاص اوصاف کے صلہ میں ملا تھا، جب تک وہ اوصاف رہے وہ انعام ان کے پاس رہا اور جب وہ اوصاف جاتے رہے تو ان کا یہ انعام بھی چھن گیا، اب اگر اس کے حصول کی پھر تمنا ہے تو پھر ان ہی اوصاف کو حاصل کرنا چاہیے اِنَّ اللہ لایغیر بقوم حتی یغیروا مابانفسھم حکم ناطق ہے۔

نادانی سے ہم لازم کو ملزوم اور ملزوم کو لازم سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کسی طرح حقوق حاصل کرنے چاہئیں پھر اس کے ساتھ سلطنت وحکومت کے اوصاف پیدا ہو جائیں گے، یہ خیال قطعاً غلط ہے، پہلے اوصاف پیدا کرو پھر ان کے نتیجوں کی امید رکھو، اگر

ان اوصاف کے بغیر ہم کو کوئی چیز رعایت سے ملی بھی تو ہمارے پاس کبھی رہ نہیں سکتی۔

لیکن ایک سوال اس سے بھی زیادہ دقیق ہے، فرض کیجیے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہو گیا تو کیا اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے گا، اس سے مسلمان پھر مسلمان ہو جائیں گے؟ زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک اور طویل و عریض عراق یا شام یا مصر مل جائے گا تو کیا اس سے اسلام کی بے کسی اور غربت میں کچھ بھی کمی ہو سکتی ہے؟'' (معارف، اپریل ۱۹۴۲ء)

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اس طرح ظاہر فرمایا ہے:

سیاسی خودمختاری کے عناصر: سیاسی خودمختاری کے عناصر کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمان اپنی سیاسی خودمختاری کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نفس سیاسی خودمختاری کی دنیا میں قیمت کیا ہے؟ سیاسی خودمختاری اس وقت تک دل خوش کن خواب سے زیادہ نہیں جب تک اس کی اساس ایمانی، جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی طاقتوں کے چار ستونوں پر قائم نہ ہو۔

انسان صرف اپنی طاقت سے زندہ رہتا ہے، ہماری انفرادی زندگی بھی ہماری طاقت ہی کا نتیجہ ہے، اگر ہمارے جسم و اعصاب اور دل و دماغ کے اندر قوت باقی نہ رہے تو ہم میں سے کسی فرد کی بھی انفرادی زندگی قائم نہیں رہ سکتی، اگر اس کے اندر ایمان کی طاقت، جسم کی طاقت، اقتصاد کی طاقت اور تعلیم کی طاقت نہ ہو۔

قرآن پاک نے بنی اسرائیل کے آغاز سلطنت کے قصہ کے ضمن میں یہ بتا دیا ہے کہ حکمرانی کی استعداد و صلاحیت کے لیے دو صفتیں ضروری ہیں، البسطۃ فی العلم والجسم یعنی علم و جسم کی طاقت، علم کی طاقت کے دائرہ میں ایمان و تعلیم صحیح دونوں داخل ہیں اور جسم کی طاقت میں اس کے سپاہیانہ جوہروں کی طرف اشارہ ہے اور جہاد الٰہی کی راہ میں انفاق فی سبیل اللہ کی بار بار تاکید جماعت کی اقتصادی طاقت کو نمایاں کرتی ہے۔

لوگ جسمانی واقتصادی طاقت کی ضرورت کو تو تسلیم کریں گے مگر ایمانی اور تعلیمی طاقت کے بارہ میں ہم سے دلیل کے طالب ہوں گے لیکن ایمان اور تعلیم کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ شک خود بہ خود زائل ہو جائے گا، انسان جس غرض سے کوئی کام کرتا ہے اس غرض کی صحت، اس صحت کا یقین اور اس یقین کے لیے جاں فروشی کا جذبہ ایمان ہے، مسلمانوں کے جہاد کی غرض و غایت حکومت، تجارت، قومیت، وطنیت نہیں بلکہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہے، یعنی اللہ کی حاکمیت علی الاطلاق کے تحت انسانوں کی دینی اخوت کا قیام اور اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح طریق و تدابیر کے علم کا نام تعلیم ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ اگر مسلمان اپنی سیاسی خود مختاری کے طلب گار ہیں تو ان کو چاہیے کہ اپنے اندر پہلے ایمان کی طاقت، جسم کی طاقت، جماعتی اقتصادی طاقت اور تعلیم کی طاقت جمع کریں اور اس کے وسیلہ سے سیاسی طاقت کا خواب دیکھیں۔

دنیا میں آج بھی اور پہلے بھی جب کسی قوم نے سیاسی طاقت حاصل کی ہے ان چار طاقتوں کے حصول کے بعد ہی کی ہے، دنیا کی پچھلی تاریخ تو افسانہ ہے، مگر آج کا پیش نظر قصہ تو ناقابل انکار حقیقت ہے، جس قسم کی سیاسی طاقت اور جس غرض کے لیے حکومت کا قیام آج جو قوم کر رہی ہے، خوب غور سے دیکھیے کہ اس کے لیے ایمانی طاقت، جسمانی طاقت، اقتصادی طاقت اور تعلیمی طاقت کس کس طرح اس کو سنبھال کے آگے بڑھا رہی ہے۔

اقتصادی طاقت کے معنی شخصی دولت مندی نہیں ہے، بلکہ کسی نصب العین کے لیے قوم کی جماعتی حالت کی بہتری اور اس سے زیادہ اس کے لیے ایثار اور اس کے حصول کی راہ میں ہر انفرادی ضرورت کی قربانی۔" (معارف، جون ۱۹۴۲ء)

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ: حکومتوں کی تبدیلی کا اثر محض سیاسی انقلاب تک محدود نہیں رہتا، بلکہ قوموں کی پوری زندگی پر پڑتا ہے، ہر نئی حکومت محکوموں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے، اس کا سب بڑا ذریعہ تعلیم ہے، وہ نظام تعلیم

ایسا بناتی ہے کہ محکوم قوم خود بخود حاکم قوم کے سانچے میں ڈھل کر اپنی زبان و تہذیب و روایات سے بے گانہ ہو جاتی ہے، انگریزوں کا نظام تعلیم اگرچہ سیکولر تھا، اس پر کسی مذہب اور تہذیب کی چھاپ نہیں تھی، اس کے باوجود اس کے نتائج نگاہ کے سامنے ہیں اور ہندوستان میں تو ایسی جماعتیں موجود تھیں جن کا مقصد اعلانیہ ہندی زبان اور ہندو تمدن کا احیا تھا، جس کا ہلکا سا تجربہ ۳۷ء کی کانگریس حکومت کے زمانہ میں ہو چکا تھا، اس لیے اس تعلیمی نظام کے جو اثرات مسلمانوں پر پڑنے والے تھے اس کا اندازہ دور اندیش اور صاحب فکر مسلمانوں کو ہو گیا تھا، حضرت سید صاحب بھی اس کی جانب وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہتے تھے، چنانچہ جولائی ۱۹۴۵ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مستقبل کا افق امیدوں سے جھلک رہا ہے، پہلو کوئی بھی ہو مگر انقلاب کا منظر سامنے ہے، سیاسی انتظامات کے تغیر کے ساتھ تعلیمی نظام کا تغیر بھی ضروری ہے، بلکہ سیاسی انتظامات کا خاکہ تو سیاسی رہنماؤں اور انگریز حاکموں کے درمیان ابھی تک مزید گفتگوؤں کا محتاج ہے لیکن تعلیمی خاکہ تو گورنمنٹ کے مشیر تعلیم کے بغل میں ابھی سے دبا ہے۔

اس خاکہ کی جو اوپری جھلک دیکھی گئی ہے، اس سے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح حکومت کا پرانا نظام ایسے ہندوستانیوں کی پیداوار اور پرورش میں مصروف تھا جو گوشت اور رنگ و روغن کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور ذہنیت کے لحاظ سے انگریز ہوں اور جو حکومت کے دفتروں کو چلانے کے کام آئیں، اسی طرح آئندہ تعلیم کا نظام کانگریسی وزارت کے زمانہ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ایسا ہوگا جو دل و دماغ اور ذہنیت کے لحاظ سے سراسر ہندی اور خالص قومی ہو اور آئندہ ہندوستان کے متوقع صنعتی انتظامات کے مطابق ہو۔

ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتے ہیں کہ مسلمان وقت سے پہلے طوفان کا اندازہ کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ ان کو ایسی تعلیم درکار ہے، جس سے مسلمان مسلمان بھی باقی رہیں اور اس راہ میں جو غفلت سرکاری مدارس کے پہلے دور میں ہو چکی ہے وہ اس کے آنے والے دور میں نہ ہو

اوراس کے لیے وقت سے پہلے مسلمانوں کو اپنی تعلیم کا مقصد اور ملکی تعلیم کے ساتھ ساتھ جو ناگزیر ہے، اپنی مذہبی تعلیم کے شمول کا بندوبست کرنا ہے۔

تعلیم کی اہمیت بہت بڑھی ہے، یہی وہ سانچہ ہے جس میں ملت کے نوجوان افراد ڈھل کر نکلتے ہیں، ان کی ذہنی تربیت، اخلاقی نشوونما، دماغی استعداد اور قلبی قوت یقین یعنی ساری ذہنیت اسی کے ذریعہ بنائی اور بگاڑی جاسکتی ہے، امت کو جیسے افراد کی ضرورت ہے وہ اسی کے ذریعہ تیار ہوتے اور ہوسکتے ہیں۔

خوب سمجھیے کہ ہندویت کی طرح اسلامیت کوئی قومیت یا وطنیت نہیں ہے بلکہ وہ ذہنی یقین اور اعمال و اخلاق کے ایک خاص طریق کا نام ہے، جس کی بقا تعلیم و تربیت کے سوا اور کسی ذریعہ سے ممکن نہیں، اس لیے اس کی بقا کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے خاص نظام کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو مسلمان رہنے اور بننے میں مدد دے۔

ہم کو خوشی ہے کہ اس وقت متعدد اصحاب فکر ایسے ہیں جو اس ضرورت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس لیے اپنی جدوجہد سے تیاری کررہے ہیں، ڈاکٹر افضال قادری صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلم لیگ کے شعبہ تعلیم کے ماتحت ایسے اصحاب کے مشوروں کو یکجا کررہے ہیں اور اپنی کمیٹی کے ارکان کے مشورے سے اسلامی نظام تعلیم کا ایک ایسا خاکہ تیار کررہے ہیں جو موجودہ جدید علوم وفنون کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہنیت کی پرورش کا بھی کفیل ہو۔

موجودہ علما میں ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن گیلانی اس لحاظ سے مدح کے قابل ہیں کہ وہ اس کام کی مشکل کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس کا حل نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں، ابھی انہوں نے ہندوستان کے اسلامی نظام تعلیم و تربیت پر ایک ضخیم تالیف شائع کی ہے اور دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں گذشتہ زمانہ میں اس مشکل کو جس طرح حل کیا تھا وہی اب بھی اس کے حل کا راستہ ہے۔

آئندہ دنوں میں موصوف کا ایک مقالہ اسی موضوع پر آپ کی نظر سے گزرے گا جو اس

خاک سار کی اس فرمائش پر لکھا گیا[1] ہے کہ کم سے کم لفظوں میں وہ اپنے خیالات کو اس طرح یک جا کریں کہ عام مسلمان بھی ان کو سمجھ سکے اور اس کے امکان پر غور کر سکے اور ہو سکے تو آئندہ اسلامی نظام تعلیم کی ترتیب میں اس کو پیش نظر رکھا جائے۔

مولانا موصوف کا کہنا یہ ہے کہ سرکاری دفتری زبان ہونے کی جو حیثیت آج انگریزی کو حاصل ہے کل وہی ملک میں فارسی کو حاصل تھی اور عربی میں یونانی عقلی علوم کو جو درجہ حاصل تھا، آج جدید انگریزی عقلی علوم اور سائنس کو حاصل ہے، اس لیے جس طرح مسلمانوں نے پہلے اپنے خالص مذہبی علوم فقہ وتفسیر وحدیث کی ایک ایک دو دو کتابوں کے ساتھ فارسی ادبیات اور یونانی عقلی علوم کو پیوند دے کر تمام اہل ملت کے لیے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا، اسی طرح آج بھی ان خالص عربی علوم کی ایک ایک دو دو کتابوں کو ملا کر انگریزی درسیات اور جدید عقلی علوم کا ایک ہی نصاب بنایا جاسکتا ہے، جو ہمارے مدارس اور اسکولوں اور کالجوں میں یکساں پڑھایا جاسکے۔

اس نصاب کو ختم کرنے کے بعد جو لوگ مزید مذہبی علوم میں تحقیقی شان پیدا کرنا چاہیں ان کے لیے تکمیل کا الگ زائد نصاب بنالیا جائے اور جو جدید عقلیات اور انگریزی درسیات میں ترقی کرنا چاہیں ان کے لیے بھی راستہ تیار رکھا جائے، اس سے ایک طرف قوم میں علما اور جدید تعلیم یافتوں کی دورنگی کا خاتمہ ہو جائے گا، دوسری طرف مسلمانوں سے مذہبی بے گانگی کا عیب دور ہو جائے گا اور تیسری طرف علما کی بیکاری کا خیال باطل ہو جائے گا اور وہ بھی دوسروں کی طرح اگر چاہیں تو دنیا کے کام میں بھی لگ سکیں گے۔

ضرورت ہے کہ اہل نظر حضرات اس تجویز پر غور کریں، اس وقت جمعیۃ العلمائے ہند بھی عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کی فکر میں ہے اور اس کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے اور بعض تجویزیں زیر غور ہیں، اس لیے یہ وقت اس تجویز پر غور کرنے کے لیے مناسب ہے۔

قومی تعمیر کے اصول وشرائط: ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے سلسلہ میں قومی تعمیر کے اصول اور

[1] یہ مقالہ جولائی ۱۹۴۵ء کے معارف میں چھپا ہے۔

طریقوں پر روشنی ڈالتے ہیں:

''جماعت کی تعمیر صرف جذبات، جوش وخروش اور ہنگاموں سے نہیں ہوتی، بلکہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اوراس کے حصول کی راہ میں جان و مال وعزت ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہیے اوراس راہ میں موانع کی جومشکلیں پیش آئیں ان کے ازالہ اور برداشت میں صبرو ضبط اور عزم وہمت واستقلال اور حصول مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقا کے لیے اخلاق کی بلندی، عیش وآرام کی زندگی سے پرہیز، مال ودولت کی اور جاہ وعزت کی حرص اور محبت سے آزادی، مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ اور مقصد کی بقا و ہر ذاتی منفعت اور شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اوراسی کے لیے جینا اور مرنا جب تک کسی جماعت کے افراد میں اکثریت اوراغلبیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے اول تو کوئی جماعتی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو باقی نہیں رہ سکتا۔

اسلام میں بدر کا معرکہ جو تین سو تیرہ مسلمانوں کا کارنامہ ہے، ہروقت پیدا کیا جاسکتا تھا، مگر بدر کے وقوع کے لیے تیرہ برس کے انتظار کی ضرورت پیش آئی اور جب تک ٹھونک بجا کراور آزمائشوں کی آگ میں تپا کر ان کو دیکھ نہیں لیا گیا ان کو معرکوں میں نہیں لایا گیا، اس سے اندازہ ہو گا کہ جماعتوں کی تعمیر صرف ضد اور ہٹ، سب وشتم، طعن وطنز، شوروغل اور مختلف نعروں کے شعر پڑھنے اور چیخنے سے نہیں ہوتی، بلکہ مقصد کی بلندی اس سے عشق نما وابستگی، اس کے حصول وبقا کے لیے اعلیٰ اخلاق پختہ سیرت اور مضبوط کیرکٹر پیدا کرنا ضروری ہے۔

تاریخ میں بکثرت ایسی مثالیں ہیں کہ جماعت میں اپنے وحشیانہ جوش اور شجاعت سے کسی مقصد کو حاصل کرلیا لیکن اس کی بقا کے لیے جو اخلاق اور کیرکٹر چاہیے اس کے نہ ہونے سے ان کے ہاتھ سے وہ مقصد بہت جلد کھو گیا، ہندوستان کی تاریخ میں اودھ کی سلطنت اور روہیلوں کی ریاست، سکھوں کی شاہی اور مراٹھوں کی پیشوائی میں عبرت کی داستانیں چھپی ہیں۔

اب جب کہ ہندوستان میں وزارتیں قائم ہو رہی ہیں، ان کو بھی دیکھیے اگر ان کے

چلانے والوں میں اخلاق کی یہ بلندی اور وسعت اور سیرت کی یہ پختگی اور وسعت کیرکٹر کی یہ مضبوطی نہیں تو یہ انگریزوں کے سہارے چلنے کو چل جائیں مگر ان میں وجود کی ذاتی صلاحیت اور بقا کی اصلی استعداد کبھی نہ ہوگی۔

کانگریس کی پچھلی منسٹری میں جو کمزوریاں تھیں ان کے ہوتے ہوئے اگر وہ جنگ کے بارے نہ ٹوٹ جاتی تو بھی از خود ٹوٹ جانا چاہیے تھا، واقعات کی شہادت اور گواہی ہے تو اس کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے خصوصاً جب یہ شہادت کسی حکومتی نظام کے زیر ہدایت فراہم کی جائے تو اور بھی مشکل ہے، اس لیے ہم حریف اور مقابل بن کر نہیں بلکہ دوست بن کر کہتے ہیں کہ افراد کا انتخاب اعلیٰ کیرکٹر، شریفانہ سیرت اور بلند اخلاق کی بنا پر کرنا چاہیے، جن کی نظر میں وسعت، سینہ میں گنجائش اور ہاتھوں میں مضبوطی ہو، جن میں دوستوں کو بھی ان کی غلطی پر پکڑ میں جھجک نہ ہو اور دشمنوں کے ساتھ ان کے بجا مطالبہ پر ضد اور ہٹ نہ پیدا ہو، جو صرف اپنے اور اپنے خاندان اور اپنے دوستوں کی شکم سیری کے سامان نہ ہوں بلکہ ان کی نیکی اور مہربانی، عام خلق کے ساتھ ہو، ان کو صرف اپنے ہی معبد، مدرسے، مکتب اور دھرم شالے عزیز نہ ہوں بلکہ ہر جماعت کے مذہبی، جماعتی، تعلیمی اور مجلسی اداروں کے ساتھ ان کو یکساں تعلق ہو، ان کی نظر میں انسانوں کی جانوں کو بچانا جانوروں کی جانوں کے بچانے سے زیادہ عزیز ہو، جن میں کسی سیاسی مسلک کے لیے صرف قربانی ہی کا جذبہ نہ ہو بلکہ دیانت اور قوت نظم بھی ہو، جن میں قوم ہی نہیں بلکہ خدمت خلق کے لیے بھی لگن ہو۔

مسلمانوں کے لیے ان کا معاملہ انتخاب ختم ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد بھی یکساں غور و فکر کا مستحق ہے کہ ان کا دینی وجود اس ملک میں کیوں کر قائم رہ سکتا ہے اور اس سرزمین میں جو بقول مولانا حالی اکال الامم (قوموں کو کھانے والی) ہے، امت محمدیہ کی حفاظت کا کیا سامان ہوگا، یہاں برہمنوں نے اقلیت کے باوجود ساری قوم کی سرداری اور نیابت کا مرتبہ حاصل کیا ہے اور دوسری قوموں کو اپنے جھنڈے کے نیچے کسی نہ کسی گوشہ میں جگہ دے کر ان کو اس طرح بے خبر بناتے رہے کہ خود ان کو اپنی خبر نہیں رہی اور پھر ان کو اچھوت، راکشس اور ملیچھ بنا کر ان کی ہستی کو کھو

دیا، اس لیے قومیت متحدہ کا تصور نہایت خطرناک ہے، البتہ وطنیت متحدہ کی گنجائش ہے، جس کے حقوق اسلام میں بھی ہیں۔

اس حقیقت کا اظہار آج ہی نہیں ہو رہا، بلکہ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار وزارت بننے اور اس کی تعلیمی اسکیم کے موقع پر بھی معارف اور مدینہ میں میرے قلم سے ہوا ہے اور اس کے لیے میں نے اپنے بعض دوستوں کو ناراض کیا ہے اور مجھ سے کہا گیا کہ مسلمان اپنے مستقل دینی وجود کے لیے اپنی تعلیم کا نظام اس طرح قائم کریں جس طرح یہودیوں نے جرمنی میں کیا ہے، گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی یہودیوں کی جرمنی میں تھی، جس کا انجام معلوم ہو چکا، غرض مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے اور ضرورت ہے کہ مسلمان رہنما اس تنبیہ کا بار بار اعادہ کرتے رہیں تا کہ مسلمان بھی بے خبر ہو کر ۳۳ کروڑ کی بھیڑ میں اگلوں کی طرح گم نہ ہو جائے۔" (معارف، مارچ ۱۹۴۶ء)

مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت: اپریل ۱۹۴۶ء کے شذرات میں فرماتے ہیں:

"کسی ملک کی آزادی کے لیے سب سے پہلی شرط اس کے باشندوں کا مقصد خاص پر اتحاد و اتفاق ہے، جب تک یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، ان کے اندر وہ طاقت نہیں آسکتی، جس سے وہ دوسری طاقت کے مقابلہ میں اپنی قوت کا ثبوت دے سکیں اور جب تک اس قوت کا ثبوت نہ پیش کیا جائے گا ... ملک کا ہر دعویٰ نامسلم اور ہر قول نامسموع رہے گا۔

سب کو معلوم ہے کہ ملک کی دو بڑی قوموں میں آزادی کے بعد کی منزل میں اختلاف ہے لیکن واقعاً ہم سب کو آزادی محبوب ہے اور اس کی سچی طلب ہے تو ضرور ہے کہ ہم اس اختلاف کی خلیج کو جس طرح سے ہو پاٹنے کی کوشش کریں، اقلیت کو اکثریت کی بے اعتنائی بلکہ ظلم کا خطرہ ہے اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک قوم سے چھوٹ کر دوسری قوم کی غلامی میں دیے جا رہے ہیں، ایسی حالت میں اکثریت کا یہ فرض ہے کہ ہر طور سے ان کو مطمئن کرے اور اس کے اعتبار کو حاصل کرے، تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کا اصل مقصد واقعاً اس قدر عزیز ہے کہ اس کی خاطر وہ

تھوڑا سا نقصان بھی برداشت کرنے کو تیار ہے۔''

مسلمانوں کی آزادی اور اصل مقصدِ حیات: جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے پیش نظر سیاسی انقلاب خواہ کتنا ہی خوش آیند ہو ان کا اعلیٰ مطمح نظر نہیں بن سکتا، ان کا اصلی مقصد حیات تو اشخاص کا عروج وزوال، پارٹیوں کی شکست وریخت، وزارتوں کا عزل ونصب اور زمینوں کا ردوبدل نہیں بلکہ عقائد واصول کی تصحیح، مقصدِ حیات کی تعیین اور مسائل زندگی میں اسلامی نظام کی سچی تقلید وپیروی ہے اور اس کی برقراری کے لیے دلوں میں سچی تڑپ اور ناقابل سکون اضطراب، غرض ہم کو نئے سرے سے ایک نئی عمارت قائم کرنا ہے۔

بحمد اللہ کہ مسلمان نوجوانوں میں اس حقیقت کا ادراک ہو رہا ہے اور یہ آواز پہلے کی طرح اب نامانوس نہیں رہی ہے، وہ زمانہ جاچکا، جب ہمارے رہنما یہ کہتے تھے کہ صرف انگریزوں کی نقالی ہمارے ہر مرض کی دوا ہے، اب ان ہی بیماروں میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جنھوں نے یہ پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ یہ صحت کا نسخہ نہیں بلکہ ایک بیماری کی جگہ دوسری بیماری کے بدلنے کی محض تدبیر تھی، چنانچہ بیماری بدل گئی اور پہلے مرض کا مریض اب دوسرے مرض کا مریض ہے اور شکر ہے کہ اب مریض نے بھی سمجھ لیا کہ مرض کے تبادلہ کا نام صحت نہیں، چنانچہ اب بہت سے نوجوان اس جراثیم گھر سے نکل کر جس کا نام شفا رکھا گیا تھا، اصلی شفاخانہ کی طرف لوٹ رہے ہیں، رجوع الی الاسلام یعنی زندگی کے ہر اصول میں اسلام کی طرف بازگشت ہی ہماری ہر بیماری کا علاج ہے۔

اس لیے حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو پہلے اسلام کا خواب دیکھنا چاہیے کہ اسلام کیا ہے، اس کا نظام کیا ہے، اس کے احکام کیا ہیں اور اس کے مطابق ہمارے افراد کی زندگی ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ہمارے اندر وہ انقلاب کیسے پیدا ہو جو ہم کو ترکستان کی راہ سے ہٹا کر حجاز کی طرف لے جائے، جو ہم کو یورپ کی نقالی کے بجائے خود اپنی اصلیت مفقودہ کی تصویر ہم کو دکھائے تاکہ ہم خلافت موعودہ کے مستحق ٹھہریں۔

جب تک ہمارا مقصود صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین نہ ہوگا اور اسی کے اٹھنا اور بیٹھنا اور مرنا اور جینا نہ ہوگا، ہم اسی طرح ممبریوں اور وزارتوں اور لیڈری کے لیے آپس میں لڑتے، مرتے اور کٹتے رہیں گے، کیوں کہ ہم نے اپنا مقصد ان ہی شخصی اعزازات اور اسی جاہ و منصب کے حصول کو بنا رکھا ہے، اور اسی کا نام ہم نے اسلامی ترقی رکھ چھوڑا ہے۔

ضرورت ہے کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی سیاسیات، اسلامی اقتصادیات، اسلامی طریق تجارت اور اسلامی اصول مضاربت (یعنی سرمایہ اور مزدوری کے تعاون)، اسلامی طریق پر کاشت کاری، اسلامی طریق کارخانہ داری، کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق، اسلامی لین دین اور معاملات کے مسائل اور دیگر ضروری امور زندگی کے متعلق خالص اسلامی حل کو لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے، جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں۔

متحدہ قومیت اور متحدہ کلچر کا نعرہ: ہندوستان کی آزادی کے بہت پہلے سے ایک بڑی جماعت جس میں کانگریسی بھی تھے، آزاد ہندوستان میں ہندی زبان اور ہندو کلچر کے احیا کے لیے کوشاں تھی، اس لیے مسلمانوں کے خطرات بالکل صحیح نکلے اور آزادی ملنے کے ساتھ ہی متحدہ قومیت اور متحدہ کلچر کا نعرہ بڑے زور و شور سے بلند ہوا، اس وقت مسلمان ۴۷ء کے حالات سے ایسے سراسیمہ تھے کہ وہ اپنی حیثیت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے، ان میں سے کچھ لوگ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے متحدہ کلچر کو قبول کرنے کی دعوت دیتے رہے، جو مسلمانوں کے لیے سراسر مہلک تھی، سید صاحب نے اس کے متعلق صحیح نقطہ نظر پیش کیا، فرماتے ہیں:

> ”ہندوستان میں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور خصوصاً مشرقی پنجاب اور دہلی کے غیر متوقع واقعات سے مسلمانوں پر ایک حیرت سی چھا گئی ہے، ان کو اپنے لیے ہندوستان کی اس نئی دنیا میں عزت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، بہتیرے دماغ تو سوچنے اور سمجھنے سے

معذور ہو گئے ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ نئے ماحول سے وہ اپنے کو کیسے مطابق کریں، بعضوں نے اب سوچنا شروع کیا تو ان کو یہ راستہ نظر آیا کہ وہ محکوم ہیں اور ہندوان کے حاکم ہو گئے ہیں، اس لیے مسلمانوں کی عزت کی زندگی کا راستہ یہ ہے کہ محکوم قوم حاکم قوم کے ساتھ محکومانہ وفاداری کا تعلق پیدا کرے اور اس کے علوم وفنون اور زبان کو اپنائے اور اس کے طور وطریق اور تمدن وتہذیب کو اختیار کرے، چنانچہ اس وقت جو نئے اخبارات نئے پیغاموں کے ساتھ نکلنے لگے ہیں وہ کبھی صراحۃً اور کبھی اشارۃً اس قسم کے خیالات پھیلا رہے ہیں، افسوس کہ یہ مقصد سرتاسر غلط ہے اور یہ غلط رہنما مسلمانوں کو خودکشی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔

صحیح صورت یہ ہے کہ کانگریس کا اعلان اور حکومت وقت کا منظور کردہ دستور اساسی ظاہر کرتا ہے کہ ملک ہندوستان میں اس ملک کے سارے باشندوں کی متحدہ جمہوری حکومت ہے، جس میں اس ملک کی ہر قوم برابر کی شریک وسہیم ہے، البتہ نمائندگی اور تقسیم ملازمت میں قوموں اور فرقوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ہوگی اور لازماً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس قوم کی تعداد بڑی ہوگی اس کو اکثریت کی قوت حاصل ہوگی، مگر اس کا نتیجہ اقلیت والے گروہ کی محکومی نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر فرقہ اور گروہ اور اہل مذہب کو اپنے دین، زبان، تمدن، تہذیب اور طریق معاشرت کی پوری آزادی کا مساویانہ حق حاصل ہے، اور اس وقت تک کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اپنی قومیت کے عناصر کی پوری طرح حفاظت نہ کرے اور اس کے لیے پوری جدوجہد نہ کرے، اور اس راہ میں جانی و مالی خدمت وایثار کے جذبات سے اپنی خودمختاری کا ثبوت نہ دے۔" (معارف، نومبر ۱۹۴۷ء)

پھر جولائی ۴۸ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:

"پنت جی تو صرف ہندی زبان ہی کے قبول کو قومیت متحدہ کی شرط قرار دے کر رہ جاتے ہیں لیکن ٹنڈن جی اس کے لیے ہندو کلچر کے قبول کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، مگر اس حکم سے پہلے ان کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ کس عہد کے اور کس صوبہ کے ہندو کلچر کے اختیار کرنے پر وہ مسلمانوں کو

مجبور کرنا چاہتے ہیں اور کیا مدراس و بنگال سے لے کر پنجاب تک کے ہندوؤں میں کوئی متحدہ کلچر کا نقشہ ان کے سامنے ہے، کیا پگڑی باندھی جائے یا ننگے سر رہا جائے، پگڑی بھی کیسی پنجابی یا راجستھانی، یا گجراتی یا مرہٹی یا مارواڑی یا میواڑی یا بنگالی سر برہنگی اختیار کی جائے، کس دیس کا کھانا کھایا جائے اور کس دیس کی ہندی بولی جائے، میرے خیال میں ٹنڈن جی جلدی کر رہے ہیں، ان کو چاہیے کہ پہلے اپنے ہم خیالوں کو تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیں اور ہندی کو علوم و فنون سے معمور بنالیں پھر ہندوستان کا ہر باشندہ غالب قوم کی ہم نوائی، ہم شکلی اور ہم لباسی کو بضرورت زمانہ اور بغرض اعزاز خود قبول کرلے گا، اس وقت نہ دعوتوں کی ضرورت ہوگی، نہ دعووں کی اور نہ وعیدوں کی، حسن کو اشتہار کے بغیر عشق کا پیام عبودیت پہنچتا رہتا ہے، انگریزوں نے اپنی تہذیب و تمدن اور زبان و کلچر کو جن اصولوں پر پھیلایا وہی اصول اب دوسرے بھی اختیار کر سکتے ہیں، جن میں نہ زور ہے نہ ظلم ہے، اور مقصد بہمہ وجوہ حاصل ہے۔

لیکن ٹنڈن جی کو مسلمانوں سے پہلے خود اپنی حکومت کو مشورہ دینا چاہیے کہ وہ نئی دلی کی یورپین کلچر کی عمارتوں، کوٹھیوں، فرنیچروں، دفتروں، قاعدوں، قانونوں، سکریٹریوں، کلرکوں، چپراسیوں، سڑکوں، سواریوں کو چھوڑ کر بنارس کی گلیوں میں چلے جائیں، موٹروں کے بجائے ہمارے منتری رتھوں پر نکلیں اور ہماری سینا بانوں سے لڑے۔

ٹنڈن جی کو جاننا چاہیے کہ کسی قوم کا کلچر نہ اس آسانی سے بنتا ہے نہ اس آسانی سے بگڑتا ہے، پھر وہ کانگریس جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہندو، مسلمان، یہودی، پارسی سب کی نمائندہ ہے، اس کے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ مسلمان، یہودی، پارسی سب مل کر ہندو کلچر اختیار کرلیں، اپنے دعویٰ کی آپ تردید ہے، کلچر ایک ترقی پذیر چیز ہے، وہ کوئی جامد اور ساکن چیز نہیں، ٹنڈن جی کی اس دعوت کے یہ معنی ہیں کہ آج بیسویں صدی عیسوی سے ہٹ کر بکرمی سمبت کی ابتدائی صدیوں میں ہم پہنچ جائیں اور زمانہ کی ہر ترقی کا ساتھ چھوڑ کر عہد تاریک کی خاموش تصویر بن جائیں، اس دعوت کو نہ مسلمان ہی قبول کر سکتے ہیں اور نہ سمجھدار ہندو۔

ہندو کلچر کی بنیاد تو دھرم شاستر پر ہے، جن کی بنیاد پر ذاتوں کی تقسیم، چھوت اچھوت کی تمیز، راج، ہنر، پیشہ اور مزدوری کی طبقاتی تقسیم ہے، مجھے ڈر ہے کہ اس شاستر کے زور اور ٹنڈن جی کی تجویز پر راج پوت دلی اور صوبوں کے دارالحکومتوں پر قبضہ چاہیں گے اور پنڈتوں کو سیاست سے نکال کر پوجا پاٹھ اور سکھشا کے پرانے دھندوں میں اور کایستھوں کو ان کے اپنے کاموں پر لگا دیں گے اور اپنے تمام سفیروں کو سمندر پار سے بلوالیں گے، اور اچھوت، ادھار، گاؤں سدھار اور ہریجن کی تعلیم و ترقی کی ہر تجویز کو مٹا دیں گے، اس سے بھی بڑھ کر کوئی احمقانہ بات ہو سکتی ہے۔''

باب ہشتم

ہجرت اور قیام پاکستان

۱۹۵۰ء-۱۹۵۳ء

مختلف مقامات سے طلب اور عہدوں کی پیش کش: بھوپال کے قیام کے زمانہ ہی سے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف تعلیمی ادارے حضرت سید صاحب کے خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھے، مسلم یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی نے شعبہ اسلامیات عربی کی پروفیسری کی پیش کش کی تھی[1]، مولانا عبدالماجد صاحب کو اپریل ۱۹۴۹ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''علی گڑھ میں رشید[2] صاحب وغیرہ نے قیام علی گڑھ پر بہت اصرار کیا، یہاں سے

---

[1] اس کا ذکر اوپر ایک خط میں بھی گزر چکا ہے۔ [2] اس زمانہ میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا بڑا اثر تھا، ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو چکے تھے جو خود سید صاحب کے مرتبہ شناس تھے اور ان کو اپنا بزرگ مانتے تھے، رشید صاحب لکھتے ہیں ''میں نے ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ کسی طرح علی گڑھ آ جائیں، جہاں ان کی بڑی ضرورت ہے، پھر جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے لیے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آ جائیں لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ سید صاحب پاکستان جانا طے کر چکے تھے، بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲ پر)

بھوپال پہنچا تو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا خط میں جس میں شعبہ اسلامیات کی پروفیسری کے لیے مجھ سے نام پوچھے گئے تھے اور اشارۃً خود مجھے دعوت پیش کی گئی تھی، تنخواہ آٹھ سو روپے سے بارہ سو تک، آپ کیا فرماتے ہیں، جی چاہتا ہے اپنے بجائے مولوی مناظر احسن صاحب کا نام پیش کروں، مولانا مناظر کا کل خط آیا ہے، جائزہ (عثمانیہ یونیورسٹی سے سبک دوشی) دے کر وطن جا رہے ہیں۔" (مکاتیب سلیمانی، جلد۲، ص۳۲۶)

پاکستان کے ارباب حکومت علاحدہ سید صاحب کو بلانے کی کوشش میں تھے، ان کے مسترشد غلام محمد صاحب جن کو سید صاحب کے قیام پاکستان کے حالات کا ذاتی علم ہے، تذکرہ سلیمان میں لکھتے ہیں:

"مارچ ۴۹ء میں وہ قرارداد مقاصد پاس ہوئی جس کے رو سے دستور پاکستان کو کتاب و سنت کے چوکھٹے میں لانا ضروری ہوگیا۔...... اس ضرورت کے تحت طے پایا کہ پانچ علما کا ایک بورڈ قائم کیا جائے جو اسمبلی میں پاس شدہ دستوری سفارشات کو اصول شرع پر رکھ کر ان کو کتاب و سنت کے مطابق کرے، ارباب حکومت میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین علامہ سید سلیمان ندوی کو مرکز نگاہ بنائے ہوئے تھے، اس معاملہ میں جب انہوں نے مولانا عثمانی (مولانا شبیر احمد صاحبؒ) سے مشاورت کی تو مولانا نے بکمال بے نفسی اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے فرمایا "طبقہ علما میں صرف علامہ سید سلیمان ندوی ہی کی شخصیت اس کام کے لیے موزوں ہو سکتی ہے، چوں کہ وہ جدید و قدیم کا سنگم ہیں" اس طرح اہل حکومت اور مولانائے عثمانی کے اتفاق رائے حضرت علامہ ندوی کا اسم گرامی مجوزہ بورڈ کی صدارت کے لیے طے ہوا، اس بورڈ کے ارکان ڈاکٹر محمد حمید اللہ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲) یا جس کے لیے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کے لیے وقف کر دی تھی وہ مسلم ہے لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا، اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، ان کے اس نصب العین کے خلاف نہیں تھا جو ان کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبہ ان کی تصنیف ہی سے نہیں ان کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔ (سلیمان نمبر، صفحہ ۱۲۱)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندی، پروفیسر عبدالخالق مرحوم اور جعفر حسن صاحب منتخب ہوئے۔"

حضرت علامہ قدس سرہ کے نام حکومت پاکستان کی طرف سے دعوت نامہ جاری ہوا، اس وقت حضرت والا قاضی القضاۃ (بھوپال) کے عہدہ پر فائز تھے اور ہجرت پاکستان کا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ تھا، اس لیے کہ دارالمصنّفین وہاں (ہندوستان) تھا، محبوب استاد کی خواب گاہ وہیں تھی اور ارض پاک بطحی کے بعد اپنی خواب گاہ کے[1] لیے جو زمین محبوب تھی، وہ بھی اسی کے قریب مسجد کے سامنے درخت کے نیچے تھی، اس قلبی انجذاب کے علاوہ عقلی طور پر بھی ترک قیام مناسب نہ تھا، پریشان حال اور لاچار بھارتی مسلمانوں کی ڈھارس جن دو چار ہستیوں کی بندھی تھی، ان میں ایک حضرت کی ذات اقدس بھی تھی۔

ان سب کے علاوہ خود حکومت ہند بھی ان کے وزن اور اہمیت سے باخبر تھی اور کسی قیمت پر اس گراں پایہ شخصیت کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی[2]، اسی طرح حضرت والا کے مخلص احباب بھی ان کے قیام ہندوستان پر مصر تھے، ان حالات میں جب حکومت پاکستان کا دعوت نامہ پہنچا اور وہاں کے علمائے کرام کے خطوط آئے اور اصرار پر اصرار کیا جانے لگا تو حضرت والا کشمکش میں مبتلا ہو گئے اور راقم حقیر کو ایک عریضہ کے جواب میں تحریر فرمایا:

"حالت یہ کہ ہر دو جگہ (ہندوستان اور پاکستان) میرے وجود کے لیے احباب مصر ہیں مگر اپنی حالت یہ ہے کہ عدم صحت اور ضعف قوی سے بھی اور طبیعت کے اقتضا سے بھی اختلاف و منازعت سے گھبراتا ہوں۔" (تذکرہ سلیمان، صفحہ ۲۱۷-۲۱۸)

---

[1] سید صاحب نے اپنی قبر کی جگہ دارالمصنّفین کی مسجد کے صدر دروازہ کے سامنے مولانا شبلی کے مزار سے متصل متعین فرمادی تھی لیکن قضاوقدر کا فیصلہ کچھ اور تھا، لاتدری نفس بای ارض تموت، اس لیے یہ شرف اعظم گڑھ کے بجائے کراچی کو حاصل ہوا۔ [2] پنڈت جواہر لال نہرو سے سید صاحب کے پرانے تعلقات تھے، وہ ان کا بڑا لحاظ و احترام کرتے تھے اور ان کی جیسی شخصیت کا پاکستان جانا ان کو پسند نہ تھا اور یہاں تک آمادہ تھے کہ ان کا مستقل قیام ہندوستان میں رہے اور ضرورت کے وقت ان کو پاکستان جانے کی ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے۔

اس قسم کے اشارے راقم کے نام کے خطوط میں بھی ہیں جو بعد میں آئیں گے۔

دارالمصنّفین کی ناخوش گوار فضا: حقیقت یہ ہے کہ بھوپال سے علاحدگی کے بعد سید صاحب کی پہلی جگہ دارالمصنّفین تھی، مگر یہاں ان کو امن وسکون حاصل نہ تھا، ان کے اور مولوی مسعود علی صاحب کے اختلافات اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہ رہ گئی تھی، ایک زمانہ میں ان دونوں کا اتحاد ضرب المثل تھا اور دونوں نے مل کر دارالمصنّفین کو پروان چڑھایا تھا لیکن پھر اختلاف بھی اسی درجہ کا ہوگیا، اس کا سبب دونوں کا اختلاف مزاج تھا، سید صاحب نرم خود، حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے، اختلاف اور جنگ اور مقابلہ سے گھبراتے تھے، ان کی ایک سطح تھی جس سے کسی حال میں نیچے نہ اتر سکتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب کا مزاج بالکل اس کے برعکس تھا، اب اس کی تفصیل کیا لکھی جائے، ...... وہ کسی معاملہ میں ادنیٰ اختلاف رائے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، دارالمصنّفین کے معاملات میں بھی استبداد اور مطلق العنانی سے کام لیتے تھے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ان کو کسی بات میں تامل نہ تھا، اس لیے دونوں میں اختلاف بڑھتا گیا، جس کا اثر دونوں کے گھروں سے لے کر دارالمصنّفین کے معاملات تک پہنچ گیا، سید صاحب اس کو اپنی طبعی بردباری اور دارالمصنّفین کے مصالح کی خاطر برداشت کرتے رہے لیکن آخر میں ان کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ان کا دارالمصنّفین میں سکون کے ساتھ رہنا مشکل ہوگیا، اس کی تفصیل بڑی طویل اور ناخوش گوار ہے اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں، اس لیے اس کا قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

اس زمانہ میں سید صاحب نے دارالمصنّفین کے ارکان اور ارباب خاص کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں ان حالات کا ذکر ہے، مولانا عبدالماجد صاحب کے نام کے خطوط چھپ چکے ہیں، ان میں دیکھا جا سکتا ہے، خود مولانا نے مکاتیب سلیمانی کے دیباچہ میں دونوں کے اختلاف کا ذکر کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا مسعود علی صاحب کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے، آخر کئی برسوں میں سید صاحب کو ان سے بہت زیادہ رنجش ہو گئی تھی اور آخر وقت تک قائم رہی، اس مجموعہ کے آخری دو مراسلے تو گویا بالکل استغاثے یا عرضی دعویٰ ہیں۔'' (دیباچہ مکاتیب سلیمانی، ص ۶)

مولانا مسعود علی صاحب کو یہ یقین تھا کہ سید صاحب کی دار المصنّفین سے علاحدگی کے بعد وہ بلا شرکت غیرے اس کے مالک و مختار ہو جائیں گے، اس لیے سید صاحب کی بھوپال سے علاحدگی کے بعد ان کی کوئی پذیرائی نہیں کی، بلکہ الٹے ان کو پاکستان کا سبز باغ دکھا کر وہاں جانے کا مشورہ دیتے رہے، سید صاحب مولانا عبد الماجد صاحب کو لکھتے ہیں:

''اگر واقعی میری قدردانی آپ کے دلوں میں ہوتی تو آپ کے ارکان منتظمہ اور ارکان عاملہ یا ناظم امور انتظامی (مولانا مسعود علی صاحب) میری واپسی کے لیے کوئی اصرار یا درخواست پیش فرماتے اور دار المصنّفین میں میرے قیام پر مصر ہوتے، حالاں کہ آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں حباب کے اصرار کے مقابلہ میں انکار کا مادہ ہی سرے سے نہیں ہے، میں تو ہمیشہ سے مروت کا مارا ہوا ہوں، بلکہ احباب خاص (مولانا مسعود علی صاحب) نے مشورہ دیا کہ) آپ کا ہندوستان میں اب کوئی کام نہیں، اس کے یہ معنی ہوئے کہ دار المصنّفین کو میرے وجود کی ضرورت نہیں اور ہندوستان چھوڑنے سے پہلے میرے سامان کی خریداری میں سبقت کی۔'' (مکاتیب سلیمانی، جلد دوم، صفحہ ۲۳۰)

راقم کو پاکستان سے جنوری ۱۹۵۱ء کے خط میں لکھتے ہیں[1]:

''سنا ہے کہ مولوی صاحب (مولوی مسعود علی) نے فرمایا ہے کہ میں یہاں دار المصنّفین میں قائم کرلوں تو محمد علی جناح کی طرح میرا کارنامہ ہوگا، میں نے ہندوستان میں دار المصنّفین قائم کر کے کیا فائدہ اٹھایا، جو یہاں قائم کر کے حاصل کروں گا، اب جب وقت آیا کہ جوانی کی محنت سے بڑھاپے میں فائدہ اٹھاؤں تو صیاد نے چمن سے باہر کر دیا، اب بھی دار المصنّفین میں جو سرمایہ حاصل ہو رہا ہے، وہ ہماری ہی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اس کے نتیجہ سے سب فیض یاب ہو رہے ہیں اور میں

---

[1] یہ خط پاکستان جانے کے بعد کا ہے۔

محروم ہوں۔

مولوی صاحب کا ۲۰/دسمبر کا خط ۲/فروری کو ملا، جس میں میرے محولہ بالا فقرے سے انہوں نے انکار کیا ہے، حالاں کہ قائل نے خود مجھی سے دفتر (دفتر دارالمصنّفین) میں کہا تھا کہ آپ کا ہندوستان میں کوئی کام نہیں ہے، آپ ہندوستان سے باہر جائیں۔

ظاہر ہے کہ جب ہندوستان میں کام نہیں تو دارالمصنّفین میں بھی نہیں، دارالمصنّفین مجھ سے مستغنی ہے، البتہ آپ لوگوں سے مستغنی نہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اوران سے استفادہ کرنے والوں کو سلامت رکھیں، ان کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ مجھے روکنے پر اصرار کرتے اور دارالمصنّفین کی ضرورت پر زور دیتے، یا یہ کہ میرے وہاں غیر ضروری ہونے کو فرماتے، جس کا مطلب سوائے اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ میرے دارالمصنّفین واپس آنے پر دل سے خیر مقدم نہ ہوگا۔''

کراچی کا اتفاقی اور عارضی سفر: ان حالات نے سید صاحب کو اور زیادہ بددل کر دیا، اتفاق سے اسی زمانہ میں پاکستان جانے کی ایک اتفاقی صورت نکل آئی، اس کی تفصیل خود سید صاحب کے قلم سے یہ ہے:

''میری کئی اولادیں بسلسلہ ملازمت پاکستان آچکی تھیں، ان کا تقاضا تھا، اسی طرح میرے احباب کوشاں تھے کہ میں پاکستان آجاؤں لیکن میرا دل ترک وطن کے لیے آمادہ نہ تھا، مگر جب یہ خبر ملی کہ میری نواسی سخت قسم کے ٹائفائڈ میں مبتلا ہے اور میری بڑی لڑکی ولادت کے بعد سخت بیمار ہے تو دل کو بے چینی ہوئی اور چاہا کہ کسی طرح کراچی پہنچوں لیکن نو آبجکشن سرٹیفکیٹ ملنے سے مایوسی تھی، کیوں کہ بھوپال سے تعلق منقطع ہو چکا تھا اور وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا، عین اس وقت میرے پاس ایک تار ۷/جون ۵۰ء کو اعظم گڑھ سے کان پور پہنچا جس میں لکھا تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن نے دلی سے تار دیا ہے کہ خیر سگالی وفد کا پرمٹ تیار ہے، فوراً آئیے،[1]

---

[1] یہ وفد سپرو صاحب کی قیادت میں گیا تھا، اس زمانہ میں سید صاحب اپنے داماد سید حسین صاحب کے یہاں جو کان پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، مقیم تھے، دلی سے اعظم گڑھ تار آیا تھا، مگر بھیجنے والے کا نام صحیح (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۸ پر)

اس اطلاع کو امدادِ غیبی سمجھا، گو پہلے سے مجھے اس کا کوئی حال معلوم نہ تھا، تاہم اولاد کی محبت کی خاطر غیر معلوم سفر کے لیے دوسرے شام کو دہلی روانہ ہوگیا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ایک دوست کو تار سے اپنی آمد کی اطلاع دے دی، صبح کو دہلی اسٹیشن پہنچا تو مولانا نظر نہ آئے لیکن میرے دوست آ گئے تھے، ان سے آمد کی غرض بیان کی، انہوں نے کہا سچر صاحب کا وفد تو جا چکا، اب کوئی وفد نہیں جا رہا ہے، مجھے یقین نہیں آیا، میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملا، انہوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور تار سے بے تعلقی کا اظہار کیا، پھر تحقیقات کے بعد مطلع فرمایا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے صاحب زادے عزیز الرحمٰن نے تار دیا تھا اور ان کا بیان ہے کہ آپ کا پرمٹ تیار ہے، یا تیار ہو سکتا ہے، میں نے اس سفر کی ذاتی غرض بیان کی تو مولانا نے مجھے بجا طور پر یہ مشورہ دیا کہ آپ کو اس پرمٹ کے بجائے اپنے وطن کے کلکٹر سے نو آبجکشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہیے، میں نے عرض کیا کہ افسوس ہے کہ مجھے میرے وطن کے حکام نہیں جانتے اور وہاں سے مشکل سے مجھے اجازت نامہ مل سکتا ہے، اس لیے یہیں مرکز سے مجھے اجازت نامہ دلوا دیں، انہوں نے اس سے معذوری ظاہر کی، بالآخر میں نے اسی خیر سگالی کے وفد کے پرمٹ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور احباب کی کوشش سے ۹؍ جون کو وہ بن کر میرے پاس آ گیا اور میں نے ڈپٹی کمشنر لاہور (ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر) کو اپنی آمد کی اطلاع دلوا دی اور دوسرے دن ۱۱؍ بجے کی دوپہر کو ہوائی جہاز سے لاہور پہنچ گیا، یہاں ہوائی اڈے پر ڈپٹی ہائی کمشنر صاحب از راہ عنایت ملے اور فرمایا وفد کے ممبر یہاں نہیں ہیں، آگے بڑھ گئے اور کوئی پروگرام بھی معلوم نہیں، میں اس حالت میں تھا کہ چوں کہ پچاس روپے سے زیادہ ساتھ لانے کی اجازت نہ تھی، اس لیے آئندہ سفر کے لیے ایک دوست سے قرض لینے پڑے اور ۲۴؍ جون کو کراچی پہنچا، یہاں بھی مجھے وفد کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوا اور نہ اس کے کسی رکن سے ملاقات ہوئی اور سچ یہ ہے کہ میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی، کیوں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۷) طریقہ سے نہیں لکھا تھا، اس لیے عزیز الرحمٰن کو حفظ الرحمٰن پڑھا گیا، کیوں کہ وہی اس قسم کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے اور اس کی اطلاع تار کے ذریعہ سید صاحب کو کان پور دے دی گئی تھی۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ وفد واپس جاچکا ہے یا جا رہا ہے، بہر حال میں نے جس غرض کے خاطر سفر کیا تھا، اور ذاتی مصارف سے کیا تھا، اس کے لحاظ سے میں نے اپنے کو وفد کا پابند نہیں بنایا اور ساتھ ہی دو چار روز بعد رمضان شریف شروع ہو رہے تھے، قصد کیا کہ یہاں ٹھنڈے موسم میں رمضان بسر کر کے واپس جاؤں، یہی ہندوستانی احباب کو لکھ دیا، رمضان بعد انڈین ہائی کمشنر کے دفتر سے پرمٹ کی واپسی کی درخواست کی، پہلے تو پرمٹ دینے سے انکار کیا گیا، پھر جواب ملا کہ دلی تار دے کر پوچھا جائے گا، اس میں چند روز لگیں گے اور جواب آنے پر پرمٹ دینے کا وعدہ کیا اور کہا جلد نہیں ہے، جب چاہیے پرمٹ لے جائیے اور ایک فارم بھرنے کا حکم ہوا، جس نے عجیب عجیب خانے تھے، جس کو بھرنے کا جی نہ چاہا، بالآخر فارم بھر کر داخل کیا گیا تو اب انڈین ہائی کمشنر کے دفتر کا اصرار ہوا کہ بذات خود ان کے دفتر میں حاضر ہو کر پاسپورٹ آفیسر کے سامنے دستخط کروں، یہ بھی کیا، وہاں دفتر کے چپراسی نے جو سلوک کیا اس سے دل پر چوٹ لگی، خیر پرمٹ ملا، اتفاق سے کچھ طبیعت خراب ہوگئی، اس لیے پرمٹ کی توسیع کی درخواست دی، جس سے انکار کیا گیا، ابھی اسی حالت میں تھا کہ ہندوستان کے بعض دوستوں نے لکھا کہ پاکستان کے اخبارات آپ کے متعلق جو خبریں شائع کر رہے ہیں ان سے یہاں بڑی بدگمانی پیدا ہو رہی ہے، میں نے لکھا کہ ان اخبارات کا روکنا میرے بس میں نہیں ہے، اخبارات نے یہاں آنے پر خیر مقدم کے مضامین اور نوٹ لکھے تھے اور اپنے حسن ظن کا اظہار کیا تھا یا بعض مجالس میں میری تقریروں کے اقتباسات چھاپے تھے، اس کے علاوہ ہندوستانی اخبارات کے بعض تراشے ہندوستان کے احباب نے مجھے بھیجے، جس سے معلوم ہوا کہ میرے کراچی پہنچنے کے چار ہی روز بعد دہلی کے اخبار میں یہ مفتریانہ نوٹ شائع ہوا۔"

(مکاتیب سلیمانی، جلد۲، صفحہ ۲۳۸-۲۴۰)

افسوس ہے کہ یہ اہم تحریر جس سے ترک وطن کے متعلق بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوتیں، یہیں پر ختم ہوگئی، یہ تحریر سید صاحب کے صاحب زادے سلمان میاں نے مولانا عبدالماجد صاحب کو بھیجی تھی، جس کو انہوں نے مکاتیب سلیمانی جلد دوم کے آخر میں شائع

کردیا ہے۔

جمعیۃ علمائے اسلام کی طرف سے خیر مقدم: حضرت سید صاحب کے قیام بھوپال کے زمانہ سے پاکستان کے علما اور کراچی کا علمی طبقہ آپ کے لیے چشم براہ تھا، چنانچہ آپ کی تشریف آوری کے بعد جمعیۃ العلمائے اسلام نے آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا اور آپ کے اعزاز میں نگار ہوٹل میں ایک استقبالیہ دیا، جس میں کراچی کے عمائد اور اہل علم کے علاوہ مصر اور حجاز وغیرہ کے سفرا بھی شریک ہوئے، مولانا محمد یحییٰ ندوی نے عربی میں سپاس نامہ پیش کیا اور حجاز ومصر کے سفراء نے تقریریں کیں، اس کے جواب میں سید صاحب نے بھی عربی میں تقریر فرمائی، جس میں بانیان جلسہ اور عرب سفرا کا شکریہ ادا کیا اور اتحاد ملت کی اہمیت واضح فرمائی۔ (تذکرۂ سلیمان، صفحہ ۲۳۵)

مستقل قیام: جیسا کہ اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، یہ سفر اتفاقی اور عارضی ہوا تھا لیکن پھر ایسے اسباب پیش آتے گئے کہ اس نے مستقل قیام کی شکل اختیار کرلی، یہ اسباب حسب ذیل تھے:

۱- اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دار المصنفین میں سکون کے ساتھ قیام کی کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی ۲- سید صاحب کی بڑی لڑکی، داماد اور بڑے صاحب زادے پاکستان میں تھے، یہ سب قدرۃً پاکستان میں آپ کے قیام کی کوشش میں تھے ۳- پاکستان کے ارباب حکومت قیام بھوپال کے زمانہ سے سید صاحب کو پاکستان بلانے کے لیے کوشاں تھے اور آپ کا نام اسلامی تعلیمات کے بورڈ کی صدارت کے لیے طے ہوگیا تھا، گو آپ نے اس کو منظور نہیں کیا تھا ۴- ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ حکام کی بدسلوکی جس کا تجربہ خود آپ کو بھی ہو چکا تھا۔

ان اسباب نے مستقل قیام کی صورت اختیار کرلی اور سید صاحب نے ۱۹۵۰ء میں اہل وعیال کو بھی کراچی بلالیا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان میں اعزازی جلسہ: نومبر ۵۰ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے آپ کے اعزاز میں مرکزی وزیر ڈاکٹر محمود حسین خاں کی صدارت میں ایک جلسہ کیا، اس میں سید صاحب نے ''ہندوستان کے نومسلم حکم راں'' کے عنوان سے ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا، جو پاکستان کے کسی رسالہ میں چھپ گیا ہے۔

اسلامی دستور کے خاکہ کی ترتیب: حکومت پاکستان نے دستور سازی کے سلسلہ میں ایک بنیادی کمیٹی مقرر کی تھی، اس نے اپنی رپورٹ میں اسلامی بورڈ کی سفارشات کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، اس لیے ضرورت تھی کہ علما کی طرف سے اسلامی دستور کا ایک متفقہ خاکہ مرتب کر کے حکومت کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اس کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ علما نے کوئی دستور ہی نہیں پیش کیا، اس کام کے لیے دسمبر ۱۹۵۰ء میں سید صاحب کی صدارت اور رہنمائی میں ۳۱ علما کا ایک اجتماع کراچی میں ہوا، جس میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی ہر مکتب خیال کی نمائندگی تھی، انہوں نے مجوزہ خاکہ بنا کر پیش کر دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنیادی کمیٹی کی رپورٹ کالعدم قرار ہوگئی اور وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے ایک کمیشن قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مروجہ قانون پر نظر ثانی کر کے اس کو شریعت کے مطابق بنایا جائے، اس کمیٹی کے ارکان جسٹس عبدالرشید، جسٹس میمن اور سید صاحب تھے، سید صاحب کی سفارش سے مفتی محمد شفیع صاحب بھی اس کے رکن بنا دیے گئے تھے۔ (تذکرۂ سلیمان، صفحہ ۲۴۰، ۲۴۳)

جمعیۃ علمائے اسلام سلہٹ کے جلسہ کی صدارت: جنوری ۵۱ء میں جمعیۃ علمائے اسلام سلہٹ کے جلسہ کی صدارت کے لیے سلہٹ تشریف لے گئے اور اس میں ایک عالمانہ خطبہ پڑھا، اس خطبہ میں دینی امور و مسائل کے ساتھ پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ خاص طور سے فیاضانہ سلوک کی تاکید فرمائی:

> ''میں نے جب کبھی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی، مسلمانوں کا فرض ہے کہ کسی دوسرے ملک میں ان کے ہم

مذہبوں پر جو کچھ بھی گزرے مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری حفاظت کریں، اس طرح وہ دوسرے ملک میں اپنے بھائیوں کی مدد کر سکتے ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاہد) پر ظلم کرے گا تو میں قیامت کے دن خدا ان کے سامنے اس کا دامن پکڑوں گا اور وہ جنت کی خوش بو تک نہ سونگھنے پائے گا۔''

اسلامی ملکوں کے علما کی کانفرنس: فروری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں احتفال علما کے نام سے اسلامی ملکوں کے علما کی کانفرنس ہوئی، جس میں سید صاحب کا نمایاں حصہ رہا، راقم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فروری کا پورا مہینہ احتفال علمائے اسلام کی مشغولیتوں میں گزر گیا، بحمداللہ بیس ملکوں کے علما نے جو عراق سے لے کر الجزائر تک کے تھے، جن میں ایران اور نجف کے علما بھی تھے، بہت سے مفید کام انجام دیے، کام سے الگ میں تو علما کے اس اجتماع کو تاریخ کا بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، تجاویز میں مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان ارتباط اور جائز رواداری کی تجویز بھی باتفاق آرا منظور ہوئی، نجف کے مشہور مجتہد آل کاشف الغطا اور مفتی اعظم فلسطین (مفتی امین الحسینی) نے مل کر اسلامی فرقوں کے درمیان خوش گوار فضا پیدا کرنے میں بڑی مدد دی، جامع ازہر کا وفد بھی آنے والا تھا، مگر عین وقت پر شیخ ازہر کی تبدیلی سے نہ آسکا[1]۔''

اسی خط میں لکھتے ہیں:

''آپ نے سنا ہوگا کہ مجمع العلمی الادبی[2] نے مجھے اپنا رکن منتخب کیا ہے، یہ مصر کی سب سے بڑی علمی عزت ہے، سفیر مصر نے جو ابھی واپس آئے ہیں، اس کی اطلاع دی ہے۔''

ابن سینا کی ہزار سالہ یادگار میں شرکت کی دعوت: ''اسی خط میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

---

[1] اس جلسہ کے پہلے اجلاس کی صدارت سید صاحب نے کی، دوسرے کی مفتی امین الحسینی نے اور تیسرے کی آل کاشف الغطا نے کی تھی۔ [2] یہ مصر کی بہت بڑی علمی اور ادبی اکاڈیمی ہے، عربی زبان کے بڑے بڑے ماہر اس کے ممبر ہوتے ہیں۔

''بغداد میں عراق کی گورنمنٹ کی طرف سے ابن سینا کی ہزار سالہ یادگار منائی جا رہی ہے، عراق گورنمنٹ نے مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی ہے، مارچ کے آخر میں ہے، اگر پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے اخراجات کی منظوری ہوئی تو جانے کا قصد ہے، ہوائی جہاز سے پانچ گھنٹوں کی راہ ہے، پانی کے جہاز سے ایک مہینہ لگ جاتا ہے۔'' (حکومت کی طرف سے اخراجات کی منظوری نہیں ہوئی اس لیے یہ سفر نہ ہوسکا۔)

آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی رکنیت اور اس کے جلسہ کی صدارت: ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کی ''آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس'' کی طرح پاکستان میں ''آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس قائم ہوئی تو سید صاحب اس کے رکن منتخب ہوئے، مارچ ۵۲ء میں لاہور میں اس کا پہلا جلسہ ہوا، سید صاحب کو اس کے اسلامی تاریخ کے شعبہ کی صدارت تفویض ہوئی، اس نے خطبۂ صدارت کے علاوہ آپ نے ''دیبل'' پر ایک مقالہ پڑھا۔

لاہور کے سفر کے سلسلہ میں اور بھی علمی مشغولیتیں رہیں، راقم کو لکھتے ہیں:

مختلف علمی و تعلیمی مشغولیتیں: مارچ کا مہینہ بہت مصروف ہے، ۷؍ تک شاید لاہور میں مختلف علمی و تعلیمی اداروں میں شرکت ہوگی، پنجاب یونیورسٹی میں ''قصص القرآن'' کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھوں گا، انشاءاللہ تعالیٰ پھر جامعہ عباسیہ بھاول پور کے نصاب کا کام کرنا ہے، مولوی ناظم صاحب ندوی وہاں کے شیخ الجامعہ ہو گئے ہیں، چار سو تنخواہ ملتی ہے، پھر ملتان میں ایک جلسہ ہے، اس میں شرکت ہے۔

کراچی یونیورسٹی سینٹ کی ممبری: ۱۹۵۲ء میں جب کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور اس کے مجوزہ شعبہ اسلامیات کی صدارت پیش کی گئی، مگر صحت کی خرابی کی بنا پر اس کو منظور نہیں فرمایا۔ (تذکرۂ سلیمان)

اسلامی بورڈ کی صدارت: اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت پاکستان نے سید صاحب کو اسلامی بورڈ کی صدارت کے لیے بلایا تھا، مگر شرائط طے نہ ہونے کی وجہ سے اس کو قبول نہیں

فرمایا تھا، ۱۹۵۲ء میں یہ شرائط طے ہوئے، اس وقت اگست ۱۹۵۲ء میں قبول فرمایا، سید صباح الدین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عہدۂ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلام دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شرائط رکھے تھے، وہ اب پورے ہوئے تو میں نے ۲؍ اگست کو قبول کرلیا، تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جاسکے، گو آئین کا کام اب ختم ہورہا ہے۔'' (معارف سلیمان نمبر، ص ۴۵)

جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت: کراچی جانے کے ساتھ ہی آپ کے سامنے جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت کا عہدہ پیش کیا گیا تھا، مگر آپ نے اس بنا پر اس سے انکار فرمایا کہ:

''پالیٹکس بڑی گندی چیز ہے، میں نے کبھی اس خرقہ ے آلودہ کو خود سے نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا، کبھی شوکت علی نے اور جب کسی نے پہنایا تو میں فوراً اتار پھینکا:

حافظ کہ خود نہ پوشید ایں خرقہ مئے آلود   اے شیخ پاک دامن مند ور دار ما

لیکن علما کا اصرار برابر جاری رہا اور انہوں نے اس کا یقین دلایا کہ علما کی مصلحت اسی میں ہے، اسی سے ان کا انتشار دور ہوسکتا ہے اور وہ اس کام میں ہر قسم کی امداد وتعاون کریں گے، اس وقت علما کے مصالح کی خاطر اس کو قبول فرمایا، یہ ۵۲ء کے آخر کا واقعہ ہے۔

ڈھاکہ کا سفر: مارچ ۵۳ء میں آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کا جلسہ ڈھاکہ میں ہوا اور حضرت سید صاحب کو اس کی صدارت تفویض ہوئی، اس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔

خطبۂ صدارت میں دوسرے علمی مسائل کے ساتھ اردو اور بنگالی نزاع کے مسئلہ پر بھی دردمندانہ خیالات ظاہر کیے، جو وہاں کے نوجوان اور ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہ آئے، انہوں نے اس کے خلاف اتنا ہنگامہ برپا کیا کہ جلسہ ملتوی کردینا پڑا، طلبہ نے سید صاحب کی موٹر گھیر لی اور گستاخی پر آمادہ ہوگئے، سنجیدہ لوگوں کی کوشش سے یہ ہنگامہ کسی نہ کسی طرح فرو ہوا اور سید صاحب اپنی فرودگاہ پر واپس آئے، آپ کی واپسی کے بعد ڈھاکہ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی معذرت کی اور معافی مانگی۔

فتح پور میں ورود: اس زمانہ میں سید صاحب کے داماد سید حسین صاحب فتح پور ہنسوہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اس لیے ڈھاکہ سے واپسی میں فتح پور تشریف لائے راقم الحروف اور سید صباح الدین صاحب کو اس کی اطلاع ہوگئی تھی، اس لیے ہم دونوں ملنے کے لیے فتح پور گئے، دو دن ساتھ رہا، حسب معمول بڑی شفقت و محبت کا اظہار فرمایا اور وعدہ کیا کہ رمضان بعد جب دوبارہ ہندوستان آئیں گے تو دو مہینہ دار المصنفین میں قیام فرمائیں گے۔

لکھنؤ تشریف آوری اور ندوہ میں پر اثر جلسہ: ہم دونوں فتح پور سے اعظم گڑھ واپس آ گئے اور سید صاحب اپنے مادر علمی کی زیارت کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے، اس مرتبہ خلاف معمول بہت دنوں کے بعد ندوہ جانے کا اتفاق ہوا تھا اور آئندہ آنے کی امید موہوم تھی، اس لیے اہل ندوہ اور خود سید صاحب دونوں بہت متاثر تھے، ندوہ میں آپ کی آمد کی تقریب میں ایک جلسہ ہوا، سید صاحب نے جیسے ہی جلسہ گاہ میں قدم رکھا، بڑے تاثر یہ شعر پڑھا:

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

یہ شعر سن کر پورے مجمع پر گریہ طاری ہو گیا، جلسہ کی کارروائی کلام مجید کی تلاوت سے شروع ہوئی، قاری صاحب نے موقع کی مناسبت سے سورہ یوسف کی یہ آیت تلاوت کی:

لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف:۹۴)	جب (حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے بیٹوں کو لے کر قافلہ شام سے مصر کی طرف) چلا تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ مجھے سٹھیایا ہوا نہ کہو تو مجھے یوسف کی خوش بو آ رہی ہے۔

اس آیت کو سن کر اور ندوہ کے یوسف گم گشتہ کو پا کر حاضرین اور زیادہ متاثر ہوئے، خود حضرت سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک طالب علم نے عربی

میں قصیدہ پڑھا، سید صاحب نے اس کے جواب میں بڑی پر اثر تقریر فرمائی، آخر میں طلبہ کو یہ پیام دیا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا میں امامت کا

علمی منصوبے: مسلمانوں کے سارے علمی، تعلیمی اور دینی وثقافتی ادارے ہندوستان میں رہ گئے تھے، پاکستان میں لاہور کو چھوڑ کر کوئی ایسا مقام نہ تھا، جہاں اہل علم کے ذوق کا سامان ہو، قیام پاکستان کے بعد سید صاحب فرماتے تھے کہ پاکستان کو علمی حیثیت سے ایک بنجر علاقہ ملا ہے، مگر مسلمانوں کی تاریخ یہی رہی ہے، اسلام کا مرکز حجاز خود بنجر علاقہ تھا، اندلس جس کو مسلمانوں کے علم وکمال اور تہذیب وثقافت کا تماشا گاہ کہا جاتا ہے، مسلمانوں کے قبضہ کے وقت بالکل ویران تھا، کم وبیش یہی حال ان کے دوسرے مقبوضات کا تھا، انہوں نے ان سب کو اپنی کوشش سے بنایا سنوارا، اس لیے پاکستان کو بھی انہیں بنانا ہے، اس کے لیے سید صاحب کے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے، ایک خط میں راقم کو کراچی سے تحریر فرماتے ہیں:

> ''دل میں ایک دنیا خیالات کی ہے مگر افسوس ہے کہ دل ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ زبردستی چند سطروں کی تحریر پر آمادہ ہوتا ہے، یہ چار ماہ یوں ہی پڑے پڑے گزر گئے، واپسی کا ارادہ کئی دفعہ ہوا مگر اولاد کے مستقبل کا خیال اور بعض قومی و مذہبی آرزوؤں کی تکمیل جلد واپسی سے روک دیتی ہے، میں نے ابھی تک کوئی سرکاری زنجیر پاؤں میں نہیں ڈالی ہے، بحمد اللہ کی صبح کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ ایک مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے، سو دو سو سامعین ہوتے ہیں، جن میں بعض افسران بھی ہوتے ہیں، یہی ماحصل زندگی ہے، کراچی میں اب تک تین قسم کے لوگ آئے ہیں، یا فقرائے پناہ گیر یا متلاشیان روزگار نو تعلیم یافتہ یا سرمایہ دار تجار، مگر خالص اہل علم اور علما بہت کم آئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مستقبل میں اگر اس کی تلافی نہ ہوئی تو لا دینی کی فضا پیدا ہونا لابد ہے، بحمد اللہ کی دین کی طلب سب میں موجود ہے، متعدد مرکزی مساجد میں درس قرآن اور سلسلہ مواعظ ہے، عربی کی ایک بڑی

درس گاہ اشرف آباد بہ نسبت حضرت مولانا اشرف علی صاحب ٹنڈو الہ یار ضلع حیدر آباد سندھ میں دار العلوم اسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی ہے، دیو بند اور سہارن پور کے افاضل مدرس ہیں، ابھی طلبہ کی تعداد پچاس ہے۔

یہاں مسلمان اپنا سارا اثاثہ دماغی وذہنی ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں، کتب خانے مدرسے اور ادارے ہندوستان میں ہیں، ضرورت ہے کہ یہاں بھی دیو بند، ندوہ، دار المصنفین، مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ قائم ہو، ابھی سب افکار اور خاکے ہیں، امکانات بے انتہا ہیں مگر مشکلات بھی ہیں۔

اس کام کا آغاز انہوں نے خود ایک اشاعتی ادارے مکتبہ الشرق کے قیام سے کیا، اس سے ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں، یہ برید فرنگ، یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وفد خلافت کے سفر میں یورپ سے اپنے احباب کو لکھے تھے، ان میں اس وفد کی کارگزاریوں کی پوری روداد درج ہے، یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہوگئی تھی، دوسری یادِ رفتگاں، اس میں ان تاثرات اور مضامین کو جمع کیا گیا تھا جو انہوں نے ہندوستان کے اکابر کی وفات پر لکھے تھے، اس میں ۱۳۵ متوفیوں کے حالات ہیں اور وہ ان کے دور کے اکابر کا تذکرہ بن گئی ہے، یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

لیکن ان کی ساری توانائی دار المصنفین میں ختم ہو چکی تھی اور وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ نئے ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کی قوت باقی نہ رہ گئی تھی اور اس کا وقت بھی نہیں ملا، یہ سارے منصوبے دماغ ہی میں تھے کہ ان کا وقت آخر ہو گیا۔

دار المصنفین سے قلبی وابستگی اور اس کے فلاح کی فکر: اگرچہ سید صاحب نے بڑے ناخوش گوار حالات میں دار المصنفین کو چھوڑا تھا لیکن اس کو انہوں نے خونِ جگر سے سینچا تھا، اس لیے ان کا قلبی تعلق اس سے برابر قائم رہا اور اس کی فلاح ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی، اس کے متعلق وقتاً فوقتاً مفید مشورے دیتے رہے، ان کا کوئی خط اس سے خالی نہیں

ہوتا تھا، بعض لوگوں نے دارالمصنفین کے نمونہ کا ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے سرمایہ پیش کیا مگر سید صاحب نے اس کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ دارالمصنفین کو نقصان پہنچے گا، ایک خط میں راقم کو لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر محمود صاحب کو میں نے اس منصب (مجلس منتظمہ کی صدارت) کے لیے اس لیے چنا تھا کہ دارالمصنفین کو اس انقلاب میں گزند نہ پہنچے[1]، دارالمصنفین مجھے اب بھی عزیز ہے، خواہ وہ مجھے عزیز سمجھے یا نہ سمجھے، یہاں متعدد اشخاص اور اہل ذوق اور اہل دولت نے دارالمصنفین کے قیام کے لیے زمین اور سرمایہ پیش کیا مگر میں نے قبول نہیں کیا، اس چیز کو دوسرے رنگ میں قائم کرنا چاہتا ہوں تاکہ دارالمصنفین کو نقصان نہ پہنچے۔"

دسمبر ۵۰ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"دارالمصنفین کی ہستی کو میری ذات سے متعلق نہ سمجھیں، ہر انسان فانی ہے اس لیے اس کی نسبت کی چیز بھی فانی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ عزیزوں کی محنت سے اس کو بقا نصیب ہو، آپ کی انشاء، ماشاء اللہ بہت ترقی کر رہی ہے، خصوصیت کے ساتھ شروانی صاحب کی وفات (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) پر جو شذرات آپ نے لکھے ہیں بہت بلند اور پرزور ہیں، اللہ تعالیٰ مزید زور اور بلندی عنایت فرمائیں، شروانی نمبر کی مجوزہ[2] ترتیب مناسب ہے، آپ کے اس یقین دلانے سے کہ آپ دارالمصنفین کی خدمت اسی طرح کرتے رہیں گے[3]، بڑی خوشی ہوئی، یہی امید عزیزی صباح الدین سلمہٗ سے ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سید محمود صاحب کانگریس کے پرانے بڑے لیڈروں میں تھے اور ہندوستان کی آزادی کے بعد صوبہ بہار کے وزیر، اس کے بعد مرکز میں نائب وزیر ہوئے، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پہلے سے ممبر تھے، پھر سید صاحب کے مشورہ سے ان کو اس کا صدر بنایا گیا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ [2] معارف کا شروانی نمبر [3] سید صاحب اپنے خطوط میں دارالمصنفین کے کاموں کی تکمیل کی برابر ہدایت فرماتے رہتے تھے، ایک خط میں اپنے مقالات کی ترتیب کے لیے فرمایا تھا، راقم نے ان سب کاموں کی تکمیل کا وعدہ کیا تھا، اس خط میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

آپ نے میرے کاموں کی تکمیل کا جو ارادہ ظاہر کیا ہے[1] اس سے بڑی تسکین ہوئی، یہاں متعدد ادارے میری اعانت کے طالب ہیں۔"

فروری ۵۱ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کے اس اظہار سے کہ آپ دارالمصنفین کو دو کی یادگار سمجھ کر باقی رکھنے کی کوشش کریں گے[2] میری عمر چاند کے حساب سے ۶۹ رسال کی ہوگئی، اب نئے کام کا وقت نہ تھا، مگر کیا کیا جائے، تقدیر الٰہی یہی تھی، دیسنہ (سید صاحب کا وطن) ویران ہو چکا تھا، اعظم گڑھ میں راحت کا سامان نہ تھا، تیسری جگہ کا قصد کیا، سات ماہ ہو چکے ہیں، ہنوز روز اول ہے یعنی دل و دماغ فیصلہ سے عاجز ہیں، گو زمانہ خود فیصلہ کر رہا ہے، سرکاری قید سے اب تک آزاد ہوں۔"

دارالمصنّفین کا نیا نظام: دارالمصنّفین اب تک پرانے نظام پر چل رہا تھا، یعنی سید صاحب اس کے ناظم اعلیٰ تھے اور مولانا مسعود علی صاحب ناظم امور انتظامی لیکن سید صاحب کے ترک وطن کے بعد یہ صورت قائم نہیں رہ سکتی تھی، اس کا خود ان کو بھی احساس تھا، اس لیے انہوں نے ایک خط میں اس کی طرف توجہ دلائی:

"دارالمصنفین کی نئی تنظیم کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اس کی زندگی محال ہے، دارالمصنفین ایک رجسٹرڈ باڈی ہے، اس کی تشکیل قانونی ضروری ہے، ضرورت ہے کہ نئے صدر کا

---

[1] حضرت سید صاحب نے ایک خط میں راقم سے فرمائش کی تھی کہ آپ سے ایک فرمائش کرنے کو جی چاہتا ہے، جس طرح میں نے اور مولوی عبدالسلام صاحب نے حضرت الاستاذ کی ایک ایک تحریر کو زندہ کیا، آپ صاحبان میرے مضامین اور مقالات بہ ترتیب جمع کر کے شائع کریں کہ اب میری زندگی ان ہی اوراق سے عبارت ہے، ۲ رصفر کو میری عمر قمری حساب سے انہتر سال کی ہو چکی ہے، رہے نام اللہ کا۔

راقم نے اس فرمائش کی تعمیل کا وعدہ کیا تھا، مذکورہ بالا تحریر میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور الحمدللہ کہ اس وقت مقالات سلیمانی کے تین حصے چھپ چکے ہیں اور "حیات سلیمان" ناظرین کے سامنے ہے۔

[2] یہ بھی سید صاحب کے کسی ارشاد کی تعمیل کا جواب ہے۔

انتخاب کیا جائے، نظامت میں مناسب تبدیلی ہو۔"

اس کے بعد جنوری ۵۱ء میں اس نظام کا پورا خاکہ لکھ کر بھیجا۔

"دارالمصنفین کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ اس کو دوبارہ منظم کیا جائے، ارکان کچھ چل بسے، کچھ چل رہے ہیں، کچھ بے تعلق ہو گئے، اس لیے ارکان کا انتخاب کر کے تعداد پوری کر لیں، پھر ان سے ارکان عاملہ کو چنیں، ارکان عاملہ کی ایک کمیٹی ہو، جو علمی اور عملی دونوں شعبوں کی نگرانی کرے، علمی نظامت آپ قبول کر لیں اور عملی مولوی صاحب (مولانا مسعود علی) رہیں جیسے اب تک ہیں، عاملہ کی خالی جگہوں میں سے ایک پر ناظم علمی کی حیثیت سے آپ خود ہی ممبر ہو جائیں گے، مولوی مناظر احسن صاحب کو بھی لے لیں، انتظامیہ میں صباح الدین صاحب کو لیں، سید عبد الحکیم دیسنہ اور سید مرتضیٰ علی دہلوی[1] بھی ہو سکتے ہیں، مجلس دارالمصنفین کی صدارت ڈاکٹر محمود صاحب کو دی جائے، ماجد میاں (مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی) کو مجلس عاملہ کی صدارت دے سکتے ہیں، گو مولانا حمید الدین صاحب کے بعد یہ عہدہ غیر ضروری ہو گیا ہے، ماجد میاں کا وظیفہ حیدرآباد بند ہو گیا ہے، اچھا ہو کہ دارالمصنفین ان کو وظیفہ دے کر اپنا لے۔"

ان ہدایات کے مطابق نئی تنظیم عمل میں آئی اور سید صاحب کو اس کی اطلاع دے دی گئی، اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"دارالمصنفین میں آپ لوگوں نے جو طے کیا اس پر راضی ہوں اور درگاہ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دارالمصنفین کے حق میں مفید و نافع بنائے:

سپردم بہ تو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

معارف میں آپ اپنے جدید نظام کا ذکر جس طرح چاہیں کریں، آپ کے ہونے کو میں

---

[1] سید مرتضیٰ علی صاحب دہلوی نواب سید علی حسن خاں کے داماد تھے، انگریزوں کے عہد حکومت میں کمانڈر ان چیف کے دفتر میں کسی بڑے عہدے پر تھے، دارالمصنفین کے پرانے ہمدرد اور ہوا خواہ تھے، دارالمصنفین کے لوگ دہلی میں ان ہی کے یہاں قیام کرتے تھے، چند سال ہوا انتقال ہو گیا۔

اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسے ہی مسرت اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کے دارالمصنفین کا نقشہ دیکھ لیا۔

اب آپ جہاں تک ہو سکے دین وملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقائے کار کی تیاری میں مصروف رہیں، تا کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ یوں ہی جلتا رہے اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے۔

معارف میں آپ کے شذرات پڑھے، الحمدللہ آپ نے شذرات کے وقار کو قائم رکھا، ''س'' (سلیمان) ''ش'' (شاہ معین الدین احمد) میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہو۔

اب اپنے رفیق عزیزی صباح الدین سلمہٗ اللہ تعالیٰ پر پوری رعایت کے ساتھ نظر رکھیں اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں کہ ان کو دارالمصنفین سے وحشت نہ ہو۔

یہ میں نے صرف اپنی طرف سے ناصحانہ پیش بینی کے طور پر لکھا ہے ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ ان میں سے ہر بات کا اپنی شرافت اور رفاقت پسندی سے لحاظ رکھتے ہیں اور اس کا خود انہیں بھی اقرار ہوگا۔''

حضرت سید صاحب نے بھوپال کے قیام کے زمانہ ہی سے معارف کی ادارت میں اپنے نام کے ساتھ راقم کا نام بھی شامل کر دیا تھا، ان کے ترکِ وطن کے بعد ان کا نام معارف میں قائم نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے صرف میرا نام رہ گیا، اس کا پہلا پرچہ دیکھ کر تحریر فرمایا:

''معارف آیا، دیکھ کر خوش ہوا، اولاد کسی کی طرف بھی منسوب ہو، مگر اصلی باپ کو بہر حال اس کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور پھر لکھتا ہوں کہ اپنی تکمیل کے ساتھ ایک دو نئے طلبہ کی تربیت بھی ضروری ہے، تا کہ یہ کام چلتا رہے، میرے خیال میں دارالمصنفین صرف دارالاشاعت نہیں بلکہ ایک دینی وذہنی دعوت ہے، جس نے بہتیروں کو متاثر بھی کیا ہے، جس طرح اس کی ضرورت ہندوستان کو ہے، اس سے زیادہ اس کی ضرورت پاکستان کو ہے۔

انکارِ حدیث کا فتنہ یہاں پھیل رہا ہے، ضرورت ہے کہ معارف کے تمام پچھلے مضامین (جو انکارِ حدیث کے جواب میں لکھے گئے تھے) ایک ترتیب خاص سے مرتب کرکے شائع کیے جائیں، یہ کام اگر وہاں ہوسکتا ہے تو وہاں چھپوایئے، ورنہ مرتب کرکے یہاں بھیج دیجیے، یہاں چھاپا جائے۔

اسی طرح میرا پرانا خیال جو صحاح ستہ کی تاریخ کا تھا، اس کو پورا کیجیے، موطا اور بخاری پر میرا مضمون، مسلم پر مولوی عبدالسلام صاحب کا اور ترمذی پر آپ کا ہے، غرض اس کو مکمل کرکے چھپوایئے یا مسودہ یہاں بھیج دیجیے تو یہاں چھاپا جائے[1]۔"

اگست ۵۰ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"چوں کہ آپ مجھے اپنی محبت سے بزرگوں کا درجہ دیتے ہیں اس لیے دو نصیحتیں کرتا ہوں، ایک یہ دارالمصنفین کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ آگے بھی یہ چراغ جلتا رہے، اس لیے جوہر قابل کی تلاش میں رہیں اور جب کوئی ملے تو اس کی تربیت کریں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ

ع من نہ کردم شما حذر بکنید

اپنا جائز حق کبھی نہ چھوڑیے، دنیا اس کی قدر نہیں کرتی، میں نے اپنی دنیا ناشناسی ہر جگہ نقصان اٹھایا ہے، آپ نے بہت اچھا کیا جو جامعہ[2] یا مدرسہ عالیہ کلکتہ کا قصد نہیں کیا، دارالمصنفین کے باہر قدم نہ رکھیں، آپ کا معاوضہ حسب ضرورت ہمیشہ بڑھ سکتا ہے، آپ اس کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ یہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہوجائے گا۔"

---

[1] اس ہدایت کی پوری تعمیل ہوئی اور نہ صرف صحاح ستہ بلکہ تمام ائمہ حدیث کے حالات اور ان کی تصنیفات پر دو جلدوں میں ایک مستقل کتاب "تذکرۃ المحدثین" کے نام سے لکھی گئی جس کی ایک جلد شائع ہوگئی ہے۔ [2] اس زمانہ میں ہمارے فاضل دوست مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل تھے اور مجھ کو تاریخ اسلام کی پروفیسری کے لیے بلانا چاہتے تھے بعض اصحاب جامعہ ملیہ میں بلانا چاہتے تھے، اس خط میں اسی کی طرف اشارہ ہے مگر میں نے انکار کردیا تھا۔

معارف کی کتابت وطباعت تک پر نظر رکھتے تھے، مارچ ۵۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"فروری کے معارف کی لکھائی چھپائی ماشاء اللہ بہت اچھی ہے، کسی نے لکھا ہے نام لکھیے، آپ کا مقالہ اردو والا[1] اچھا تھا، مگر وہاں سوال دلیلوں کا نہیں بل کہ فیصلہ کا ہے، دیکھیے علاقائی زبان مانے جانے کی تحریک کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔"

ایک خط میں معارف کی طباعت کی خرابی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے ہیں:

"اس مہینہ جون ۵۳ء کے معارف کی چھپائی بہت ناقص ہے، حروف آڑے ہو گئے ہیں۔"

جب تک حضرت سید صاحب زندہ رہے دارالمصنفین پر ان کی نگاہ شفقت قائم رہی اور اس کے متعلق برابر مفید مشورے دیتے رہے لیکن اس کا زیادہ موقع نہ مل سکا:

ع: روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

صحت کی خرابی: سید صاحب کی ساری توانائی دارالمصنفین کو بنانے میں صرف ہو چکی تھی، علمی کام میں جانکاہ محنت اور قومی وملی مشغولیتوں نے ہندوستان ہی میں ان کی صحت خراب کر دی تھی، ضعف اعصاب اور معدہ کی شکایت مستقل تھی، ہندوستان میں دومرتبہ سخت بیمار پڑ چکے تھے، بھوپال کے زمانۂ قیام میں بھی کچھ نہ کچھ شکایت چلی جاتی تھی، اس لیے پاکستان کے سفر کے وقت اگر چہ ان کے ذہنی ودماغی قویٰ میں فرق نہ آیا تھا لیکن جسمانی صحت بگڑ چکی تھی، پھر وہاں بھی ان کو سکون وآرام کا موقع نہ ملا، بلکہ ان کی مشغولیتیں کچھ اور بڑھ گئیں، اس وقت تک عام جسمانی کمزوری کے علاوہ کوئی خاص بیماری نہ تھی، مگر ذرا سی بے احتیاطی سے تنفس ہو جاتا تھا، سب سے پہلے نومبر ۱۹۵۱ء میں جب وہ مسجد سلیمانی میں کلام مجید کا

---

[1] راقم نے آل انڈیا اورینٹل کانگریس منعقدہ لکھنؤ میں اردو زبان کی لغوی، لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت پر ایک مقالہ پڑھا تھا جو معارف میں چھپا تھا، اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

درس دے رہے تھے لقوہ کا خفیف اثر ہو گیا جو علاج سے دور ہو گیا، اس کے چند مہینوں کے بعد ۱۹۵۲ء میں دستور ساز اسمبلی کی کمیٹی میں شرکت کے لیے نتھیا گلی تشریف لے گئے، پہاڑ کی بلندی کا اثر قلب و اعصاب پر برا پڑا اور وہیں تنفس کا دورہ پڑ گیا، وہاں سے علاج کے لیے راول پنڈی کے فوجی اسپتال میں لائے گئے، کرنل سرور نے معائنہ کے بعد تشخیص کیا کہ قلب بڑھ گیا ہے، اسی کے اثر سے تنفس ہو جاتا ہے اور اس کے لیے دوائیں تجویز کر دیں، راول پنڈی سے لاہور تشریف لائے، یہاں کے ڈاکٹروں نے بھی کرنل سرور کی تجویز سے اتفاق کیا اور نمک سے پرہیز کی سخت تاکید کی، لاہور سے کراچی تشریف لے گئے اور کرنل عبدالرحمٰن کو جن سے قیام بھوپال کے زمانہ سے تعلقات تھے، دکھایا، انہوں نے بھی راول پنڈی اور لاہور کے ڈاکٹروں کی تجویز سے اتفاق کیا اور باقاعدہ علاج شروع کر دیا، ان کے علاج سے فائدہ ہوا۔

مگر قلب کے مریض کے لیے سکون ضروری تھا، وہ سید صاحب کو حاصل نہ تھا، اعزہ کی مخالفت کے باوجود فروری ۵۳ء میں آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لیے ڈھاکہ تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی کے بعد پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا، اس مرتبہ بھی علاج سے سکون ہو گیا، اگست ۵۲ء میں تیز دورہ پڑا اور تنفس کے ساتھ تیز حرارت بھی ہو گئی، اس مرتبہ کرنل شاہ نے قلب کا پوری طرح معائنہ اور خون وغیرہ کا اکزامن کیا، ان کی تجویز بھی یہی تھی کہ قلب بڑھ گیا ہے اور اس کی کسی شریان میں گرہ پڑ گئی ہے، جس سے دوران خون میں دقت ہوتی ہے، اس کے اثر سے تنفس ہو جاتا ہے، اس کی دوائیں تجویز کیں اور مکمل آرام کی ہدایت کی اور بہ تاکید لوگوں سے ملنے جلنے سے منع کر دیا اور سید صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے بڑے کام کیے ہیں، کم ہی لوگوں نے اتنی قومی خدمت کی ہوگی، ابھی قوم کو آپ کی ضرورت ہے، اس لیے کچھ دنوں تک قومی، ملی اور علمی مصروفیتوں سے الگ رہیے، صحت ہونے کے بعد ان شاء اللہ پھر حصہ لیجیے گا، اس پر صرف اس حد تک عمل ہو سکا

کہ گھر سے باہر آنا جانا بند کر دیا لیکن گھر پر آ کر ملنے والوں کے لیے پابندی پسند نہیں فرمائی، جو لوگ آتے ان سے گھنٹوں علمی و مذہبی ہر قسم کی گفتگو کرتے، اگر گھر والے آپ کے کسی ملنے والے کو روک دیتے اور آپ کو اس کی خبر ہو جاتی تو سخت ناگواری ظاہر فرماتے، اس لیے قلب کے مریض کے لیے جس سکون و آرام کی ضرورت ہے وہ حاصل نہ ہو سکا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تنفس کے دورے جلد جلد پڑنے لگے، اس وقت کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبدالصمد کا مشترکہ علاج شروع ہوا۔

وفات: اب سید صاحب کو مرض کی نزاکت اور اس کے نتیجہ کا پورا احساس ہو گیا تھا، ایک دن اپنے مرحوم اعزہ کی عمر پوچھ کر فرمایا کہ خاندان میں سب سے زیادہ عمر میں نے پائی، پرانے بزرگوں کی یاد اور ان کا تذکرہ فرماتے، وفات سے دو تین دن پہلے، اپنے بعد کے خانگی نظام پر اپنی اہلیہ اور اپنے داماد ابوعاصم صاحب سے گفتگو فرمائی، اب کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ ۲۳/ نومبر کو مغرب کی نماز پہلی مرتبہ بیٹھ کر پڑھی اور فرمایا، میں نے آج مولانا شوکت علی کی طرح نماز پڑھی ہے، نماز کے بعد آرام فرمانے کے لیے لیٹ گئے، اس کے تھوڑی دیر کے بعد قلبی دورہ پڑا، اعزہ ڈاکٹروں کے بلانے کے لیے دوڑے، مگر جب تک ڈاکٹر آئیں سوانح نگار نبویؐ خدا کے حضور میں حاضر ہو چکا تھا۔

غلام محمد صاحب کا جو وفات کے وقت حضرت سید صاحبؒ کے پاس موجود تھے، بیان ہے کہ میں حضرت والا کے مواجہ میں اس طرح بیٹھا تھا کہ دست مبارک میرے ہاتھ میں تھا، میری انگلیاں ان کی نبض پر اور نظریں جمال مبارک پر جمی ہوئی تھیں، میں اسی حالت بس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہلکا سا جھٹکا تنفس کا محسوس ہوا جیسے ہچکی آئی ہو، چہرہ پر فوراً خون کی لہر دوڑ گئی اور بس طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا، اتنا کٹھن مرحلہ اس آسانی اور سکینت و سرعت سے طے ہو گیا کہ گویا گرہ کھل گئی۔

ساڑھے سات بجے شب کو انتقال ہوا تھا، آٹھ بجے کراچی ریڈیو نے خبر وفات نشر

کردی، اس لیے رات ہی کو دولت کدہ (ڈار منزل) میں لوگوں کا ہجوم ہو گیا، ان لوگوں میں سید صاحب کے خواجہ تاش مولوی محمد حسن کاکوروی، ڈاکٹر عبدالحیٔ، مفتی محمد شفیع صاحب، مولوی تمیز الدین صاحب، راغب احسن صاحب، مولوی عبدالقدوس ندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

رات ہی کو حکومت کے عہدہ داروں سے مل کر طے پا گیا تھا کہ حضرت سید صاحب کی تدفین مولانا شبیر احمد صاحب کے مزار کے قریب ہوگی، صبح آٹھ بجے صوفی محمد دریس صاحب، ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب اور ابو عاصم صاحب نے غسل دیا، تجہیز و تکفین کے بعد مصر و حجاز کے سفیر آ گئے، انہوں نے زیارت کی، اس وقت ڈار منزل کے باہر ہزاروں آدمی جمع ہو چکے تھے، جب جنازہ گھر سے باہر لایا گیا تو ایک کہرام مچ گیا، خلق اللہ کے ہجوم میں جنازہ نیو ٹاؤن کی جامع مسجد میں جو اس وقت زیر تعمیر تھی، لایا گیا اور اس کے سامنے کے میدان میں ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی، جنازہ میں بڑے بڑے علما، اسلامی ملکوں کے سفرا، حکومت کے وزرا اور حکام سب شریک تھے، نماز جنازہ کے بعد مشتاقین کی خواہش پر آخری دیدار کرایا گیا، جس کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

جامع مسجد سے جنازہ مولانا عثمانی کے مدفن پر لایا گیا، اس وقت قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی، اس لیے ایک چبوترہ پر رکھ دیا گیا، شامی سفارت خانہ کے کلچرل اٹیچی ابو الخیر صاحب نے جوش عقیدت میں حضرت سید صاحب کے فضائل و کمالات پر تقریر شروع کردی، اردو کا مترجم ترجمہ کرتا جاتا تھا، اس تقریر نے پورے مجمع کو ماتم کدہ بنا دیا، اس کے بعد مفتی محمد شفیع نے تقریر کی، جس کا آغاز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس شعر سے کیا جو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے موقع پر کہا تھا:

للناس هم ولي اليوم همان — فقد الجراب و قتل شيخ عثمان

یعنی لوگوں کو صرف ایک غم عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا ہے اور مجھے دو غم

ہیں، ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ توشہ دان کے گم ہونے کا، دوسری عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا۔

یہ شعر پڑھ کر فرمایا کہ ابھی غم عثمانی (مولانا شبیر احمد عثمانی) کو بھلانے نہ پائے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور نشانی بھی ہم سے کھوگئی، مگر مفتی صاحب شدت تاثر میں زیادہ نہ بول سکے اور قبر بھی تیار ہو چکی تھی، اس لیے تقریر ختم کر دی اور علم وعمل کا یہ گنج گراں مایہ ۲۳ رنومبر کو آغوش لحد کے حوالہ کر دیا گیا۔

ہندوستان و پاکستان میں ماتم: حضرت سید صاحب کی وفات تنہا ایک شخص کی موت نہ تھی، بلکہ ایک جامع کمال ہستی کی وفات تھی، جس کی علمی ضیا باری سے پورا ملک منور رہا، جس کے کمالات کا آوازہ نصف صدی تک گونجتا رہا اور جس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر پوری علمی دنیا میں پھیلی، اس لیے ہندوستان و پاکستان دونوں میں صف ماتم بچھ گئی، ہر طبقہ کے اکابر نے آپ کی وفات پر بیانات دیے، علمی و دینی مرکزوں میں تعزیتی جلسے ہوئے، اہل علم نے تقریریں کیں، اخبارات نے نوٹ لکھے، رسالوں نے خاص نمبر نکالے، شعراء نے مرثیے اور تاریخی قطعات کہے، خود دارالمصنفین میں تعزیتی تاروں اور خطوط کا تانتا بندھ گیا، اگر ان سب کو نقل کیا جائے تو ایک ضخیم رسالہ تیار ہو جائے گا، اس لیے قلم انداز کیا جاتا ہے، کتاب کے آخر میں منتخب مراثی اور قطعات تاریخ نقل کر دیے جائیں گے۔

باب نہم

ذاتی حالات

آل واولاد: سید صاحب کی تین شادیاں ہوئیں، پہلی شادی عنفوان شباب میں ان کی چچا زاد بہن سے ہوئی تھی، ان سے کئی اولادیں ہوئیں مگر صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی زندہ رہے، لڑکی سیدہ کی شادی عزیزوں میں سید نجیب اشرف صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی نواب اشرف صاحب مرحوم سے ہوئی تھی، ان کا عین عالم شباب میں انتقال ہوگیا، ان کے انتقال کے کئی سال کے بعد دوسرا عقد سید صاحب کے دوسرے عزیز سید عبدالودود سے ہوا، مگر اس عقد کے ڈیڑھ ہی دو سال کے بعد سید صاحب کی زندگی ہی میں سیدہ کا انتقال ہوگیا اور پہلے شوہر سے ایک لڑکا نقی اشرف یادگار چھوڑا جو اس وقت پاکستان میں بینک میں کسی بڑے عہدے پر ہے، صاحب زادے ابو سہیل بھی پاکستان میں کسٹم آفیسر ہیں۔

اپریل ۱۹۱۷ء میں بیوی کا انتقال ہوگیا، سید صاحب پر اس کا بڑا شدید اثر ہوا اور معارف میں بڑے درد انگیز تاثرات ظاہر کیے اور ایک پر اثر نظم لکھی، شذرات میں لکھتے ہیں:

"آخر خدا کی مرضی پوری ہو کر رہی اور دو ماہ شدید علالت کے بعد میرے رفیقہ زندگی نے ۲۷ سال کی عمر میں اس عالم کو الوداع کہا، استاد مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا حادثہ ہے جس

نے میرے سکون خاطر کو درہم برہم کر دیا، اپنے ایک سالہ صغیر السن بچہ کو چھوڑ کر بڑی بے کسی میں جان دی، یہ ۱۲/اپریل ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے لیکن اب تک حواس برجا نہیں ہوئے، میری حیات منزلی کی اس بربادی کے غم میں جن احباب نے تعزیت ناموں کے ذریعہ شرکت کی، ان کا ممنون ہوں، بہتر ہوتا کہ میرے بجائے دعائے خیر سے اس مرحومہ کو یاد کرتے کہ اب میری قلبی تسلی اسی کی روحانی تسلی میں ہے، خدا عفت وفا کے اس پیکر کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مرحومہ نے تیرہ سال تک میری زندگی کی رفاقت لی، دس برس سے صحت خراب تھی اور کبھی کامل صحت اس عرصہ میں اس کے تن زار کو میسر نہ آئی، علاج کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہوا، پچھلے دس برس میں اس پریشان حالی اور پراگندگی خاطر کے باوجود مجھ سے جو کچھ قوم وملت کی خدمتیں انجام پاسکیں وہ بجائے خود تعجب انگیز ہے کہ اس طویل عرصے میں کبھی میرے دل ودماغ نے فراغ خاطر نہ پایا، میں مرحومہ کی زندگی میں غالب مغفور کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

میں بھی بتاؤں تم کو کہ مجنوں نے کیا کیا فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

اس پیکر وفا نے اپنی جان دے کر مجھے علم وملت کی خدمت گزاری کے لیے کشاکش غم پنہاں سے فرصت عطا کی لیکن ایسا کانٹا دل میں چبھ گیا ہے جو شاید عمر بھر نہ نکلے:

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تھا عمر کو بھی تو نہیں ہے پائے داری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

گوش محروم پیام، چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے"

مرگِ یار کے عنوان سے ایک نظم لکھی:

ہم سفر وادی ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا
ہجر کا خوف کبھی اور کبھی ہجر کا داغ چین گا ہے دل مضطر کو میسر نہ ہوا
تیر جو آئے فلک سے ہدف ان کا میں تھا ظلم کہیے نہ کبھی اس کو جو مجھ پر نہ ہوا!

دردا ٹھ اٹھ کے میرے دل میں ٹھہر جاتا ہے
کیوں رگ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا

یہ تماشائے جہاں خواب ہے میں مانتا ہوں
پر یہ کیوں خواب میرے واسطے شب بھر نہ ہوا

کس سے کیجئے دل شیدا کا گلہ تنہائی
مسند آرا میرے پہلو میں وہ دلبر نہ ہوا

ناز بے جا تو اٹھایا ہے پہ مرنے والے
میں تیرے ناز بجا کا کبھی خوگر نہ ہوا

تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا
تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

دل کو کیوں مورد احساس بنایا یارب
حسرت اس کی ہے کہ یہ دل ہوا پتھر نہ ہوا

حیف اس خون کی قسمت جو مژہ سے ٹپکے
قطرۂ اشک ہوا بادۂ احمر نہ ہوا

گر قضایائے جہاں قابل تغییر نہیں
کیوں نہ کہیے کہ میرے واسطے داور نہ ہوا

دل میں بیٹھا ہو کوئی اس سے تسلی تو نہیں
پردۂ دل میں جو ہے بر سر منظر نہ ہوا

قہر آلود نظر میں نگہ لطف بھی تھی
لطف فرما نہ رہا جب وہ ستم گر نہ ہوا

باعث رنج ہے امید کا پیدا ہونا
یا رب اس خرمن امید میں اخگر نہ ہوا

ان بیوی کی موت کا اتنا شدید اثر دل پر تھا کہ بقیہ زندگی تجرد میں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس پر کئی سال تک قائم بھی رہے لیکن اس وقت آپ کے والد اور چچا جو آپ کے خسر بھی تھے، زندہ تھے، ان کے حکم اور اصرار سے مجبور ہو کر ۱۹۲۰ء میں دوسری شادی کی، مگر شادی کے دو ہی ڈھائی سال کے بعد ان بیوی کا بھی انتقال ہو گیا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، سید صاحب پر اتنی گھریلو ذمہ داریاں تھیں کہ اب شادی کے بغیر ان کی زندگی سکون سے بسر نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے ۱۹۲۳ء میں تیسری شادی مظفر پور میں ایک کم سن بیوہ سے کی،[1] مولانا عبدالماجد صاحب کو ۱۴/ جنوری ۱۹۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] یہ بیوی مظفر پور کے مشہور سیاسی لیڈر مولوی محمد شفیع داؤدی صاحب مرحوم کی عزیز تھیں اور ان ہی نے شادی طے کی تھی۔

''یقین جانیے پہلی شادی کے بعد تمام دوسری شادیوں کو میں نے ایک رسمی تقریب سمجھا، انتہائی سادگی، خاموشی اور اخفا کے ساتھ یہ کارِ خیر انجام پایا، طرف ثانی کے لیے بھی میں نے یہی شرط رکھی تھی اور انہوں نے پوری طرح وفا کیا، یہاں تک کہ میں ایک جوڑا کپڑا تک ساتھ نہیں لے گیا، ۷رجنوری کو نکاح ہوا، ۹رکو رخصتی ہوئی، اعظم گڑھ سیدھے لے آیا، دستورِ زمانہ کے مطابق وطن بھی نہیں لے گیا کہ وہاں کچھ مراسم مسرت نہ ظاہر ہوں اور میرے لیے پچھلی غم ناک حسرتوں کی یاد تازہ نہ ہو۔'' (مکتوبات سلیمانی ۱۷۰، صفحہ ۱۹۵)

یہ بیوی بڑی ہوش مند اور خوش سلیقہ تھیں، انہوں نے اپنی سمجھ داری سے سید صاحب کی زندگی بہت پرسکون اور خوش گوار بنادی، وہ بفضلہ ابھی تک زندہ ہیں اور اپنے صاحب زادے اور داماد کے ساتھ کراچی میں رہتی ہیں، ان کے ایک صاحب زادے سلمان سلمہٗ اور چار صاحب زادیاں شمیمہ، شکیلہ، شمسیہ اور تارا ہیں، چاروں لڑکیوں کی شادیاں سید صاحب کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی، بڑی صاحب زادی کی شادی ان کے چچیرے بھتیجے سید ابو عاصم کے ساتھ ہوئی، یہ کراچی میں وکالت کرتے ہیں، شکیلہ کی شادی سید حسین صاحب الہ آبادی ڈپٹی کلکٹر سے ہوئی، وہ آج کل فیض آباد میں کمشنر کے عہدے پر ہیں اور ہندوستان ہی میں ہیں، تیسری کی شادی بہار کے ڈاکٹر عطاء اللہ سے ہوئی، وہ بھی کراچی میں ہیں، چوتھی کی شادی بھی بہار ہی کے ایک صاحب سید محی الدین مقیم کراچی سے ہوئی تھی، جن کا شادی کے چند ہی دنوں کے بعد انتقال ہوگیا، اس کے بعد دوسرا عقد کسی پاکستانی نوجوان سے ہوا، وہ بھی کراچی میں ہیں، سلمان میاں نے عربی کی ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی پڑھی اور ایم، اے کیا، وہ سندھ یونیورسٹی میں لکچرار اور آج کل امریکہ میں ہیں، انہوں نے اپنی ایک ہم درس میمن لڑکی سے شادی کرلی ہے۔

اہل وعیال کی محبت میں سید صاحب ''خیرکم خیرکم لاھلہ'' کے مصداق تھے، بیرونی مشغولیتوں کو چھوڑ کر اعظم گڑھ میں ان کی زندگی دار المصنفین تک محدود تھی، شہر کی

کسی چیز سے کوئی تعلق نہ تھا، تصنیف و تالیف کے علاوہ ان کا بقیہ وقت اہل و عیال اور خانگی دل چسپیوں میں گزرتا تھا، طبیعت میں نرمی کی بنا پر بچوں کی تربیت میں بھی نرم تھے۔

سراپا: قد میانہ، جسم دوہرا، رنگ کھلتا ہوا گندمی، مائل بہ سفیدی، ناک ستواں، آنکھیں بڑی، مجموعی حیثیت سے سراپا بڑا دل کش تھا، بدن بہت نرم اور گداز تھا، چوں کہ ساری عمر علمی مشاغل اور دماغی کاموں میں گزری تھی، طبیعت بھی نازک پائی تھی، اس لیے جسمانی مشقت نہیں برداشت کر سکتے تھے۔

لباس: نوجوانی میں لباس کے شوقین تھے، قمیص، علی گڑھ کٹ چھوٹی مہری کا پائجامہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے، جاڑوں میں کبھی کبھی پتلون بھی استعمال کرتے تھے لیکن خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانہ سے کھدر پوش ہو گئے تھے، فرماتے تھے کہ ان تحریکوں نے لباس کا شوق پورا نہ ہونے دیا لیکن کھدر پوشی میں بھی نفاست اور خوش مذاقی تھی، ہمیشہ مہین اور نہایت صاف ستھرا کھدر استعمال کرتے تھے، شیروانی اس زمانہ میں بھی موسم کے لحاظ سے اچھے کپڑے کی ہوتی، جوتا کبھی پمپ اور کبھی سلیم شاہی پہنتے تھے، جب باہر نکلتے تو پابندی سے صافہ باندھتے تھے، جو ان پر بہت زیب دیتا تھا، ان کا ایک لطیفہ خود ان کی زبانی سننے کے قابل ہے، حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

''ندوہ میں کوئی تقریب تھی، مولانا (شبلی) قیمتی ریشمی عمامہ باندھ کر آئے، اتفاق سے راقم سوتی ململ کا عمامہ باندھ کر حاضر ہوا، فرمایا، دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے، مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے اور تمہارا چھ ٹکے کا صافہ ہے مگر ایسے قرینے سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔'' جاڑوں میں چسٹر یا پشاوری جبہ استعمال کرتے تھے اور سر پر شامی رومال کا صافہ باندھتے تھے۔

کھانا: کھانے کا کوئی خاص ذوق اور اہتمام نہ تھا، جیسا مل جاتا کھا لیتے لیکن ان کے گھر میں کھانا بہت خوش ذائقہ پکتا تھا، آم کے البتہ شائق تھے، خوراک بہت کم تھی، دو چپاتی اور دو

چار لقمے چاول سے زیادہ نہ کھاتے تھے، آخر میں اس میں بھی کمی ہوگئی تھی، کھانا بڑی نفاست سے کھاتے تھے اور اپنے رفقا کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے، مولانا عبدالسلام طبعاً آدابِ مجلس کے پابند نہ تھے، کھانے کے بعد ڈکار زور زور سے لیتے تھے اور پانی غٹ غٹ پیتے تھے، سید صاحب فرماتے کہ مولانا آپ کی حلق اور معدہ میں کوئی خرابی ہوگئی ہے، اس کا علاج کرائیے۔

سادگی اور نفاست: طبعاً سادہ اور صاف ستھری زندگی پسند تھی، تکلفات ان کے ذوق کے خلاف تھے، اس لیے بقدر ضرورت بہت صاف ستھرا سامان رکھتے تھے، ان کا صرف ایک کمرہ تھا، وہی بیڈ روم بھی تھا اور ڈرائنگ روم بھی اور کبھی کبھی ڈائننگ روم بھی بن جاتا تھا، کمرے میں ایک پلنگ، فرش اور اس پر قالین رہتا تھا، دیوار پر دو چار آیت قرآنی اور احادیث نبویؐ کے کتبے اور تغرے تھے، برآمدہ میں ایک میز اور چند کرسیاں۔

مولانا مسعود علی ندوی کی زندگی بہت پر تکلف تھی، ان کو بھی سادگی کی تلقین کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ دارالمصنّفین کے رفقا اور کارکنوں کی زندگی میں اتنا فرق نہ ہونے پائے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں برتری یا کم تری محسوس کریں، آگے چل کر ان کی زندگی میں بھی ان کے ذوق کے خلاف بیوی بچوں کے اصرار اور مولانا مسعود علی کے اثر سے کچھ تکلف پیدا ہو گیا تھا، اس کی تمثیل میں فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ چین کے دو نقاشوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، ایک نقاش نے ایک دیوار پر نہایت اعلیٰ نقش و نگار بنایا، دوسرے نے مقابل کی دیوار کو صرف شیشے کی طرح مجلی و مصفی کر دیا، جب دونوں نے پردہ اٹھایا تو دوسرے نقاش کی دیوار پر کوئی نقش نہ تھا مگر اس شفافیت کی وجہ سے مقابل کی دیوار کے نقش و نگار کا عکس آ گیا تھا، یہی حال میری اور مولوی مسعود علی صاحب کی زندگی کا ہے۔

سید صاحب کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی سے ہمیشہ رہا، عرصہ تک کورٹ کے ممبر رہے، پھر مختلف کمیٹیوں کے ممبر ہوتے تھے، اس لیے اکثر علی گڑھ کا سفر ہوتا

تھا اور پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے یہاں ٹھہرتے تھے، علی گڑھ والوں کا معیار زندگی جس قدر اونچا ہے، وہ ظاہر ہے لیکن سید صاحب کی نفاست پسندی اس ماحول میں بھی مسلم تھی، پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی لکھتے ہیں:

''وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے لباس اور ساز و سامان صاف ستھرا اور مجلی رکھتے تھے اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی تھی، بستر بند کٹا پٹا، میلا کچیلا، تڑا مڑا نہیں ہوتا تھا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا، تکیہ کا غلاف اور چادر نہایت صاف اوڑھنے بچھانے کا کافی سامان آرام دہ وافر، خوش نما لوٹا، گلاس، ناشتہ دان، صابن دان منجھا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا دبیز اور بہت صاف دھلا ہوا، سفر کتنا ہی مختصر ہو بکس میں پہننے اوڑھنے کا کافی سامان رکھتے تھے، کلام پاک اور اوراد و وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوب صورت جز دان میں ہوتی۔

سفر میں نوکر ہم راہ نہ ہوتا، سب کام خود کرلیا کرتے تھے، جہاں ٹھہرتے وہاں ہر شخص ہر خدمت کے لیے حاضر رہتا، میں نے یا تو ہمیشہ سفید عمامہ میں دیکھا یا نج کی صحبت میں دو پلیا ٹوپی میں جو مجھے سید صاحب پر خاص طور سے بڑی دل کش نظر آتی، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے، اس لیے کہ میں نے سید صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی مل گجا لباس بھی نہیں دیکھا، موزہ بالعموم پہنتے جو ہمیشہ صاف و ثابت ہوتا، رومال نہایت صاف رکھتے تھے اور بہت جلد بدل دیتے تھے۔

کھانا بڑے سلیقے سے کھاتے اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا، جو چیز جتنی چمچہ میں آتی اتنی ہی پلیٹ میں رکھ لیتے، کھانا کتنا ہی لذیذ اور مرغوب کیوں نہ ہوتا لیتے تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار بھی لے لیتے، جو چیز پسند آتی اس کی بڑی شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے، دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کر کے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے، جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور

مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی۔'' (سلیمان نمبر)

فضائل اخلاق: فضائل اخلاق کا پیکر تھے، لینت ونرمی، حلم وعفو، متانت وسنجیدگی، تواضع وخاکساری ان کے صحیفہ اخلاق کے جلی عنوانات ہیں۔

طبعاً بڑے نرم خو اور متحمل مزاج تھے، ناگوار سے ناگوار باتیں سن کر پی جاتے تھے، غصہ میں ان کا عمل ''والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس'' پر تھا، غصے کی حالت میں بھی ان کی زبان ناروا کلمہ سے آلودہ نہ ہوتی تھی، ان کے غصہ کا اظہار عموماً چہرے کے تغیر تک محدود رہتا، زبان سے بہت کم اظہار ہوتا تھا، سختی ودرشتی ان کے مزاج کے بالکل خلاف تھی، ملازموں پر بھی سختی نہ کر سکتے تھے، متانت وسنجیدگی فطرت میں تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی کبھی متانت کے دائرہ سے نہیں نکلے، اس شہرت وعظمت کے باوجود جوان کو حاصل تھی کسی عنوان سے بھی اپنی بڑائی کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے، ادنیٰ ادنیٰ آدمیوں سے خوش اخلاقی سے ملتے تھے، اوران سے ان کے مذاق کے مطابق باتیں کرتے تھے، راقم کو برسہا برس تک ان کی خدمت ورفاقت کا شرف حاصل رہا اوران کے فضائل اخلاق سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا، یاد نہیں آتا کہ کبھی کسی معاملہ میں ان کا قدم اخلاقی دائرے سے باہر نکلا ہو، سید صاحب سے راقم اور دوسرے رفقا کا تعلق استادی وشاگردی کا تھا، جس میں تادیب وتنبیہ کے مواقع بھی آتے تھے، ان موقعوں پر بھی تنبیہ کے بجائے نرمی سے سمجھاتے تھے، اگر کبھی کسی بات پر ناگواری کا اظہار فرماتے تو بعد میں طرح طرح سے اس کی تلافی کی کوشش فرماتے لیکن ان کا رعب ووقار ایسا تھا کہ ہر شخص ڈرا سہا رہتا تھا۔

ان کے وہ اعزہ واحباب جن کا ساتھ طالب علمی سے لے کر اخیر عمر تک رہا، ان کے ضبط وتحمل کے معترف ہیں، ان کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے، ان میں سے مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا ابوظفر صاحب کے بیانات کے اقتباسات نقل کیے جاتے

ہیں، مولانا عبدالباری[1] صاحب طالب علمی کے زمانہ کے حال میں لکھتے ہیں:

''اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب ولہجہ زوردار البتہ ہو جاتا اور بیان کی قوت وروانی سے اس پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا۔''

متانت ہر حال میں غالب رہتی، کبھی ٹھٹھا مار کر نہ ہنستے تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے مگر اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو سے کر دیتے مگر زبان پر قابو رہتا۔

مرحوم معصوم نہ تھے لیکن ان کی زندگی کا جو رخ طالب علمی سے لے کر کم وبیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود رائی اور خود پسندی دور دور تک نظر نہ آئی، طالب علمی میں ان کا شمار ممتاز اور آگے چل کر ممتاز ترین طلبا میں رہا لیکن نیچے سے نیچے درجہ کے طالب علموں کے ساتھ بھی برتاؤ میں کوئی امتیاز ظاہر نہ ہوتا تھا، ورنہ عام طور پر دوسرے طلبہ جو ہم چشموں میں کچھ امتیاز بھی رکھتے تھے، اس کو دبا نہ سکتے تھے، چندے کے وفدوں میں بار بار ساتھ رہا، رئیس وفد سید صاحب ہی ہوتے مگر یاد نہیں کہ کسی موقع پر بھی کسی طور طریق سے دوسرے رفقا پر اپنا رئیس وفد ہونا ظاہر ہونے دیا ہوتا۔

طالب علمی سے جب استاد ہوئے تو خود اپنا ایک ایسا تجربہ سناتا ہوں کہ آج بھی اس کی شرم سے گڑ جاتا ہوں، ایک سبق میری جماعت کا بھی ان سے متعلق ہوا، اب میرا شمار بھی کچھ اچھے طلبہ میں تھا، غالباً اس کا غرور تھا کہ اس سبق میں جانا چھوڑ دیا کہ کل تک جن سے طالب علمانہ ہم عصری کا دعویٰ تھا، آج اس کی استادانہ برتری کیسے قبول کر لوں، سید صاحب

[1] مولانا عبدالباری صاحب طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی اور شاگرد بھی ہیں، طالب علمی کے زمانہ سے لے کر دارالمصنفین اور ندوہ کے معاملات تک میں آخر تک ساتھ رہا، مولانا ابوظفر صاحب مرحوم سید صاحب کے حقیقی بھتیجے تھے مگر عمر میں ان سے دو ہی چار سال چھوٹے تھے۔

اس کم ظرفی کے جواب میں ضابطہ سے کام لیتے تو سزا دلوا سکتے تھے، سرکشی سے باز نہ آتا، مدرسے سے نکلوا دے سکتے تھے، مگر ان کی عالی ظرفی نے اس کے بجائے کس طرح کیا کہوں کیا کیا، نئے استاد نہیں پرانے بھائی بن کر الٹے خود ہی سمجھا کر کسی طرح منا لیا، مرحوم کی شفقت و محبت کا یہ پہلا بیج تھا جو دل میں پڑا، پھر آخر تک بحمد اللہ پھلتا پھولتا ہی رہا، دخل اس میں ان ہی کی بے نفسی کو رہا۔

آگے چل کر دار المصنفین اور دار العلوم ندوہ کے جب تک وہ ناظم اور معتمد رہے اور میرے رکنیت کا باضابطہ کچھ تعلق رہا، ایک موقع بھی خیال میں نہیں کہ اپنے مزاج و مذاق کے خلاف بات کو بھی پوری توجہ سے نہ سنا ہو اور سمجھ میں آتے ہی بے تامل قبول نہ فرما لیا ہو۔

بعض بڑے اور بہت کم عمر دوستوں بلکہ شاگردوں تک کا یہ تجربہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی علمی یا جماعتی یا تحریکی بڑائی عطا فرما دی تو اپنی رائے اور رنگ کے خلاف بات قبول کرنا کیا سننا بھی گوارا نہیں کرتے یا ''جواب جاہلاں باشد خموشی'' کا زبان حال سے اعلان کرتے ہیں، باقی اپنی کسی رائے سے خوش دلی سے رجوع کرتے یا کسی کوتاہی کے برملا اعتراف و اعتذار، اس کا تجربہ تو آج کے مشاہیر علم و قلم سے شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن سید صاحب کی روح ایسے موقع پر کیسی بے چین ہو جاتی تھی، اس زیر تحریر مضمون[1] کے لیے ان کے کچھ پرانے محفوظ خطوط دیکھنے لگا، ان میں ایک ایسا معذرت نامہ ملا کہ آج ان کی روح عالم آب و گل میں مل جاتی تو بے تابانہ قدموں پر گر جانے کو جی چاہتا ہے، غالباً دار المصنفین ہی کے کسی معاملہ میں میری نسبت کچھ غلط فہمیاں ان کو پیدا ہو گئیں، ان سے ایسا متاثر ہوئے کہ مدعا علیہ کو صفائی کا موقع دیے بغیر ایک بڑا طویل معذرت نامہ تحریر فرما دیا، فوری تاثر کے بعد نظر ثانی واللہ اعلم کیا محسوس کیا اور کتنے بے قرار ہوئے کہ میرے جواب کا انتظار بھی نہ فرما سکے، معذرت نامہ نہیں ان کی اخلاقی کرامت کا بڑا یادگار کرامت نامہ ہے:

---

[1] معارف سلیمان نمبر کا مضمون جس سے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔

''پرسوں نرسوں میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا، وہ ہلکا ہو جائے مگر دیکھتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ بڑھ گیا، میں نے رات اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو، بایں وجہ سے جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کو ایک رازِ سربستہ کی طرح دفن کر دیجیے اور مجھے معاف کیجیے، میں نے گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے اور آئندہ کے لیے حسنِ معاونت کے خاطر لکھا تھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ تجھ سے آخر صبر نہ ہو سکا، اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں اور میری اس تحریر کو بھی میرے گذشتہ اعمالِ بد کا ایک جزو ہی سمجھ لیں، اس وقت مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے، اس وقت کا احساس یہی ہے، کوشش کروں گا اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ میرا یہ احساس قائم رہے، میں بے چینی سے آپ کے لطف آمیز خط کا انتظار کروں گا، آپ کا یہ بڑا بھائی کم ہمت ہے، اپنی کم ہمتی سے ایسا کر گزرا ہے اور شاید عمر میں اس کا پہلا قصور ہے، آپ کا بڑا احسان ہوگا اگر آپ اس تحریر کو نسیا منسیا کر دیں، آپ کا مجھ پر بڑا کرم ہوگا۔

اب یاد کیا آ سکتا ہے کہ اس سراپا کرامت کرامت نامہ کا جواب کیا عرض کیا، مگر اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو اس کی موٹائی سے خیال یہی ہوتا ہے کہ بہت زور لگانے اور تکلف و تصنع سے کام لینے پر بھی جواب میں ان کی بے نفسی کا مقابلہ ہرگز نہ ہو سکا ہوگا، اپنی نالائقیوں اور کوتاہیوں کی معافیاں ان سے اور دوسروں سے مانگنے کی توفیق الحمدللہ بارہا ملی لیکن شکستگی اور فروتنی کے اس بلند مقام تک رسائی چھوٹوں کے کیا کسی بڑے کے مقابلہ میں بھی یاد نہیں، علم و فضل، جاہ و مرتبت ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے اور استاذ تک ہو کر اپنے کم ہمت بڑا بھائی ہونے کا جس طرح اظہار فرمایا ہے ذرا چھوٹے سے چھوٹا یہ ہمت کر کے دیکھتے تو حضرت مرحوم کی قدر و کرامت معلوم ہو۔'' (معارف، سلیمان نمبر، صفحہ ۹۱-۹۴)

مولانا ابوظفر صاحب ندوی بچپن کے حالات میں لکھتے ہیں:

متانت و کم سخنی: علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دل چسپی

نہ تھی، ان کے احباب جب تاش اور شطرنج کھیلتے تو وہ صرف تماشائی ہوتے یا اخبار وغیرہ پڑھنے لگتے، اگر کبھی کھیل میں شرکت کی تو وہ کبڈی ہے، بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے جس سے ان کے استاد ان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے اور ان کے تیز زبان ساتھیوں کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کر ان کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، پھر جب حصول فضل وکمال کے بعد دنیا میں ان کی شہرت ہوئی تو ان کی کم سخنی کی وجہ سے لوگ ان کو مغرور سمجھنے لگے، علامہ موصوف کو اس کا اندازہ ہوا تو انہوں نے اپنے کو شگفتہ بنانے کی کوشش کی اور آخر عمر میں تو واقعی ایسے شگفتہ ہو گئے تھے کہ ان کی مجلس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

(معارف، سلیمان نمبر، صفحہ ۴۹-۵۰)

مولانا عبدالباری صاحب لکھتے ہیں:

مزاج کی سنجیدگی بھی کچھ نہ کچھ سست روی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، سید صاحب کی غیر معمولی سنجیدگی ان کا نمایاں وصف تھا، جلد بازی سے کسی کام میں بھی ذہن و جسم کسی سے بھی کام لینا گویا جانتے ہی نہ تھے۔

اختلاف و کشمکش سے گریز: طبیعت پر خلق و مروت اس قدر غالب تھی اور طبیعت ایسی مرنجا مرنج پائی تھی کہ اختلاف و کشمکش اور مسابقت و مقابلہ سے بہت گھبراتے تھے، ایسے میدان قدم نہ رکھتے تھے اور جب کسی کام میں ایسی شکل پیدا ہوتی تو اس سے الگ ہو جاتے، خلافت اور تحریک ترک موالات میں انہوں نے سرگرم حصہ لیا تھا، مگر جب کشمکش کی صورت پیدا ہوئی تو اس سے الگ ہونے کے لیے تیار ہو گئے، سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی کو جنوری ۲۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں "میں نے مولانا محمد علی اور شوکت علی صاحب سے کہا کہ مجھے چھوڑ دیجیے، مجھے دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہیں مگر دونوں نے نامنظور کیا۔"

(معارف، سلیمان نمبر، صفحہ ۱۷)

اختلاف کی صورت میں خاموشی اختیار فرما لیتے اور اپنے اختلاف کا برملا اظہار نہ

ہونے دیتے۔

۱۹۲۶ء میں حجاز کی مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے ہندوستان سے جو وفد گیا تھا، سید صاحب اس کے صدر تھے اور مولانا محمد علی، شوکت علی اور شعیب قریشی ارکان، سلطان عبدالعزیز بن سعود کی بادشاہت کے بارہ میں سید صاحب اور مولانا محمد علی کے نقطہ نظر میں اختلاف تھا، سید صاحب حجاز کے اسلامی مصالح کی بنا پر سلطان کی حمایت میں تھے اور مولانا محمد علی اس کے خلاف تھے اور اس بارہ میں مسلمانانِ عالم کا مشورہ ضروری سمجھتے تھے، وفد کی واپسی کے بعد مولانا محمد علی نے ہمدرد میں سلطان کی بادشاہت کی مخالفت میں متعدد مضامین لکھے، ان میں سید صاحب کے متعلق بعض قابل اعتراض باتیں لکھ دیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں سید صاحب کا دہلی جانا ہوا اور مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، ان سے فرمایا کہ آپ میرے خلاف جتنا چاہیں لکھیں میں اس کا مطلق جواب نہ دوں گا، مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا کہ میرے لکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں، یہ جواب سید صاحب کو اتنا پسند آیا کہ اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

ندوہ کے معاملات میں بھی جس کے وہ معتمد تھے، ان کی روش یہی تھی، ان کی معتمدی کے زمانہ میں ایک مرتبہ طلبہ نے اسٹرائک کی، اسٹرائک ختم ہونے کے بعد طلبہ کو سزا دینے کے بارے میں سید صاحب اور بعض دوسرے اراکین میں اختلاف رائے ہو گیا، سید صاحب کی اپنی فطری نرمی اور عفو و درگزر کی بنا پر رائے تھی کہ اسٹرائک کرنے والوں کے ساتھ سختی نہ برتی جائے، جن طلبہ کا نمایاں حصہ نہیں تھا اور ان کو ندامت ہے ان کو معاف کر دیا جائے لیکن بعض اراکین سخت سزا کے حق میں تھے، جب اس اختلاف نے کشمکش کی شکل اختیار کی تو سید صاحب معتمدی سے الگ ہونے کے لیے تیار ہو گئے لیکن نواب علی حسن خاں نے جو اس وقت ندوہ کے ناظم تھے اور ان کے نائب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کسی قیمت پر اس کے لیے تیار نہ تھے، انہوں نے اپنی صفائی پیش کر کے سید صاحب کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔

اعتماد و حسن ظن: باہمی محبت، حسن ظن اور اعتماد ان کا اصول زندگی تھا، ان کا قول تھا کہ میں ہر شخص کو اچھا سمجھتا ہوں، جب تک وہ اپنے کو برا نہ ثابت کر دے، محبت، اعتماد اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہ رہے گی میں نہ رہوں گا۔ (معارف سلیمان نمبر، صفحہ ۷۳)

اہل و عیال سے محبت: مہر و محبت ان کے خمیر میں داخل تھی، جس سے ہر تعلق رکھنے والا بقدر استحقاق فیض یاب ہوتا تھا، ان کی گھریلو زندگی مہر و محبت کا نمونہ تھی، دارالمصنّفین میں کام کے اوقات کے علاوہ ان کا سارا وقت بال بچوں کی دلچسپیوں میں گزرتا تھا، سب سے چھوٹی اولاد پر نگاہ مہر زیادہ رہتی تھی، اس کو گود میں لے کر اور اگر چلنے کے قابل ہو تو انگلی پکڑ کر دارالمصنفین کی سڑک پر ٹہلا کرتے تھے، کبھی کبھی سفر میں بھی ساتھ لے جاتے، طبیعت کی نرمی کی وجہ سے بچوں پر بھی سختی نہیں کر سکتے تھے، اس کی ناگواری چہرے تک محدود رہتی، جب زیادہ برہم ہوتے تو فرماتے مجھے یہ حرکت پسند نہیں، لڑکیوں میں شمسیہ خاموش اور سنجیدہ تھی اور تارا شوخ اور چنچل، ان کے مزاج کی مناسبت سے ایک کا نام خنداں رکھا اور دوسری کا گریاں، سلمان نے کچھ دنوں ندوہ میں پڑھا تھا، وہ کبھی کبھی سید صاحب سے بحث پر آمادہ ہو جاتے تھے تو سید صاحب فرماتے کہ عربی پڑھ کر کٹ حجتی ہو گیا ہے۔

وطن سے محبت: ان کی ساری زندگی اتر پردیش میں گزری لیکن وطن کی محبت بدستور قائم رہی، علمی و قومی کاموں کے سلسلہ میں جب پٹنہ جانا ہوتا تو دیسنہ ضرور جاتے اور سال دو سال کے بعد مع اہل و عیال کے گرمیوں میں جاتے اور دو تین مہینے پورے لطف و مسرت کے ساتھ وطن کے احباب و اعزہ کے ساتھ بسر کرتے، اس کا ایک لطیفہ بیان کیا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جب دیسنہ جاتا ہوں تو پہلے مقامی پالیٹکس سے طبیعت گھبراتی ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد دلچسپی ہونے لگتی ہے، آخر میں اس میں حصہ لینے کو دل چاہنے لگتا ہے، اس وقت بوریا بستر باندھ لیتا ہوں۔

دیسنہ میں ایک انجمن ''الاصلاح'' کے نام سے قائم تھی، اس کے تحت اردو کا ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس کے تحت جلسے ہوا کرتے تھے، ابتدائی زمانہ میں سید صاحب بھی مقالے پڑھتے اور تقریریں کرتے تھے، آگے چل کر جب بڑی بڑی کانفرنسوں کی صدارت کرنے لگے تو اس وقت بھی ان جلسوں کو نہ بھولے، فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی کانفرنسوں کی صدارت کا شرف بخشا لیکن جو لذت الاصلاح کے جلسوں کی صدارت میں محسوس کی وہ کسی میں نہ ہوئی۔

عمر کا آخری حصہ وطن میں بسر کرنے کی تمنا تھی اور اس کے لیے آبادی سے باہر ایک خوب صورت بنگلہ بنوایا تھا لیکن حالات سے یہ تمنا دل ہی دل میں رہ گئی، ایک ہم وطن دوست کو بڑی حسرت سے لکھا:

> ''دیسنہ کا اس پیری میں قیام کا ہمیشہ سے خیال تھا، اسی لیے وہاں سب کچھ لگایا، مگر افسوس انقلاب زمانہ نے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، اب تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بقیہ ایام عمر کہاں گزریں گے۔'' (معارف سلیمان نمبر، صفحہ ۵۹)

دولت دنیا سے استغنا: سید صاحب علم کی جس بلندی پر تھے، وہاں سے دولت دنیا بہت حقیر نظر آتی تھی، انہوں نے اس کے حصول کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور اس کے جو مواقع بھی ملے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، ان کو مختلف اوقات میں مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی اور لاہور یونیورسٹی کے شعبہ عربی و اسلامیات کی صدارت پیش کی گئی، مگر انہوں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور پوری زندگی سادگی اور قناعت کے ساتھ بسر کر دی، بھوپال جانے سے پہلے ان کو مالی فراغت کبھی حاصل نہیں ہوئی، بلکہ کبھی کبھی مصارف کی تنگی کی شکایت بھی ہو جاتی، اس زمانہ میں ان کی تنخواہ ڈھائی سو ماہوار تھی، کچھ آمدنی ان کی ذاتی کتابوں کی فروخت، ممتحنی اور بعض دوسرے علمی ذرائع سے ہو جاتی تھی اور ان کی آمدنی کا اوسط تین ساڑھے تین سو ماہوار سے زیادہ نہ تھا، جو ان کے علم و فضل کے مقابلہ میں بالکل ہیچ

تھا، مگر اسی میں وہ صاف ستھری زندگی بسر کرتے اور اس کے سارے فرائض ادا کرتے تھے، وہ دارالمصنّفین کے رفقاو مصنّفین کو بھی ہمیشہ سادگی اور قناعت کی تلقین کرتے رہتے تھے اور ان کی یہ روایت آج بھی قائم ہے، چنانچہ دارالمصنّفین کے خدام جتنے قلیل معاوضہ میں زندگی بسر کرتے ہیں اس کا اس زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں بعض بڑی حکیمانہ باتیں فرماتے تھے، ان کا مقولہ تھا کہ زندگی میں آسودگی روپیہ کی زیادتی میں نہیں بلکہ مصارف کی کمی میں ہے اور ہر نئی آمدنی اپنے ساتھ نیا خرچ بھی لاتی ہے، حقیقت ہے کہ بڑے کام ہمیشہ دولت کے گہوارے میں نہیں غربت کے بوریے پر انجام پائے ہیں، اگر اداروں کے باقی اور قوم وملت کے خدمت گزار بھی حصول دولت کو زندگی کا مقصد بنالیں تو کوئی کام انجام نہیں پاسکتا، اگر سید صاحب نے یونیورسٹیوں کے عہدے قبول کر لیے ہوتے تو ان کو ہزار بارہ سو ماہوار تنخواہ ضرور ملتی لیکن وہ علامہ سید سلیمان ندوی نہ بنتے اور نہ دارالمصنّفین کو فروغ حاصل ہوتا۔

ذوق مطالعہ: سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے کتب بینی اور مطالعہ میں بڑا انہماک تھا، جب ان کے ساتھی تفریحی مشاغل میں مشغول ہوتے اس وقت بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا، مولانا ابوظفر صاحب اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:

> ''علامہ موصوف نے کبھی بھی کھیلوں سے دل چسپی نہیں لی، ورزشی کھیلوں کا وقت عصر سے لے کر مغرب تک تھا، علامہ موصوف یہ وقت رسالہ، اخبار یا کتب بینی میں صرف کرتے اور جب وہ دارالاخبار کے ناظم مقرر ہوئے جس میں ہندوستان کے اکثر اخبارات ورسالے آتے تھے تو اس سے انہوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔'' (معارف، سلیمان نمبر، صفحہ ۱۵)

مولانا عبدالباری صاحب ندوی لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھتے، کتب بینی کرتے، اپنے ساتھیوں

کے مقابلہ میں زیادہ پایا، ہرطرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے ہیں، طلسم ہوش ربا تک کو اس توجہ سے پڑھا تھا کہ چندہ کے ایک وفد میں ساتھ تھا، یاد نہیں کہ کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالباً پانی بھی برس رہا تھا، اس عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سناتے جاتے تھے جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں، راستہ تفریحی سفر بن گیا، شاگردی کی سعادت کے بعد سے حاضری زیادہ ہونے لگی تھی، جب حاضر ہوتا، کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے پاتا، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار و رسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آگئی تو اسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگے، ذرا بھی کوئی بات دل چسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ خالی وقت گزاری کے طور پر نہیں بلکہ توجہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، طبیعت بہت اخاذ پائی تھی، ہر ادنیٰ و اعلیٰ کتاب و رسالہ اور ہر کہہ و مہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے اور حسب موقع کام لیتے۔

عرفی طالب علمی سے لے کر علمی شہرت و عزت کے اوج کمال تک اشخاص اور کتابوں دونوں سے کھلے دل و دماغ سے اخذ و استفادہ کا یہی کمال کہنا چاہیے کہ ان کو زندگی بھر لفظاً و معناً سچا طالب علم بنائے رہا۔

ان کے گوناگوں کمالات میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے زیادہ کام لینے کو دخل رہا، فطری ذہانت و ذکاوت اور طباعی و جودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے، ندوہ میں سید صاحب سے پہلے اور ان کے ساتھ اور بعد میں ایک سے ایک بڑھ کر ذہین و طباع داخل و فارغ ہوتے رہے لیکن ''سید سلیمان ندوی'' ہونے میں سب سے پیچھے رہے، بڑا راز اس کا ان کے کسب و کمال کا کمال ہی تھا، ان کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی کا یہی بڑا قیمتی سبق ہے۔

علمی ذوق و شوق کی عام فضا ندوہ میں استاد محترم (علامہ شبلیؒ) کے دور میں پیدا ہوئی لیکن سید صاحب جہاں تک دیکھا سنا اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود میں تو کوئی نمایاں شرکت تو قطعاً یاد نہیں آتی، نہ میل جول اور سیر و تفریح کی زیادہ عادت تھی، یہی رنگ طبیعت آخر تک رہا کہ خالص تعلق والے لوگ تک بھی ''دلے بر ندش'' ہی آپ تک پہنچ پاتے، گویا یکسوئی

ان کا طبعی امر تھا، جو علم و عمل کی ہر راہ میں کسب کمال کی شرط ہے۔" (سلیمان نمبر، صفحہ ۸۲، ۸۳)

کتب بینی سے یہ شغف آخر عمر تک قائم رہا، فارغ اوقات میں بھی کبھی بیکار نہ بیٹھتے تھے، کچھ نہ کچھ پڑھا کرتے تھے، لکھے ہوئے کاغذ کا کوئی ٹکڑا بھی مل جاتا تو اس کو پڑھے بغیر نہ چھوڑتے، ایک زمانہ میں رات کو بھی مطالعہ کرتے تھے لیکن جب کثرت مطالعہ نے صحت پر اثر ڈالا تو رات کا مطالعہ چھوڑ دیا تھا، دارالمصنّفین کے کتب خانہ کی ساری کتابیں جن کی تعداد ہزاروں تک ہے، ان کے مطالعہ سے گزر چکی تھیں، جس پر ان کے نوٹ شاہد ہیں، جس کتاب میں جو کام کی بات مل جاتی اور شروع کتاب کے سادہ صفحہ پر نوٹ کر دیتے، مشکل ہی سے کوئی کتاب ان کے نوٹوں سے خالی نکل سکتی ہے، بعض بعض کتابیں تو نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں، اس کا آغاز طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہو گیا تھا، ابن خلکان کا ایک نسخہ جو طالب علمی کے زمانہ سے ان کے مطالعہ میں تھا، نوٹوں سے بھرا ہوا تھا، یہ نسخہ دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں تھا، بعد میں کراچی منگوا لیا تھا۔

ان یادداشتوں سے ان کی تصانیف میں بڑا فائدہ پہنچا، عرب و ہند کے تعلقات کا موادوہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے جمع کر رہے تھے، دارالمصنّفین کے کتب خانہ کی تاریخ وجغرافیہ وغیرہ کی کتابوں میں جہاں اس کا مواد ملتا نوٹ کر لیتے، چنانچہ یہ کتاب ان کے پچیس سال کے مطالعہ کا ثمرہ ہے۔

نادر کتابوں کی تلاش: نادر کتابوں کے مطالعہ کی ہمیشہ تلاش و جستجو رہتی، جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں کو ضرور دیکھتے، ان میں جو نادر کتابیں نظر آتیں ان کو نوٹ کر لیتے اور ناظرین معارف سے ان کا تعارف کراتے، انہوں نے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے اور بیرون ہند کے بعض مشہور کتب خانوں کا بڑی غائر نظر سے معائنہ کیا تھا اور معارف میں ان پر مضامین اور نوٹ لکھے، وفد خلافت کے سلسلہ میں جب لندن جانا ہوا تو انڈیا آفس کے کتب خانہ کو دیکھا اور واپسی میں "انڈیا آفس میں اردو کا خزانہ" کے عنوان سے ایک مضمون

لکھا، جو جون ۲۰ء کے معارف میں چھپا، ۲۶ء میں جب ایک وفد میں حجاز جانا ہوا تو مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں کو دیکھا اور ان پر ایک مفصل مضمون لکھا، جو اکتوبر اور دسمبر ۲۶ء کے معارف میں چھپا ہے، اس میں ان کتب خانوں کی پوری تاریخ اور ان کی نادر کتابوں کا مفصل ذکر ہے، اس سے مولانا ہاشم ندوی نے ''تذکرۃ النوادر''[1] میں استفادہ کیا ہے، جس کا احوال اس میں موجود ہے۔

اکتوبر ۲۷ء میں مدراس کے سفر کے سلسلہ میں حیدرآباد کا سفر کیا، اس سفر میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ دارالترجمہ، دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور دسمبر ۲۷ء کے معارف میں اس کی روداد لکھی، کتب خانہ آصفیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کی علمی عمارت کا چوتھا ستون ہے، ہمارے خیال میں نوادر کی کثرت، قلمی کتابوں کی کثرت، فائدہ اٹھانے والوں کی کثرت، استفادہ کی سہولت اور حسن انتظام کے لحاظ سے یہ ہندوستان کے تمام مشرقی کتب خانوں سے بہتر ہے، دس برس کے بعد اب اس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، کتابیں بڑھتی جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ اس کی فہرست نئے اسلوب سے تیار کی جائے، موجودہ ناظم کتب خانہ نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے مگر یہ کام نہایت اہم و وقت نظر کا ہے، اس کے لیے خاص توجہ درکار ہے۔''

جولائی ۳۳ء میں سیرت کے جلسہ کے سلسلہ میں گجرات کا سفر کیا تو بھڑوچ اور انکلیشور کے بعض خاندانوں کے پرائیویٹ کتب خانوں کو دیکھا، اور ستمبر ۳۳ء میں ''سفر گجرات کی چند یادگاریں'' کے عنوان سے اس کے نوادر پر ایک مضمون لکھا۔

۳۶ء میں کتب خانہ حمیدیہ بھوپال پر ایک مضمون لکھا، اس میں اس کے نوادر کا تذکرہ کیا۔

---

[1] تذکرۃ النوادر مختلف فنون کی عربی کی ان نادر کتابوں کی فہرست ہے جو دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، مولانا ہاشم ندوی نے اس کو مرتب کیا ہے، اور دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اس کو شائع کیا۔

خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ اور کتب خانہ رام پور کو تو بار ہا دیکھا، معارف میں ان کے بہت سے نوادر کا ذکر ہے، اس کے علاوہ جہاں کسی نادر کتاب کا پتہ چلتا یا کوئی کتاب شائع ہوتی تو اس کا ذکر معارف میں ضرور کرتے، ایسی کتابوں کا معارف میں بکثرت ذکر ہے۔

معلومات کی وسعت اور تلاش و تحقیق: مطالعہ کی کثرت اور نادر کتابوں کی تلاش و جستجو نے ان کے دماغ کو مستقل کتب خانہ اور متنوع علمی معلومات کا خزانہ بنادیا تھا، ان کی کوئی گفتگو علمی معلومات سے خالی نہ ہوتی، ان کی صحبت سے جو قیمتی معلومات حاصل ہو جاتے تھے، وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق خواہ وہ علمی ہو، مذہبی ہو یا سیاسی و معاشرتی ایک سوچی سمجھی ہوئی پختہ رائے اور اس کے متعلق مستقل نظریات رکھتے تھے، چنانچہ کسی مسئلہ پر ان کو بروقت غور وفکر کی ضرورت نہ ہوتی تھی، اس کا پورا نقشہ پہلے سے ان کے دماغ میں موجود ہوتا تھا، جس کو وہ مرتب طریقہ سے پیش کر دیتے تھے، تحریر میں تو یہ چیز آسان ہے کیوں کہ وہ سوچ سمجھ کر لکھی جاتی ہے، ان کی فی البدیہہ علمی تقریریں بھی ایک مرتب مقالہ معلوم ہوتی تھیں، جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے معلومات کی وسعت اور تحقیق و تنقید کا پورا حق ادا کرتے اور اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑتے، مذہبی مباحث سے قطع نظر جو ان کا خاص دائرہ تھا، خالص علمی و تاریخی موضوع پر انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، جس کا نمونہ ''خیام'' اور ''عرب و ہند کے تعلقات'' ہیں، بلکہ عرب و ہند کے تعلقات کا راستہ ان ہی نے دکھایا اور یہ موضوع ان کے اولیات میں ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی علمی اور تصنیفی خصوصیات پر بڑے جامع اور صحیح تبصرہ کیا ہے، اس کے کچھ اقتباس یہاں نقل کیے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا بھی نہیں، کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقوں

سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف میں بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے، مستند حوالے کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے، اور تقسیم ابواب و ترتیب مضامین میں کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالب علم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا۔

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا، ان کے ذہن میں تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھیں، کام کی باتیں ضخیم سے ضخیم کتاب اور پیچیدہ سے پیچیدہ بحث سے جلد اخذ کر لیتے تھے اور اس کا صحیح مقام دینے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ذخیرۂ معلومات کی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمل رکھتے ہیں، جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست جو جدید ترتیب کے اصولوں پر مرتب کی گئی ہو۔

ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں نے سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب میں تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائیں، اسٹاف کلب اس طرح کی فرمائش کسی سے بہت کم کرتا ہے، تقریر کا موضوع غالباً ''فن تاریخ میں مسلمانوں کا احسان'' یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا، سید صاحب نے سوا گھنٹہ سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع سے خاص ذوق تھا، بیان کرتے ہیں کہ سید صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے اور جتنے متنوع اور مستند ماخذ سید صاحب کے علم میں ہیں، اتنے شاید ہی کسی کے علم میں ہوں، جس طرح بچے آٹوگراف لینے کے لیے مشاہیر پر گرتے ہیں اسی طرح لوگوں نے سید صاحب سے ماخذات نوٹ کیے۔

خیام کے بارے میں مغربی مصنّفین نے جو کچھ لکھا تھا اور ان کی دیکھا دیکھی یا سنی سنائی ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیش نظر تھا لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی، جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے، اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز

طالب علمانہ شغف، موشگافانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، معمولی سے معمولی دعویٰ کو مستند سے مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے، ماخذات کے لیے کس کس بے کنار سنسان اور دشوار گزار جنگل اور گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہوگا، تب جا کر کسی رہ رو کے نقش قدم ملیں ہوں گے، اور جادہ منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا، معلوم نہیں اس تصنیف پر سید صاحب کو کیا داد ملی ہوگی، حکومت سے، قوم سے یا کسی اکیڈمی سے، میں سمجھتا ہوں کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی سید صاحب کو بڑے فخر اور خوشی سے اعلیٰ ڈگری دے سکتی ہے۔" (سلیمان نمبر)

درس وتدریس کا ذوق: سید صاحب کی زندگی کا آغاز ندوہ کی معلّمی سے ہوا، پھر وہ پونہ کالج میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرار ہو گئے، اسی کو چھوڑ کر دارالمصنّفین آئے تھے، اس وقت ان کا دائرۂ عمل بدل گیا تھا لیکن درس وتدریس کا چسکہ ہمیشہ قائم رہا، جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا، انہوں نے رفقا کو کتابی درس تو کبھی نہیں دیا لیکن زبانی درس وتعلیم کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا، ندوہ کے بعض منتہی طلبہ کبھی کبھی ان سے استفادہ کے لیے رمضان کی تعطیل میں دارالمصنّفین آتے تھے، ان کو جن فنون سے دل چسپی ہوتی ان کا کتابی درس نہ دیتے تھے بلکہ اس فن پر تقریر فرماتے تھے، جس سے اس کے تمام مسائل ذہن میں آجاتے تھے، البتہ رمضان میں قرآن مجید کا درس پابندی سے دیتے تھے، جس کا سلسلہ کبھی کبھی رمضان کے بعد بھی جاری رہتا تھا، ندوہ کے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس نگرامی اسی درس کے فیض یافتہ ہیں، راقم کی طالب علمی کے زمانہ میں جب ندوہ جاتے تو طلبہ سے امتحانی سوالات ضرور کرتے، اس لیے طلبہ ان سے ملتے ہوئے گھبراتے تھے، جب وہ ندوہ کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے اور اس سلسلہ میں وہاں زیادہ آنا جانا ہونے لگا تو درجوں میں جا کر درس وتعلیم کا معائنہ کرتے اور کبھی کبھی خود بھی درس دیتے تھے۔

رفقا کی تصنیفی تربیت: رفقا کو تصنیفی تعلیم وتربیت کی سب سے بڑی درس گاہ تو ان کی صحبت تھی، جس سے اتنے متنوع معلومات حاصل ہو جاتے تھے جو سیکڑوں کتابوں کے مطالعہ کے

بعد بھی بمشکل حاصل ہو سکتے تھے، مختلف فنون کی اہم کتابوں خصوصاً ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن خلدون، امام رازی، ابن رشد، شاہ ولی اللہ اور اس زمرہ کے دوسرے مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کراتے، سب سے بڑا فائدہ ان کی علمی اسسٹنٹی سے پہنچتا تھا، وہ اکثر اپنی زیر تصنیف کتاب کا مواد رفقا سے تلاش کراتے تھے اور اس کے ماخذ بھی بتا دیتے تھے، اس سے مختلف فنون کی کتابوں پر ان کی نظر ہو جاتی تھی، اس کے بعد عربی رسالوں وغیرہ سے تلخیص و ترجمہ کراتے تھے، آخر میں کسی موضوع پر مضمون لکھاتے، مضامین پر حک و اصلاح کم کرتے تھے، نقائص کی طرف زبانی توجہ دلاتے تھے، ان کی پسند کی علامت مسکراہٹ یا کوئی ہلکا سا فقرہ ہوتا، ناپسندیدگی کا اظہار بھی چہرے کی ناگواری یا اشارے سے ہوتا، کھل کر کبھی حوصلہ افزائی یا ہمت شکنی نہیں کرتے تھے۔

معمولات: سید صاحب بڑے لوگوں کی طرح معمولات کے سختی سے پابند نہ تھے، ان کا معمول عموماً یہ تھا، نماز فجر کے بعد کلام مجید کی تلاوت کرتے، ناشتہ کے بعد کام کے لیے کتب خانہ میں آجاتے اور بارہ ساڑھے بارہ بجے تک اس انہماک سے کام کرتے کہ وقت کا خیال نہ رہ جاتا، کھانے کے لیے بار بار یاد دہانی کرنا پڑتی اور دستر خوان پر دیر تک انتظار کرنا پڑتا، کام کے اوقات میں اگر کوئی ملنے والا آجاتا تو ان کو سخت ناگوار ہوتا لیکن مروت کی وجہ سے کچھ کہتے نہ تھے، کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے، پھر ظہر کی نماز پڑھتے، جب تک قویٰ مضبوط تھے ظہر کے بعد بھی عصر تک کام کرتے تھے لیکن پھر دوسرے وقت کا کام چھوڑ دیا تھا اور ظہر کے بعد سے عصر تک کا وقت گھر میں گزرتا تھا، اس میں بھی بے کار نہ رہتے، کلام مجید یا کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرتے، عصر کی نماز کے بعد مغرب تک ان کے برامدہ میں مشترک نشست ہوتی، جس میں رفقاء کے علاوہ اکثر باہر کے لوگ بھی آجاتے تھے، یہ وقت سید صاحب کے خاص انشراح و شگفتگی کا ہوتا، اس مجلس میں علمی، مذہبی، سیاسی، تفریحی ہر قسم کی باتیں ہوتی تھیں اور بڑے قیمتی معلومات حاصل ہوتے تھے، کبھی کبھی جب

حاضرین کم ہوتے تو دارالمصنّفین کی سڑک پر مشی کرتے، ایک زمانہ میں کھانا یک جائی ہوتا تھا، سب کے گھروں سے کھانا آجاتا تھا اور سب ایک دستر خوان پر کھاتے تھے، اس زمانہ میں دارالمصنّفین کا دستر خوان مشہور تھا، خصوصاً رمضان میں روزانہ دعوت کی کیفیت رہتی تھی لیکن بعد میں سب اپنے اپنے گھروں پر کھانے لگے تھے۔

بزم رفتہ کی یاد: ان سطور کی تحریر کے وقت پرانی صحبتوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا اور بے اختیار ناظرین کو بھی اس میں شریک کرنے کا دل چاہتا ہے، اس زمانہ کے بزرگوں میں سید صاحب، مولانا مسعود علی صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب تھے اور رفقا میں سید نجیب اشرف مرحوم، سعید انصاری مرحوم، مولوی ریاست علی ندوی، مولوی ابوالجلال ندوی، ڈاکٹر محمد عزیز، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور راقم الحروف یہ دارالمصنّفین کا نورتن تھا۔

ان سطور کی تحریر کے وقت تینوں بزرگ دنیا سے اٹھ چکے ہیں، رفقا میں نجیب صاحب اور سعید انصاری بھی مرحوم ہو چکے، نجیب صاحب راقم کے زمانہ میں بہت کم رہے، پہلے احمد آباد کے کسی کالج میں لکچرار ہو گئے تھے، پھر اسماعیل کالج اندھیری بمبئی میں چلے گئے اور وہیں سے رٹائر ہوئے، اس کے بعد اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام بمبئی کے ڈائرکٹر ہو گئے تھے، ۱۹۷۰ء میں بمبئی میں انتقال کیا، مقدمہ رقعات عالم گیری اور رقعات عالم گیری ان کی تصانیف ہیں، سعید انصاری صاحب قدیم رفیق تھے لیکن ان میں استقلال نہ تھا، مختلف اوقات میں دارالمصنّفین اور دوسرے اداروں میں رہے، آخر میں پاکستان چلے گئے اور لاہور یونیورسٹی میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ سے متعلق ہو گئے تھے، یہیں انتقال کیا، سیر الانصار اور سیر الصحابیات ان کی یادگار ہیں، مولوی ریاست علی صاحب بڑے ہونہار تھے لیکن ان میں سیاسی ذوق غالب تھا، سیاسی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، اس سے دارالمصنّفین کے کاموں میں حرج ہوتا تھا، اس لیے دارالمصنّفین سے الگ ہو گئے اور سید صاحب کی سفارش سے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پرنسپل کی جگہ مل گئی، پھر پٹنہ

یونیورسٹی کے عربی وفارسی کے ریسرچ کے شعبہ میں منتقل ہوگئے، اس سے رٹائر ہونے کے بعد اپنے وطن گیا میں مقیم ہیں، تاریخ صقلیہ اور تاریخ اندلس جلد اول ان کی تصانیف ہیں، مولوی ابوالجلال بہت لائق رفیق تھے لیکن طبیعت لاابالی پائی تھی، مزاج میں استقلال نہ تھا، کوئی کام جم کر نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کئی مقامات پر رہے اور کوئی کتاب مکمل نہ کر سکے، آج کل کراچی میں مقیم ہیں، ڈاکٹر عزیز صاحب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرار ہو گئے تھے، اس سے رٹائر ہونے کے بعد کراچی چلے گئے، بڑے شریف الطبع اور متانت و سنجیدگی کا پیکر ہیں، تاریخ دولت عثمانیہ ان کی تصنیف ہے، اس دور کے خدمت گزاروں میں اب صرف دو باقی رہ گئے ہیں، سید صباح الدین صاحب اور راقم الحروف، صباح الدین صاحب میرے دست راست ہیں، علمی کاموں کے ساتھ انہوں نے انتظامی و مالی شعبہ کو بھی بڑی خوبی سے سنبھالا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو صحیح وسلامت رکھے، راقم طبعی مدت حیات پوری کر چکا ہے، معلوم نہیں کب وقت آجائے، اللہ تعالیٰ خاتمہ بخیر فرمائے[1]۔

شہر کے کچھ لوگ روزانہ کے حاضر باش تھے اور کچھ کبھی کبھی آتے تھے، روزانہ کے آنے والوں میں حکیم محمد اسحٰق صاحب، قاضی صادق وکیل، شاہ علاء الحق وکیل، رشید خان، نیاز احمد صاحب صدیقی، پرنسپل بشیر احمد صاحب صدیقی، حاجی عبدالغفور صاحب، حکیم اسحٰق صاحب شہر کے نام ور اور مقبول طبیب ہیں، دارالمصنفین سے پچاس سال سے زیادہ ان کے تعلقات ہیں، وضع داری کا نمونہ ہیں، اب بہت ضعیف ہوگئے ہیں مگر اب بھی وضع داری پر قائم ہیں اور مہینہ میں ایک دو مرتبہ ضرور آجاتے ہیں، قاضی صادق حسین صاحب وکیل تھے، کئی سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا، شاہ علاء الحق صاحب فوج داری کے نام ور وکیل تھے، کئی سال ہوئے کراچی چلے گئے اور وہیں مقیم ہیں، رشید خان سینٹری انسپکٹر تھے، ابھی

[1] راقم کے پہلے کے بزرگوں مولانا عبدالباری ندوی، مولانا حاجی معین الدین ندوی اور مولوی ابوالحسنات ندوی ہیں، آخر الذکر دونوں بزرگ مرحوم ہو چکے ہیں، مولانا عبدالباری صاحب حیات ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ قائم رکھے۔

چند مہینے ہوئے کہ انتقال ہوا، نیاز صاحب شبلی اسکول اور پھر شبلی کالج میں انگریزی کے استاد تھے، دارالمصنّفین ہی میں رہتے تھے، اس لیے ان کا شمار گویا رفقا میں تھا، پھر محمد حسن انٹر کالج جون پور میں پرنسپل ہوگئے، آج کل ندوہ میں انگریزی کے ٹیچر اور شرافت کا مجسم پیکر ہیں[1]، بشیر صاحب شبلی کالج کے پرنسپل تھے، سہ پہر سے لے کر رات تک ان کا وقت دارالمصنّفین ہی میں گزرتا تھا، اکثر رات کا کھانا گھر سے منگا لیتے تھے اور ساتھ ہی کھاتے تھے، بڑے مخلص اور دوست نواز ہیں، آج کل کراچی میں مقیم ہیں، حاجی عبدالغفور صاحب کی بیکری تھی، ناخواندہ تھے لیکن دارالمصنّفین کے خادم اور روزانہ کے حاضر باش تھے، اس لیے سب ان کی قدر کرتے تھے، اپنی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے، سید صاحب بھی ان کی شاعری سے لطف لیتے تھے، کئی سال ہوئے انتقال ہوگیا۔

اکثر و بیش تر آنے والوں میں مولوی اقبال احمد خان سہیل، مرزا احسان احمد صاحب وکیل، مولوی ظہور صاحب مختار اور شیخ امین الدین صاحب وکیل تھے، اقبال صاحب سہیل اور ان کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے، وہ بڑے لائق، ذہین طبع اور خوش گفتار تھے، ان کی گفتگو علم و ادب، لطائف و ظرائف کا زعفران زار ہوتی تھی، جب وہ آجاتے تھے تو لطف و لطائف کا ایک گلستان کھل جاتا تھا، کئی سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا، مرزا احسان احمد صاحب وکیل بھی ہیں اور شاعر بھی، ادھر کئی سال سے وکالت چھوڑ دی ہے اور خانہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی ہے، مگر اپنی وضع داری پر قائم ہیں، کبھی کبھی دارالمصنّفین آجاتے ہیں[2]، امین الدین صاحب شبلی کالج کے شعبہ قانون کے ہیڈ ہوگئے تھے، اب رٹائر ہوگئے ہیں، دارالمصنّفین کے پرانے تعلقات رکھنے والوں میں ہیں، اور اب تک اپنی وضع داری پر قائم ہیں اور ان سے اس بزم کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

۱؎ اب ندوہ سے رٹائر ہوکر اپنے وطن مڑیاہو ضلع جون پور میں مقیم ہیں۔ ۲؎ ابھی چند روز ہوتے ہیں کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔

سید صاحب میں فطری متانت اور علمی وقار کی وجہ سے ایک زمانہ میں خشکی تھی، لوگ ان کے سامنے بے تکلف ہوتے ڈرتے تھے لیکن عمر کے ساتھ خشکی کم ہوتی گئی اور آخر میں بڑے شگفتہ مزاج ہوگئے تھے اور ان صحبتوں میں پوری دل چسپی سے حصہ لیتے تھے، ہر شخص سے اس کے مذاق کی باتیں کرتے اور بے تکلف صحبتوں میں تو ضلع جگت تک پر اتر آتے تھے، مولانا عبد السلام صاحب بڑے بھولے اور مجلسی آداب سے لاپرواہ تھے، سید صاحب ان کو بت بے پیر کہا کرتے تھے اور ان سے بڑی دل چسپی لیتے تھے، ان کے لطائف وظرائف بڑے دل چسپ ہیں، مولانا مسعود علی صاحب طبعاً ظریف تھے، ان کا کوئی فقرہ ظرافت سے خالی نہ ہوتا تھا، گفتگو بڑی دل چسپ اور لچھے دار کرتے تھے اور زور بیان میں بڑے بڑے لوگوں کو ٹکنے نہ دیتے تھے، یہ دار المصنّفین کے شباب کا دور تھا، جب پورا نورتن جمع ہوتا تھا تو لطف وتفریح کا چمن کھل جاتا تھا، اب اس کی یاد حاصل زندگی ہے۔

معاصرین اور احباب: سید صاحب کے کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا، علم وادب، مذہب و سیاست، تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، ہر میدان میں ان کے کارنامے ہیں، اس لیے ان کے تعلقات کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا، ان کے ممتاز معاصرین میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے ان کے تعلقات نہ رہے ہوں، ان سب کا ذکر دشوار بھی ہے اور غیر ضروری بھی، اس لیے صرف ان ہی لوگوں کا تذکرہ کیا جائے گا جن سے زیادہ تعلقات تھے۔

علما واصحاب علم: علما میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا سجاد بہاری، مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور مولانا عبد الماجد بدایونی سے خاص تعلقات تھے، مولانا حسین احمد سے تو ایک زمانہ میں اتنی عقیدت رکھتے تھے کہ ان سے بیعت کا رجحان بھی ہو چلا تھا، مولانا بھی سید صاحب کی بڑی قدر کرتے تھے، جب ضلع اعظم گڑھ میں آنا ہوتا تو ان سے ملنے کے لیے دار المصنّفین تشریف لاتے، مولانا کفایت اللہ صاحب کے تفقہ، علم وفہم، متانت وسنجیدگی اور اصابت رائے، مولانا احمد سعید کی انتظامی

قابلیت،خوش بیانی اور مولانا سجاد بہاری کے اخلاص،سادگی اور جوش عمل کے مداح و معترف تھے،یہ بزرگ بھی سید صاحب کے علمی کمالات کے معترف تھے اور جمعیۃ کے کاموں میں ان کے علم ورہ نمائی سے فائدہ اٹھاتے تھے،اور وہ ایک زمانہ تک جمعیۃ العلما کے رکن رکین رہے،مولانا کفایت اللہ صاحب ایک دو مرتبہ دارالمصنّفین بھی تشریف لائے اور مولانا احمد سعید صاحب کا تو ایک مقدمہ کے سلسلہ میں وقفہ وقفہ سے کئی مہینہ دارالمصنّفین میں قیام رہا[۱]۔

مولانا کی گفتگو بڑی دل چسپ ہوتی تھی،اس لیے ان کے گرد رفقا کا مجمع لگا رہتا، ان کے بعض لطائف اب تک یاد ہیں،مقدمہ کی پیشی میں وہ ناشتہ کے بعد جاتے تھے تو شام کو واپسی ہوتی تھی،دن کو کھانے کا موقع نہ ملتا تھا،ایک دن فرمانے لگے کہ میاں اس سے تو اچھا ہے کہ نفل کا روزہ رکھ لیا کروں،کچھ ثواب ہی مل جائے گا۔

ایک مرتبہ کسی صاحب نے جن کا رجحان لیگ کی طرف تھا،اعتراض کیا کہ آپ لوگ موقع بے موقع بیانات کیوں دیتے رہتے ہیں،انہوں نے جواب دیا،میاں اس میں ہم لوگوں کا قصور نہیں،آپ کا ہے،آپ ان بیانات کی طرف توجہ ہی کیوں کرتے ہیں،ہم اپنا کام کرتے ہیں،آپ اپنا کام کرتے رہیے۔

آخری دور میں فرنگی محل کی مرکزیت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے دم سے قائم تھی،انہوں نے فرنگی محل کو علم کے ساتھ سیاست کا بھی مرکز بنا دیا تھا،ان کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہوگیا تھا مگر جب تک زندہ رہے قومی و سیاسی تحریکوں میں پیش پیش رہتے تھے اور ان کے زمانہ میں فرنگی محل اس دور کے لیڈروں کا مستقل مہمان خانہ تھا،قومی کاموں میں بے دریغ صرف کرتے تھے،سید صاحب سے ان کے تعلقات خوردانہ اور بزرگانہ تھے،اس کا اندازہ ان

---

[۱] یہ مقدمہ مبارک پور کی ایک تقریر کے سلسلہ میں قائم ہوا تھا اور اعظم گڑھ کی عدالت سے غالباً تین مہینہ کی سزا ہوئی تھی اور یہیں کی جیل میں رہے تھے۔

خطوط سے ہوسکتا ہے جو سید صاحب نے ان کو وفد خلافت کی کارگزاریوں کے سلسلہ میں لندن وغیرہ سے لکھے ہیں اور برید فرنگ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

مولانا عبدالماجد بدایونی اپنے دور کے مشہور عالم نامور خطیب اور تحریک خلافت کے لیڈروں میں تھے، وہ بدایوں کے پیرزادوں میں تھے، اس لیے ان کے اور سید صاحب کے عقائد میں اختلاف تھا، اس کے باوجود دونوں میں گہرے تعلقات تھے، سید صاحب ان کی شرافت اور مہر ومحبت کے بڑے مداح تھے۔

علمی دائرے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوبکر شیث جون پوری، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا ابوالکلام سے زیادہ تعلقات تھے، مولانا ابوالکلام سے تعلقات کی کئی نوعیتیں تھیں جس کی تفصیل آئندہ آئے گی، سید صاحب مولانا مناظر احسن گیلانی کی وسعت معلومات، ذہانت اور نکتہ آفرینی کے معترف تھے، فرماتے تھے کہ ان کی ذہانت ایسی ایسی جگہوں سے نکتے نکال لیتی ہے جہاں دوسروں کی نظر نہیں پہنچ سکتی، مگر یہ بھی فرماتے تھے کہ ان کا قلم ان کی ذہانت کا ساتھ نہیں دے پاتا اور ان کی تحریر وتقریر ذہانت کے سیلاب میں بہہ جاتی ہے، مولانا مناظر احسن دارالمصنّفین کے رکن بھی ہوگئے تھے، اس سلسلہ میں کئی بار آنا ہوا، ان کی گفتگو عالمانہ بھی ہوتی تھی اور دلچسپ بھی، جس سے ہر ذوق کا آدمی لطف اندوز ہوتا تھا، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کے منیجر صاحب نے فرمائش کی کہ مولانا تعطیل میں جب آپ وطن تشریف لاتے ہیں تو کبھی کبھی مدرسہ عزیزیہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا کیجیے اور یہاں کی تعلیم کا معائنہ فرما کر طلبہ اور اساتذہ کو ہدایات دیا کیجیے، ان کی فرمائش پر ایک مرتبہ میں نے دو چار دن قیام کر کے مدرسہ میں درس دیا، جس سے طلبہ بہت خوش اور مطمئن ہوئے، میری واپسی کے بعد منیجر صاحب نے اساتذہ سے کہا کہ آپ لوگ بھی مولانا کی طرح پڑھایا کیجیے، انہوں نے جواب دیا، مولانا ایک ہزار روپے تنخواہ پاتے ہیں، مرغ اور پراٹھے کھاتے

ہیں، ہم لوگوں کی تنخواہ اتنی ہے کہ مشکل سے دال روٹی چلتی ہے، اس لیے ہم میں وہ دماغی قوت کہاں سے آسکتی ہے، جو مولانا میں ہے، ان کی علمی گفتگو بھی لطائف سے خالی نہ ہوتی تھی، اس لیے جب وہ تشریف لاتے تھے تو ہم لوگوں کا مجمع ان کے گرد جمع رہتا تھا، مولانا کے دل میں سید صاحب کی جو عظمت تھی اس پر ان کے خطوط اور ارض القرآن اور سیرۃ النبیؐ جلد ششم پر ان کے مبسوط تبصرے اور سید صاحب کی وفات پر ان کے تاثرات جو شائع ہو چکے ہیں، شاہد ہیں۔

مولانا ابوبکر شیث سے علمی ذوق کے علاوہ مسلک کا بھی اشتراک تھا، اس لیے دونوں ایک دوسرے کے بڑے قدردان تھے، مولانا ابوبکر مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی نظامت کی تقرر میں سید صاحب کی کوشش کو بڑا دخل تھا، دونوں میں علی گڑھ میں ملاقات ہوتی رہتی تھی، مولانا ابوبکر کا وطن قریب ہی جون پور تھا، اس لیے وہ کبھی کبھی دارالمصنفین بھی تشریف لاتے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگر چہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے لیکن حدیث وفقہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اس لیے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔

بعض علما جو مولانا اشرف علیؒ کے متوسلین میں تھے، ان سے بیعت کے بعد تعلقات قائم ہوئے، ان میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوری، مفتی محمد حسن صاحب امرتسری کے نام قابل ذکر ہیں، مولانا عبدالغنی صاحب کا وطن ضلع اعظم گڑھ میں تھا، اس لیے وہ اکثر تشریف لاتے تھے، مولانا اشرف علیؒ کے متوسلین میں ڈاکٹر عبدالحئی صاحب اور خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری سے بھی خصوصی تعلقات تھے، یہ سب مولانا تھانوی کے خلفا میں ہیں، پاکستان جانے کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سے بھی بڑے تعلقات ہو گئے تھے، سید صاحب کو پاکستان بلانے میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو بھی دخل تھا اور وہ سید صاحب کو وہاں کے

معاملات میں پیش پیش رکھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام تو سید صاحب کے خواجہ تاش اور طالب علمی کے زمانہ کے بے تکلف دوستوں میں تھے، دونوں نے ایک ہی زمانہ میں مولانا شبلی سے تصنیفی تربیت حاصل کی تھی، دونوں کا آغاز ایک ساتھ ہوا، پھر کچھ دنوں تک الہلال میں اور ایک عرصہ تک سیاسی میدان میں دونوں کا ساتھ رہا، اس لیے عمر بھر دونوں کے تعلقات قائم رہے، لیکن کچھ لوگوں نے ان کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا اور عجیب عجیب بحثیں پیدا کیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل حقیقت واضح کر دی جائے، اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں، اور ان کے تعلقات کے متعلق کوئی زبانی شہادت نہیں ہے، صرف ان کی تحریروں اور خطوط سے اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے، جو سب سے بڑی شہادت ہے، مولانا ابوالکلام نے سید صاحب کو جو خطوط لکھے ہیں وہ حسن اتفاق سے محفوظ رہ گئے ہیں اور معارف میں شائع ہو چکے ہیں، افسوس ہے کہ سید صاحب نے مولانا کو جو خطوط لکھے وہ محفوظ نہیں رہے لیکن اپنی تحریروں میں ان کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ محفوظ ہیں، یہ خطوط اور تحریریں دونوں کے تعلقات کی خوش گواری کے ثبوت کے لیے بالکل کافی ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی کتنی وقعت تھی، تمام خطوط کا نقل کرنا تو دشوار ہے، صرف چند خطوط کے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں، افسوس ہے کہ بیش تر خطوط پر تاریخ اور سنہ درج نہیں ہے، بعض میں تاریخ ہے مگر سنہ نہیں ہے، ورنہ زمانہ کا بھی تعین ہو جاتا، مگر اس سے اصل مقصد پر اثر نہیں پڑتا، یوں تو ۱۹۱۳ء کے بھی بعض خطوط ہیں لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، اصل خط و کتابت کا سلسلہ دارالمصنّفین کے قیام سے کچھ پہلے سے شروع ہوتا ہے، اس زمانہ سے لے کر ۱۹۳۶ء تک کے اکثر خطوط محفوظ ہیں۔

۱۹۱۳ء کے آخر میں جب سید صاحب پونہ کالج میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرار ہوئے تو مولانا ابوالکلام نے اس کو ان کے علمی رتبہ سے فروتر سمجھا اور لکھا:

''آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کر لی، حالاں کہ خدا نے آپ کو درس وتعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لیے بنایا ہے، خدا کے لیے میری سنیے اور مجھے اپنا مخلص بھائی تصور کیجیے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں، میں خود غرض لے ہوں اور میری غرض میری خواہش میں اصلی عنصر ہے، تاہم میری خود غرضی آپ کے لیے مضر نہیں، بلکہ بہتر ہے، کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی وعربی سکھا دی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھا سکتے ہیں۔''

اسی زمانہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اخی الاعز الاجل انعم اللہ علی بلقائکم السلام علیکم

ولا نامہ پہنچا، مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ پونہ سے چلے نہ گئے ہوں، یہ آپ نے کیوں کر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں غالباً تواتر وتسلسل مراسلات علائق قلبیہ کے لیے شرط نہیں ہیں، آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحاد مشرب وفکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا:

اریـد لانسی ذکر ھا فکا نما　　　تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

(میں محبوب کی یاد بھلانا چاہتا ہوں مگر ہر سمت سے لیلیٰ نمودار ہو جاتی ہے۔)

۱۹۱۵ء کے ایک خط میں جب دارالمصنفین قائم ہو گیا تھا، سید صاحب پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے تھے، لکھتے ہیں:

عجبت لمن یقول ذکرت الفی　　　وھل انسی فا ذکر من ھویت

(مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے جو کہتا ہے کہ تم نے اپنے محبوب کا یاد کیا، کیا جس سے میں محبت کرتا ہوں اس کو میں بھول گیا ہوں کہ اس کو یاد کروں۔)

لے غالباً خود غرضی سے اس کی طرف اشارہ ہے کہ سید صاحب الہلال کو چھوڑ کر پونہ گئے تھے، اور مولانا ان کو الہلال میں رکھنا چاہتے تھے، یا دوبارہ بلانا چاہتے تھے۔

صدیقی العزیز الاجل

کل صبح سویرے سفر سے واپس آیا اور خط پڑھا، یہ پہلے آپ نے شکایت اس لیے تو نہیں کر دی تا کہ میرے لیے شکایت کا موقع نہ رہے:

بیـنـی و بینك فی المحبة نسبة　　مســتـورة مـن اهل هذا العالم

نحن اللذان ترافقت ارواحنا　　من قبل خلق الله طینة و آدم

(میرے اور تمہارے درمیان میں محبت کی ایسی نسبت ہے جو اس عالم کے رہنے والوں کی آنکھ سے مستور ہے، ہم دونوں کی روحیں اس وقت سے ایک دوسرے کی رفیق ہیں جب اللہ نے آدم کا خمیر بھی پیدا نہیں کیا تھا۔)

خط سے غالباً مقصود وہ خط ہوگا جو آپ نے بھوپال سے لکھا تھا، اس کے جواب میں ایک نہایت مفصل خط جس میں متعدد ضروری امور تھے، اعظم گڑھ کے پتہ سے لکھا اور آج تک اس کے جواب کے لیے ترستا ہوں، اب آپ نے خط لکھا تو جواب کی جگہ الٹی شکایتیں ہیں۔

بہر حال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق و ہم عنان یقین کیجیے، اور ہر دم خدمت گزاری کے لیے تیار، افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی، کاش اللہ یکجائی کا سامان کرتا......۔

دار المصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوہ کا حقیقی بدل بلکہ نعم البدل، اصلی کام وہی ہے، باقی سب کے سب فروعی ہیں، آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ آدمی پیدا ہوں۔

میں اواخر جنوری میں پھر نکلوں گا اور کوشش کروں گا کہ فاتحہ کے لیے (یعنی مولانا شبلی کے مزار پر) اعظم گڑھ حاضر ہوں، بصورت دیگر آپ کو اطلاع دوں گا کہ نسبۃً کسی قریب تر مقام پر ملاقات ہو سکے۔"

سید صاحب نے دار المصنفین کے قواعد بھیجے اور اس کی آنریری فیلوشپ کی پیش کش کی، اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنّفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کرلوں گا بشرطے کہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص۔''

ایک دوسرے خط میں دارالمصنّفین ہی کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتے ہیں:

''آپ نے دارالمصنّفین کی موجودہ مالی حالت کا ذکر کیا، نہایت درجہ خوشی ہوئی، یہ سب آپ کے قیام و سعی کا نتیجہ ہے، بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بار آور ہوئیں لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں[1]، اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہوجائے گا، کوئی ایسا انتظام کیجیے کہ ''سہ ماہ بخور و نہ ماہ پارسا باش'' کی اسکیم پر عمل درآمد ہو سکے، مستقل قیام وہاں رکھیے، عارضی ہر جگہ۔''

ایک طویل خط کے آخر میں جو ترجمان القرآن کے متعلق بعض علمی مشوروں پر مشتمل ہے، لکھتے ہیں:

''اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے صحیح سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں:

قضاها لغیری و ابتلانی بحبها

(محبوب کو دوسرے شخص سے متعلق کر کے مجھے اس کی محبت میں مبتلا کر دیا۔)

دارالمصنّفین کے لیے بہت ضروری ہے کہ اسے حقیقت اور اصلیت کا نمونہ بنایا جائے اور اس کے دائرہ کو اتنا وسیع کیا جائے کہ ہر اڈیٹر، اہل قلم اور ہر مضمون نگار مصنف ہو ورنہ سب کچھ بے سود ہے، وہ وقت ابھی سے پیدا کرنا چاہیے کہ اس کا نام سند اور سارٹیفکٹ کا کام دے۔''

ایک خط میں معارف کے متعلق لکھتے ہیں:

''معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، یہی تو ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے،

---

[1] غالباً ابتدا میں سید صاحب نے اس قسم کا خیال ظاہر کیا ہوگا۔

بحمد للہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو صرف خدمت علم و تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے۔"

مولانا کو اندیشہ تھا کہ ان کی گرفتاری عمل میں آنے والی ہے، اس زمانہ میں البلاغ نکل رہا تھا، اس لیے اس کو چلانے کے لیے ان کی نگاہ سید صاحب کی طرف اٹھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نہیں چاہتا کہ آپ اسی وقت اپنے کاموں میں کوئی تبدیلی کریں، اگر اس کا آپ بذریعہ تحریر وعدہ کریں کہ جب وقت آئے گا تو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ صرف ایک کام کے ہو رہیں گے تو میں بڑی ہی تسکین پاؤں اور اطمینان کے ساتھ آنے والی حالت کو قبول کرلوں، وہ تسکین جو بدبختی سے اور کسی کے پاس نہیں۔

آپ مجھ سے بلا تاخیر بذریعہ تحریر وعدہ کریں کہ اگر میری نسبت آپ کو کوئی نئی خبر ملے تو آپ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ آپ فوراً کلکتہ آئیں اور البلاغ کو جو نکل چکا ہے (اور ما شاء اللہ محفوظ ہے) اپنی ایڈیٹری میں لے لیں، ایک خالص دینی و اصلاحی رسالے کی شکل میں مع اس کے خصائص کے اس کو جاری رکھیں، کسی پر خطر راہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، نہ جنگ پر رائے زنی کی ضرورت ہے، صرف قرآن و سنت کے معارف ودعوۃ کو باندازو اصول البلاغ مخصوص جاری رکھنا چاہیے اور جب تک اس طرح کیا جائے گا اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

یہاں تمام لوگ آپ کے استقبال کے لیے منتظر ملیں گے اور وہ آپ کا ساتھ دیں گے جس طرح میرا دے رہے ہیں اور اسی طرح حکم مانیں اور ماتحت رہیں گے جیسے میرے رہتے ہیں۔"

بعض خطوط میں بے تکلفانہ شوخی بھی ہے، غالباً رانچی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا نے سید صاحب کو کسی مذہبی جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں سید صاحب کی (آخری) شادی ہونے والی تھی، انہوں نے شرکت کا وعدہ تو کرلیا لیکن شادی کی تاریخوں کا بھی ذکر کردیا، اس کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں:

''آپ نے شرکت کی امید تو دلائی لیکن ''فیہ دخن صرف اتنا ہی کافی نہیں، آپ کو ۲۴ر تک ضرور تشریف لانا چاہیے، کوئی عذر مسموع نہ ہوگا، مسئلہ تزویج کی اہمیت سے کسی فرد و بشر کو انکار ہوسکتا ہے لیکن تاریخوں کا ردو بدل تو آپ کے اختیار میں ہے، یا تو پہلے فراغت ہو جائے اور جلسہ میں تقریر کریں تو قلب و دماغ بالکل مطمئن اور فارغ ہوں، یا پھر رانچی سے واپسی پر رکھیے کہ یہاں کا قیام آتش شوق کے تیز تر ہونے میں بسر ہوگا ''کلا وعدالله الحسنى '' آپ حضرت ام حبیبہؓ کی نکاح والی سنت پر کیوں نہ عمل کریں۔''

ایک خط میں جو شادی کے بعد کا ہے، لکھتے ہیں:

''صدیقی العزیز

آپ کا خط ننزل الغيث من بعد ماقنطوا کا مصداق تھا:

اذا كبتكم لم تدن منى تشو قا ‌ ‌ ‌ ‌ بعثت لكم كبتى بشوتى اليكموا

جب بہت عرصہ گزر گیا تو مولوی ابوالحسنات کو لکھا معلوم ہوا وطن میں ہیں اور ''هــلا بكرا تلاعبها و تلاعبك'' کی تعمیل میں مشغول، اس مشغولیت میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔''

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''صدیقی العزیز

چند دنوں کے لیے کلکتہ چلا گیا تھا، وہاں سے واپس آیا تو لکھنؤ جانا پڑا، اب مہلت ملی تو سب سے پہلے آپ کے خط پر نظر پڑی، سحری کا وقت ہے، چائے کا دور چل رہا ہے اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں، آپ بھولے نہ ہوں گے کہ رمضان میں یہی دور میرے لیے جام صبوحی کا بھی کام دیتا ہے اور سفرۂ افطار کا بھی:

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند ‌ ‌ ‌ ‌ جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

آپ نے ترجمان القرآن جلد دوم کی اشاعت کے لیے جو آمادگی ظاہر کی ہے، یقین کیجیے اس سے میرا دل نہایت درجہ متاثر ہوا، یہ محبت و اخلاص کا بڑے سے بڑا ثبوت ہے جس کا میں آپ سے متوقع

ہوسکتا تھا، فعلاً یہ بات ظہور میں آسکے یا نہ آسکے لیکن میرے دل پر آپ کی محبت کا نقش ثبت ہوگیا۔"

بعض خطوط میں مولانا عبدالسلام صاحب کی طرف بڑے لطیف اشارے ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالسلام نے بالآخر اپنے سوانح حیات بیان ہی کردیے، جو بڑے ہی دل چسپ ہیں، کاش آپ سنتے[1]۔"

یہ اقتباسات نہ صرف دونوں کے تعلقات کی خوش گواری بلکہ یگانگت ومحبت کی ناقابل تردید شہادت ہیں، ان خطوط میں بہت سے مفید علمی معلومات ہیں لیکن ان کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں تھی، افسوس ہے کہ سید صاحب نے مولانا ابوالکلام کو جو خطوط لکھے وہ محفوظ نہیں رہ گئے، ورنہ یہ معلوم ہوجاتا کہ سید صاحب کی طرف سے ان کا کیا جواب ملا، مگر جو خطوط سید صاحب کے خطوط کے جواب میں ہیں ان سے کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔

سید صاحب مولانا ابوالکلام کی ذہانت، طباعی اور علم و وسعت نظر کے پورے معترف تھے، راقم نے بارہا ان کی زبان سے اس کا اعتراف سنا ہے، ایک واقعہ اب تک یاد ہے، فرماتے تھے کہ الندوہ کی سب ایڈیٹری کے زمانہ میں ایک مرتبہ مولانا شبلی نے مجھ کو امام بخاری پر مضمون لکھنے کا حکم دیا، میں بڑی محنت سے لکھ کر لے گیا مگر مولانا کو پسند نہیں آیا، اسی درمیان میں مولانا ابوالکلام آگئے، مولانا نے ان کو ہدایت فرمائی، انہوں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی، میرا مضمون لے کر اس کو ایک نظر دیکھ لیا اور دوسرے دن مضمون لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کردیا مولانا نے پسند کیا اور فرمایا "اسے مضمون کہتے ہیں۔"

مولانا ابوالکلام ترجمان القرآن کی تالیف کے زمانہ میں اس کے مباحث و مشکلات میں برابر سید صاحب سے مشورہ کرتے رہتے تھے، جس کا ذکر ان کے خطوط میں ہے،

---

[1] یہ خط غالباً الہلال کے دور کا ہے، مولانا عبدالسلام بھی اس کے اسٹاف میں تھے، اس اشارہ کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو مولانا کے ذوق سے واقف ہیں، بعض اور خطوط میں بھی ان کا ذکر ہے۔

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سید صاحب اس کو دارالمصنّفین سے شائع کرنا چاہتے تھے، مگر اس کی نوبت غالباً اس لیے نہ آسکی کہ وہ مکمل نہ ہوسکی تھی، اس کے برسوں کے بعد ۱۹۳۲ء میں جب اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تو مولانا نے سید صاحب کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیجی، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کیا آپ نے معارف میں کچھ لکھا، میری نظر سے نہیں گزرا، ممکن ہو تو بھجوا دیجیے۔''

سید صاحب نے بڑا مفصل تبصرہ لکھا اور کھل کر مولانا کی قرآنی خدمات اور تفسیر کی داد دی، یہ تبصرہ بڑا طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال والبلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب، بلاغت، کمال انشاپردازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا، اس نے ان پر تفسیر وتعبیر کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن کے معانی ومطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا، ضرورت تھی کہ اسی موثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہوتا کہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لیے نور بینش اور بصیرت کا سروسامان اردو میں میسر آئے۔

مصنف ترجمان کی یہ دیدوری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور فتنہ افرنگ کے عہد میں اس طرز وروش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنہ تاتار میں اختیار کیا تھا اور جس طرح انہوں نے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفہ یونان کی دماغی غلامی کو قرار دیا تھا، اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفہ یونان وفرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلام الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح میں اور فطرت کی عقل وفلسفہ سے سمجھنا چاہیے۔

پیش نظر کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، حصہ اول مصنف کی تفسیر البیان میں سے سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے، اور حصہ دوم میں سورہ فاتحہ سے لے کر انعام تک کا تفسیری ترجمہ ہے، مصنف کی

دیدہ وری اور نکتہ آفرینی کا اصلی جولان گاہ پہلا حصہ ہے، یہ درحقیقت نصف کتاب ہے، اس میں سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دل نشین اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سے اس سورہ کے ام الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا فیصلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے، خصوصاً کلام مجید کے طرز استدلال اور خالق کائنات کی رحمت وربوبیت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے اور امام غزالی نے ''الحکمۃ فی مخلوقات اللہ'' میں اور ابن قیم نے ''مفتاح دارالسعادۃ'' میں اس بحث پر جو کچھ لکھا ہے، اس سے زیادہ بسط وتشریح اور مقتضیات زمانہ کی مطابقت سے ترجمان القرآن میں یہ بحث آ گئی ہے، چنانچہ توحید، دلائل توحید، تخلیق بالحق، الہدی اور الدین کے مصنف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں وہ اگر ایک طرف نکتہ پرور ہیں تو دوسری طرف ایمان افروز۔

ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے، ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے، نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے اور مولانا سے بھی عرض ہے کہ وہ اس ضروری تالیف کی تکمیل کو اپنی عمر کا اہم کارنامہ سمجھیں اور دوسرے کاموں سے وقت بچا کر سب سے پہلے اس کام کو انجام تک پہنچائیں۔''

(معارف، اکتوبر ۳۲ء)

ایک معاصر کے قلم سے مولانا کے علم و کمال کا اس سے بڑھ کر اعتراف اور کیا ہو سکتا ہے لیکن دونوں نہ صرف معاصر بلکہ نوجوانی کے زمانہ کے بے تکلف دوست تھے، اس لیے کبھی کبھی لطیف چشمک بھی ہو جایا کرتی تھی لیکن اس کی حیثیت دوستانہ بے تکلفی سے زیادہ نہ تھی، جس سے مشکل ہی سے کوئی معاصر مستثنیٰ نکل سکتا ہے، جس کو یار لوگوں نے ایک داستان بنا دیا ہے، اس موقع پر ایک واقعہ نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، دینی و سیاسی ذوق دونوں میں تھا لیکن مولانا ابوالکلام میں سیاست غالب تھی اور سید صاحب پر دین کا غلبہ تھا، ایک زمانہ میں سید صاحب کھدر کی شیروانی اور اسی کی کشتی نما ٹوپی استعمال کرتے تھے

اور اوپر سے عمامہ باندھتے تھے، ایک مرتبہ کسی جلسہ میں سید صاحب نے عمامہ اتارا تو اس کے نیچے کھدر کی ٹوپی تھی، مولانا ابوالکلام نے فرمایا، اچھا، آپ بھی قومی نشان (یعنی گاندھی کیپ) سر پر رکھتے ہیں، سید صاحب نے برجستہ جواب دیا لیکن مذہب (یعنی صافہ) سے نیچے، اس قسم کے بعض اور لطائف بھی ہیں۔

غیر مسلم احباب: علمی سلسلہ میں بعض غیر مسلم فضلا سے بھی تعلقات تھے، ان میں ڈاکٹر تارا چند سے زیادہ تعلقات تھے، ڈاکٹر تاراچند عرصہ تک ہندوستانی اکیڈمی کے سکریٹری رہے، سید صاحب اس کے اہم رکن تھے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اس لیے دونوں میں برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے، دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ اور پنڈت کشن پرشاد کول سے بھی رسم وراہ تھی، مستشرقین میں ڈاکٹر براؤن سے خط وکتابت رہتی تھی، پروفیسر براؤن سے لندن میں ملاقات بھی ہوئی تھی، سید صاحب کے نام ان کے عربی کے ایک دو خط محفوظ ہیں، مشہور نومسلم انگریز اور مترجم قرآن مارماڈیوک پکھتال سے بھی علمی تعلقات تھے۔

بزرگ معاصرین: دوسرا طبقہ ان بزرگوں کا تھا جو مولانا شبلی کے معاصر اور ان کے دوستوں میں تھے اور ندوہ کے کاموں میں ان کے شریک وسہیم رہے، پھر دارالمصنفین کے قیام کے بعد ان سے بھی ان کا تعلق قائم ہوا، ان کے اور سید صاحب کے تعلقات خوردانہ اور بزرگانہ تھے، ان میں حسب ذیل بزرگ ہیں:

مولانا حمید الدین فراہی، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، نواب سید علی حسن خاں، مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب، پروفیسر عبدالقادر صاحب، ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی، جسٹس کرامت حسین اور جناب اکبر الہ آبادی۔

مولانا حمید الدین صاحب مشہور مفسر قرآن، مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی اور

دارالمصنفین کے ابتدائی دور کے سرپرستوں میں تھے،اس کے قیام میں انہوں نے بڑی مدد کی تھی،اس کے صدر بھی تھے،نواب عماد الملک ہندوستان کے نامور فاضل مولانا شبلی کے دوستوں میں تھے،ان کو ندوہ سے بھی دلچسپی تھی،دارالمصنفین کے قیام کے بعد اس سے بھی تعلق قائم رہا،اس کے صدر بھی تھے،مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مولانا شبلی کے خاص دوستوں میں تھے،ندوہ کے کاموں میں ان کے شریک وسہیم رہے،قیام دارالمصنفین کے بعد اس کے رکن،پھر صدر ہوئے،اورکئی مرتبہ یہاں آنے کی زحمت گوارا کی،نواب علی حسن خاں بھی ندوہ کے پرانے رکن رکین تھے،اس کے ناظم بھی ہو گئے تھے،دارالمصنفین کے قیام کے بعد اس کے رکن منتخب ہوئے ایک مرتبہ دارالمصنفین بھی تشریف لائے تھے، ان کی زندگی میں جب سید صاحب لکھنؤ جاتے تھے تو ان ہی کے یہاں قیام فرماتے تھے، مولانا سید عبدالحئی صاحب بھی ندوہ کے پرانے خدمت گزار تھے،اس کے نائب ناظم پھر ناظم ہوئے،سید صاحب نے ان سے کچھ پڑھا بھی تھا،اس لیے دونوں ایک دوسرے کو بہت مانتے تھے،ان کے صاحب زادے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب بھی ندوہ کے ناظم ہوئے،وہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے،دونوں کو ایک دوسرے سے بڑا تعلق تھا،پروفیسر عبدالقادر صاحب مولانا شبلی کے دوستوں میں تھے،پونہ کالج میں عربی وفارسی کے پروفیسر تھے،ان ہی نے سید صاحب کو پونہ کالج میں رکھایا تھا،اس لیے ان سے سید صاحب کے خصوصی تعلقات تھے اور دارالمصنفین کے قیام کے بعد ان کو اس کا رکن بنایا تھا، ایک مرتبہ وہ دارالمصنفین بھی تشریف لائے تھے،جسٹس سید کرامت حسین مولانا شبلی کے معاصر اور اپنے دور کے مشہور فلسفی اور نامور اہل علم تھے،اس لیے دارالمصنفین کے بھی بڑے قدردان تھے،اس کے ابتدائی دور میں اس کی مجلس انتظامیہ کے نائب صدر رہے تھے، اور اپنے علمی مشوروں سے اس کی رہنمائی کرتے رہتے تھے،جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، مشہور صاحب طرز ادیب ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی مولانا شبلی کے دوستوں میں

تھے، ان کی یادگار دارالمصنفین کے قیام کے بعد اس سے بھی ان کا تعلق قائم رہا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے اور اپنے علمی و ادبی مشوروں سے نوازتے رہتے تھے، ان کی تحریریں بھی کبھی کبھی معارف میں چھپتی تھیں، سید اکبر حسین الہ آبادی بھی مولانا شبلی کے دوستوں میں تھے، اس لیے دارالمصنفین کے بھی قدردان تھے اور سید صاحب سے ان کو خاص تعلق تھا، دونوں میں برابر خط و کتابت رہتی تھی، سید صاحب ان کا بڑا احترام کرتے تھے، جب الہ آباد جانا ہوتا تو ان کی زیارت ضرور کرتے، سید صاحب جب وفد خلافت میں لندن گئے تھے تو اکبر نے ان کی شان میں یہ قطعہ کہا تھا:

سلیمان کی بات کیسی بنی — کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بے شک کھنچے — مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں — خدا غیر سے ان کو کردے غنی

وفد خلافت کے جب لندن سے پیرس جانے کی خبر آئی تو یہ شعر کہا تھا:

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پر
مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر

جدید تعلیم یافتہ معاصر اہل علم میں سر اقبال سے خصوصی تعلقات تھے، دونوں ایک دوسرے کے کمالات کے بڑے قائل تھے، اقبال سید صاحب کو علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد کہتے تھے، اور جب اسلامی مسائل کے مطالعہ میں ان کو معلومات کی ضرورت ہوتی یا جو مشکلات پیش آتیں ان میں سید صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے، جس کی تفصیل سید صاحب کے نام ان کے خطوط میں موجود ہے، یہ خطوط چھپ چکے ہیں، افسوس ہے کہ اقبال کے نام سید صاحب کے خطوط محفوظ نہیں رہے، ورنہ علمی معلومات کا ایک خزانہ ہوتا۔

سید صاحب اقبال کے علمی کمال، دینی جذبۂ ایمانی کیفیت اور مفکرانہ عظمت کے بڑے معترف تھے، فرماتے تھے کہ مسلمانوں میں اتنا بڑا مفکر صدیوں کے بعد پیدا ہوا، سفر

افغانستان میں اقبال کی رفاقت کے بعد ان کا تاثر اور بڑھ گیا تھا، پنجاب کے علما اور اہل علم میں مولانا داؤد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری سے بھی تعلقات تھے۔

ملکی وسیاسی رہنما: قومی وملکی اور سیاسی تحریکوں میں ہندوستان کے بہت سے لیڈروں کا ساتھ رہا تھا، اس لیے مولانا محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، حسرت موہانی، شعیب قریشی، پنڈت موتی لال، جواہر لال وغیرہ سب سے ان کے تعلقات تھے، اور ان میں مولانا محمد علی اور شوکت علی کا زیادہ ساتھ رہا، اس لیے ان دونوں سے خصوصاً بہت گہرا لگاؤ تھا، دونوں ایک دوسرے کے بڑے قدرداں تھے، مولانا محمد علی کو سید صاحب سے بڑی جذباتی عقیدت تھی، جس پر ان کے خطوط اور تحریریں شاہد ہیں، سید صاحب ان سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کی ذہانت، قابلیت، اخلاص اور دینی جذبہ کے بڑے مداح و معترف تھے، جیل تک میں ان سے ملنے جاتے تھے، ان دونوں کے تعلقات کی تفصیل طویل ہے، حسرت موہانی سے طالب علمی کے زمانہ سے تعلقات تھے، سید صاحب ان کی جرأت، بے باکی، ایثار وقربانی اور قلندرانہ شان کے بہت قائل تھے، ان کا ایک واقعہ اب تک یاد ہے، ایک مرتبہ دارالمصنفین آئے ہوئے تھے، اس زمانہ میں ان پر کمیونزم کا اثر تھا، کہنے لگے اسلام اور کمیونزم بہت قریب ہیں، چنانچہ سویٹ سوِیّت (مساوات) سے اور کامریڈ اخوت سے ماخوذ ہے، شعیب قریشی کا بعض وفود میں ساتھ رہ چکا تھا، پھر بھوپال کے زمانہ قیام میں زیادہ تعلقات ہو گئے تھے، شعیب صاحب اس زمانہ میں بھوپال میں وزیر تعلیم تھے، سید صاحب کو بھوپال بلانے میں ان کو بڑا دخل تھا۔

پنڈت موتی لال اور جواہر لال جب مشرقی اضلاع کے دورے پر آتے تھے تو دارالمصنفین میں ٹھہرتے تھے اور یہیں سے دورہ کرتے تھے، ان دونوں کے تعلقات مولانا مسعود علی سے زیادہ تھے، پنڈت جواہر لال اپنے بزرگوں کی طرح سید صاحب کا ادب

کرتے تھے، انہوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں ان تعلقات کا بڑا لحاظ رکھا، قیام پاکستان کے بعد جب دارالمصنّفین کی مالی حالت خراب ہوئی تو مولانا ابوالکلام کی تحریک سے پنڈت جی نے ساٹھ ہزار کی ایک مشت امداد دی تھی اور مستقل امداد مقرر کرنے کے لیے بھی تیار تھے، مگر مولانا مسعود علی صاحب نے اس کو منظور نہیں کیا، اسی امداد پر ٹنڈن جی نے پارلیمنٹ میں اعتراض کیا تھا تو مولانا ابوالکلام نے اس کا بڑا پرزور اور مدلل جواب دیا تھا، جو ان کی بہترین تقریروں میں شمار کیا جاتا ہے، جب بھی دارالمصنّفین کو کوئی ضرورت پیش آتی تھی تو پنڈت جی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔

ان دونوں باپ بیٹوں کے بعض لطائف قابل ذکر ہیں:

ایک مرتبہ پنڈت موتی لال کسی دورہ کے سلسلہ میں اعظم گڑھ آنے والے تھے، اتفاق سے پنڈت مدن موہن مالویہ بھی کسی تقریب میں آنے والے تھے، پنڈت موتی لال ان کو اپنی کار پر ساتھ لیتے آئے اور حسب معمول سیدھے دارالمصنّفین آئے، مالوی جی کسی دوسری جگہ ٹھہرنے والے تھے، مگر ابھی اپنی قیام گاہ پر نہیں گئے تھے کہ چائے اور ناشتہ آ گیا، ان سے بھی شرکت کی درخواست کی گئی، انہوں نے معذرت کی، لوگوں نے اصرار کیا، مگر وہ برابر معذرت کرتے رہے، اس اصرار و انکار پر پنڈت موتی لال نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں جس جگہ دن میں پانچ مرتبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا جاتا ہو وہاں پنڈت جی کھا پی سکتے ہیں، اس پر مالوی جی اور بھی خفیف ہوئے اور یہ یاد نہیں کہ انہوں نے کس طرح اس مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اسی طرح ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال دورے پر آنے والے تھے اور ان کے قیام وطعام کا انتظام حسب معمول دارالمصنّفین میں تھا، کانگریس کے کسی نیتا نے کہہ دیا تھا کہ پنڈت جواہر لال نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد سے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، اس لیے ترکاریوں کا خاص طور سے انتظام کیا گیا تھا، دوسرے لوگوں کے لیے گوشت اور کباب

وغیرہ تھے، دسترخوان لگنے کے بعد مولانا مسعود علی صاحب نے پنڈت جی سے کہا کہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، اس لیے آپ کے لیے ترکاری کا انتظام زیادہ کیا گیا ہے، یہ سن کر پنڈت جی نے بے ساختہ کہا کہ کم بختوں نے یہی کہہ کہہ کے کئی وقت سے مجھے بھوکا رکھا ہے، آج جی بھر کر کھاؤں گا اور ترکاری ہٹا کر صرف گوشت کھایا، اس قسم کے اور بھی بہت سے لطائف ہیں۔

اس زمانہ میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا لیڈر ایسا ہو جو دارالمصنفین نہ آیا ہو، گاندھی جی دو مرتبہ آئے، قیام تو ان کا دوسری جگہ تھا لیکن دونوں مرتبہ دارالمصنفین آئے تھے۔

اس موقع پر مسز سروجنی نائیڈو کا ایک واقعہ یاد آ گیا، وہ اقبال سہیل مرحوم کی طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ علی گڑھ گئی تھیں، یہ دونوں کے شباب کا زمانہ تھا، مولانا سہیل نے ان کے خیر مقدم میں ایک بڑی شاعرانہ نظم کہی تھی، جس کے دو شعر یہ ہیں:

کنوں بہ چشم روشنی چو جلوہ زد سروجنی   فلک بہ سطح سوسنی بساط ماہتاب زد
تبسمش تکلمش ترنمش   سزد اگر تلاطمے بہ جان شیخ و شاب زد

یہ پوری نظم بڑی شاعرانہ ہے، سروجنی نائیڈو جب دارالمصنفین آئیں تو اقبال صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے، ان کو بتایا گیا کہ ان ہی صاحب نے علی گڑھ کالج میں آپ کی شان میں نظم کہی تھی، سروجنی نائیڈو کو یہ واقعہ یاد تھا، اور یہ نظم ان کو بہت پسند تھی، اس لیے اقبال صاحب کی زبان سے پھر سنی اور بہت محظوظ ہوئیں۔

احباب خاص: سید صاحب کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا لیکن احباب خاص صرف چند تھے، مولانا ضیاء الحسن علوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا فضل الرحمٰن کیرانوی، یہ سب طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی تھے، بعض نے بعد میں ان سے پڑھا بھی تھا، ان میں مولانا عبدالماجد صاحب، مولانا عبدالباری صاحب اور مسعود علی صاحب کا عمر بھر ساتھ رہا۔

مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی اور تعلیم میں ان سے ایک درجہ آگے تھے، دونوں ندوہ کے ممتاز طالب علم اور مولانا شبلی کے ارشد تلامذہ میں اوران سے استفادہ میں برابر کے شریک تھے، مولانا ان دونوں کو بہت مانتے تھے، تعلیم کے بعد دونوں کی راہیں جدا ہوگئیں، مولانا ضیاء الحسن نے ندوہ سے فراغت کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی اور صوبہ متحدہ کے عربی وفارسی امتحانات کے رجسٹرار اور مدارس عربیہ کے انسپکٹر ہوگئے، مگر دونوں کے تعلقات برابر قائم رہے، انہوں نے سید صاحب کو اکزامینیشن کمیٹی کا ممبر بنایا تھا، سید صاحب اس کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور ضیاء الحسن صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے، ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ ضیاء الحسن صاحب ہی تنہا شخص تھے جو سید صاحب کی شہرت شباب کے زمانہ میں بھی ان کو سلیمان کہتے تھے اور تم سے خطاب کرتے تھے، سید صاحب ان کی اس بے تکلفی سے خوش ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ کوئی تو ایسا شخص ہے جو مجھ کو سلیمان کہتا ہے اور تم سے خطاب کرتا ہے، افسوس ہے کہ انہوں نے ملازمت ہی کے زمانہ میں ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔

مولانا عبدالماجد صاحب اور سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ قریب قریب ایک تھا، مولانا عبدالماجد صاحب کیننگ کالج میں پڑھتے تھے اور سید صاحب ندوہ سے قریب ہی زمانہ میں فارغ ہوئے تھے، دونوں کا ذوق علمی تھا اوران کی ان کی علمی زندگی ساتھ ساتھ شروع ہوئی تھی، مولانا عبدالماجد صاحب مولانا شبلیؒ کے شاگرد تو نہ تھے لیکن ان کی صحبت میں شریک ہوتے تھے اوران سے استفادہ کرتے تھے، سیرۃ النبویؐ میں بھی کچھ دنوں کام کیا تھا، اس حیثیت سے بھی دونوں خواجہ تاش تھے اور بھی مختلف حیثیتوں سے ان کو بڑی قربت اور یگانگت تھی، اس لیے قیام دارالمصنّفین کے بعد سید صاحب نے ان کو مجلس انتظامیہ کارکن بنایا اور وہ دارالمصنّفین کے ہر مرحلہ میں ساتھ رہے اور یہ تعلق اب تک قائم ہے، اب تو وہ مجلس عاملہ کے صدر ہیں اور دارالمصنّفین کے پرانے ارکان میں تنہا وہی رہ گئے ہیں، اس

مختصر تذکرہ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں، ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ ان کے نام سید صاحب کے خطوط سے ہوسکتا ہے جو مکتوبات سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔

مولانا عبدالباری صاحب طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی بھی تھے اور شاگرد بھی، انہوں نے بھی مولانا شبلی کی صحبت سے استفادہ کیا تھا اور طالب علمی ہی کے زمانہ سے علمی ذوق رکھتے تھے، اس لیے قیام دارالمصنّفین کے بعد ان کو بھی دارالمصنّفین میں بلالیا تھا لیکن ان کا قیام صرف دو سال تک رہا تھا کہ جامعہ عثمانیہ میں جو اس زمانہ میں نئی نئی قائم ہوئی تھی، فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوگئے، مگر مجلس انتظامیہ کے رکن کی حیثیت سے دارالمصنّفین سے ان کا تعلق عرصہ تک قائم رہا، وہ اس کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے، ندوہ کے معاملات میں بھی دونوں کا ساتھ رہتا تھا، سید صاحب جب حیدرآباد تشریف لے جاتے تھے تو ان ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے، پھر آگے چل کر دونوں ایک ہی شیخ کے مرید ہوئے، بلکہ سید صاحب کو یہ راہ مولانا عبدالباری صاحب ہی نے جو بہت پہلے مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے مرید ہوچکے تھے، دکھائی تھی، اور ان ہی نے ان کو ان کے آستانہ تک پہنچایا تھا، اس لیے شروع زندگی سے لے کر آخر تک دونوں کا ساتھ رہا، سید صاحب کی وفات کے بعد سلیمان نمبر کے لیے مولانا عبدالباری صاحب نے جو مضمون لکھا ہے اس سے ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مولانا مسعود علی صاحب طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی بھی تھے اور شاگرد بھی، قیام دارالمصنّفین کے بعد سید صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے اور مولانا مسعود علی مہتمم یا منیجر، اس لیے ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ سے لے کر سید صاحب کے بھوپال اور اس کے بعد پاکستان جانے تک دونوں کا برابر ساتھ رہا، دارالمصنّفین کو پروان چڑھانے میں دونوں کا حصہ ہے، سید صاحب اگر اس کی روح تھے تو مولانا مسعود علی صاحب جسم، سید صاحب کی

ذات سے ہندوستان اور بیرون ہند میں دارالمصنفین کی علمی شہرت ہوئی تو مولانا مسعود علی صاحب نے اس کا مقامی وقار قائم کیا اور اس کے انتظامی امور کو سنبھالا......غرض ایک مدت تک دونوں دارالمصنفین کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہے لیکن آخر میں دونوں کے تعلقات کا خاتمہ بڑے افسوس ناک طریقہ سے ہوا، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، ۱۹۶۹ء میں انتقال ہوا اور دارالمصنفین میں دفن ہوئے۔

احباب میں ایک نام مولانا عبدالسلام ندوی کا بھی ہے، وہ بڑے بھولے بھالے، لاابالی اور مجلسی آداب و رسوم سے بے نیاز تھے، ان میں نہ دوست بننے کی صلاحیت تھی اور نہ دوست بنانے کی لیکن سید صاحب کے پچاس سال کے رفیق تھے، طالب علمی کے زمانہ سے سید صاحب کے پاکستان جانے تک ساتھ رہا، دارالمصنفین کے آغاز سے لے کر موت تک اس سے وابستہ رہے اور اس کے مصنفین میں سید صاحب کے بعد علمی دنیا میں ان ہی کا نام لیا جاتا تھا، وہ بڑے بھولے تھے، ہر شخص ان کے بھولے پن سے لطف لیتا تھا، سید صاحب بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور ان کی آزادروی، کی بنا پر ان کو ''بت بے پیر'' فرمایا کرتے تھے، ان کے بہت سے لطائف وظرائف ہیں، ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا اور دارالمصنفین میں دفن ہوئے۔

مولانا عبداللہ عمادی سید صاحب کے ابتدائی دور کے دوستوں میں تھے، وہ مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے تربیت یافتہ تھے اور ان ہی کے ساتھ لکھنؤ میں رہتے تھے، ندوہ میں بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی اور مولانا شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، اسی زمانہ سے سید صاحب سے تعلقات پیدا ہوئے جو آخر عمر تک قائم رہے، مولانا عبدالعلی آسی البیان کے نام سے عربی میں ایک رسالہ نکالتے تھے، اس میں سید صاحب اور مولانا عمادی دونوں کے مضمون نکلتے تھے، مولانا شبلی نے ان کو الندوہ کا عملاً سب ایڈیٹر بھی بنایا تھا، پھر الہلال میں دونوں کا ساتھ رہا، دارالترجمہ حیدرآباد کے قیام کے بعد اس میں ملازم ہو گئے تھے اور وضع اصطلاحات علمیہ وغیرہ کا کام کرتے تھے، عربی کی متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کیں،

دائرۃ المعارف حیدرآباد کے بھی رکن تھے، عربی زبان وادب پر بڑی گہری اور وسیع نظر تھی، سید صاحب جب حیدرآباد جاتے تھے تو مولانا عمادی بڑے اہتمام سے دعوت کرتے تھے، ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد میں وفات پائی۔

حافظ فضل الرحمٰن صاحب سید صاحب کے ہم جماعت اور بے تکلف دوستوں میں تھے، کچھ دنوں تک ندوہ میں رہے پھر مدرسہ فرقانیہ میں مدرس اور لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولانا عین القضاۃ کے مرید ہوگئے، اوران پر مجددیت کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ مدرسہ فرقانیہ چھوڑ کر حضرت مجدد الف ثانی کے مزار کی مجاورت اختیار کر لی، اور مستقل سرہند میں رہنے لگے، یہاں کی مسجد کے امام بھی تھے، ۱۹۴۴ء میں انتقال کیا۔

سید صاحب اپنے معاصرین کے کمالات کے اعتراف میں بڑے وسیع القلب تھے اوران کے بعد بھی تعلقات کا پورا حق ادا کرتے تھے، ان کی موت پر معارف میں اپنے تاثرات ظاہر کرتے تھے، اوپر جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں جنھوں نے سید صاحب کی زندگی میں وفات پائی ان پر معارف کے شذرات میں بڑے درد انگیز تاثرات ظاہر کیے ہیں اور بعض پر وفیات کے عنوان سے مستقل مضامین لکھے ہیں، ان میں ان کے کمالات اور خصوصیات کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے، اس سے ان کے ساتھ سید صاحب کے تعلقات کے مدارج کا بھی اندازہ ہوتا ہے، یہ مضامین یادرفتگاں کے نام سے کتابی شکل میں چھپ گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب ان کے عہد کے بہت سے اکابر کا مستند تذکرہ بن گئی ہے، افسوس ہے کہ اس کتاب میں اس کے مختصر اقتباسات بھی نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

سید صاحب کے عزیزوں اور ہم وطنوں میں تو ان کے بہت سے بے تکلف احباب تھے، ان میں دو سے ان کو بڑا گہرا لگاؤ تھا، مولوی نجم الہدیٰ صاحب ندوی اور مولوی عبدالحکیم صاحب دیسنوی، مولوی نجم الہدیٰ صاحب سید صاحب کے ہم عمر وہم سبق اور ان کے ماموں زاد بھائی تھے، دونوں نے ندوہ میں تعلیم پائی تھی، مولوی نجم الہدیٰ صاحب

طالب علمی کے زمانہ میں سید صاحب سے زیادہ ذہین اور تیز تھے، درجہ میں ہمیشہ ان سے ممتاز رہتے تھے لیکن تعلیم کے بعد دونوں کا راستہ بدل گیا، جس نے مولوی نجم الہدیٰ صاحب کا سارا امتیاز ختم کر دیا، وہ ایک اسکول میں ہیڈ مولوی بنے اور اسی سے ریٹائر ہوئے اور سید صاحب آگے چل کر علامہ سید سلیمان ندوی بنے، ان کی طالب علمی کے زمانہ کا ایک دل چسپ واقعہ قابل ذکر ہے، یہ زمانہ مختلف مذاہب میں مناظرہ کا تھا، سید صاحب عیسائیوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ دونوں میں طے پایا کہ مولوی نجم الہدیٰ صاحب ایک دن اپنے کو عیسائی ظاہر کریں، پھر کسی دن مناظرے کی مجلس میں سید صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کریں، چنانچہ وہ کوٹ پتلون پہن کر مناظرہ میں جاتے اور ایک دو مرتبہ عیسائی مذہب کی حمایت میں تقریر بھی کی، ایک دن سید صاحب کی تقریر کے بعد ان کی طرف بڑھے اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا، مولانا آج آپ کی تقریر سے مجھ پر اسلام کی حقانیت ظاہر ہوگئی، میں عیسائیت سے توبہ کر کے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہوں، اس واقعہ سے پادری صاحب کا رنگ بالکل اکھڑ گیا اور پھر انھوں نے سید صاحب سے مناظرہ نہیں کیا، مولوی نجم الہدیٰ صاحب بفضلہٖ تعالیٰ ابھی بقید حیات ہیں اور پاکستان میں ہیں، ضعیف بہت ہو گئے ہیں۔

مولوی عبدالحکیم صاحب رشتہ میں سید صاحب کے چچا ہوتے تھے، دونوں کو ایک دوسرے سے غایت درجہ الفت تھی، دونوں زندگی کے ہر حصہ میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہے، سید صاحب ان کا بڑا لحاظ اور ان کی ہر طرح کی مدد کیا کرتے تھے، عبدالحکیم صاحب سید صاحب کی ہر ترقی اور شہرت و ناموری پر باغ باغ ہو جاتے اور خوشی و مسرت سے مامور خطوط لکھتے اور آئندہ کے لیے مشورہ دیتے، جب سید عبدالحکیم صاحب دارالمصنفین آئے تو سید صاحب ان کی خاطر مدارات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، ان کے نام سید صاحب کے بہت سے خطوط ہیں جو معارف میں چھپ چکے ہیں، ان سے دونوں کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے، عبدالحکیم صاحب نے ۱۹ء میں وفات پائی۔

مولانا شبلی کے صاحب زادے حامد نعمانی سے گہرا عزیزانہ تعلق تھا، سید صاحب ان کو استاد کی جسمانی یادگار اور وہ سید صاحب کو ان کا علمی جانشین اور خلیفہ بلافصل سمجھتے تھے، حامد صاحب سید صاحب سے کچھ بڑے تھے، اس لیے وہ ان کو حامد بھائی کہتے تھے، ان کی محبت کا ایک واقعہ اب تک یاد ہے، ایک مرتبہ معلوم نہیں حامد صاحب کو یہ کیسے خبر ملی کہ سید صاحب دارالمصنّفین چھوڑنے والے ہیں، اس زمانہ میں وہ گورکھ پور میں تحصیل دار تھے، میں ایک دن کتب خانہ بیٹھا کام کر رہا تھا کہ کسی کے زور زور سے رونے کی آواز آئی، اٹھ کر دیکھا تو حامد صاحب اور سید صاحب گلے مل کر رو رہے ہیں، حامد صاحب کہہ رہے ہیں کہ ابا کی ڈیوڑھی میری زندگی میں چھوڑ دیجیے گا، سید صاحب رو رو کر اس کی تردید کر رہے تھے کہ حامد بھائی یہ خبر بالکل غلط ہے، آپ نے کس سے سنی، حامد صاحب کا انتقال سید صاحب کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، مرنے کے بعد مولانا شبلی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

امرا و سلاطین سے ملاقات اور ان کی قدر دانی: سید صاحب کو ندوہ اور دارالمصنّفین اور دوسرے قومی و سیاسی کاموں کے سلسلہ میں ہندوستان اور بیرون ملک بہت سے امراو سلاطین سے ملاقات کا موقع ملا، ہندوستان کے والیان ریاست میں نظام حیدر آباد اور بیگم صاحبہ بھوپال مولانا شبلی کی بڑی قدر دان تھیں، نظام نے تین سو ماہوار مولانا شبلی کا علمی منصب مقرر کیا تھا جو قیام دارالمصنّفین کے بعد اس کی طرف منتقل ہو گیا تھا، مولانا نے جب پہلی مرتبہ سیرت نبویؐ کی تالیف کے لیے سرمایہ کی اپیل کی تھی تو نواب سلطان جہاں بیگم نے تنہا اس کے پورے مصارف دو سو ماہوار مقرر کر دیے تھے، اسی کے شکریہ میں مولانا نے یہ قطعہ کہا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
وہی تالیف و تنقید رولہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر میرا دل ہے میری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک گدائے بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

دارالمصنّفین کے قیام کے بعد یہ تعلقات سید صاحب کو وراثۃً ملے، مولانا شبلی مرحوم کے انتقال کے بعد ان کا وظیفہ اور سیرت کی امداد کے بند ہو جانے کا خطرہ تھا، اس لیے وہ اس کے اجرا کی کوشش کے لیے آخر نومبر ۱۹۱۴ء میں بھوپال تشریف لے گئے اور بیگم صاحبہ سے ملے، اس وقت سیرت عائشہؓ زیر تالیف تھی، بیگم صاحبہ کو اس سے بڑی دل چسپی تھی، انہوں نے اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اشاعت کے مصارف میں امداد فرمائی، اس کا ذکر سیرت عائشہؓ کے دیباچہ میں ہے، سیرت نبویؐ کی پہلی جلد کی اشاعت کے لیے تین ہزار یک مشت عطا کیے تھے اور مستقل امداد بھی جاری ہوگئی تھی، اس لیے اس کی اشاعت کے بعد سید صاحب نے خود اس کو لے جا کر بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیا، اس کا ذکر معارف میں ہے، فرماتے ہیں:

> '۱۶ر اگست ۱۹۱۸ء کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو جلدیں لے کر اس آستانہ پر حاضر ہوا جہاں آنکھیں اس کے دیدار کی سب سے زیادہ مشتاق تھیں یعنی سرکار عالیہ ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال خلد اللہ ملکہا، ہر ہائنس نے تاریخ مقرر پر شرف باریابی بخشا، شرف یابی کا دوسرا موقع تھا، ہر ہائنس نے خود اپنے دست مبارک سے جلدیں اٹھائیں اور فرمایا یہ بڑا کام ہوگیا، پھر اس کی فہرست ملاحظہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ فہرست اتنی بڑی ہے تو کتاب کتنی بڑی ہوگی، عرض کیا، یہ جلد کتاب کا پہلا حصہ ہے، اس کے بعد دیر تک قومی، علمی، تعلیمی و مذہبی مسائل پر گفتگو فرماتی رہیں، اثنائے کلام میں دریافت فرمایا کہ مولوی صاحب آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی خواب میں بھی دیکھا ہے، عرض کیا کہ دو مرتبہ لیکن چہرہ مبارک نظر سے اوجھل رہا، تو پھر زیارت کیا ہوئی۔''
>
> (معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء)

بیگم صاحبہ کے بعد نواب حمید اللہ خاں سے بھی تعلقات قائم رہے، ان سے بار ہا

ملاقات ہوئی، ایک مرتبہ سید صاحب حیدرآباد سے واپسی میں بھوپال ٹھہرے، نواب حمید اللہ خاں سے ملاقات اور مختلف اسلامی امور پر گفتگو ہوئی، اس زمانہ میں ریاست کے مصارف کی تخفیف کے سلسلہ میں دارالمصنفین کی بھوپال کی امداد میں بھی سو روپے کم ہو گئے تھے، دارالمصنفین کی ضرورتوں کا حال معلوم ہونے کے بعد نواب صاحب نے پورے دوسو جاری کر دیے۔ (معارف اگست ۱۹۳۵ء)

نواب صاحب سید صاحب کے بڑے قدر دان تھے، انہوں نے ان کو باصرار بلا کر ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ کے منصب پر سرفراز کیا اور جب تک سید صاحب کا قیام بھوپال میں رہا نواب صاحب بڑے احترام کے ساتھ پیش آتے رہے، اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

نواب حمید اللہ خاں کے بعد ان کی صاحب زادی اور جانشین بیگم ساجدہ سلطان صاحبہ نے بھی دارالمصنفین کے پرانے تعلقات کا لحاظ رکھا اور ۱۹۶۵ء میں جب اس کی جوبلی ہوئی تو اس میں شرکت کی زحمت گوارا فرمائی اور دس ہزار کا گراں قدر عطیہ دیا۔

نظام حیدرآباد سے بار ہا ملاقات کا موقع ملا، بعض ملاقاتوں کا ذکر معارف میں بھی ہے، اگست ۱۹۳۵ء کا سفر حیدرآباد کے حال میں لکھتے ہیں کہ:

> ”ڈیڑھ ماہ کے قیام حیدرآباد میں دکن کے احباب وعمائد نے جس محبت سے ذرہ نوازی کی وہ میرے استحقاق سے زیادہ تھی، ہز ایکسلینسی سر مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر نے خلعت پارچہ سے نوازش کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم ہز اگزالٹیڈ ہائنس شہر یار دکن خلد اللہ تعالیٰ ملکہ وہ دولتہ نے یاد فرما کر باریابی بخشی اور ایوان خاصہ سے سرفراز فرما کر ہم چشموں میں حقیر کی توقیر بڑھائی۔“

سید صاحب مہاراجہ سرکشن پرشاد کی شرافت، عالی ظرفی اور وضع داری کے بڑے مداح ومعترف تھے، جب حیدرآباد جاتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے، ایک مرتبہ مہاراجہ

حیدرآباد سے باہر اپنی جاگیر پر تھے، سید صاحب وہاں جا کر ملے، لکھتے ہیں:

"مہاراجہ یمین السلطنۃ بہادر سے ملنے کے لیے ان کی جاگیر السوال گیا، جو حیدرآباد سے بارہ میل پر ہے، مولانا عبدالباری، مولانا مناظر احسن گیلانی اور حکیم الشعرا امجد ساتھ تھے، سر مہاراجہ نے اپنی شرافت طبع اور وضع کی پابندی کی بنا پر جس کی خاندانی امرا میں وہ آخری مثال ہیں، تا لب فرش پیشوائی فرمائی۔"

ان کی شرافت و عالی ظرفی کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حیدرآباد میں کوئی بڑی پارٹی تھی، اس میں حیدرآباد کے تمام ارکان وعمائد شریک تھے، سید صاحب بھی تھے، اتنے میں ریاست کے ایک بڑے عہدہ دار تشریف لائے، انہوں نے بڑے بڑے امرا سے مصافحہ کیا اور سید صاحب کو غالباً مولوی سمجھ کر نظر انداز کر دیا، مہاراجہ کی نظر پڑ گئی، وہ فوراً سید صاحب کی طرف بڑھے اور خود ان سے مصافحہ کیا، یہ دیکھ کر ان عہدہ دار کو بھی شرما شرمی میں سید صاحب کی طرف بڑھنا پڑا۔

نظام سے دوسری ملاقات اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس میں مختلف مذہبی اور علمی تعلیمی مسائل پر بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی، اس ملاقات میں سید صاحب نظام کی سادگی اور مذہبی جذبہ سے بہت متاثر ہوئے، اس کا تفصیلی ذکر نومبر ۱۹۳۷ء کے معارف میں ہے، اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

"مجھے اپنی زندگی میں کئی دفعہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے اسلامی فرماں رواؤں کی بارگاہوں میں میں بار پانے کے موقعے ملتے رہے، ان میں سب سے پہلے ہر ہائنس سلطان جہاں بیگم مرحومہ والیہ بھوپال میں یہ مذہبی جوش اور ذات پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی دیکھی تھی، یا اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن آصف سابع خلد اللہ ملکہ کے اندر وہ مذہبی عقیدت اور ذات قدسی صفات سرور کائنات علیہ الف صلوٰت والتحیات کے ساتھ اور آپ کی ایک ایک چیز کے ساتھ وہ گہری عقیدت دیکھی جو کہیں نہیں دیکھی، جب کبھی اعلیٰ حضرت

اپنے آقا و مولیٰ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ فرماتے تو لب ولہجہ سے سننے والے کو محبت کی یہ چاشنی معلوم ہوتی۔" (معارف نومبر ۱۹۳۷ء)

اس ملاقات کے بعد نظام نے حضرت سید صاحب کا سو روپے ماہوار ذاتی وظیفہ مقرر کیا اور اس کا فرمان خود اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا، جواب تک دار المصنفین میں محفوظ ہے، اس قدر افزائی پر سید صاحب کے احباب نے مختلف طریقوں سے اپنی مسرت کا اظہار کیا، پروفیسر نواب علی نے ایک قطعہ لکھا:

خدا کا شکر ہے اب سرحد تکمیل کو پہنچا
وہ دینی کارنامہ شبلی ٔ فردوس منزل کا

سلیماں کا قلم دکھلا رہا ہے جلوۂ سیرت
تماشائے کرم دیکھو دکن کے شاہ باذل کا

گہر بیزی ادھر سے ہے ادھر سے ہے گہر باری
عجب عالم نظر آتا ہے اس پاکیزہ محفل کا

جو طالب حق کے ہیں وہ جال میں اب پھنس نہیں سکتے
کہو مستشرقوں سے اب اٹھائیں جال باطل کا

وہ دن آئے الٰہی جلد جب سیرت مکمل ہو
نظر آ جائے اعظم گڑھ سے جلوہ ماہِ کامل کا

نظام حیدر آباد کے کارنامے ایسے اظہر من الشمس تھے کہ سید صاحب کیا سبھی اس کے معترف تھے، مگر ان کی سادگی پر یہ دل چسپ فقرہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر نظام کی سادگی مذہبی جذبہ کا نتیجہ ہوتی تو اس وصف میں وہ عمر ثانی ہوتے۔"

ہندوستان کے باہر کے فرماں رواؤں میں نادر شاہ اور شریف حسین ان کے لڑکوں علی اور فیصل، سلطان عبد العزیز ابن سعود سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، نادر شاہ سے زیادہ ملاقاتیں رہیں جن کا ذکر افغانستان کے سفر کے سلسلہ میں اوپر گزر چکا ہے، اس سفر میں نادر شاہ نے سید صاحب کو ایک بڑی قیمتی پوستین اور دو قالین دیے تھے، پوستین پہننے کی نوبت کبھی نہیں آئی، رکھے رکھے کیڑوں کی نذر ہوگئی، قالین اتنے اعلیٰ قسم کے تھے کہ ایک قالین مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو پسند آگیا تھا، وہ لے گئے تھے، ایک

سید صاحب کے استعمال میں رہا۔

سید صاحب کے احباب خاص میں ایک ضروری نام مولانا شبلی متکلم کا رہ گیا تھا، جو بعد میں یاد آیا، مولانا شبلیؒ[1] نے ان کو درس و تدریس کے لیے تیار کیا تھا اور آخر میں انہوں نے اپنے کاموں کی تکمیل کا جو نقشہ بنایا تھا اس میں مولانا شبلی متکلم کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی مدرسی کے لیے تجویز کیا تھا، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذۂ خاص نے جب کاموں کی تقسیم کی تو مولانا شبلی متکلم کو مدرسۃ الاصلاح کی صدر مدرسی سپرد کی، انہوں نے پوری زندگی مدرسہ کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور اس ایثار و قربانی اور سادگی و قناعت سے عمر گزاری جس کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، ان کے دور میں ان کی اور ان کے رفقا کی کوشش سے مدرسۃ الاصلاح ایک معیاری درس گاہ بن گیا لیکن آخر میں مختلف اسباب کی بنا پر اس سے علاحدہ ہو گئے تھے، سرائے میر اعظم گڑھ سے بہت قریب ہے، اس لیے مولانا شبلیؒ اکثر دارالمصنفین آتے رہتے تھے، ابھی بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں لیکن ضعیف بہت ہو گئے ہیں لیکن دارالمصنفین سے ان کا تعلق اور اس کے کارکنوں پر شفقت بدستور قائم ہے، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ قائم رکھے۔

مذہبی عقائد و خیالات: سید صاحب ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ان کے بزرگ متبع سنت اور شریعت و طریقت کے جامع تھے، پورے گھر کی فضا مذہبی تھی، اسی فضا میں ان کی پرورش ہوئی، اس زمانہ میں دین کا جو نقش ان کے دل پر قائم ہو گیا تھا، آئندہ چل کر زمانہ کے خیالات و رجحانات کا کوئی مد و جزر اس کو ہٹا نہ سکا، اس کی روداد خود ان کی زبان سے سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں:

---

[1] مولانا شبلی کے زمانہ میں ندوہ میں اس نام کے تین شخص تھے، ایک مولانا شبلی نعمانی، دوسرے مولانا شبلی جیراج پوری، مدرس، تیسرے شبلی متکلم جو اس زمانہ میں طالب علم تھے، بعد میں علم کلام کی تکمیل کے بعد ناموں میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے ان کے نام کے ساتھ متکلم کا اضافہ کیا گیا۔

"میرے بڑے بھائی مرحوم مولوی حکیم سید ابوحبیب صاحب رضوی، مجددی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور ان کے شاگرد مولوی شاہ علی نعمت صاحب پھلواری کے شاگرد تھے، اس کا یہ اثر تھا کہ وہ توحید وسنت کے شیفتہ ودلدادہ تھے اور تمام عمر کامل اتباع سنت اور زہد وتقویٰ میں گزار دی۔

وہ جب فراغت پا کر گھر آئے تو میں بچہ تھا، وہ مجھ سے عمر میں اٹھارہ سال بڑے تھے، میں نے ان ہی کے دامن شفقت میں پرورش پائی، مسلمانوں میں بدعات کا رواج زیادہ تر عورتوں کے سبب سے ہے، اس لیے ان کو اپنے رشتہ کی بیبیوں اور گاؤں کی دوسری مسلمان بیبیوں کو سمجھانے اور ان کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنا کی دھن تھی، انہوں نے ہفتہ میں ایک دن ان بیبیوں میں وعظ وتلقین کے لیے مخصوص فرمایا تھا، چوں کہ میں بچہ تھا، فارسی ختم ہو کر میزان ومنشعب شروع کی تھی، قرآن پاک کے بعد مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی، میں ان بیبیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویۃ الایمان کا ایک ایک باب پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردے کے پیچھے اس کے ایک ایک مسئلہ کی تشریح وتفسیر فرماتے تھے اور وہ جو کچھ فرماتے میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم ومطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے، مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ ومعتزلہ کے نزاعات، غزالی ورازی وابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگر نگاہوں سے گزرے مگر اس میں شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ پر قائم رہی۔

احادیث نبویؐ سے شغف اور اس کا نتیجہ: ۱۹۰۱ء میں دار العلوم آیا اور دوسرے درجہ میں داخل ہوا، گھر سے کچھ رسالے ساتھ لایا تھا، ان میں اصول حدیث میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا رسالہ عجالۂ نافعہ بھی تھا، اصول حدیث کے اس مختصر فارسی رسالہ کے پڑھنے سے علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی، ندوہ کے کتب خانہ میں شاہ صاحب کی

دوسری کتاب بستان المحدثین ہاتھ آئی، بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا اور بالآخر محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالک نے میرے دل پر قبضہ کرلیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موطائے امام مالک سے بے حد گرویدگی پیدا ہوگئی۔

اس شوق نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، آخری سال تھا، صحیح بخاری کا آغاز تھا، ہم درس ساتھیوں میں کچھ غالی حنفی تھے اور کچھ مائل الی الحدیث، آخری لقب کا اطلاق مجھ پر تھا، درجہ میں یہ دونوں قسم کے لڑکے ہر روز اسباق میں الجھتے اور سوال و جواب کرتے تھے اور آخر درس گاہ سے اٹھ کر اپنے اپنے ثبوت کے لیے کتابوں کی طرف دوڑتے تھے، دوسرے اشخاص امام طحاوی اور حافظ عینی کا سہارا ڈھونڈتے تھے اور میں حافظ ابن حجر کی فتح الباری کی پناہ، اسی سلسلہ میں فتح الباری کے مقدمہ کے مطالعہ کی توفیق ملی، اس کا نتیجہ امام بخاری پر وہ مضمون ہے جو الندوہ ۱۹۰۶ء میں نکلا ہے۔

علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے، ان کی تصنیفات پڑھیں، ان کی حوالہ دی ہوئی کتابیں دیکھیں، ملل ونحل شہرستانی اور فصل فی الملل والنحل ابن حزم نگاہوں میں رہیں، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ سب نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا، بالآخر امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصنیفات نے ہر نقش مٹا ڈالا اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا۔

سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا، مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دل چسپ و دل پسند صحبتوں میں یہ چسکا آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرۃ النبی کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبوی اس کے نقش و نگار ہیں اور اب یہی دونوں میرا سرمایہ اور یہی میرا زادراہ ہیں، ایک اصل دوسری ظل، ایک وحی جلی ہے اور دوسری وحی خفی، ایک دلیل ہے دوسری نتیجہ، جس کو ایک دو نظر آتے ہیں وہ احول ہے، ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ (میری محسن کتابیں)

اس سلسلہ میں ایک چیز کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے، ایک زمانہ میں ندوہ کا دینی حلقہ میں اچھا اثر نہ تھا، دیندار علما ان کی دینی حیثیت سے مطمئن نہ تھے لیکن سید صاحب کی دینی حیثیت ہر طبقہ میں مسلم تھی، چنانچہ وہ جمعیۃ العلما کے جو ہندوستان کے علما کی سب سے بڑی جماعت ہے اور اس میں غالب اکثریت علمائے دیوبند کی ہے رکن رکین تھے، علمائے اہل حدیث بھی ان کو مانتے تھے، ان کے اکابر مولانا ابراہیم صاحب سیال کوٹی، قاضی سلیمان منصور پوری اور مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ سے ان کے تعلقات تھے، بلکہ سید صاحب کے مسلک اعتدال[1] کی بنا پر بعض اہل حدیث ان کو اپنی جماعت میں شمار کرتے اور اہل حدیث علما کے زمرہ میں ان کے حالات بھی لکھے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے ارادت کے بعد ان کے حلقہ میں بھی ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔

روحانی انقلاب: اگرچہ سید صاحب ہر دور میں دین خالص پر عامل رہے اور ان کا دامن ہر داغ سے پاک رہا، ان کی پوری زندگی دین کی خدمت میں گزری، ان کے بیشتر علمی کاموں کا محور دینی تھا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبی کی ضخیم مجلدات ہیں، جو اسلامی تعلیمات کی انسائیکلوپیڈیا ہے، اس کے باوجود وہ ایک روحانی تشنگی محسوس کرتے تھے اور اس کی ایک خلش رہتی تھی، عمر کے ساتھ یہ تشنگی اور خلش بڑھتی گئی، اور ایک عرصہ کی بے چینی اور اضطراب کے بعد جب ان کی علمی عظمت وشہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اس دور کے سب سے بڑے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانہ پر سرخم کردیا اور اس دور میں امام غزالی کے ذوق وطلب کا نمونہ پیش کیا، حضرت مولانا کی طرف ان کا رجحان ایک

---

[1] سید صاحب عملاً ہمیشہ حنفی رہے، آمین بالجہر اور رفع الیدین اور اس قسم کے اہل حدیث کے امتیازی نشانات پر کبھی عمل نہیں کیا، فقہیات میں عموماً ان کا عمل فقہ حنفی پر تھا لیکن مقلد جامد نہ تھے، بعض مسائل میں ان کی تحقیق عام حنفی مسلک سے الگ تھی، جس کی مثالیں ہر دور کے محقق حنفی علما میں ملتی ہیں، بدعات کے منکر تھے، ان کا عمل قریب قریب وہی تھا جو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا تھا۔

عرصہ سے تھا، ان سے خط و کتابت بھی رہتی تھی اور کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے تھے لیکن باقاعدہ ارادت کا تعلق ۱۹۴۰ء میں قائم ہوا، اس کے بعد ان کی زندگی میں بڑا انقلاب ہوگیا، اگرچہ اس سے ان کے علمی مشاغل میں فرق نہیں آیا لیکن ان کا نقطۂ نظر بالکل بدل گیا، دین داری نے للّٰہیت اور زہد و ورع کا رنگ اختیار کرلیا، عبادت و ریاضت بڑھ گئی، تقریر و تحریر نے وعظ و پند اور ارشاد و ہدایت کی شکل اختیار کرلی، اپنے منتسبین و تلامذہ کو تلقین فرماتے تھے کہ تصنیف و تالیف کا مقصد رضائے الٰہی ہونا چاہیے، اگر اخلاص و للّٰہیت نہ ہو تو محض علمی تلاش و تحقیق سے کیا حاصل، یہی نقطۂ نظر ہر عمل کے بارے میں پیدا ہوگیا تھا۔

رجوع و اعتراف: اپنی شہرت کے عین شباب کے زمانہ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے آستانہ پر سر ارادت خم کر دینا ہی کیا کم تھا، اس سے بھی بڑا کارنامہ ''رجوع و اعتراف'' ہے، گو سید صاحب کا ذوق ہمیشہ سے دینی تھا اور ان کے بیش تر علمی کاموں کا مقصد دین کی خدمت تھا اور وہ فقہی مسائل میں جمہور کے مسلک سے الگ نہ ہوتے تھے لیکن ان میں تحقیقی شان تھی جس میں خطا و لغزش کا بھی امکان تھا، اس لیے مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ سے تعلق کے بعد اس قسم کے مسائل اور تحریروں پر نظر ثانی فرمائی اور جو تحریریں خلاف احتیاط نظر آئیں ان سے رجوع فرمالیا اور اس کو ''رجوع و اعتراف'' کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں شائع کیا، اس کی نقل حسب ذیل ہے:

> ''میری پیدائش صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، اب یہ محرم ۱۳۶۲ھ شروع ہوگیا ہے، یعنی میری عمر نے زندگی کے ساٹھ مرحلے طے کر لیے، میری تحریر کا آغاز ۱۹۰۲ء سے ہوا اور اب ۱۹۴۳ء ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ میری تحریری عمر نے چالیس سال پورے کر لیے، جب اس پر نظر جاتی ہے کہ ساٹھ سال کی زندگی میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں اور کیسی کیسی لغزشیں پیش آئی ہوں گی تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے: ع
>
> از کردہ ناصواب یارب توبہ

تحریری زندگی کے چالیس سال پورے ہو گئے، یاد نہیں کہ ان چالیس برسوں میں قلم نے کیا کیا لکھا اور کہاں کہاں غلطی کی، اتباع حق کے بجائے اتباع ہوئی کے موقع کہاں کہاں پیش آئے اور اب بھی بزبان حال یہ صدائے غیب آتی ہے:

چہل سال عمر عزیزت گذشت　　　مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

کتابوں اور مضمونوں کے ہزار ہا صفحات اتنے دنوں میں سیاہ کیے گئے، کہا نہیں جا سکتا کہ کہاں کہاں حق کا ساتھ چھوٹا ہے اور کس باطل کی تائید میں قلم نے لغزش کی ہے، جس سے اتباع حق کے بجائے اتباع ہوئی کا ارتکاب ہوا، بندہ ہر حالت میں قصوروار ہے، خطا ونسیان اس کا خمیر ہے اور اس کا علم وعمل کی لغزش گاہوں سے ٹھیک ٹھیک بچ کر نکلنا بہت مشکل ہے، اس لیے یہ خاکسار علی الاعلان اپنی تمام غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ حق کے خلاف ہوئی ہوں، صدق دل سے توبہ کرتا ہے اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اس رائے سے جس کی سند کتاب وسنت میں نہ ہو اعلان برأت کرتا ہے، وما توفیقی الا باللہ تعالیٰ۔

مذہبی معاملات کی تحقیقات میں میرا عمل یہ رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علاحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی ہے، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہا کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے۔

ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری ذجسم ہونے پر مجھے قرآن پاک سے صحیح استدلال نہیں مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی، تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر تصحیح کر دی، اس طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں جو کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا

اضافہ کرکے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی، اور اب بحمد اللہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آ گیا، وما توفیقی الا باللہ۔

مسئلہ تصاویر کے متعلق میں نے ۱۹۰۹ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں ذی روح کے فوٹو لینے یعنی عکسی تصویر کشی خصوصاً نصف جسم کے فوٹو کا جواز ظاہر کیا تھا، اس سلسلہ میں بعد کو ہندوستان اور مصر کے بعض علمائے حق نے بھی مضامین لکھے جن میں سے بعض میرے موافق ہیں اور بعض مخالف لیکن بہر حال اس بحث کے سارے پہلو سامنے آ گئے ہیں، اس لیے سب کو سامنے رکھ کر اب اس سے اتفاق ہے کہ صحیح یہی ہے کہ امر اول دستی تصاویر کی طرح ناجائز ہے، اور امر ثانی کا کھنچانا ناجائز، بہ اضطرار جائز اور دھڑ کا بغیر سر اور چہرے کے دونوں جائز، پوری تفصیل آئندہ لکھی جائے گی۔

زیوروں میں زکوٰۃ کا وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر اب تک اختلاف چلا آتا ہے، روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عدم وجوب کی قائل تھیں، سیرت عائشہؓ میں ان کے اس مسلک کی تشریح میرے قلم سے کچھ اس انداز سے نکلی ہے جس سے اس مسئلہ میں ان کی رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ ایک صاحب علم نے بڑی خوبی سے اس کا جواب بھی ایک رسالہ میں لکھا ہے جو شائع ہو چکا ہے، اس لیے اس غلط فہمی کو دور کر دینا اور کہہ دینا ہے کہ میں زیوروں میں جمہور کے فیصلے کا قائل اور اسی پر بحمد اللہ عامل ہوں اور کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں ان شاء اللہ اس کی تصحیح بھی ہو جائے گی۔

یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری محسوس کرکے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بارالٰہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے متنبہ فرما اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہ صواب دکھا، ربنا اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين، ربنا لا تؤاخذنا ان نسينا او اخطانا واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولٰنا۔

اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو جس نے میری وجہ سے ان مسئلوں میں میری رائے اختیار کی ہو تو اس کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ میرے اس رجوع اور تصحیح کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کر لے اور صحیح امر اختیار کرے، علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور ترجیح اور قول ثانی کا عام رواج رہا ہے، یہ ان ہی کا اتباع حق ہے، والحق احق ان یتبع والسلام علی من اتبع الهدیٰ۔"

اسی کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کے بعض مباحث میں ترمیم فرمائی۔

یہ رجوع و اعتراف سید صاحب کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے، عالی ظرفی کا یہ نمونہ بڑا انسان ہی پیش کر سکتا ہے، ان میں سلوک و معرفت کی استعداد قدرت کی طرف سے ودیعت تھی اور وہ اصلاح نفس کے بہت سے مراحل پہلے ہی طے کر چکے تھے، زمین بالکل تیار تھی، صرف بیج ڈالنے کی کسر تھی، وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ارادت سے پوری ہوگئی اور انہوں نے ان کی توجہ سے وہ مدارج بہت جلد طے کر لیے جو برسوں میں حاصل ہوتے ہیں، خود ان کے مرشد کو ان کی اس فطری استعداد کا اعتراف تھا، چنانچہ ایک مرتبہ سید صاحب کے ذکر کے سلسلہ میں فرمایا کہ "جو لکڑی سوکھی ہوتی ہے وہ دیا سلائی دکھاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے اور جو گیلی ہوتی ہے اس کو عمر بھر پھونکتے رہیے، سوائے دھوئیں کے کچھ نہیں اٹھتا، ہمارے سید صاحب میں کمی کس چیز کی تھی۔"

مفتی محمد شفیع صاحب کا جو حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں ہیں، بیان ہے کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد اس قدر رسوخ کیسے حاصل ہو گیا، بعد کو پتہ چلا کہ یہ جوہر ہی کچھ اور تھا۔

ان کے دوسرے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب فرماتے ہیں "حضرت سید صاحب کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، دیکھنے والوں کو تو صرف یہ نظر آتا تھا کہ سید صاحب تھانہ بھون تشریف لائے ہیں، محفل میں شرکت فرماتے ہیں، چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، نہ کوئی گفتگو ہوتی ہے نہ کچھ عرض و معروض مگر دیکھتے ہی دیکھتے درجہ کمال کو پہنچ گئے۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تحریر فرماتے ہیں ''مولانا ندوی کا شمار دیکھتے ہیں دیکھتے اصحاب یمین میں نہیں مقربین میں ہونے لگا۔'' (تذکرہ سلیمان، صفحہ ۱۲۶)

سید صاحب نے نہ صرف خود سلوک وطریقت کے مدارج طے کیے بلکہ اکابر صوفیہ اور مشائخ کی طرح اپنے بعد اس کا پورا نصاب چھوڑ گئے، انہوں نے اپنے مسترشدین مولانا محمد اشرف خان صدر شعبہ عربی اسلامیات پشاور یونیورسٹی اور مولوی غلام محمد صاحب بی اے کو جو خطوط لکھے ہیں وہ سلوک ومعرفت کی حقیقت اوراس کی تعلیم وتربیت کا مکمل نصاب ہیں، غلام محمد صاحب نے اپنے نام کے خطوط تذکرہ سلیمان کے آخر میں شائع کردیے ہیں، محمد اشرف خان صاحب نے اپنے نام کے خطوط کی روشنی میں سلوک سلیمانی کے عنوان سے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا جس کو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کردیا ہے اور اب انہوں نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے، سید صاحب کے علمی کارناموں کی طرح ان کے سلوک ومعرفت پر بھی ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو ایک حد تک تذکرہ سلیمان نے پورا کردیا ہے، یہ اگر چہ سید صاحب کی سوانح عمری ہے لیکن اس میں زیادہ تر ان کے عرفانی پہلو کو رکھا گیا ہے، امید ہے کہ اس کی مزید تفصیل وتکمیل مولانا اشرف خان کی کتاب سے ہوگی اور پرانے بزرگوں کے ملفوظات اور مکاتیب کی طرح سلوک ومعرفت کا ایک نیا مجموعہ صالحین طریقت کے ہاتھ میں آجائے گا۔

سید صاحب کو خوش قسمتی سے علم وعرفان دونوں راہوں میں یگانہ عصر شیوخ میسر آئے، جن کے فیض نے ان کے جوہروں کو چمکا دیا اوران کی بارگاہ میں ان کو اتنا تقرب اور حسن قبول حاصل ہوا کہ ایک (مولانا شبلی نے ان کو علمی جانشینی کا منصب عطا کیا دوسرے مولانا تھانویؒ) نے روحانی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

اس زمانہ میں اس سلسلہ میں ایک بڑی بحث پیدا ہوگئی تھی اور مولانا اشرف علی سے ارادت نے علمی ودینی حلقہ میں دوگروہ پیدا کردیے تھے، علمی طبقہ اس ارادت کو

سید صاحب کے علمی مرتبہ سے فروتر سمجھتا تھا، اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ ان کی اصل اور حقیقی زندگی سلوک و معرفت کے بعد کی سمجھتا تھا اور اس سے پہلے کے علمی کارناموں کو اہمیت نہ دیتا تھا لیکن درحقیقت یہ دونوں نقطہ نظر غلط اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں، یہ دونوں دور باہم ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، ان کا سلوک و عرفان درحقیقت ان کے علم ہی کا نتیجہ تھا، بہت سے اکابر، علما اور ائمہ اسلام علم کی منزل سے گزر کر عرفان کی منزل تک پہنچے ہیں اور ان ہی نے بڑے بڑے دینی کارنامے انجام دیے ہیں، جو علم و معرفت اور شریعت و طریقت کے جامع تھے، ہندوستان میں اس کی مثال حضرت مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان ہے، اس لیے ان دونوں میں سے کسی کی اہمیت سے انکار کرنا جہل و نادانی ہے، اس لیے اگر سید صاحب نے علم کی منزل سے گزرنے کے بعد سلوک و معرفت کی راہ اختیار کی تو کوئی تعجب کی بات نہیں کی بلکہ اکابر اسلام کی سنت کی تقلید کی اور اس سے ان کے علمی مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آتا، ان کے اصلی کارنامے علمی و دینی ہی ہیں، ان کی تصانیف نے بڑے بڑے مسلمانوں کو مسلمان بنا دیا اور ایک دنیا ان سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور آئندہ اٹھاتی رہے گی، اس کے باوجود وہ اپنے میں ایک خلا محسوس کرتے تھے، جس کو انہوں نے مولانا اشرف علی صاحب کی ارادت سے پورا کیا، انہوں نے خود معترضین کے جواب میں فرمایا ہے:

> ”یہ لوگ زبان سے تو مجھ کو فاضل و محقق کہتے ہیں مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں، وہ اس پر کیوں غور نہیں کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق اگر میں واقعی علامہ محقق ہوں تو کیا بلا سوچے اور سمجھے مولانا اشرف علی کا دامن تھاما ہے، میں نے اپنے اندر کوئی کمی تو پائی جس کی تکمیل کے لیے ان کی طرف رجوع کیا۔“

سید صاحب کے عزیز اور مخلص بزرگ سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی نے اسی قسم کا اعتراض کیا تھا، ان کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوگا:

> ”آپ اپنی محبت سے مجھ کو سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن من آنم کہ من دانم علما پر فرائض کا بار

عام مسلمانوں سے زیادہ ہے، اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے، معاملہ دماغ کا نہیں قلب سلیم کا ہے اور قلب مصیب کا ہے نفس کا نہیں روح کا ہے، میری اتنی زندگی اور بندھنوں میں گزری، اب اس زندگی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے جو باقی ہے، علم و قوم کی خدمت بہت ہو چکی، اب اپنے نفس کی خدمت بھی لازم ہے، ابھی منزل بہت دور ہے، صرف تسبیح و مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا، جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو، ہم تو بندوں کی ناراضی اور رضامندی میں گرفتار ہیں، مالک کی رضامندی اور نارضامندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو صحیح راستہ پر چلائے۔''

درحقیقت تصوف و سلوک وہی چیز ہے جس کو قرآن مجید نے احسان سے تعبیر کیا ہے، یہ اخلاص فی العمل کی وہ کیفیت ہے جو محض کتابوں سے نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اس کے لیے کسی صاحب دل سے تعلق، اس کی صحبت اور ریاضت و مجاہدہ ضروری ہے، آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری حدیثیں کتابوں میں محفوظ ہیں جو سب کی نظر سے گزرتی ہیں، بڑے بڑے کثیر الروایہ صحابہ سے زیادہ ایک ایک محدث کو حدیثیں یاد ہیں اور ان سے بقدر صلاحیت فائدہ بھی پہنچتا ہے لیکن جو تاثیر رسول اکرم کی چند روزہ صحبت نے صحابہ کرام میں پیدا کر دی تھی، وہ اس پورے ذخیرہ کے حفظ سے پیدا نہیں ہوتی، پھر صحابہ کرام کی تعداد کئی لاکھ تھی، ان کے درجات کے لحاظ سے ان کا شرف مسلم ہے لیکن ان میں سے جن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا قرب و اختصاص حاصل تھا، اسی قدر ان کو احسانی کیفیت سے حصہ ملا، اسی لیے بعد کے صحابہ مہاجرین اولین کے برابر نہیں ہیں، ان میں بھی عشرہ مبشرہ کا خاص درجہ ہے، اس لیے جب عہد رسالت میں احسان کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ضروری تھی تو اس زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کی مذہبی روح مضمحل ہوگئی ہے، دلوں پر سیکڑوں حجابات پڑ گئے ہیں، کسی صاحب دل شیخ کی صحبت اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس سے جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ محض کتابوں سے نہیں ہوتا، اسی کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے بڑے بڑے ائمہ اسلام نے اپنے دور کے شیوخ کی طرف

رجوع کیا ہے، اس لیے اگر سید صاحب نے مولانا اشرف علی کی طرف رجوع کیا تو اس سے ان کے علمی مرتبہ میں کیا فرق آتا ہے[1]۔

قدیم وجدید کی جامعیت: سید صاحب کی ایک بڑی خصوصیت قدیم وجدید کی جامعیت اور ہر طبقہ میں ان کی مقبولیت تھی، وہ اگر چہ قدیم تعلیم کے نمائندہ تھے، ان کی تعلیم وتربیت تمام تر پرانے ماحول میں ہوئی تھی لیکن ان کے قلب میں بڑی وسعت تھی، وہ جدید خیالات و رجحانات اور اس کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف تھے، وہ ان سے بھڑکتے نہ تھے بلکہ ان کو صحیح راستہ پر لگانے کی کوشش کرتے تھے، اس لحاظ سے وہ قدیم وجدید کا سنگم تھے اور اپنے کو ان دونوں سے ایسا مانوس کر لیا تھا کہ کہیں اجنبی نہ معلوم ہوتے تھے، ان کو دونوں کا اعتماد حاصل تھا اور دونوں اپنے اپنے حلقہ میں ان کے علم واصابت رائے سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسی طریقہ سے وہ احناف اور اہل حدیث میں یکساں مقبول تھے، ان کا مسلک ایسا صلح کل تھا کہ ہر جماعت ان کو اپنا آدمی سمجھتی تھی، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے قدیم وجدید کے فرق و امتیاز اور احناف واہل حدیث وغیرہ کے اختلاف مٹا کے ان میں اتحاد وہم آہنگی کا عملی نمونہ پیش کیا، جو ندوہ کا ایک بڑا مقصد تھا[2]، اس سلسلہ میں قدیم وجدید دونوں طبقوں کے نمائندوں کے بیانات نقل کیے جاتے ہیں، پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی لکھتے ہیں:

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، سید صاحب کی تعلیم وتربیت پرانے طریقوں پر اور پرانے استادوں اور بزرگوں کے سایہ شفقت اور پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی، جدید علوم وفنون

---

[1] سید صاحبؒ کے عرفانی پہلو پر تذکرہ سلیمان کے مصنف مولوی غلام محمد بی اے نے اتنا لکھ دیا ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، اس لیے اس کتاب میں اس پہلو پر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ [2] اس سے یہ نہ قیاس کر لینا چاہیے کہ وہ ہر قسم کے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ان کو گوارا کرتے تھے، وہ مذہبی عقائد وخیالات میں نہایت راسخ العقیدہ تھے اور اس کے خلاف کسی آواز کو سننا گوارا نہ کرتے تھے، چنانچہ ان کے زمانہ میں اس قسم کی جو آواز بھی اٹھتی تھی سب سے پہلے ان کا قلم اس کی مخالفت اور تردید میں بلند ہوتا تھا، اس کے واقعات اوپر گزر چکے ہیں۔

میں انہوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے اپنے آپ کو اس خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، چاہے وہ اہل علم کا حلقہ ہو چاہے ارباب سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو خواہ عامۃ الناس کا اجتماع، جدید افکار و رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا سید صاحب سے تبادلہ خیال کرنے میں کبھی اس کو محسوس نہ ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں یا جس کا ذہن بند ھے ٹکے خانوں میں اسیر ہے یا جس کی فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے، علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح و مرصع نو جوانوں کو میں نے دیکھا کہ وہ خالص علمی و ذہنی سطح پر مولانا کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ لے کر واپس گئے۔'' (معارف، سلیمان نمبر)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ ذاتی اوصاف تھے جن کے باعث جہاں مولانا شبلی کام یاب نہ ہو سکے وہ کام یاب ہوئے اور جو عام و ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا وہ ان کے استاد کو حاصل نہ ہو سکا تھا، علما نے ان پر اعتماد کلی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ جمعیۃ العلمائے ہند اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے، ایک عرصہ تک اس کی مجلس عاملہ کے سربرآوردہ ممبر رہے، جمعیۃ العلمائے ہند کے زیر اہتمام دلی میں جو آل انڈیا فلسطین کانفرنس ہوئی تھی تو اس کے صدر بھی وہی تھے، ندوۃ العلما کی وہ سرزمین جو مولانا شبلی پر تنگ ہو گئی تھی مولانا سید سلیمان ندوی کے لیے اس نے عزت و احترام کے ساتھ اپنی آغوش کھول دی، پھر علما خواہ کسی مسلک کے ہوں، ان سب میں ان کا بڑا وقار اور درجہ تھا اور سب دل سے ان کے علم و فضل کے مداح ہونے کے ساتھ ان کے اخلاق و فضائل کے قدردان تھے، دوسری طرف جس علی گڑھ کو مولانا شبلی نے حالات سے تنگ اور مجبور ہو کر خیر باد کہا تھا اسی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی و اسلامی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ مولانا کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے پر فخر کیا، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اور اس کی بعض مجلسوں کے رکن رکین ایک مدت تک رہے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو مولانا کی ذات کے ساتھ جو

عقیدت وارادت تھی اس کا اظہار مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال رحمہما اللہ تعالیٰ کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو ان دونوں بزرگوں نے مولانا کو لکھے، مولانا محمد علی کے خطوط میں تو خیر بڑی عقیدت اور جوش ارادت ہی کا اظہار ہے لیکن ڈاکٹر اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مسائل اور مباحث پر غور کرتے وقت انہیں جب کوئی الجھن پیش آتی تھی تو وہ فوراً مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو مولانا کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی اس کا عملی اظہار انہوں نے اس طرح بھی کیا کہ ادارہ معارف اسلامیہ جس کے بانی خود ڈاکٹر صاحب تھے اس کے اجلاس لاہور کی صدارت انہوں نے مولانا کو پیش کی اور پھر صدارت کی تحریک کرتے وقت انہوں نے جو الفاظ مولانا کی نسبت کہے تھے وہ ان کے دلی جذبات وارادت کے آئینہ دار تھے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اعتماد کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ خلافت کا جو وفد انگلستان گیا تھا، مولانا اس کے رکن تھے، پھر حجاز کی مؤتمر اسلامی میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان سے خلافت کا جو وفد گیا تھا جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، شعیب قریشی جیسے لوگ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے نمائندہ تھے، مولانا اس وفد کے امیر تھے، اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیاں اور ان یونیورسٹیوں کے مختلف علمی وادبی ادارے مولانا کو برابر بلاتے رہے اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔'' (معارف، سلیمان نمبر، صفحہ ۱۶۱-۱۶۲)

نظمیں وتاریخی قطعات

حضرت سید صاحب کی وفات پر شعرا نے اس قدر کثرت سے نظمیں اور تاریخی قطعات لکھے کہ معارف میں مہینوں ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، ان سب کا نقل کرنا دشوار ہے، اس لیے صرف چند منتخب نظمیں اور قطعات نقل کیے جاتے ہیں۔

آہ علامہ سید سلیمان ندوی

از جناب ثاقبؔ کان پوری

سرنگوں علم وعمل کا ہے پھریرا کیوں آج
غم زدہ ہم کو نظر آتی ہے دنیا کیوں آج

آج ندوے میں بچھی ہے صف ماتم کیسی
حشر سے پہلے یہ اک حشر ہے برپا کیوں آج

کون روپوش ہوا نیر اخلاص وعمل
تارے مدھم سے ہیں اور چاند ہے دھندلا کیوں آج

ہل رہی ہے غم و اندوہ سے قبر شبلیؒ
زلزلہ ہند کے اطراف میں آیا کیوں آج

آج سب اہل نظر چاک گریباں کیوں ہیں
اشک آلود ہے ہر دیدۂ بینا کیوں آج

آج سنتے ہیں کہ مولانا سلیماں نہ رہے
تھے جو انسانوں میں ممتاز وہ انساں نہ رہے

اے سلیماں تیری عظمت ہے زمانے پر عیاں — جانتا کون نہیں آج تیری قدر جلیل
نثر کا تیری تھا انداز معارف پرور — کیا غلط ہے کہ جو شبلی سے تجھے دیں تمثیل
کام جو باقی تھا پورا وہ کیا ہے تو نے — سیرت احمد مرسلؐ کی ہوئی ہے تکمیل
تجھ کو بخشے گئے وہ علم و ادب کے جوہر — بن گئے نقش قدم تیرے ادیبوں کی دلیل
علم تاریخ کا بے شبہ محقق تو تھا — قدر تصنیف کی تھیں تیری تصانیف کفیل
تھی ضرورت کہ ابھی اور جہاں میں رہتا — آہ افسوس کہ رحلت میں ہوئی ہے تعجیل

مرگ بے وقت نے کیا داغ دوگونا چھوڑا
بزم تالیف و تصانیف کو سونا چھوڑا

چاہتے تھے تجھے ہم تیری بھی ہستی نہ رہی — موت سے تیری ہے ہر سمت بپا اک کہرام
اللہ اللہ یہ تیری موت کا غم ناک اثر — غم کدہ ندوہ ہے تصویر الم ہیں در و بام
ہائے کس وقت تجھے موت نے ہم سے چھینا — کام جو تیرے تھے اب دے گا انہیں کون انجام
کشور پاک کو اب بھی تھی ضرورت تیری — سامنے تھے تیرے آئین شریعت کے کام
تو دیا کرتا تھا اکثر میرے گھر کو زینت — کیوں جدائی سے نہ ہو پھر مرا دل بے آرام

ہستیاں ایسی کہاں ایسے اب افراد کہاں
ثاقبؔ اس قوم میں اس قسم کے مناد کہاں

یادِ سیّد

از جناب یحییٰ اعظمی

ہو گئی پھر تازہ یاد سید معجز قلم — آ گئی تیئیس نومبر کی گذشتہ شام غم

ہو گیا مصروف ماتم پھر جہان علم وفن — وقف غم پھر ہو گئی دنیائے قرطاس وقلم
مسند استاد پھر سونی نظر آنے لگی — بن گئی بزم معارف پھر سراپا بزم غم
زمزمے حکمت کے ہیں اب وہ نہ نکتے علم کے — ہوگئی ہے کہ کس کے ماتم میں جبین خانہ خم
دیر سے روشن تھی جو وہ شمع دانش بجھ گئی — ہے بجا گر ہیں سیہ پوش آج اسرار وحکم
کس کی محفل میں قلم اس کا ہے اب معجز طراز — وہ کہ مسجود ملک تھا جس کا ہر نقش قلم
نسخہ سیرت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے — اب کہاں سے لائیں گے ہم وہ خامۂ معجز رقم
ہم نے مانا منتظر تھی قدس کی محفل مگر — اس قدر عجلت تھی کیا اے سید والا شیم
کارنامے تیرے مقبول حریم قدس ہیں — تیری صورت کی قسم پاکیزہ سیرت کی قسم
سرور کونین کے دربار میں ہے مستجاب — زندگی بھر کی تیری سعی گرامی لا جرم
صرف کردی مدح سرکار دو عالم میں حیات — تیرے طغرائے شرف کے واسطے یہ کیا ہے کم
تیری ہی ذات گرامی کے لیے مخصوص تھے — طرۂ تاج معارف خاتم مجد و کرم
تیرے فیضان معارف سے سبھی تھے بہرہ مند — ہند سے تا خاک پاکستاں عرب سے تا عجم
روز اٹھتے ہیں کہاں ایسے رجال علم وفن — عصر نو میں یہ مبارک زندگی تھی مغتنم
غیر ممکن ہے تلافی آہ اس فقدان کی — تیری ہستی تھی وطن میں نازش خیر الامم
سینۂ امت سے مٹ سکتا نہیں ہرگز یہ داغ — کس طرح ملت بھلائے سید الملت کا غم
تیرے اس عزم سفر کی ہم کو کیوں ہوتی خبر — دیر سے تھے دور تیری بزم سے اے محترم
آہ کیا معلوم تھا اے سید ومولائے ما — محفل امکاں سے اب اٹھنے کو ہیں تیرے قدم
ورنہ کچھ جلوے جمال آخریں کے جا کے ہم — اپنی چشم تر میں کر لیتے ادب سے مرتسم

آہ یہ تنہا نہیں اک ملت وامت کا غم
بلکہ ہے سارے جہان دانش وحکمت کا غم

علامہ سید سلیمان ندوی

از جناب مولانا سید احمد صاحب عروج قادری

گلشن سیرت میں جس کے دم سے آئی تھی بہار
اے دریغا چل بسا دنیا سے وہ سیرت نگار

وہ محقق جس کی باتیں دل نشین و بے غبار
جس کا نامہ نورافشاں جس کا خامہ زرنگار

وہ مؤرخ جس کی تاریخی سند کا اعتبار
جس کے تصنیفی ذخیرے سیم و گوہر در کنار

سرور دنیا و دیں کا ذکر جس کا مشغلہ
سیرت پیغمبر برحق ہے جس کا شاہ کار

وہ محرر جس کی تحریروں میں بستی تھی نسیم
وہ مقرر جس کی تقریروں میں پلتی تھی بہار

اک طرف اردو زباں افتادہ ہے باصد ملال
اک طرف تاریخ اسلامی کھڑی ہے سوگوار

اک طرف خیام سا رند ازل افسردہ دل
اک طرف رومی و حافظ کی نگاہیں اشک بار

جس کی شہرت تا بہ مصر و تیونس و شام و عراق
جس کی عزت تا بمکہ مکہ گردوں وقار

آخری شب کی طراوت جس کے چہرے سے عیاں
جس کی نورانی جبیں پر نور باطن آشکار

جس کے لب پہ دم بہ دم اللہ ہی اللہ تھا
آہ رخصت ہو گیا وہ عابد شب زندہ دار

ان کی شفقت اور نصیحت اب بھی مجھ کو یاد ہے
ان کی آہستہ کلامی ان کا وہ علمی وقار

رو رہا ہے باغ دیسنہ[1] انقلاب دہر پر
سرزمین سندھ میں سونپا گیا گنج بہار

میرے بس میں بس دعا ہے تیرے احساں کا صلہ
میں بھی ممنون کرم ہوں سید عالی تبار

ماہ و انجم رہروؤں کے رہنما جب تک رہیں
تیری خاک پاک پر ہو رحمت پروردگار

---

[1] سید صاحب کا وطن۔

قطعۂ تاریخ

انتقال پر ملال علامۂ عصر و فاضلِ دوراں مولانا سید سلیمان ندویؒ

از شاہ ولی الرحمٰن صاحب ڈپٹی کلکٹر

اے جن و انس ہے یہ قیامت کا حادثہ
رخصت ہوئے جہاں سے سلیمان خوشخصال

یہ واقعہ مصیبت عظمیٰ سے کم نہیں
یہ سانحہ قیامت کبریٰ کی ہے مثال

علم و ادب کی بزم ہے ویراں و مضمحل
خاموش ہوگئی ہے جو اک شمع بے مثال

عالم کی موت اصل میں عالم کی موت ہے
اک فرد ہی کی موت کا تنہا نہیں سوال

ویراں نہ صرف علم و ادب کا دیار ہے
ہے بلکہ مرغ ملت بیضا شکستہ بال

تاریخ دان عصر و سوانح نگار بھی
تاریخ و سیرت و ادب و سنت و رجال

اللہ رے ان کے خامہ رنگیں کا معجزہ
ہر شعبہ علوم میں دکھلا دیا کمال

کس دل میں کارناموں کی ان کی نہیں ہے یاد
کس شہر میں ان کے علم و عمل کا نہیں جمال

آئی پسند خدمت دارالمصنفین
ان کو اسیر کر نہ سکی زلف جاہ و مال

اب صوبہ بہار سے رخصت ہوئی بہار
اٹھیں گے اس کی خاک سے ایسے نہ باکمال

تکمیل کو پہنچ نہ سکی سیرۃ النبی
اس غم سے شائقین ادب کیوں نہ ہوں نڈھال

ذات ان کی آہ ہوگئی واصل بذات حق
قطرہ کا یعنی ہو گیا دریا سے اتصال

ان کے بغیر دل کو کسی کے نہیں قرار
فرقت میں ہیں اعزہ و احباب خستہ حال

اس حادثہ سے پڑ گئے سب کے دلوں میں زخم
ایسی جراحتوں کا ہے دشوار اندمال

رحمت کے پھول ان کی لحد پر کھلے رہیں
ہو ان کی خاک مرجع انوار ذوالجلال

تھا غرق بحر فکر ولی خامۂ حزیں
بہر تلاش مادۂ سالِ ارتحال

ہاتف نے میرے گوش حزیں میں یہ دی صدا
لکھ از سر بکا غم فاضل بصد ملال
۱۹۵۱ء ۱
۲ ۲
۱۹۵۳ء

نذرِ عقیدت

از جناب عبدالحلیم صاحب سلطان پوری

الوداع اے ساقی جام شریعت الوداع
الوداع اے قائد وفد خلافت الوداع
الوداع اے ناظم اجزائے ملت الوداع
الوداع اے کاشف اسرار سیرت الوداع
تو سلیماں جانشین شبلی مرحوم تھا تو سلیماں ہم زبان حالی مرحوم تھا
الفراق اے آفتاب علم و عرفاں الفراق
الفراق اے رہنمائے ارض قرآں الفراق
الفراق اے نغمہ خیام ایراں الفراق
الفراق اے ہند کی شمع شبستاں الفراق
آج بزم علم میں وہ نور ربانی نہیں شمعیں گو جلتی ہیں لیکن ضوء نعمانی نہیں

السلام اے قرن اول کی مکمل یادگار
السلام اے ندوۃ العلما کے در شاہوار
السلام اے مرد غازی عابد شب زندہ دار
السلام اے کعبہ تحقیق کے اونچے منار
تیرا پرچم آسمان علم پر لہرائے گا
ہر محقق تیری تصنیفات کو دہرائے گا

قطعہ تاریخ رحلت حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

از جناب عطاالرحمٰن صاحب عطا کاکوی

وہ آہ! حضرت علامہ سلیماں آہ — رموزِ دین کا وہ راز داں نہ رہا
وہ نور علم وہ غواص بحر سیرت پاک — چراغ مصطفوی کی وہ تابناک ضیا
وہ عالم تبحر فقیہ نکتہ شناس — ادیب بے بدل و بے نظیر و بے ہمتا
وہ جلوہ گل سر سبد گلشن ندوہ — شمیم عطر تقدس نسیم باغ صفا
تھا جس کی ذات پر دارالمصنّفین کو ناز — ہزار حیف وہ سرمایۂ ادب نہ رہا
جنید ہند و اشرف علیؒ کا حلقہ بگوش — بہ فیض زہد و ورع جانشین شبلی کا
وہ فخر ملت اسلامیہ فرید العصر — خم معارف دیں کی مئے سرور افزا

رندھی رندھی سی فضا سونی سونی محفل ہے
چراغ علم بجھا آہ! آہ! آہ! عطا
۱۳۷۳ھ

قطعہ تاریخ وفات علامہ سید سلیمان ندویؒ

نور اللہ مرقدہ

از مولانا حکیم فخر الحسن صاحب سہسرامی

صاحب عرفان و اہل علم آہ — مولوی سید سلیماں نیک نام
دفعۃً آمد پیام وصل حق — رفت از دنیا سوئے دارالسلام
رنج و غم افزود مرگ ناگہاں — کرد محزوں فرقتش ہر خاص و عام
حیف مرگش روز یکشنبہ رسید — از نومبر بست و دو بوقت شام

گفت سال رحلتش غمگیں حکیم
رحمت حق بر مزارش صبح و شام
۱۳۷۳ھ

تاریخ ارتحال علامہ سید سلیمان ندویؒ

از جناب سید شاہ محمد منظور الرحمٰن اختر کاکوی

وا دریغا نقش شبلی را امیں — در کراچی گشت پیوند زمیں
سید عالی ہمم عالی صفات — اہل علم، اہل عمل، اہل یقیں
بود موسوم از سلیماں در جہاں — متقی و عالم دین متیں
کرد ہجرت از برائے ارض پاک — بود صیاد اجل اندر کمیں
روح پاکش چوں رواں شد سوئے خلد — قدسیاں شاداں و فرحاں حور عین
سال رحلت را چو اختر فکر کرد — چشم گریاں بود و دل اندوہ گیں

گفت رضواں بر در خلدش جزاک
۳
باز گفتہ ادخلوھا خالدین
۱۳۴۲+۳۱=۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخِ وفات حسرت آیات علامہ سید سلیمان ندویؒ

از سید صمصام شیرازی مدیر شیراز حیدرآباد دکن

آصف قوم سلیماں ندوی بود و نبود — عالم اہل تسنن دگرے بہتر ازیں
سید ننگ سلیماں ندوی بود و نبود — در خیابان سیادت شجرے بہتر ازیں
نخل پر میوہ سلیماں ندوی بود و نبود — بر سر شاخ فضیلت ثمرے بہتر ازیں
دانش آموز سلیماں ندوی بود و نبود — صاحب معرفت و باخبرے بہتر ازیں
صائب الرائے سلیماں ندوی بود و نبود — مرد میدان عمل فرد جری بہتر ازیں
ناشر علم سلیماں ندوی بود و نبود — فاضل جید و صاحب نظرے بہتر ازیں
صاحب درد سلیماں ندوی بود و نبود — عاشق صادق و آشفتہ سرے بہتر ازیں
شمس تا بندہ سلیماں ندوی بود و نبود — روشنی بخش زمانہ قمرے بہتر ازیں
در اخلاص سلیماں ندوی بود و نبود — درصدف ہائے محبت گرے بہتر ازیں
صاحب طرز سلیماں ندوی بود و نبود — اہل دل اہل قلم دیدہ ورے بہتر ازیں
مایۂ ناز سلیماں ندوی بود و نبود — افتخار فضلا نام ورے بہتر ازیں
نازش ملک سلیماں ندوی بود و نبود — شخص باعز و شرف ذی اثرے بہتر ازیں
خواستہ باشی اگر سال وفاتش صمصام — بشنو از من کہ نگوید دگرے بہتر ازیں

ہر کہ پرسید ز من سال وفاتش گفتم
مادر ہند نہ بیند پسرے بہتر ازیں

۱۹۵۳ء

دریغا سید سلیمان ندویؒ

از جناب اشفاق حسین صاحب، کراچی

دریغا کہ سید سلیمان ندوی — کہ بودہ سر عالمان زمانہ
فقیہ و مفسر ادیب و محدث — مؤرخ محقق یگان زمانہ
کلاہِ سر افتخار و بزرگی — عمید و عمود سران زمانہ
تقیؒ، نقیؒ، صفیؒ، ولیؒ — سبق بردہ بر صوفیان زمانہ
چہ صاحب دلے منبع علم و عرفاں — ستودند صاحب دلان زمانہ
قلیل الطعام و قلیل المنام — قلیل الکلام میان زمانہ
مفیض علوم و معارف بدنیا — کہ بد اوستا اوستان زمانہ
باقوام عالم معرف مشرف — مکرم باسلامیان زمانہ
مخلی ز سو و محلی باحساں — برومند از و محسنان زمانہ
حیات زماں طیبہ ز علومش — زماں مثل جسم اوزان زمانہ
چو رخت سفر بست بازاد و رحلہ — گوگیر شد خاندان زمانہ
ازیں حادثہ عالم دل گرفتہ — دریں فاجعہ عالمان زمانہ
گزید آشیاں طیر روحش بسدرہ — پریدہ ازیں آشیان زمانہ
فلکیاں بگفتند اہلاً و سہلاً — بہ غم مبتلا فانیان زمانہ
بفردوس باید سلیماں سریرے — دعا از من و دوستان زمانہ

بہ محشر شفیعش شفیع الوریٰ کن
بجنات بامخلصان زمانہ

۱۳۷۳ھ

قطعِ تاریخ

از جناب قاضی فتح محمد فاتح، بی،اے، منشی فاضل (بھکر)

آہ برفت آں ندوی سلیماں | جانب جنت شاداں و فرحاں
خلق بمرگش زار و پریشاں | چاک گریباں سینہ بریاں
اہل کراچی افتاں خیزاں | سوئے جنازہ زود گریزاں
جملہ مسلماں ششدر و حیراں | آہ سلیماں آہ سلیماں
رفت مؤرخ و عالم و شارح | صدر گرامی محفل عرفاں
سیرت احمد مرسل گفتہ | سفتہ بہ سلکِ لآلی تاباں
نثر مقفٰی نظم مرصع | فکر بہ اوج ثریا طیراں
آہ ز مرگش گشت فسردہ | مسند ایماں منبر ایقاں
تخت فقہ را صدر خاندہ | رخت سلیماں رشک سلیماں
قائل حکمت و تحقیقش را | رازی و سینا سعدی و سحباں
نام بلندش تاباں ہر سو | ماہ درخشاں انجم رخشاں
باز نیاید از ما رفتہ | رفت بگوشۂ روضۂ رضواں
صبر و تحمل باید کردن | اے دل نالاں اے دل ناداں

فاتحہ خواند و فاتح گفتہ

اہل ادب دہ گو نہ سلیماں

۹۱۰-۱۰×۱۹۱×-۴۳

۱۹۵۳ء

ضمیمہ

سید صاحب ہر قسم کے مسائل پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے، ان میں وہ شذرات (سونے کے ٹکڑے) بڑے حکیمانہ اور اسم با مسمّٰی ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی و ملی زندگی کے اجزاو عناصر پر لکھے ہیں، ان میں ان کی ترقی و تنزل اور بقاو استحکام کا پورا فلسفہ بیان کردیا ہے، کچھ شذرات مختلف مسائل کے سلسلہ میں اوپر نقل ہو چکے ہیں اور کچھ نہیں ہو سکے، یہ شذرات وقتی نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت مستقل درس کی ہے، جن سے ہر زمانہ میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس لیے نمونۃً چند شذرات کا آخیر میں نقل کردینا مناسب معلوم ہوا۔

ملت اسلامیہ کی قوت و حیات اور ترقی و تنزل کے اصول

مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب، تجزیہ اور اس کا علاج: مسلمانوں کے اختلاف کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”رائے اور تخیل کے لحاظ سے مسلمانوں کا جو عام حال ہے وہی ان کے قومی مظاہر کی صورت ہے، ان کی یونیورسٹی سے لے کر ان کے کالج، اسکول، مدرسہ اور مکتب تک اور اسمبلی سے لے کر کونسل، ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی تک ہر جگہ اختلاف آرا، نفاق انگیزی اور ہنگامہ آرائی کی ایک صورت ہے، آخر آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی اصل وجہ اور علت کیا ہے؟

اصل یہ ہے کہ قوموں کے منتشر افراد میں جامعیت، یکجائی اور اتحاد پیدا ہوتا ہے، اس کی وحدت اعتقاد اور وحدت خیال اور وحدت مقصد سے، اگر اعتقاد، خیال اور مقصد میں خواہ وہ سیاسی ہو یا قومی، معاشرتی ہو یا مذہبی، کسی قسم کی وحدت اور جامعیت نہ ہوتو اعتقاد، خیال اور مقصد کے اعمال و مظاہر میں اتحاد و وحدت کا جلوہ کیوں کر نظر آئے گا، یہی سبب ہے کہ مذہبوں میں بھی ایمان کو عمل صالح کی بیخ و بنیاد مان کر ایمان کو اصل اور اعمال صالحہ کو اس کی فرع قرار دیا گیا ہے کہ اگر اعتقاد نہیں تو اس کے مطابق عمل بھی نہیں ہوسکتا، جڑ کھوکھلی ہوتو برگ و بار اور شاخوں کی تر و تازگی کا کیا سوال ہے؟

ہر قوم کی ترقی و تنزلی کا صرف ایک سبب ہے، وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کے تمام یا بیش تر افراد میں کسی ایک اعتقاد، خیال اور مقصد کے لیے ایسی وحدت پیدا ہو جاتی ہے جو شیرازہ بن کر منتشر افراد کو جکڑ کر ایک دوسرے سے ملا کر اس طرح سے ایک کر دے کہ ان کا جینا اور مرنا اسی کے لیے ہوتو وہ قوم اپنے میں نا قابل تسخیر قوت پاتی ہے اور ہر مشکل کے پہاڑ کو سیلاب بن کر بہا لے جاتی ہے اور ذاتی اغراض، مال کی حرص و طمع ،نفسانی اور خاندانی عزت و آبرو کی خواہش وغیرہ ہر چیز اسی وحدت مقصد کی تیز آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔

آج زبانوں پر تنظیم تنظیم کا نام ہے، مگر تنظیم ہے کیا، معارف کو فخر ہے کہ سب سے پہلے آج سے چودہ برس پہلے (۱۷ء میں) اسی نے لفظ ''تنظیم'' اور اس کا مفہوم سب کے سامنے پیش کیا تھا، لفظ تو سب نے قبول کر لیا، مگر معنی کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، تنظیم نام حکومت یا کانگریس کی معیت، سول نافرمانی میں شرکت یا عدم شرکت، گول میز کانفرنس میں جانے یا نہ جانے، جمعیۃ العلما یا توسیع نظام علما میں شامل ہونے، خاص مسلمان یا عام ہندوستانی پارچہ بافوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں کے خریدنے کا نہیں، یہ سب تو نتائج و مظاہر و فروع ہیں اور یہاں بحث اصل اور جڑ کی ہے۔

تنظیم اور جامعیت کی حقیقت تمام قوم کے مقصد، غرض و غایت، خیال اور نصب العین کی وحدت اور اتحاد ہے، یعنی تمام افراد کی باہمی کوشش، جدوجہد، دوڑ دھوپ خواہ کسی قدر متعدد، مختلف اور متفاوت ہو لیکن ہو سب ایک ہی غرض، ایک ہی جہت اور ایک ہی مقصد کے لیے جب تک یہ نہ ہو لفظ تنظیم بے معنی، کوشش بے سود، جدوجہد بے نتیجہ اور سعی و محنت بے کار ہے۔

ایک سلطنت کے کتنے مختلف اجزا، متعدد ارکان اور متفاوت عہدے ہوتے ہیں، چپراسی سے لے کر سپہ سالار اور وزیر اعظم تک ہزاروں اور لاکھوں کارکن افراد ہوتے ہیں لیکن یہ سب مل کر جب تک ایک ہیں اور ایک عقیدہ اور نظریہ کے ماننے والے ہیں، وہ سلطنت قائم ہے، جہاں ان میں اغراض و مقاصد کا اختلاف ہوا اخلاص خدمت کا فور ہوا، حکومت کی فلاح پر ذاتی فلاح کو ترجیح ہوئی، طوائف الملوکیاں پیدا ہوئیں اور ایک سلطنت مٹ کر بیسیوں ٹکڑوں میں بٹ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ جو پہاڑ تھا وہ ایک ہی ٹکر میں خاک کا تودہ اور ذروں کا انبار بن گیا، جس کی تباہی کے لیے آندھی کا ایک جھونکا کافی ہے۔

مسلمانوں کی بڑی سے بڑی درس گاہ اور انجمن سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے مکتب اور جماعت تک یہی صورت حال ہے اور درس گاہیں، انجمنیں اور جماعتیں مختلف افراد اور ارکان سے مرکب ہوتی ہیں مگر ان پورے ارکان میں کوئی وحدت مقصد، کوئی اتحاد غرض، کوئی جامعیت خیال نہیں ہوتی، جو ان کو اخلاص، ایثار، انہماک، خدمت اور قربانی پر آمادہ کر سکے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہر مشورہ کی مجلس پہلوانوں کا اکھاڑا اور ہر مجلس انتظامیہ شخصی اور ذاتی اغراض کا معرکۂ کارزار ہوتی ہے، کیا یہ ضروری نکتہ ہم سب لوگوں کے سوچنے کے لائق نہیں؟ (معارف، ستمبر ۱۹۳۰ء)

قدیم و جدید کا مسئلہ فریب نظر ہے: دوسری قوموں سے مرعوبیت، خیالات و تصورات اور تہذیب و معاشرہ میں ان کی نقالی، غلط قسم کے تجدد اور غیر معتدل ترقی پسندی بلکہ

درحقیقت نفس مفروضات یا غلط مسلمات کا نتیجہ ہوتے ہیں، سید صاحب نے ان پر بڑی حکیمانہ تنقید فرمائی ہے، قدیم وجدید کی جنگ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''قدیم وجدید کی جنگ دنیا میں ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن کبھی اس پر غور کیا ہے کہ قدیم وجدید دونوں حقیقی نہیں بلکہ اضافی نسبتوں سے ہیں، ہر قدیم اپنے اگلے کے لحاظ سے جدید اور ہر جدید آئندہ کے لحاظ سے قدیم ہے، عہد شاہ جہانی کا طور طریق، تہذیب وتمدن، لباس وپوشاک اور طرز عمارت اپنے زمانہ میں کتنا پسندیدہ، معیاری اور مقبول ہوگا لیکن محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں وہی بھدا، نازیبا اور ناپسندیدہ ٹھہرا ہوگا، پھر ابتدائی انگریزی عہد میں انگریزی لباس کس قدر ہندوستانیوں کو ناپسندیدہ، غیر دلکش بلکہ بدنما اور بدتہذیبی اور بے شعوری کا مرقع نظر آتا ہوگا، بالآخر پچیس تیس برس میں وہ تہذیب و شرافت اور بڑی سوسائٹی کا شان امتیاز وطریق حصول اعزاز بن گیا، اب اگر عہد شاہ جہانی کا کوئی وضع دار امیر اپنی پگڑی، جامہ اور گھیتلے جوتوں میں ہمارے سامنے آئے تو ہم اس کو کیا سمجھیں گے، اس لیے آج آپ جس کو جدید سمجھ کر خوش ہورہے ہیں اور جس کو عقل ودانش، فضل وکمال اور تہذیب وتمدن کا معیار سمجھتے ہیں اس کی زندگی بھی کتنے دن کی ہے، پھر یہ جدید وقدیم کی جنگ بے معنی ہے، کسی چیز کے حسن وقبح کے پرکھنے میں ہم ہمیشہ دھوکا کھاتے ہیں کہ پسند تو اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں اور اس قابل پسند ہونے کی اہلیت خود ان اشیا میں یقین کرتے ہیں، حالاں کہ حسن وقبح بالذات اشیا میں نہیں ہے، بلکہ خود ہماری آنکھوں میں ہے۔

ظاہری لباس ووضع کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یہی حال اندرونی افکار وخیالات کا بھی ہے، وہ ہر عہد میں نئے اور ہر زمانہ میں متغیر ہوتے ہیں، اور جس طرح ہر زمانہ میں جو لباس اور جو وضع مقبول ہوجاتی ہے اس کی قبولیت کی دلیل عقلی نہیں ہوتی، بلکہ سراسر زمانی ہوتی ہے، یعنی وہ حسن اشیا میں نہیں بلکہ اس زمانہ کے دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہوتا

ہے، اسی طرح ہر زمانہ میں جو خیالات پھیل جاتے ہیں وہ نظری ہونے کے باوجود بھی اس زمانہ میں بالکل بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں، حالاں کہ ان خیالات کی جدت ان کے عقلی اور مبنی برحکمت ہونے کی شہادت نہیں، اس لیے صرف جدید اور نیا ہونا یا کسی عہد میں رواج پذیر اور شائع ہونا کسی اندرونی خوبی کی قطعاً دلیل نہیں:

بیاؤ یکدمے تو در کمین خود بہ نشیں

اصل چیز دائمی حقیقت ہے: پھر کیا ابدی اور دائمی حقیقت کوئی چیز نہیں اور ہر چیز تغیرات زمانہ کے نظر فریب طلسمی وجود سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس کا جواب آپ کو ابھی مل جائے گا، ان نت نئے تغیرات اور دم بدم بدل جانے والے اشکال وصور کے ساتھ ساتھ ایک دائمی حقیقت بھی ہمیشہ موجود ہے، وضعیں بدلتی ہیں، شکلیں مٹتی بنتی ہیں، تراش وخراش بگڑتی اور بنتی ہے، مگر ایک چیز ان تغیرات کے اندر ہمیشہ قائم ہے اور وہ سردی اور گرمی سے بچاؤ اور بعض اعضا کی کوشش کا لحاظ یہی غیر متغیر اور غیر معتدل خیال لباس کی حقیقت ہے، جو ہزار تغیرات کے باوجود قائم ہے اور یہی غیر متغیر حقیقت اہل نظر کی نگاہوں میں لحاظ کے قابل ہے، اسی اصول کو باطنی خیالات وافکار کی حقیقت رسی کے کام میں لا سکتے ہیں اور حقیقت و فریب کے درمیان فرق کر سکتے ہیں اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ جو اس راستہ سے مجاز کے فریب سے نکل کر حقیقت کی منزل تک پہنچے ہیں۔'' (شذرات، معارف، ماہ مارچ ۱۹۳۲ء)

حسن وقبح اور محال وممکن کے فیصلہ کا معیار: اس سلسلہ بحث میں اپریل ۱۹۳۲ء کے معارف میں لکھتے ہیں:

''لوگ سمجھتے ہیں کہ جو آج ممکن ہے وہ ہمیشہ ممکن تھا اور جو آج محال ہے وہ ہمیشہ سے محال تھا اور رہے گا، جو تمام تر غلط ہے، کل یہ محال سمجھا جاتا تھا کہ سیکڑوں میل کی دوری سے کسی کی آواز سن لی جائے، یا اس کی صورت دیکھ لی جائے مگر آج یہ محال نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ ہے، پھر آج ہم جس کو محال کہہ رہے ہیں کیا ضرورت کہ کل بھی وہ محال باقی رہے

گا، پھر اپنے کسی دعویٰ کی صداقت اور کسی دوسرے کے قول کے بطلان پر ممکن و محال کہہ کر استدلال کرنا اور اس امکان و استحالہ پر اس وثوق سے گفتگو کرنا علم کا ثبوت ہے یا جہالت کا۔

پھر ہر دعویٰ کے انکار و تردید میں نہایت آسانی مگر پورے وثوق کے ساتھ ہم کہہ گزرتے ہیں کہ یہ خلاف عقل ہے لیکن یہ کہتے وقت ذہن میں خلاف عقل سے مقصود اپنی عقل کے خلاف ہوتا ہے اور دعویٰ کا ابطال اس پر موقوف ہے کہ وہ ہر انسان کی عقل کے خلاف ہوگا اور ایسا ثابت کرنا آسان نہیں، پھر کیا یہ حماقت نہیں ہے کہ جو بات اپنے پیمانہ عقل میں نہ سما سکے اس کی نسبت یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ وہ تمام دنیا کی عقل سے باہر ہے۔

جب تمہارا مخاطب یہ کہتا ہے کہ فلاں بات خلاف عقل ہے تو تم نہایت آسانی سے اس سے یہ پوچھ سکتے ہو کہ یہ کس کی عقل کے خلاف ہے، اگر کسی فرد یا ایک محدود جماعت کے خلاف ہو تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ حقیقت میں خلاف عقل ہے، بالکل افراد انسانی کی عقلوں کے خلاف ہے اور جب تک یہ ثابت نہیں دعویٰ کا انکار و بطلان محال ہے۔

شاید کہ ایسے برخود غلط عقلائے زمانہ یہ سمجھتے ہوں کہ جو بات ایک عقل میں نہ سما سکے وہ کسی کی عقل میں بھی نہیں آسکتی، تو گویا ان کے نزدیک عقل ایک ایسا معیار ہے جو ہر انسان کے قبضہ میں برابر ہے، حالاں کہ اگر ایسا ہوتا تو ہر انسان یکساں ارسطو، بوعلی سینا اور ایڈیسن ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے، ایک احمق انسان جس کو محال جانتا ہے عاقل انسان اس کو ممکن سمجھتا ہے اور اس سے عاقل تر انسان اس ممکن کو واقعہ بنا دینے کی قدرت رکھتا ہے، غرض عقل انسانی کا کوئی ایسا معیار نہیں، بلکہ اس کے سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں مراتب و مدارج ہیں اور ایک دوسرے سے عاقل اور اس سے بھی عاقل تر لوگ موجود ہیں، اسی نکتہ کو قرآن پاک نے ان مختصر لفظوں میں ادا کیا ہے، وفوق کل ذی علم علیم یعنی ہر عالم کے اوپر ایک عالم اور ایک عاقل کے اوپر دوسرا عاقل ہے، اس لیے کوئی ایسی چیز جو متفقاً تمام عقول انسانی

کے نزدیک قطعاً محال ہو چند منطقی باتوں سے زیادہ نہیں، باقی آپ جن جن چیزوں کو جلدی سے محال عقلی کہہ بیٹھتے ہیں یا تو وہ سرے سے محال ہی نہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ وہ محال ہیں جن کو اصطلاح میں محال عادی کہتے ہیں۔

یہ بات کہ ہر انسان میں عقل کا معیار و مرتبہ متفاوت اور دوسرے سے مختلف اور کم وبیش ہے، بدیہی ہے جس کو ہر شخص جانتا اور مانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک شخص ایک مسئلہ نہایت آسانی سے سمجھ جاتا ہے اور دوسرا سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتا، ایک وہ ہیں جو عجیب سے عجیب آلات ایجاد واختراع کرتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو ان کو دیکھ کر بھی ان کو کام میں نہیں لا سکتے، پھر یہ کیسی حماقت ہے کہ جو بات ایک کی عقل میں نہ سما سکتی ہو وہ اس کو ایسا محال تسلیم کرلے کہ اس کی بنیاد پر بڑے بڑے اور دانا سے دانا انسان کی تکذیب کی جاہلانہ جرأت کرتا ہے اور اس کا نام علم رکھتا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیے، نہ صرف یہ کہ عقول انسانی تمام افراد انسانی میں متفاوت ہیں، بلکہ ہر شخص کی عقل اس کی عمر کے مختلف حصوں میں بھی یکساں نہیں رہتی اور عمر کے ہر حصہ میں ممکن ومحال اور مخالف عقل وموافق عقل کا معیار بدلتا رہتا ہے، ایک کمسن بچہ کتنے کتنے ممکنات کو محالات اور کتنے واقعی محالات کو ممکنات میں سے جانتا ہے اور ان کے لیے روتا اور ضد کرتا ہے، مگر جیسے جیسے اس کی عمر آگے بڑھتی ہے، تجربے بدلتے ہیں اور معلومات بڑھتے ہیں، اس کے ممکن ومحال اور عقل کے مخالف وموافق ہونے کے معیار بھی بدلتے رہتے ہیں، پھر کوئی انسان کہہ سکتا ہے کہ انسان کی کسی حصہ عمر کے معیار عقل کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے۔

اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ ہر انسان کی ذہنی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی، ایک وقت میں جو ملحد ہے وہ دوسرے وقت میں دین دار اور خدا پرست ہوسکتا ہے، ایک شخص جو آج صرف فطرت اور نیچر کو کارفرما سمجھتا ہے کل وہ وہم پرست بن کر ہر چیز کو فاعل اور موثر

یقین کرنے لگتا ہے، کتنے ملحد ہیں جو کل ہر چیز کا انکار کرتے تھے اور آج وہ کسی وجہ سے ایسے بدلے کہ قبروں کو جھک جھک کر سجدہ کرتے ہیں اور انسان کو خدا کا مرتبہ دینے لگتے ہیں، کل دولت مندی کے غرور میں جو کچھ نظر آتا تھا وہ آج فقر و افلاس کے آئینہ میں ان کو پہلے کے بالکل برخلاف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کنزرویٹیو ہے، کل تک جو سمجھتا تھا، آج لبرل بن کر اس کے تمام تر خلاف سمجھتا ہے اور کل ممکن ہے لیبر بن کر کچھ اور سمجھنے لگے، غرض انسان کے انکار و یقین کا معیار ہر ماحول میں، ہر ذہنی کیفیت میں، ہر اختلاف عمر میں ہمیشہ بدلتا اور متغیر ہوتا رہتا ہے، ایک شخص کو جو بات محال معلوم ہوتی ہے، جو کل قبیح نظر آتی تھی، وہ آج اس کی نگاہ میں سراسر مستحسن ہے،، پھر کیا یہ ایسا متغیر اور دم بدم بدلنے والا معیار ناقابل زوال وثوق و یقین کی بنیاد بن سکتا ہے۔ (شذرات، معارف ماہ اپریل ۱۹۳۲ء)

قوموں کی بقا، ان کے عقائد وایمانیات اور ان کی خصوصیات پر موقوف ہے: قوموں کی بقا و حیات ان کے عقائد و ایمانیات کی پختگی اور ان کی خصوصیات کے تحفظ پر موقوف ہے، نقالی سے قومیں دوسری قوموں میں ضم ہو جاتی ہیں، ان کا قومی وجود باقی نہیں رہتا، کسی قوم کی بربادی کا اصل وقت وہ ہوتا ہے جب اس کے یقینیات یعنی ایمانیات تو اس کے نزدیک مشکوک ہو جاتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں یا اس کی جگہ دوسری قوم کے یقینیات اس کے دل میں راہ پاتے اور پختگی و استحکام حاصل کرتے جاتے ہیں، اس وقت وہ قوم تمسخر انگیز تناسخ کی صورت میں ہوتی ہے، اوپر سے تو وہ وہی قوم معلوم ہوتی ہے مگر اندر سے کچھ اور ہو جاتی ہے، بظاہر وہ اب بھی وہی کہنے کہلانے پر مصر ہوتی ہے، مگر اس کا باطنی ہیولیٰ کسی اور قومیت میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے، گویا وہ اندر سے تو کوئی اور حیوانی صنف میں بدل جاتی ہے، مگر اوپر سے اس پر چہرہ انسان کا لگا ہوتا ہے، پھر یہ انسان نما حیوان تعجب کرتا ہے کہ ہم پر انسانی برکات کے اس پہلے خزانے کا منھ کیوں نہیں کھل جاتا جب ہم صرف اوپر سے انسان نہیں بلکہ اندر سے بھی انسان ہیں۔

ہم بظاہر مسلمان بنتے ہیں مگر اسلامی ایمان ویقین سے سرتاپا عاری، اسلامی تعلیم و ہدایت سے یکسر غافل اور اسلامی تمدن و معاشرت سے تمام تر خالی ہیں، پھر اصرار ہے کہ ہم کو اسلام کا پیرو اور مسلمان کہا جائے اور اسلام اور مسلمانوں کے جو لوازم اور خصوصیات ہیں ان کا ہم کو اہل قرار دیا جائے اور اگر وہ وعدے جو مسلمانوں سے کیے گئے تھے ہمارے ساتھ پورے نہ کیے جائیں تو ہم کو اپنی غلط نمائی پر جھوٹ کا گمان نہیں ہوتا بلکہ وعدے کرنے والے کے جھوٹے ہونے کا (نعوذ باللہ) خیال ہوتا ہے کیا یہ علت و معلول اور خاصیت اور ذی خاصیت کے درمیان لزوم کی صحیح منطقی شکل ہے۔

دنیا کی سطح پر جو قومیں وجود پذیر ہوئی ہیں ان کی بناوٹ کا خمیر عموماً تین مختلف مسالوں سے تیار ہوا ہے یعنی کسی نسل کی محبت یا کسی خاص ملک کی الفت یا چند خیالات سے مستحکم عقیدت، اسلامی قوم کی طبعی ساخت تیسرے مسالہ سے ہوئی ہے، اس لیے اس کی بنا کی سستی کو دور کرنا ہے تو اسی خاص قسم کے مسالہ کو جہاں جہاں سے جھڑ گیا ہے لگا دیئے اور اس کو پختہ کیجیے ورنہ اگر آپ چاہیں گے کہ کمزوری اور سست بنیادی کو پہلی یا دوسری قسم کے مسالے سے دور کریں تو آپ اس کو وہی چیز نہیں بلکہ دوسری یا تیسری چیز بنا رہے ہیں، اس کو ہندو یا انگریز بنا رہے ہیں مسلمان نہیں بنا رہے ہیں، جس وقت عرب کے ملک میں اسلامی قومیت کی تعمیر ہو رہی تھی، اس کے داہنے اور بائیں دو اور قومیں موجود تھیں، ایک طرف ایرانی نسل کی قومیت دوسری طرف رومی شہنشاہی وطنیت، مگر عرب کے نئی قومیت کے خلاق نے نہ ادھر دیکھا نہ ادھر کیوں کہ ان دونوں کی کمزوریاں آشکارا تھیں، بلکہ وہ اپنے لیے ایک تیسری قومیت کا مسالہ تیار کرتا رہا اور بالآخر ایک نئی قوم بنا کر کھڑی کر دی جس نے آن کی آن میں دونوں قدیم قوموں کو تہ و بالا کر کے ان کو اپنے میں مدغم ہونے پر مجبور کر دیا۔

مسلمان اگر آج مسلمان ہیں تو اس نکتہ پر غور کریں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قومیت کی تعمیر کے وقت یہ نہیں کہا کہ اے مسلمانو! تم ایرانیوں کی طرح بن جاؤ تو

درفش کاویانی جیسا علم تمہارے سروں پر لہرانے لگے یا اے مسلمانو! تم رومیوں کی طرح بن جاؤ تو عالم گیر شہنشاہی کے تخت پر تم کو بیٹھنا نصیب ہو، بلکہ جب کہا تو یہی کہا یاایھا الذین آمنوا (اے ایمان والو، ایمان والے بن جاؤ) یعنی اے بے مثال قوم والو، اپنی مثال آپ بن جاؤ، یا پھر یہ کیا؟ بدبختی ہے کہ آج مسلمانوں کے نزدیک ان کے مسلمان بننے کی صرف دوراہیں ہیں، کچھ کے نزدیک یہ کہ تمام مسلمان یک لخت فرنگی بن جائیں اور بعضوں کے نزدیک یہ کہ وہ ہندی بن جائیں اور اب مسلمان بننا مسلمان بننے کے لیے ضروری نہیں رہا تو خدارا بتاؤ یہ پوری قوم کی پوری قوم کو ایک دوسری قوم میں مدغم ہو جانے کی صریح دعوت ہے یا نہیں۔ (شذرات معارف ماہ مئی ۱۹۳۲ء)

قوموں کی تعلیم وتربیت کے اصول: ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں بڑی خوبی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اشخاص اور افراد کی طرح قوموں کی بھی عمریں ہوتی ہیں، وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں، بوڑھی ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں، دنیا کی تمام تاریخیں اس نظریہ کے ثبوت میں ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ اب یہ فلسفہ تاریخ کا مسلمہ مسئلہ ہے۔

لیکن اگر زیادہ دقت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقوام کے ان مختلف دوروں میں ان کی زندگی کے خصوصیات اور لوازمہ بھی الگ الگ ہوتے ہیں، بچپن میں ان کی خواہشیں بچوں جیسی ہوتی ہیں جوانوں میں جوانوں جیسی، بڑھاپے میں بوڑھوں کی طرح ان اقوام کی تعلیم وتربیت کے اصول بھی نوعمروں کی تعلیم وتربیت کے مماثل ہوتے ہیں۔

قوم کے مصلح قوم کے معلم ہوتے ہیں، کامیاب معلم وہی ہے جو تعلیم وتربیت کے ان فطری اصولوں کی پیروی کرتا ہو، جس طرح استادوں کی اس کی ضرورت ہے کہ طلبہ کو صبح خیزی، ورزش اور جدوجہد کی عادت ڈلوائیں اور ان کی آرام طلبی، راحت جوئی، وضع داری اور فیشن پرستی سے باز رکھیں، اسی طرح مصلح قوم کے لیے ضروری ہے کہ عیش پرستی، آرام طلبی اور تعطل سے باز رکھ کر محنت وجدوجہد اور دوڑ دھوپ میں مصروف رکھے، اسی سے

اسلام کے جہاد کی حقیقت اہل بصیرت پر روشن ہوگی۔

استادوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچوں سے ایک کام شروع کرا کے دل جمعی اور استقلال کے ساتھ اس کو ان سے پورا کرادے، تاکہ ان میں عزم و استقلال پیدا ہو اور ایک کام یابی سے دوسری کام یابی کی ہمت پڑے اور حوصلہ بڑھے، ایسے ہی قوم کے مصلح کا فرض ہے کہ قوم کے سامنے جب کوئی تجویز پیش کرے تو اس پر فوراً عمل شروع کرادے اور جیسے بنے اس سے اس کام کو پوری مستعدی اور جوش و خروش کے ساتھ انجام دلائے تاکہ ایک کی کام یابی کے نشہ میں وہ دوسرے کام کو پورے زور کے ساتھ کر سکے اور اس طرح سے عزم پختہ، استقلال مضبوط، ہمت بلند اور حوصلہ بڑھتا رہے، اگر اس اصول کی پیروی نہ کی جائے گی تو قوم کا عزم روز بروز کم زور، استقلال مفقود، ہمت پست اور حوصلہ فنا ہوتا رہے گا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ قومی تعلیم و تربیت کے دور میں اس اصول کی سب سے کم پروا کی گئی ہے، بلکہ ان انجمنوں اور کانفرنسوں نے جو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بنائی گئی تھیں، سب سے زیادہ ان کو سست اور نکما بنانے میں مدد دی، انہوں نے پوری قوم کو یہ عادت تو ڈلوائی کہ وہ بڑی بڑی تجویزوں کے ذریعہ جن کا اصلاحی نام ''برعکس نام نہند زنگی کافور'' رزولیوشن یعنی اظہار عزم رکھا مگر عملاً اس کے معنی بات بنانے کے قرار دیے، نتیجہ یہ ہوا کہ قوم باتونی تر ہوگئی مگر کامی نہ ہوئی۔

ہر انجمن اور کانفرنس کی روداد ان قومی عزائم کی فہرست سے معمور ہے مگر جہاں تک عمل کا سوال ہے ان میں سے ہر ایک ہمارے قومی ضعف، روحانی انحطاط اور اخلاقی کم زوری کا مظہر...... ہے، مسلمانوں کی پچھلی تاریخ تو چھوڑیے خود ہندوستان میں ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں اس کا مشاہدہ ہوا اور روسی اشتراکیوں اور کمالی ترکوں نے اپنے پنج سالہ پروگراموں کے ذریعہ دکھا دیا کہ قوموں کی تعلیم و تربیت کس طرح ہوتی ہے، اس ایک نکتہ سے بتدریج نزول قرآن کی حکمت سمجھ میں آسکتی ہے، قرآن کا مقصد دنیا میں ایک عملی قوم پیدا کرنا تھا، محض

نظری وخیالی نہیں۔

قوموں کی تعلیم وتربیت کا بڑا راز یہ ہے کہ جو بات جماعتی اور اجتماعی حیثیت سے ان کی زبان سے نکلوائی جائے اس کو کر کے چھوڑا جائے تا کہ ان کے حوصلہ کا ہر قدم آگے بڑھتا رہے اور ان کی زندگی کا سرچشمہ جوش مارتا رہے، اس عہد کا سب سے بڑا ہندو مصلح ٹھیک اسی اصول پر گام زن ہے، اگر مسلمان مصلحوں کے طریقہ تعلیم پر ذرا غور کریں کہ جنگ بلقان، غزوہ طرابلس، واقعہ کان پور، ہنگامہ مسلم یونیورسٹی، جنگ عظیم، مسئلہ خلافت، مسئلہ مقامات مقدسہ، مسئلہ آزادی کس اہم مقصد پر ان کے مورچے مضبوطی کے ساتھ جمائے گئے اور ان کو کامیاب بنا کر چھوڑا گیا، اب تک یہی عمل جاری ہے، آج ایک بات اٹھائی گئی اور کل وہ بھلا دی گئی، نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز مسلمانوں کے حوصلے پست ہمتیں ضعیف اور ارادے کم زور ہوتے جارہے ہیں اور ان میں کسی ایک مورچہ پر جم کر لڑنے کا مادہ اب تک پیدا نہیں ہوا۔

تعلیم وتربیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ انفرادیت فنا کر کے اجتماعیت پیدا کی جائے اور بار بار کے تجربوں سے طالب علموں کو مشاہدہ کرادیا جائے کہ جماعتی طاقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور انفرادیت اس طاقت کے لیے زہر قاتل ہے، اسکولوں اور کالجوں کے تمام کھیل اسی اصول کی تعلیم اور مشق کے لیے ہیں، بوڑھی قومیں جب فنا ہونے لگتی ہیں تو ان کی موت کے جراثیم اس انفرادیت کی آب وہوا میں پرورش پاتے ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر ان میں خود غرضی، عدم ایثار، ذاتی اعزاز کی طلب اور قومی خیانت پیدا ہو جاتی ہے، اسلام کی ہر عبادت میں جماعت کی تعلیم اسی اصول کی حفاظت کے لیے ہے۔

ترقی کا حقیقی مفہوم: انگریزی عہد کی ابتدا سے مسلمانوں میں ترقی کی پکار ہے لیکن اس کی تعبیر وتعیین میں اس قدر اختلاف ہے کہ اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہوسکا، سید صاحب نے نہایت حکیمانہ انداز میں ترقی کی حقیقت ان الفاظ میں واضح فرمائی:

آج دنیا میں ہر طرف ترقی ترقی کی پکار ہے، مسلمان بھی اسی کی رٹ لگا رہے ہیں، جہاں تک لفظ کا تعلق ہے کسی کو اس سے اختلاف نہیں لیکن جب اس کے معنی کی توضیح کی جاتی ہے تو دفعتاً ہر طرف سے ذہنی بغاوتوں کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے، کوئی صاحب اس سے یورپین طرز تمدن اور طرز معاشرت مراد لیتے ہیں، کوئی فرقہ اس سے دولت وتمول کا مفہوم سمجھتا ہے، کوئی نئی تعلیم اور ڈگریوں کی کثرت کو اس کا مرادف جانتا ہے، کوئی سیاسی سرگرمیوں کو تنہا ترقی کہہ کر پکارتا ہے، کوئی اس سے صنعت وحرفت وتجارت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کوئی پرانے خیال کا آدمی اس سے قرون اولیٰ جیسی اخلاقی وروحانی حالت وکیفیت کی تعبیر کرنا چاہتا ہے اور بہت سے نوجوانوں کے نزدیک مستورات کی عریانی، ڈنر کے بعد محفل رقص وسرود کا نشاط اور یورپین تہذیب کے دیگر معائب کے مجموعے کا نام ترقی ہے، غرض

ع: شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ترقی صرف اس روح کا نام ہے جو قوموں کو زندہ کر کے ان کے ہر رگ وریشے میں جد وجہد اور سعی وعمل کی تڑپ پیدا کر دیتی ہے، وہ تمام قوم میں کسی متفقہ غرض کے حصول کے خاطر ہر قسم کی تکلیف ومشقت کی برداشت کی قوت پیدا کرتی ہے، ترقی کسی خاص مادی مظہر کا نام نہیں بلکہ یہ وہ بجلی ہے کہ جب کسی قوم کے افراد میں کوند جاتی ہے تو ہر ایک کے دست وبازو میں اپنے فرائض کے بجالانے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے اور قوم کے تمام قویٰ کو اپنے نشوونما اور تکمیل کے لیے بیدار بنا دیتی ہے اور پوری قوم اپنے افراد کی مختلف استعدادوں اور قوتوں کی مجموعی کوششوں سے زندگی اور عمل کے لیے نئے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

کسی کارخانہ میں ہم کوئی عظیم الشان انجن دیکھتے ہیں جس کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ مختلف ضروری کام انجام دے رہا ہے، دفعۃً وہ انجن بگڑ جاتا ہے، اب اناڑیوں کا ایک گروہ اس کی مرمت واصلاح کے درپے ہے، کسی نے ایک پرزے کو کھینچا، کسی نے دوسرے پرزہ

کو صاف کیا، کوئی کہیں کا تسمہ پکڑ کر کھینچتا ہے، کوئی کسی اور پرزے کو بے قاعدہ حرکت دے دینا چاہتا ہے اور ہر ایک اپنے کام کو اپنی اصطلاح میں اصلاح و مرمت کہتا ہے مگر اس سے کیا یہ بگڑا ہوا انجن اپنی اصلی قوت اور طاقت کے خزانہ کے بغیر صرف ظاہری چمک دمک اور کھینچ کھانچ سے چل سکتا ہے۔

ہماری قومی ترقی کا بھی یہی حال ہے، دنیا میں یہودیوں نے اور ہندوستان میں پارسیوں نے یورپین تہذیب و تمدن کے ہر اچھے برے نمونہ کا چربہ اتارا اور آج جو کچھ ہمارے نوجوان چاہتے ہیں وہ سب ان کے مردوں اور عورتوں نے انجام دیا، مگر کیا ترقی کے بلند آشیانہ ہما کو وہ ان تدبیروں سے اپنے جال میں پھنسا سکے، وہ اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے، دوستو! مظاہر کا نام ترقی نہیں، ان مظاہر کی اصل روح و مصدر کا نام ترقی ہے، اب بتایئے کہ مسلمان قوم کی روح و مصدر کون سی قوت بن سکتی ہے، اسی کے جواب سے یہ لاینحل معما حل ہو سکتا ہے۔

ہر قوم کی تخلیق خاص قسم کے معنویات سے ہوتی ہے، غور کرنا چاہیے کہ مسلمان قوم کے معنویات کیا ہیں، کیا بھارت ماتا کی پرستش، کیا گائے کی تقدیس، کیا دولت کی چاہ، کیا جمشید و فریدوں اور رام و کرشن کی عقیدت، کیا گنگا جمنا اور نیل و فرات کی پوجا، نہیں ان میں سے کوئی چیز نہیں بلکہ ان سے مافوق ایک واحد ذات اعلیٰ برتر مقدس، قادر علی الاطلاق ہستی کی عقیدت اور ایک عالم گیر انسانی برادری کی مساوات اور اس تعلیم کے تمام معلمین خصوصاً آخری معلم علیہ السلام کی محبت اور اس کی تعلیم پر عمل کا جذبہ، مسلمان قوم کی معنویات ہیں اور ان ہی کا جوش و خروش ہمارے انجن کی اصلی طاقت اور قوت ہے، اب اگر ہم اس کو چھوڑ کر کسی اور طاقت سے زندگی پیدا کرنے کی کوشش کریں تو ضروری ہے کہ پہلے ان معنویات کو مٹا کر کوئی اور مقصد حیات اس کے سامنے رکھیں اور اس کو کسی اور قوم کے قالب میں بدل دیں۔ (معارف ماہ مارچ ۱۹۳۳ء)

آج قوموں کے مصلح جماعتی قوت کی تعلیم کے لیے ایک دن اور وقت مقرر کر کے کبھی ہڑتال، کبھی جلوس، کبھی جلسہ، کبھی قومی دن و ہفتہ، کبھی قومی عید اور تیوہار منانے کی مشق کراتے ہیں، مدت معینہ میں مقررہ چندہ کی مقدار فراہم کرنے کی تجویز بھی اسی اصول کی تعلیم کا ایک سبق ہے، کیا مسلمان قوم کے موجودہ مصلحوں سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان کی قوم کہاں تک اس سبق کو یاد کر سکی، ایسی حالت میں ایسے اجتماعات عامہ کا اعلان کرا کے ان کو پورا نہ کرانا مسلمانوں کے مرض کو کس تیزی سے بڑھانا ہے، یا تو کافی استعداد اور تیاری کے بغیر قوم کے منھ سے کوئی بات نہ نکلوائی جائے اور اگر نکلوائی جائے تو جس طرح ہو پوری کرائی جائے اور کیا اگر ایسا نہ کیا گیا تو قومی ضعف عزم، انحطاط قویٰ اضمحلال روح کو پیدا کر کے اس کو موت کے منھ میں ڈھکیل دینا ہے۔ (معارف ستمبر ۱۹۳۴ء)

قوموں کی ترقی کے اصول: قوموں کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند سچی حقیقتوں پر مستحکم یقین اور اس یقین کے مطابق عمل اور کام یابی کے لیے مسلسل جدوجہد، سعی و محنت اور اس راہ میں جو تکلیف و مصیبت پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا، زمانہ کی اصطلاحیں بدلتی رہیں گی لیکن اصطلاحوں کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلا کرتیں، اسلام کی اصطلاح میں اس مستحکم یقین کا نام ایمان، اس کے مطابق عمل کا نام عمل صالح اور مسلسل جدوجہد اور سعی و محنت کا نام جہاد اور اس کے لیے پامردی کا نام صبر و ثبات ہے، دنیا میں جب کسی قوم کو کام یابی ہوئی ہے تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے اور جب ہوگی اسی اصول کے مطابق ہوگی۔

جانی و مالی ایثار و قربانی اس جدوجہد کی لازمی حقیقتیں ہیں، جن کو قرآن پاک کی اصطلاح میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہتے ہیں، دنیا کی کوئی تحریک اس مالی و جانی جہاد کے بغیر نہ کام یاب ہوئی ہے اور نہ ہوگی، مذہبی تحریکوں کو جانے دیجیے آج سیاسی و اقتصادی تحریکوں کا دور ہے، ان میں سے کون سی تحریک کی گاڑی ان دو پہیوں کے بغیر چل

رہی ہے ،روس کا انقلاب، جرمنی اور اٹلی کا فاشزم، اسپین میں جمہوریت وآمریت کا تصادم، فلسطین کی شہادت گاہ ،ان میں سے کہاں ان دو کے بغیر کامیابی نصیب ہوئی ہے یا ہوگی ، پھر ہندوستان کے مسلمان اس عرصہ حیات میں کوئی انوکھی مخلوق نہیں کہ ان کے لیے دنیا کا اصول بدل جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنے قانون قدرت کو توڑ دے گا۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنے قومی وسیاسی ایمان کے لیے کون سی حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ کون سی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلبی اور ہنگامی حقیقتیں کبھی دائمی سربلندی کا جوش وخروش نہیں بن سکتیں، سکھوں، مرہٹوں کی قوتوں کے جوانا مرگی کے اسباب بتانے والے بہت کچھ بتا سکے ہیں لیکن میرے نزدیک جو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت سے کینہ اور دشمنی یا مسلمانوں سے عداوت ہی فرض کر لیجیے، ان دونوں قوموں کا ایسا ہنگامی جذبہ تھا جو پورا ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو گیا اور بقا واستحکام حاصل نہ کرسکا، آریہ سماج تحریک کا حشر بھی اس سے زیادہ نہیں۔

اب مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی قوم سے مخالفت اور آزردگی ہی ان کی قومی وسیاسی کوششوں کا محور قرار پائے تو ان کا یہ جذبہ کہاں تک ان کو اونچا لے جا سکتا ہے اور ان کی سعی ومحنت، جدوجہد اور جوش وخروش کو کب تک قائم رکھ سکتا ہے، جو طوفان اور سیلاب دم کے دم میں آتا ہے وہ اسی طرح دم کے دم میں چلا بھی جاتا ہے۔

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے، وہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے، اس کے مذہبی وسیاسی واقتصادی اور اجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، بدکاری، شراب خواری، قمار بازی اور ظلم کو بیخ وبن سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا

سیاسی واقتصادی نظام قائم کرنا اس کے وہ فرائض ہیں جن سے مسلمان غافل ہیں اور غیر مسلمان ان کے لیے آج دنیا میں کٹ مر رہے ہیں، یہ نہیں کہا جاتا کہ جس کے لیے آج وہ کٹ مر رہے ہیں وہ عین اسلام ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں اسلامی نظام کی جھلک ہے، اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا مکمل سیاسی واقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں اور اس کے لیے کم سے کم وہ جذبہ دکھائیں جو اسپین میں جمہوریت اور فاشزم کے حامی دکھا رہے ہیں، وہاں قومیں نہیں لڑ رہی ہیں بلکہ ایک ہی قوم کے دو حصے دو مختلف نظریوں کی خاطر جان ومال کی بازی لگا رہے ہیں۔

مسلمانوں نے اسلام کے آغاز میں جو لڑائیاں لڑیں ان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک مذہب کو زبردستی پھیلانے کی خاطر تلواریں نیام سے نکالی گئی تھیں لیکن آج سوشلزم اور فاشزم کے باہمی مقابلہ میں جو تلواریں بے نیام ہو رہی ہیں وہ بھی کسی خاص مذہب کو زبردستی پھیلانے کی خاطر نہیں ہیں، سوشلزم کے حامی کہیں گے کہ قوم میں طبقوں کی جنگ عوام کی بھلائی کے لیے چھیڑتے ہیں تو یہی تو اسلام کے حامی بھی کہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کی بھلائی کی خاطر تلواریں اٹھائیں، شہنشاہوں کو مٹایا، سود خواروں کا قلع قمع کیا، سونے چاندی کے ٹھیکے داروں کو نیست ونابود کیا، دنیا میں عدل ومساوات کی حکومت قائم کی اور انسان کو انسانوں کا معبود بننے سے روکا۔

آج زمانہ بدل گیا ہے تو اصطلاحیں بھی بدل گئی ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے، آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے، اگر آج کے کلمہ گو مسلمانوں میں اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہیں ہے تو کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان میں لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے۔

دنیا آج اپنی نجات کی راہ فاشزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم اور بالشوزم میں ڈھونڈ رہی ہے، حالاں کہ اس کا ایک ہی راستہ ہے، یعنی اسلامزم لیکن وہ اسلامزم نہیں جو

آج عملاً مسلمانوں میں ہے بلکہ وہ جو قرآن وسنت میں ہے، آج کی وہ کون سی مشکلیں ہیں جن کا حل ان میں نہیں ہے، ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے۔ (معارف جنوری ۱۹۳۹ء)

قومی گفتار و کردار میں توازن کی ضرورت: افسوس ہے کہ ہمارے قوم کے گفتار و کردار میں ابھی توازن نہیں پیدا ہوا ہے، جس طرف کی ہوا چلتی ہے اسی طرف سب کے سب ایک دفعہ جھک پڑتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ قوم کی مختلف ضرورتیں ہیں اور ہر ضرورت اپنی جگہ پر شدید ہے، آج کل سیاسیات کی جو صحیح یا غلط آندھی چل رہی ہے اس میں سب اڑے چلے جارہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف یہی ایک چیز ہے جو قوم کو جلا یا مار سکتی ہے، حالاں کہ جماعت کی حیثیت ایک فرد کی مانند ہے، جس طرح ایک زندہ آدمی کو زندہ رہنے کے لیے پانی، غذا اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، اسی طرح جماعت کو بھی اپنی زندگی کے لیے ایمانی واخلاقی طاقت، مالی قوت، جہاد کی روح اور صحیح تعلیمی مقصد، وغیرہ بہت سی غذاؤں کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کو لے کر دوسری چیزوں سے غفلت برتنا قوم خودکشی ہے۔

ورم اور موٹاپے دونوں میں جسم کا کچھ حصہ بڑھ جاتا ہے لیکن ورم اس کا نام ہے کہ بدن کا کوئی ایک عضو یا اسی عضو کا کوئی حصہ بڑھ کر بدن میں عیب یا درد پیدا کردے اور موٹاپے خصوصاً صحت تندرستی کے موٹاپے میں بدن کے سارے اعضا میں متوازن نشو ونما ہوتا ہے، اس لیے قوموں کی زندگی کے کسی ایک شعبہ پر اتنا زور دینا کہ دوسرے پہلو ننگا ہوں سے اوجھل ہو جائیں، قومی صحت کی فربہی نہیں بلکہ بیماری کا ورم ہے۔

زندگی کا سرچشمہ، قوت سخت کوشی اور جدوجہد ہے: دنیا کی قوموں کے حالات نگاہ کے سامنے رکھنے سے یہ بات کتنی صاحب نظر آتی ہے کہ ہر قوم کو دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے کتنی جدوجہد، کتنی محنت اور کتنے صرفِ جان ومال کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ قرآن پاک کے ہر صفحہ میں نمایاں ہے، یجاهدون بانفسهم واموالهم اور ان الله اشترىٰ من

المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنة وغیرہ سیکڑوں آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ نفس و مال کا مجاہدہ، کام یابی کی پہلی شرط ہے، جس قوم نے اس شرط کو پورا کیا وہی کام یابی کے میدان میں سب سے آگے نکلی۔

میں نے ایک دفعہ ۱۹۲۶ء میں خلافت کانفرنس دہلی کے صدارت نامہ میں جو جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ کے درمیان والے میدان میں منعقد ہوئی تھی، یہ کہا تھا کہ اگر شاہ جہاں کی طرح لال قلعہ کے تخت طاؤس پر بیٹھنے کی ہوس ہے تو پہلے بابر کی طرح بارہ برس ترکستان وافغانستان کے پہاڑوں سے سر ٹکراؤ، بدر و حنین کے معرکہ کے بغیر فتوحات فاروقی سے لطف اٹھانے کا خیال خواب شیریں سے زیادہ نہیں۔

دنیا تو جدھر جارہی ہے جارہی ہے، سوال یہ ہے کہ مسلمان عیش و آرام میں رہ کر اوج و اقبال کی چوٹی پر چڑھنے کا جو خواب دیکھ رہے ہیں وہ کہاں تک پورا ہوسکتا ہے، تغافل کی سرمستی، جان و مال کا بخل، عزم و ہمت کا فقدان اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے محرومی، ہماری ظاہری جدوجہد کو ناکام بنارہی ہے، ظاہر میں تو نظر آتا ہے کہ ہم دوڑ رہے ہیں حالاں کہ ہم حقیقۃً اپنی جگہ پر کھڑے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ دوڑ رہے ہیں کیوں کہ ہم ابھی دوڑ کی گفتگو اور دوڑ کی سمت متعین کرنے میں پوری طرح مصروف ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام نے فنون لطیفہ کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، اس پر کتنے بے خبروں نے یہ کہا کہ اسلام فنون لطیفہ کا دشمن ہے، اس نے زندگی کے تکلفات، تصاویر اور عریاں شہوانی جذبات کی شاعری کو ناپسند کیا ہے لیکن اس مسئلہ کو اس حقیقت کی نظر سے دیکھیے کہ یہ اس قوم کا نظریہ ہے جو جدوجہد اور سعی پیہم کے فلسفہ پر ایمان رکھتی ہے اور حسن منظر اور تماشائے نظر کی دل دادہ نہیں، اور فنون لطیفہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوموں کی جسمانی جدوجہد اور قلبی سکون وطمانیت کے بجائے ذہنی تعیش اور عقلی لطف انگیزی کے زمانہ میں ترقی پاتی ہے، کسی قوم میں اس کا عروج اس کے دوڑ دھوپ کے عہد کی نہیں بلکہ اس کے

توقف اور سیر وتفریح کے عہد کی علامت ہے، اس لیے فنون لطیفہ اور ان کی ترقی کے لیے ساری محنت اور جان و مال کا صرف قوم کی صحت مزاج کی نہیں بلکہ بیماری کی نشانی ہے۔

زندگی نام ہے قوت کا، جو قوم قوت سے محروم ہے، وہ زندگی سے محروم ہے، ''اعدوالھم مااستطعتم من قوۃ'' (دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جہاں تک تمہارے بس میں ہے اپنے کو تیار رکھو) کا قرآنی فلسفہ اپنی تعلیم کی طرف اشارہ کرتا ہے، اگلے مفسروں نے اپنے زمانہ کی حالت کے مطابق قوت کی تفسیر تیراندازی کی مشق سے کی تھی، مگر یہ تشریح زمانہ کی حالت کے لحاظ سے بدلتی رہے گی، اور قرآن پاک کے لفظ کا عموم اپنی وسعت کے دامن میں ہر اس چیز کو سمیٹتا رہے گا جس سے دشمنوں کی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے۔

دوسرے اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی وتنزلی کے سارے مراتب کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے جیسے جیسے مجاہدانہ طور طریق کو چھوڑ کر عیش وراحت کی زندگی کا خوگر ہونا شروع کیا ہر میدان سے ان کا قدم ہٹتا گیا اور بالآخر عیش وراحت کا وہ سامان بھی ان سے چھین لیا گیا جس کے حصول کے لیے وہ اپنا دین وایمان اور دنیا سب کچھ قربان کر رہے ہیں۔

ہم آج دوسری سفید قوموں کی نقالی بھی کرتے ہیں تو ان کے عیوب اور برائیوں میں کرتے ہیں، حالاں کہ ہم اگر ان کی نقالی بھی کرنا چاہیں تو ان کے ہنر اور محاسن میں کریں، ہم شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، فیشن بازی، بے پردگی اور الحاد و بے دینی میں تقلید کرتے ہیں اور ان ہی چیزوں کو ان کی قوت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، حالاں کہ ان کی قوت کا سرچشمہ ان کی جد وجہد، سعی ومحنت، ایثار وقربانی، انفاق مال اور حق کی خاطر ہر مصیبت کا جھیلنے کا ذوق ہے۔

بنی اسرائیل کو ایک بادشاہ کی تلاش تھی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انتخاب کی دو شرطیں بتائیں، بسطۃ فی العلم والجسم یعنی علم اور جسم میں طاقت، فلسفہ تاریخ اور

نفسیات اجتماعی کی ہر تحقیق اسی نتیجہ کو ظاہر کرے گی کہ یہ دو طاقتیں ہر طاقت کی جڑ ہیں اور شاہانہ اقتدار کی بنیاد، علم و طاقت دونوں کو شامل ہے، مگر سب سے بڑا علم ایمان ہے، ایمان کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے یعنی چند غیر متزلزل حقیقتوں کا اقرار اور اس پر جماعتوں کا اعتقاد جازم اور اس اعتقاد جازم کے مطابق عمل الذین آمنوا وعملوا الصالحات، ذرا غور تو کیجیے کہ آج مسلمانوں کے اندر ان کا کوئی متحدہ اعتقاد جازم باقی ہے اور اس کے مطابق ان میں عمل کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ (معارف جولائی ۱۹۴۰ء)

Hayat-e Sulaiman

Shah Moinuddin Ahmed Nadvi (R)

Darul Musannefin Shibli Academy
Azamgarh, U.P.

ISBN : 978-93-80104-38-6